بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ (نساء: ۶۹)

مَآثِرُ الْاَنْبِيَآءِ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَآثَارُ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ

ملقب بہ

اقوالِ سلفؒ

حصہ ہفتم

جس میں تیرھویں صدی ہجری کے اولیاء کرام کے احوال واقوال مختصراً ذکر کئے گئے ہیں۔

مرتب

شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم

ناشران

مکتبہ دار المعارف الہ آباد

ادارہ معارف مصلح الامتؒ الہ آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب سے متعلق ضروری معلومات

نام کتاب : مَاثِرُ الْاَنْبِيَآءِ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَآثَارُ الشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ

ملقب به ''اقوال سلفؒ'' حصہ ہفتم

مرتب : شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم

تعداد صفحات : ۶۴۰ تعداد اشاعت : ۱۱۰۰

سن اشاعت : رجب ۱۴۳۹ھ اپریل ۲۰۱۸ء

باہتمام : مولوی محمد عبد اللہ قمر الزمان قاسمی الہ آبادی

تصحیح : مولوی محمد عبید اللہ قمر الزمان ندوی ومولوی فیروز عالم قاسمی

کمپوزنگ : مولوی رشید احمد آچھودی گجرات

ناشر : مکتبہ دار المعارف الہ آباد۔ ادارہ معارف مصلح الامتؒ الہ آباد

قیمت :

ملنے کے پتے:

☆......مکتبہ دار المعارف الہ آباد، ۹ ۶۳ / بی وصی آباد، الہ آباد، یو پی، ۲۱۱۰۰۳

☆......مکتبہ فیضان قمر ٹائم ٹو ٹائم دکان نمبر ۷ ایس ڈی چال، بہرام باغ روڈ، جوگیشوری، ممبئی

☆......مکتبہ رحمانیہ، دار العلوم عربیہ اسلامیہ بھروچ محمود نگر کنتھاریہ، بھروچ، گجرات

☆......قاضی بکڈپو، بالمقابل بڑی مسجد (مرکز) رانی تلاؤ، سورت، گجرات ۳۹۵۰۰۳

☆......مکتبہ النور دیوبند، یو پی۔ ۲۴۷۵۵۴

☆......مکتبہ صدیق دیوبند، یو پی۔ ۲۴۷۵۵۴

☆......الفرقان بکڈپو، ۳۱/۱۱۴ نظیر آباد، لکھنؤ

فہرست

مَاٰثِرُ الأَنۡبِيَاءِ وَ الصِّدِّيقِيۡنَ وَ اٰثَارُ الشُّهَدَاءِ وَ الصَّالِحِيۡنَ

ملقب بہ ''اقوالِ سلف'' حصہ ہفتم

نمبر شمار	فہرست عنوان	صفحہ نمبر
ا	عرضِ ناشر: از محمد عبداللہ قمر الزمان قاسمی الہ آبادی	۸
ب	مقدمہ: از مرتب عفی عنہ	۱۰
ج	کلماتِ طیبات: مشفقی المکرم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری مدظلہ	۱۷
د	تعارف: مشفقی المکرم حضرت العلامہ خالد محمود صاحب مدظلہ مانچسٹر	۲۱
ہ	مکتوبِ گرامی: مشفقی المکرم حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحبؒ الہ آبادی	۲۳
و	تاثر: عزیزم مولانا مفتی جمیل احمد صاحب نذیری مبارک پور، اعظم گڑھ	۲۵
ز	تبصرہ: فخرِ شعر و ادب حضرت ڈاکٹر کلیم احمد عاجزؔ صاحبؒ، پٹنہ	۲۸

اولیاء مقربین وعلماء ربانیین تیرھویں صدی ہجری

نمبر شمار	فہرست عنوان	سنہ وفات	صفحہ نمبر
۱	حضرت سراج الہند مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ	سنہ ۱۲۳۹ھ	۳۲
۲	حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دہلویؒ	سنہ ۱۲۳۳ھ	۵۰
۳	حضرت مولانا شاہ عبدالقادر دہلویؒ	سنہ ۱۲۳۰ھ	۵۷
۴	حضرت مولانا شاہ عبدالغنی دہلویؒ	سنہ ۱۲۰۳ھ	۶۴
۵	حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید دہلویؒ	سنہ ۱۲۳۶ھ	۶۷
۶	حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب دہلویؒ	سنہ ۱۲۸۲ھ	۸۴
۷	حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ	سنہ ۱۲۶۲ھ	۸۵

نمبرشمار	فہرست عنوان	سنہ وفات	صفحہ نمبر
۸	حضرت مولانا شاہ اسد اللہ قادری برہان پوریؒ	سنہ ۱۲۰۵ھ	۸۸
۹	حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ بلگرامی ثم زَبیدیؒ (مؤلف تاج العروس)	سنہ ۱۲۰۵ھ	۹۰
۱۰	حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ	سنہ ۱۲۰۵ھ	۱۰۱
۱۱	حضرت سید علی رمز الٰہی حیدر آبادیؒ	سنہ ۱۲۱۰ھ	۱۰۸
۱۲	مجاہد ملت سراج الدولہ شہیدؒ	سنہ ۱۱۷۱ھ	۱۱۲
۱۳	مجاہد آزادی والیٔ میسور حیدر علیؒ	سنہ ۱۱۹۶ھ	۱۲۰
۱۴	مجاہد ملت اسلامیہ ٹیپو سلطان شہیدؒ	سنہ ۱۲۱۳ھ	۱۲۷
۱۵	حضرت مولانا شاہ موسیٰ قادری حیدر آبادیؒ	سنہ ۱۲۱۵ھ	۱۵۲
۱۶	حضرت مولانا محمد خلیل اللہ بالا پوریؒ	سنہ ۱۲۲۱ھ	۱۵۶
۱۷	حضرت مولانا سید کلیم اللہ بالا پوریؒ	سنہ ۱۲۲۲ھ	۱۵۷
۱۸	حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی	سنہ ۱۲۲۵ھ	۱۶۰
۱۹	بحر العلوم حضرت مولانا عبد العلی لکھنویؒ	سنہ ۱۲۲۵ھ	۱۷۲
۲۰	حضرت مولانا حافظ محمد جمال ملتانی	سنہ ۱۲۲۶ھ	۱۷۸
۲۱	حضرت مولانا سید نور الاولیاء بالا پوریؒ	سنہ ۱۲۲۹ھ	۱۸۵
۲۲	حضرت مولانا خواجہ محمد عاقل پنجابیؒ	سنہ ۱۲۲۹ھ	۱۸۷
۲۳	حضرت مولانا سید نور المصطفیٰ اورنگ آبادیؒ	سنہ ۱۲۳۰ھ	۱۹۴
۲۴	حضرت مولانا حافظ شاہ ابو اسحٰق لہراوی مئویؒ	سنہ ۱۲۳۴ھ	۱۹۵
۲۵	حضرت مولانا سید مجاہد الدین بالا پوریؒ	سنہ ۱۲۳۵ھ	۱۹۹
۲۶	حضرت مولانا شاہ محمد اجمل الہ آبادیؒ	سنہ ۱۲۳۶ھ	۲۰۳

نمبر شمار	فہرست عنوان	سنہ وفات	صفحہ نمبر
۲۷	حضرت شاہ محمد قاسم حیدر آبادیؒ	سنہ ۱۲۳۸ھ	۲۰۸
۲۸	حضرت مولانا فضل امام خیر آبادیؒ (صاحب مرقات)	سنہ ۱۲۴۰ھ	۲۱۲
۲۹	حضرت مولانا شاہ غلام علی دہلویؒ	سنہ ۱۲۴۰ھ	۲۱۵
۳۰	حضرت مولانا خالد شہر زوری کردیؒ	سنہ ۱۲۴۲ھ	۲۴۰
۳۱	حضرت مولانا شاہ کمال الدین کاندھلویؒ	سنہ ۱۲۴۳ھ	۲۴۵
۳۲	حضرت مولانا شاہ عبدالحي بڈھانویؒ	سنہ ۱۲۴۳ھ	۲۴۷
۳۳	حضرت مولانا شیخ احمد رومیؒ	سنہ ۱۰۴۳ھ	۲۵۴
۳۴	حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ	سنہ ۱۲۴۵ھ	۲۶۷
۳۵	مجاہد اسلام حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ	سنہ ۱۲۴۶ھ	۲۷۷
۳۶	حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم ولایتی شہیدؒ	سنہ ۱۲۴۶ھ	۲۸۶
۳۷	حضرت مولانا سید قطب علی نقوی بستویؒ	سنہ ۱۲۴۷ھ	۲۹۶
۳۸	حضرت شاہ محمد مدنی حیدر آبادیؒ	سنہ ۵۰ یا ۱۲۴۰ھ	۳۰۳
۳۹	حضرت مولانا شاہ ابوسعید مجددی رامپوری ثم مدنیؒ	سنہ ۱۲۵۰ھ	۳۰۶
۴۰	حضرت مولانا سید عبدالحي مجددی دہلوی ثم امروہویؒ	سنہ ۱۲۵۱ھ	۳۱۴
۴۱	حضرت مولانا شاہ محمد آفاق دہلویؒ	سنہ ۱۲۵۱ھ	۳۱۷
۴۲	حضرت علامہ سید ابن عابدین شامیؒ (صاحب فتاویٰ شامی)	سنہ ۱۲۵۲ھ	۳۱۹
۴۳	حضرت مولانا عبداللہ دہلوی نزیل امراوتی	سنہ ۱۲۵۲ھ	۳۲۸
۴۴	حضرت مولانا سید نور الاصفیاء حیدر آبادیؒ	سنہ ۱۲۵۵ھ	۳۳۱
۴۵	حضرت قاضی محمد بن علی بن محمد الشوکانی (صاحب نیل الاوطار)ؒ	سنہ ۱۲۵۵ھ	۳۳۳

نمبرشمار	فہرست عنوان	سنہ وفات	صفحہ نمبر
۴۶	حضرت مولانا قاری امام الدین بخشی امروہویؒ	سنہ ۱۲۵۶ھ	۳۳۹
۴۷	حضرت شیخ حسام الدین چشتی گجراتیؒ	سنہ ۱۲۵۷ھ	۳۴۲
۴۸	حضرت اقدس میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ	سنہ ۱۲۵۹ھ	۳۴۵
۴۹	حضرت مولانا میر شجاع الدین حسین حیدرآبادیؒ	سنہ ۱۲۶۵ھ	۳۵۹
۵۰	حضرت حافظ محمد علی خیرآبادیؒ	سنہ ۱۲۶۶ھ	۳۶۷
۵۱	حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ	سنہ ۱۲۶۷ھ	۳۷۸
۵۲	حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ	سنہ ۱۲۶۷ھ	۴۰۷
۵۳	حضرت مولانا علی کبیر جون پوریؒ	سنہ ۱۲۶۹ھ	۴۱۶
۵۴	حضرت مولانا ولایت علی صادق پوری بہاریؒ	سنہ ۱۲۶۹ھ	۴۲۳
۵۵	حضرت علامہ سید محمود آلوسی بغدادیؒ (صاحب روح المعانی)	سنہ ۱۲۷۰ھ	۴۳۵
۵۶	حضرت حافظ محمد ضامن شہید تھانویؒ	سنہ ۱۲۷۴ھ	۴۵۰
۵۷	حضرت مولانا سخاوت علی جون پوریؒ	سنہ ۱۲۷۴ھ	۴۵۹
۵۸	مجاہد آزادی حضرت مولانا فیض احمد بدایونیؒ	سنہ ۱۲۷۴ھ کے بعد	۴۶۳
۵۹	حضرت شیخ محمد گلاب ملکاپوریؒ	سنہ ۱۲۷۴ھ	۴۶۶
۶۰	حضرت مولانا شاہ احمد سعید رامپوریؒ	سنہ ۱۲۷۷ھ	۴۷۱
۶۱	مجاہد آزادی حضرت مولانا فضل حق خیرآبادیؒ	سنہ ۱۲۷۸ھ	۴۷۶
۶۲	مجاہد آزادی حضرت مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی لکھنویؒ (صاحب علم الصیغہ)	سنہ ۱۲۷۸ھ	۴۸۱
۶۳	حضرت مولانا صاحب علی صاحب گھوسویؒ	سنہ ۱۲۸۱ھ	۴۸۷
۶۴	حضرت مولانا شاہ مظفر حسین کاندھلویؒ	سنہ ۱۲۸۲ھ	۴۹۳

نمبر شمار	فہرست عنوان	سنہ وفات	صفحہ نمبر
٦٥	حضرت مولانا عبدالرحمن شاہجہاں پوریؒ	سنہ ۱۲۸۴ھ	۴۹۶
٦٦	حضرت حاجی دوست محمد قندھاری افغانیؒ	سنہ ۱۲۸۴ھ	۵۰۲
٦٧	حضرت مولانا شاہ خاموش دکنیؒ	سنہ ۱۲۸۶ھ	۵۱۳
٦٨	حضرت مولانا شاہ عبدالرشید امروہویؒ	سنہ ۱۲۸۶ھ	۵۱٦
٦٩	حضرت مولانا سید نور الحسین بالا پوریؒ	سنہ ۱۲۸۸ھ	۵۲۰
۷۰	حضرت مولانا سید جعفر علی نقوی بستویؒ	سنہ ۱۲۸۸ھ	۵۲۲
۷۱	حضرت مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادیؒ	سنہ ۱۲۸۹ھ	۵۲۸
۷۲	حضرت مولانا کرامت علی جون پوریؒ	سنہ ۱۲۹۰ھ	۵۳۳
۷۳	حضرت مولانا محمد زماں خان حیدر آبادیؒ	سنہ ۱۲۹۲ھ	۵۵۳
۷۴	مجاہد آزادی حضرت مولانا لیاقت علی الہ آبادیؒ	سنہ ۱۲۹۵ھ	۵۵۹
۷۵	حضرت مولانا محمد طاہر معروفی مئویؒ	سنہ ۱۲۹٦ھ	۵۷۲
۷٦	حضرت مولانا شیخ محمد محدث فاروقی تھانویؒ	سنہ ۱۲۹٦ھ	۵۸۰
۷۷	حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ	سنہ ۱۲۹٦ھ	۵۹۳
۷۸	حضرت مولانا سید محمد معصوم نقشبندی بالا پوریؒ	سنہ ۱۲۹۷ھ	۵۹٦
۷۹	حضرت مولانا احمد علی سہارن پوریؒ	سنہ ۱۲۹۷ھ	٦۰۰
۸۰	حضرت مولانا سید شاہ عبدالسلام فتح پوریؒ	سنہ ۱۲۹۹ھ	٦۰۵
۸۱	حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ	سنہ ۱۲۹۷ھ	٦۱۲
	مصادر ومراجع اقوالِ سلفؒ حصہ ہفتم		٦۳٦

عرض ناشر

بفضلہٖ تعالیٰ اقوال سلف کے تمام ہی جلدوں کو ارباب علم نے شرف قبولیت سے نوازا اور سند کے طور پر اپنا تاثر وتبصرہ وتقریظ ثبت فرمایا۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد سالم صاحب دامت برکاتہم نے اپنی تقریظ میں حضرت والد ماجد صاحب کے متعلق جو تحریر فرمایا کہ ''یہ سلسلۂ فیض حضرت مصلح الامتؒ ہی کا ہے کہ جس کے لئے مشیت ربانی نے آپ کو منتخب فرمالیا'' یہ بات ہمارے لئے بڑی بشارت کی ہے۔ اب مکمل تقریظ ملاحظہ فرمائیں، وہ یہ ہے۔ ''یہ سلسلۂ فیض حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ ہی کا ہے جس کے لئے مشیت ربانی نے آپ کو منتخب فرمالیا۔ اللہ تعالیٰ اس فیضان کو دواماً عموم وشمول ارزانی فرمائے اور عمر واقبال اور صحت وکمال کے ساتھ آں محترم کو اس کے لئے زیادہ سے زیادہ توفیق فرمائے۔ آمین''

نیز اس حصہ میں دنیا کی مسلم شخصیت وقت کے ابن حجر لاثانی تفسیر وحدیث، فقہ وتصوف پر گہری نظر رکھنے والے حضرت مولانا خالد محمود صاحب دامت برکاتہم اور از ہر ہند دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم نے بہت ہی اہم تاثر وتبصرہ رقم فرمایا ہے۔ فجز اہم اللہ تعالیٰ

الحمد للہ مکتبہ دار المعارف الہ آباد جن اغراض ومقاصد کے لئے قائم ہوا تھا اس کی تکمیل کے لئے رات ودن کوشش کرتا ہے اور مختلف علوم وفنون کی قیمتی

کتابیں اردو، انگریزی اور گجراتی زبان میں پیش کر کے طالبین صادقین کی علمی وعملی پیاس کو بجھاتا ہے۔ اس وقت بھی مکتبہ کی الماری میں کچھ ایسی غیر مطبوعہ کتابیں ہیں جن کو آپ کے ہاتھوں تک پہنچانا مکتبہ اپنی ضرورت سمجھ رہا ہے۔ ان میں کچھ تو فائنل کمپوز شدہ ہیں صرف پریس جانے کی دیر ہے اور کچھ ابھی دیگر مراحل سے گذر رہی ہیں۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ان قیمتی مفید سرمایہ کو آپ تک پہنچانا آسان فرمائے اور قبول فرمائے۔ آمین

اور اللہ تعالیٰ حضرت والد صاحب دامت برکاتہم کو صحت وعافیت سے رکھے اور عمر میں برکت عطا فرمائے تاکہ تعلیم وتربیت کا یہ سلسلہ چلتا رہے۔

آمین یارب العالمین

والسلام

محمد عبد اللہ قمر الزمان قاسمی الہ آبادی

مکتبہ دار المعارف الہ آباد

یکم ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

۲۱ نومبر ۲۰۱۷ء

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدلله المتفرد بالخلق يصطفى من يشاء ويختار، احمده سبحانه واستغفره واستهديه، له الفضل والمنة والثناء والاكبار، اشهد ان لااله الاالله وحده لاشريک له، له الاسماء الحسنى والبقاء والاقتدار۔

والصلوٰة و السلام على الشريف المشرف باشرف الرسالات، الكريم المكرم باكرم البينات، العظيم المعظم باعظم الآيات، الفاضل المفضل على جميع الكائنات، العالى المعلى فى اعلى المقامات، السيد المسود باللواء فى العرصات، آدم ومن دونه تحت لوائه وسائر المخلوقات۔

اللهم صل وسلم وبارک وانعم على صفيک المصفى المصطفى المختار، الخليل المتوج بالحلة الوقار، وعلى آله واصحابه الاخيار، ومن تبعهم باحسان الى يوم القرار۔

امابعد!

بعد حمد وصلوٰۃ کے عرض ہے کہ الحمدللہ اقوال سلف حصہ ہفتم کی کتابت تقریباً مکمل ہوچکی ہے، اس کی تکمیل کے بعد طباعت کے لئے مطبع بھیجنا ہے۔ فللہ الحمد والمنہ

مگر اس کے پیش لفظ یا مقدمہ کے طور پر اب تک کچھ زیر قلم نہ آسکا تھا، تو

عزیزم مولانا مقصود احمد سلمہ نے اس حقیر سے فرمائش کی کہ حسب سابق اس جلد پر کچھ لکھ دیں تو مناسب ہے، مگر میری طبیعت کچھ بھی لکھنے پر آمادہ نہ ہوئی اس لئے نفی میں جواب دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ لکھانا منظور تھا اس لئے خیال ہوا کہ اقوال سلف تو درحقیقت انبیاء علیہم السلام اور صحابۂ کرام اور تابعین و تبع تابعین اور اولیائے عظام اور اسلاف کے اقوال وارشادات کا گنجینۂ ثمینہ اور خزانۂ عامرہ ہے اس لئے اس کی خیر وخوبی کا کچھ لکھنا ضروری ہے تاکہ اس کے پڑھنے کی طرف مسلمانوں کو رغبت ہو۔ اس کے معًا بعد اللہ رب العزت کا ارشاد پاک کا جس کو حدیث قدسی کہا جاتا ہے دل میں ورود ہوا اور بخاری شریف کی روایت پیش نظر ہوئی۔ وہ یہ ہے:۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم ان الله قال: من عادی لی وليا فقد آذنته بالحرب وماتقرب اليّ عبدی بشیء احب الی مما افترضت عليه ولايزال عبدی يتقرب الی بالنوافل حتی احببته فكنت سمعه الذی يسمع به، وبصره الذی يبصربه، ويده التی يبطش بها، ورجله التی يمشی بها وان سألنی لاعطينه ولئن استعاذنی لاعيذنه وماترددت عن شیء انا فاعله ترددی عن نفس المومن يكره الموت وانا اكره مساءته۔ (بخاری: الرقم۔ ۶۲۵۳۔ ج/۲ ص/۱۴۷۸)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو شخص میرے کسی ولی کے ساتھ عداوت رکھتا ہے میں اس کے ساتھ اعلان جنگ کرتا ہوں۔ میرا بندہ فرائض سے

زیادہ اور کسی محبوب عمل کے ساتھ میرا تقرب حاصل نہیں کرسکتا، میرا بندہ نوافل پڑھ کر میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو محبوب سمجھتا ہوں، تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں، اور اگر وہ برائیوں اور مکروہات سے میری پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں، اور میں اس طرح تردد نہیں کرتا جس طرح کہ میں بندۂ مومن کی جان قبض کرنے میں تردد کرتا ہوں کیونکہ وہ موت کو پسند نہیں کرتا حالانکہ اس کی ناپسندیدگی کو میں ناپسند کرتا ہوں، اور موت سے کسی حال میں مفر نہیں ہے۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد پاک میں اولیاء کا اتنا بڑے مقام قرب کی بشارت فرمائی ہے کہ فرائض ہی نہیں بلکہ اپنی خوشی سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لئے نوافل ادا کرتے رہتے ہیں۔ اس حدیث پاک کا حاصل یہ ہے کہ بندہ قرب فرائض ونوافل کے ذریعہ محبوبیت کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرنے لگتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے بن جاتے ہیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ شانہ اس کی شان عظمت میں غایت محبت کی بناء پر فرمارہے ہیں۔ جو میرے ولی کو ایذاء دے گا میں اس کے ساتھ اعلان جنگ کرتا ہوں۔

اس کے بعد اس حقیر نے اپنے بعض تلامذہ سے کہا کہ شروح حدیث کی کتابوں میں دیکھو کہ کسی شارح نے اس حدیث قدسی کی شرح میں سمع، بصر، ید اور

رجل کے علاوہ ضمناً لسان یعنی زبان کا ذکر لائے ہیں یا نہیں؟ بفضلہٖ تعالیٰ تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ خود حدیث قدسی ہی کی ایک روایت میں لسان اور فواد یعنی قلب کا اضافہ ہے، جس سے اس حقیر کو بہت فرح وسرور نصیب ہوا۔ فللہ الحمد والمنہ

لہٰذا ہم اس اضافہ کو فتح الباری شرح بخاری سے نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔

وزاد عبدالواحد فی روایته: وفؤاده الذی یعقل به ولسانه الذی یتکلم به۔ (فتح الباری: ج/۱۱ ص/۳۴۴)

اور عبدالواحد نے ایک روایت میں زیادہ کیا ہے: اس کا دل بن جاتا ہوں جس سے وہ سوچتا ہے سمجھتا ہے، اس کی زبان کی بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے۔

اسی طرح زبدۃ العارفین حضرت شیخ ابن عطاء اسکندریؒ نے اپنی تصنیف لطیف باتحقیق مسمیٰ بہ ''التنویر فی اسقاط التدبیر'' میں جس کا ترجمہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا ہے، اس حدیث قدسی کو ان الفاظ میں درج فرمایا ہے۔

ماتقرب الیّ المتقربون بمثل اداءماافترضت علیهم ولایزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی احبه فاذااحببته کنت له سمعا وبصرا ولسانا وقلبا وعقلا ویدا ومؤیدا۔ (التنویر فی اسقاط التدبیر: ص/۱۶۰)

اس حدیث پاک کا ترجمہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کیا ہی خوب کیف آفریں فرمایا ہے، جو درج ذیل ہے۔

قرب ڈھونڈھنے والوں کو میرے ساتھ کسی عمل سے ایسا قرب نہیں حاصل ہوتا جیسا کہ ادائے فرض سے ہوتا ہے اور ہمیشہ میرا بندہ نوافل سے میرا قرب ڈھونڈھتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کو اپنا پیارا بنالیتا ہوں اور جب میں اس کو پیارا بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان اور آنکھ اور دل اور زبان اور عقل اور ہاتھ اور مددگار بن جاتا ہوں۔ (تقدیر وتدبیر: ص ر ۱۶۲)

اسی معنی میں مولانا رومؒ یہ الہامی شعر فرمارہے ہیں ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

نیز اسی معنی میں مندرجہ ذیل اشعار بھی انھیں کے فرمودہ ہیں ؎

مطلق آں آواز خود از شہ بود　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

وہ مطلق آواز (بلاتشخصات صاحب آواز) خاص اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اگرچہ بظاہر اللہ کے بندے (ولی کامل) کے گلے سے (نکلی) ہو۔

گفت او را من زبان و چشم تو　　من حواس و من رضا و چشم تو

جس کو اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہے کہ میں تیری زبان اور آنکھ ہوں میں تیرے حواس (کا کام دینے والا اور تیری) خوشی وناراضگی ہوں۔

رو کہ بی یسمع و بی یبصر توئی　　سر توئی چہ جائے صاحب سر توئی

اے پیارے جا چین کر کہ بی یسمع (میرے ذریعہ سے سنتا ہے) و بی یبصر (میرے ذریعہ سے دیکھتا ہے) کا مصداق تو ہی ہے تو (میرا) سِر بلکہ صاحب سِر ہی ہو۔ (مفتاح العلوم دفتر اول حصہ سوم: ص ر ۱۲)

ان اشعار کی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو تشریح

فرمائی ہے وہ بھی درج کرنے کی سعادت حاصل کررہاہوں۔

یہ کلام علی الاطلاق شہنشاہ حقیقی کی طرف سے ہوتا ہے گوکسی بندۂ مقبول کے حلق سے ہو، یعنی اگر وہ اس بندہ کا بھی کلام ہوتب بھی باعتبار تاویل مذکور کلام حق ہی ہے۔آگے اس کی تائید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بندہ سے فرمادیا ہے کہ میں تیری زبان وچشم ہوں اور میں تیرے حواس ورضا وچشم ہوں، جا (چین کر) توتو بی یسمع و بی یبصر ہوگیا، اورتو (میرا) خاص بن گیا بلکہ خاص تو کیا خود صاحب خاص (یعنی میں) ہی بن گیا۔(کلید مثنوی دفتر اول حصہ دوم: ص/٦)

ف: سبحان اللہ حضرت حکیم الامتؒ نے کیا خوب تشریح فرمائی جس سے حدیث قدسی کی تشریح اور مولا نارومؒ کے اشعار کی توضیح ہوگئی۔فجز اہم اللہ احسن الجزاء

اس مضمون کی مزید توضیح حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اس کرامت وبشارت سے ہورہی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے متعلق الہام باری:

''ندادی گئی اور ظاہر کیا گیا ہے کہ سب علوم (مکتوبات) جو لکھے گئے ہیں بلکہ جو کچھ تیری گفتگو میں آیا ہے سب مقبول وپسندیدہ ہے، یہ سب کچھ ہم نے ہی کہا ہے اور ہمارا ہی بیان ہے''۔(مکتوبات دفتر سوم)

ف: سبحان اللہ! حضرت مجدد صاحبؒ کے مکتوبات وارشادات کی مقبولیت وعظمت شان عیاں ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ اولیاء کرام کے اقوال واحوال کے انتخاب واندراج کی توفیق مرحمت فرمارہے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی اس

سعادت عظمیٰ سے مشرف فرمائے اور شرف قبولیت سے نوازتے رہیں۔آمین

مزید ان عزیزوں کے لئے دعا گوہوں جو اقوال سلف وغیرہ تصنیفات کی جمع وترتیب میں معین ہیں، اللہ تعالیٰ مزید توفیق دے اور اجر وثواب سے مشرف فرمائے۔آمین

اب اس کے بعد انشاء اللہ چودھویں صدی کے مشائخ وعلماء کے تذکرے پیش خدمت ہوں گے جن کے شروع میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ اور حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے احوال واقوال پیش کئے جائیں گے۔ اس کے لئے بھی دعا ہے، اور ناظرین کرام سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ فضل رحمانی اور امداد الٰہی کو شامل حال رکھے تاکہ ان بزرگوں کی صحیح ترجمانی کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور قبول فرمائے۔آمین

محمد قمرالزمان الہ آبادی

دارالتزکیہ والاحسان وادارہ معارف مصلح الامتؒ

کریلی ڈی بلاک الہ آباد

۶؍ربیع الثانی ۱۴۳۹ھ

۲۵؍دسمبر ۲۰۱۷ء

کلمات طیبات

مشفقی المکرم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہٗ

شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، و الصلوٰۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین، وعلی آلہ وأصحابہ ومن تبعھم إلی یوم الدین۔ أما بعد۔

اللہ جل شانہ نے بنی آدم کی ہدایت کے لیے اور ان کو ضلالت و گمراہی سے نکالنے کے لیے انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا سلسلہ جاری فرمایا، اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی فخر کائنات، سید الکونین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا پیغام بندوں تک پہنچایا اور بندوں کا رشتہ معبودِ حقیقی سے جوڑا، بڑی سے بڑی طاقت، طاغوتی قوت اور شیطانی سازش آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے استقلال میں تزلزل پیدا نہ کر سکی اور بے انتہا نامساعد حالات میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ دین کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک طرف کتاب وحکمت کی تعلیم دی، تو دوسری طرف مؤثر وعظ وارشاد سے تزکیۂ نفوس فرمایا:

{لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ} (آل عمران: ۱۶۴)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف بری کے بعد علماءِ امت پر یہ ذمہ داری عائد ہوئی،

علماء نے اس ذمہ داری کو ہر زمانے میں پوری ایمان داری کے ساتھ نبھایا اور ”العلماء ورثة الأنبياء“ کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور تعلیم و تزکیہ ہر دو طریق سے امت کی رہنمائی فرمائی، ایسے نفوسِ قدسیہ کی ایک طویل فہرست ہے، ان میں ایک تابندہ شخصیت شیخ طریقت حضرت اقدس مولانا محمد قمر الزمان صاحب الٰہ آبادی دامت برکاتہم کی ذاتِ گرامی بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وعمل سے وافر حصہ عطا فرمایا ہے اور راہِ سلوک کا کامیاب راہ نما بنایا ہے۔

ماضی قریب میں برصغیر میں اصلاح و اِرشاد کا کام کرنے والی متعدد شخصیتیں گزری ہیں، ان میں حکیم الامت حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ذاتِ ستودہ صفات گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی، پھر آپؒ کے مسترشدین وخلفاء نے آپؒ کی کامیاب نیابت کی، ان میں مصلح الامت حضرت اقدس مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کو اصلاح وتربیت اور تزکیۂ نفوس کے سلسلہ میں خاص امتیاز حاصل تھا اور اب آپؒ کے مسترشدین یہ کام انجام دے رہے ہیں، ان میں حضرت مولانا قمر الزمان صاحب دامت برکاتہم کی کوششیں بہت نمایاں ہیں، آپ تقریباً نصف صدی سے درس وتدریس، تصنیف وتالیف، بیعت و اِرشاد اور خطبات کے ذریعہ اصلاح و اِرشاد میں سرگرم ہیں اور ملک وبیرونِ ملک میں بالخصوص خطہ گجرات میں ہزاروں تشنگانِ علم ومعرفت برابر آپ سے فیض یاب ہو رہے ہیں، آپ کی نظر میں اللہ تعالیٰ نے وہ تاثیر رکھی ہے کہ جو شخص آپ کی صحبت بابرکت اختیار کرتا ہے اُسے دینی فہم وفراست نصیب ہوتی ہے، آپ کی ہر بات اس قدر مؤثر اور مسحور کن ہوتی ہے کہ سامعین سراپا گوش

بن جاتے ہیں اور اہل علم عش عش کرتے ہیں، اور ایسی پرنور مجلس کہ اسلاف کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

موصوف کی تصنیفات بھی علمی نکات، لطائف سے پر اور گنجینۂ معرفت ہوتی ہیں، اب تک کم وبیش پچاس چھوٹی بڑی کتابیں حضرت اقدس مدظلہٗ کے قلمِ گوہر بار سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوچکی ہیں اور خوب دادِ تحسین حاصل کررہی ہیں، جن میں سے ''اقوالِ سلف'' آپ کی مایۂ ناز تصنیف ہے، جوانمول ہیروں کا ہار اور گلہائے رنگارنگ کا حسین گلدستہ ہے، میں نے جستہ جستہ اس کو پڑھا ہے اور اس کے وجد آفریں اور اثر انگیز مضامین سے محظوظ ہوا ہوں، اس میں اسلافِ کرام اور مشائخ عظام کے بیش قیمت ملفوظات اور احوال ہیں، جن کی اثر آفرینی میں ایک صاحب نسبت بزرگ کے حسن انتخاب اور اِضافۂ فوائد نے چار چاند لگا دیے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس طرح اللہ والوں کی صحبت سے دلوں کا زنگ دور ہوتا ہے اسی طرح ان کے احوال جاننے سے اور اقوال وارشادات پڑھنے سے بھی دل کی کایا پلٹ جاتی ہے، ''اقوالِ سلف'' کا مطالعہ ہمیں ان اہل اللہ کی مجالس میں لے جاتا ہے جہاں معرفت الٰہی کی چاشنی ملتی ہے اور خشیت الٰہی کی کیفیت قلوب میں جلوہ گر ہوتی ہے اور ایمان ویقین کے ساتھ صبر وعزیمت، زہد وتقویٰ، ایثار وقربانی اور انکسار وتواضع سے سرشار کرتی ہے، ان جواہر پاروں تک ہر ایک کا پہنچنا دشوار تھا؛ مگر حضرت اقدس مدظلہٗ نے بڑی محنت اور جان فشانی سے ان موتیوں کو ایک لڑی میں پروکر اس طرح مرتب فرما دیا ہے کہ اب

ہر ایک کے لیے اس سے فائدہ حاصل کرنا آسان ہوگیا ہے۔

مجھے اس بات کے اِظہار میں ذرا تامل نہیں کہ ''اقوالِ سلف'' اہل اللہ کے بصیرت افروز پند ونصائح کا ایسا ذخیرہ ہے جس میں حق وصداقت کے متلاشی کے لیے اور رُشد وہدایت کے طالب کے لیے تسکین کا سامان ہے، اور امت کو غفلت سے بیدار کرنے میں، جذبۂ عمل کی روح پھونکنے میں اور جستجوئے آخرت کے انہماک اور طاعت الٰہی کا شوق قلب میں موجزن کرنے میں اکسیر ہے، اللہ تعالیٰ اس کو خلعت قبولیت سے نوازے اور امت مسلمہ کو اس سے بیش از بیش استفادہ کی توفیق بخشے۔

املاہٗ

سعید احمد غفرلہٗ پالن پوری

خادم دارالعلوم دیوبند

۱۴/ جمادی الاخریٰ/ ۱۴۳۸ھ

تعارف

مشفقی المکرم حضرت العلامہ خالد محمود صاحب دامت برکاتہم

ڈائریکٹر اسلامک اکیڈمی مانچسٹر

مشفقی ومکرمی حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم کا والا نامہ موصول ہوا اس میں آپ نے راقم الحروف کو اپنی عظیم اور ضخیم کتاب اقوال سلف پر تقریظ لکھنے کا ارشاد فرمایا، چھوٹوں کے لئے بڑوں کے کلام پر تبصرہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا، تاہم الحکم فوق الادب کے ضابطہ کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

بزرگوں کے کتنے ہی اقوال ہیں جن میں ایک ایک سے حکمت کے ہزاروں آبدار موتی کھلے چمکتے نظر آتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ کوئی مرد خدا اور روحانی پیشوا ان ہزاروں آبدار موتیوں کو لے کر ان کا اس طرح نشر عام کرے کہ ان کی مثال پہلی صدیوں میں کہیں نظر نہ آتی ہو۔

الحمدللہ کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ

اعتذار: عرض ہے کہ حضرت العلامہ خالد محمود صاحب زید مجدہم سے اپنی تالیف اقوال سلف کے جلد ہفتم پر اپنے تاثر کے اظہار کی درخواست کی تو مولانا نے اس کو قبول فرما کر اقوال کی افادیت واہمیت پر خاصا کلام ارقام فرمایا جو قابل مطالعہ ہے۔

مگر چونکہ اقوال سلف میں اختصار کو ہر موقع پر ملحوظ رکھا گیا ہے اس لئے اس کے اخیر حصہ جو ماشاءاللہ ’’قل ودل‘‘ کا مصداق ہے نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ وباللہ التوفیق

(مرتب عفہ عنہ)

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری ثم الہ آبادیؒ کے روحانی اور علمی جانشین پیر طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب دامت برکاتہم کی دوررس نگاہ وہاں پہنچی اور آپ نے ہزاروں اقوال سلف کا ایک نہایت قیمتی ذخیرہ اپنی ضخیم کتاب ''اقوال سلف'' میں دس ضخیم جلدوں میں جمع کر دیا ہے کہ اگر وہ عام کتابی سائز میں ہوں تو اٹھارہ، بیس جلدوں تک پہنچ سکتی ہیں۔صدیوں پہلے اقوال سلف کو یہ عزت اور شہرت دینے کی کوئی مثال نہیں ملتی، اور انگلینڈ اور امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے یہ بات اور لائق مسرت ہے کہ ان کا انگریزی میں ترجمہ بھی برابر ہو رہا ہے۔ یہ سب حضرت مولانا تھانویؒ کا فیض ہے جو مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے ذریعہ پوری دنیا میں بواسطہ پھیل رہا ہے۔ اس پر شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی ایک تاریخی مبارکبادی کے مستحق ہیں کہ وہ کام کیا جس کا ایک مدت سے زمانے کو انتظار تھا۔

یہ چند سطور اس عظیم علمی خدمت کا تعارف نہیں کرا سکتیں لیکن راقم الحروف کو اس میں خوشی ہے کہ اسے حضرت والا کے اس والا نامہ پر عمل کرنے کا ایک اور موقع مل گیا۔

والسلام خیر ختام

خالد محمود عفا اللہ عنہ

۱۸/۱کتوبر ۲۰۱۷ء

مکتوب گرامی

مشفقی المکرم حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب قدس سرہٗ المتوفی ۱۴۲۲ھ

مہتمم مدرسہ عربیہ نعمانیہ کٹرہ الٰہ آباد

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

مکرمی و معظمی جناب مولانا محمد قمر الزمان صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

''اقوالِ سلف'' کی دو جلدیں جناب نے بہت ہی محبت سے عنایت فرمائیں، بندہ تہِ دل سے شکر گذار ہے۔

یقیناً اقوالِ سلف رحمہم اللہ تعالیٰ کو ترتیب دے کرامت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ پر بڑا احسان فرمایا، اللہ تعالیٰ آپ کو جزاءِ جزیل سے نوازے، آمین۔

بہت ہی نافع کتاب ہے، اس کے مطالعہ سے اولیاءِ کاملین اور علماءِ راسخین کی خوب خوب معرفت ہوتی ہے، اِذعان وایقان نصیب ہوتا ہے، وصول الی اللہ کے طریقے معلوم ہوتے ہیں، تمام اکابر سلف کا بس ایک ہی راستہ ہے، سبھی حضرات اتباعِ سنت و اتباعِ شریعت کا ہی سبق دیتے ہوئے ملے، پس معلوم ہوا کہ اصل طریق یہی ہے۔

خلق سے گریز کو خالق سے محبت وقرب کے لیے پہلا سبق بتایا گیا ہے، استغنا وتوکل کو تمام اسلاف نے نسبت کے لیے ضروری قرار دیا ہے، محبت الٰہی کو اَساسِ رضا بتایا، کسل کو مخل طریق اور سبب محرومی قرار دیا ہے۔

اس کا بار بار مطالعہ قائم مقام مصاحبت مشائخ حقانیین ہے؛ بلکہ التزاماً و دواماً بطورِ وظیفہ اگر اس کو سکونِ قلب سے مطالعہ میں رکھا جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اصلاحِ نفس اور اِزالۂ رذائل میں بہت ہی معین ثابت ہوگا، ان بزرگوں نے اعمال کی مقبولیت کے لیے اخلاص کی تعلیم دی۔

ماشاء اللہ، اضافۂ فوائد سے نافعیت کی تکمیل ہوئی، ان بزرگوں کی معرفت سے اپنے مشائخ واکابر کی معرفت دوبالا ہوئی۔

ہمارے بزرگوں نے طریق اور سلوک میں جو رہنمائی فرمائی ہے وہ سلف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ کے بالکل طرز وطریق پر ہے۔

اندازِ ترتیب وتالیف وحسن سلیقہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ (یعنی حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ المتوفیٰ :۱۳۸۷ھ) کے فیض تام کا حصولِ تام ظاہر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کے حوصلہ میں ترقی عنایت فرمائے اور آپ سے اشاعت دین واشاعت طریق کا خوب خوب کام لے اور جملہ تالیفات کو قبولیت عامہ و تامہ کا شرف بخشے، آمین یارب العالمین۔

حبیب احمد غفرلہٗ

شوال المکرم/ ۱۴۱۰ھ

تأثر

عزیزم مولانا مفتی جمیل احمد صاحب نذیری

مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام نوادہ، مبارک پور اعظم گڑھ

نحمدہٗ و نصلّی علی رسولہ الکریم۔ أما بعد۔

اللہ تعالیٰ کے نیک بندے جو صالحین، عابدین، زاہدین اور اولیاء کہلاتے ہیں وہ کئی طرح کے ہوتے ہیں، کچھ کا ولی اور عابد وزاہد ہونا، صلحاء میں شمار ہونا بالکل واضح ہوتا ہے، وہ یکسو ہوکر ان ہی کاموں اور مشاغل کو اپنی زندگی کا محور بناتے ہیں جو صالحین اور اتقیاء کے مشاغل اور کام ہوتے ہیں، ان کی ساری مصروفیات اور تگ ودو سے ان کا صالح اور نیک ہونا ظاہر ہوتا ہے، ان کے اعمال واشغال ان کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے جو اولیاء کے ہوتے ہیں۔

مگر ان ہی میں کچھ نیک بندے جو یقیناً اولیاء اللہ میں شامل وداخل ہوتے ہیں؛ مگر عام لوگ پتہ نہیں پاتے کہ یہ بھی صالحین میں ہیں، ولی اللہ ہیں، ان کی زندگی کے مشاغل، ان کی مصروفیات ایسی لگتی ہیں جیسے وہ دنیا دار ہیں، دنیا میں لگے ہوئے ہیں؛ مگر ان کی زندگی کی تہ میں جانے اور حالات کو کھنگالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ متقی ہیں، پرہیزگاری اور خشیت الٰہی کے وصف سے متصف ہیں، ان کی زندگی کے اندرونی احوال ان کے ولی اور عابد وزاہد ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔

بادشاہت اور حکمرانی کر رہے ہیں، وزارت کے منصب پر فائز ہیں، سیاست کے گلیاروں میں جسم وجان ہلکان کیے ہوئے ہیں؛ مگر دوسری طرف

تقویٰ اور للّٰہیت کی صفت سے بھی متصف ہیں، عبادت و ریاضت اور تسبیح وتلاوت سے بھی اُن کا مضبوط رِشتہ ہے۔

’’اقوالِ سلف‘‘ کا اصل نام ’’مآثر الأنبياء والصديقين و آثار الشهداء والصالحين‘‘ ہے اور لقب ’’اقوالِ سلف‘‘ ہے، عربی نام کتاب کے مندرجات کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

درحقیقت ’’اقوالِ سلف‘‘ کے سارے حصے ان محترم ومقتدر علماء اور زہاد و عباد کے احوالِ باطنی اور کیف و ذوق کا ایک خوشنما گلدستہ ہیں جن کا کسی ایک جگہ فراہم ہونا بہت مشکل ہے، انبیاءِ کرام علیہم السلام میں نبیوں کے سردار، سیدالاولیاء والاصفیاء، امام الانبیاء، سیدالاولین والآخرین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (فداه أبي وأمي) بھی ہیں، صحابہؓ میں خلفاءِ راشدین بھی ہیں، دیگر صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بھی ہیں، تابعین عظام بھی، تبع تابعین بھی، ائمۂ مجتہدین بھی، محدثین ومتکلمین بھی، مصلحین وواعظین بھی، بیعت وارشاد سے وابستہ اور تصوف وطریقت کی اشاعت میں قولاً وعملاً مصروف ومشغول اصحابِ عزیمت ودعوت بھی، مجاہدین فی سبیل اللہ بھی، دلوں میں بسا لینے، عقیدت ومحبت سے دماغ واعصاب پر مسلط وحاوی کرلیے جانے کے حقدار بادشاہ، امراء، وزراء، سیاست داں اور عمائد وقائدین بھی۔

زندگی کے مختلف اطوار وانداز سے وابستہ مذکورہ سارے صالحین کے احوال وکوائف، ان کی نیک نفسی، للّٰہیت وخشیت، ولایت کاملہ کی صفات اور ان کے ملفوظات واِفادات جو مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے تھے اور بلا مبالغہ ہزاروں کتابوں کے ہزارہا صفحات میں نہ جانے کہاں کہاں منتشر تھے، حضرت اقدس

مدظلہ العالی کے قلم گوہر بار نے انہیں یکجا کر دیا اور خوشنما پھولوں کا ایسا گلدستہ بنا دیا جس کی دل آویزی، عطر بیزی اور رونق وچمک مدتِ دراز تک طالبین، سالکین، اللہ تعالیٰ کی محبت کے متلاشیوں، سنت نبوی کے شیدائیوں اور شریعت وطریقت سے زندگی سدھارنے اور سنوارنے کا جذبہ رکھنے والوں کے لئے مشعل راہ رہے گی، اور اس سے اپنے مشامِ جاں کو معطر ومنور کرتے رہیں گے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات اظہر من الشّمس ہوجاتی ہے کہ راہِ زندگی کا ہر مسافر خواہ اس نے زندگی برتنے اور زندگی گزارنے کا کوئی بھی طریقہ چنا ہو، وہ عابدین وصالحین میں شامل ہوسکتا ہے، اس کے لیے اس جیسا طرزِ زندگی اپنانے والوں کے بے شمار نمونے موجود ہیں، کسی طرح کے مشاغل، کسی قسم کی مصروفیات اور کسی بھی انداز سے کاروباری زندگی میں سرگرم ہونا مخل اور رُکاوٹ نہیں۔

''اقوالِ سلف'' میں اقوال بھی ہیں، احوال بھی، ملفوظات بھی ہیں، واردات بھی، تشریحات بھی ہیں، توضیحات بھی، نصائح بھی ہیں، تنبیہات بھی، یہی نہیں؛ بلکہ تصوف وسلوک کے موضوع پر حضرت والا کے قلم سے جو بلند پایہ تصنیفات منصۂ شہود پر آرہی ہیں اور جن کا سلسلہ برابر جاری ہے، یقینا یہ ایک زبردست کام ہے، اتنا متنوع اور اہم سلسلۂ تصنیف وتالیف جو تصوف وطریقت کے مختلف گوشوں کو سمیٹے ہوئے ہو، احقر کو اس راہ سے وابستہ اشخاص کے یہاں فی الحال کہیں اور نظر نہیں آتا۔

ایں سعادت بزورِ باز نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جمیل احمد نذیری غفرلہٗ

جامعہ عربیہ عین الاسلام نوادہ، مبارک پور

تبصرہ

فخرِ شعر وادب حضرت ڈاکٹر کلیم احمد عاجزؔ پٹنہ

کوئی بزم ہو، کوئی انجمن، یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اِک چراغ جلا دیا

یہ خدائی شعار ہے اور ابتداءِ آفرینش سے اَزل تک رہے گا، اللہ تعالیٰ اس کون ومکان کے خالق ہیں، وہ اس گھر کو دیر تک اندھیرا کیسے رکھ سکتے ہیں؟ روشنی کے جمال وجلال کو بھرپور واضح کرنے کے لیے تھوڑی دیر تاریکی رکھی جاتی ہے، پھر آہستہ آہستہ آفتاب طلوع ہوتا ہے اور سارا جہاں منوّر ہوجاتا ہے۔

یہ خدائی شعار بندوں میں بھی منتقل ہوتا ہے، انسان اللہ تعالیٰ کی صفت پر ہے، اُسے تاریکی ناگوار ہے، روشنی خوش گوار ہے، تخلیقی طاقت وقدرت میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اللہ تعالیٰ کا دست وبازو ہے، قوتِ تخلیق اُسے گرم رکھتی ہے، اگر یہ گرمی نہ نکلے تو دَم نکل جائے، تخلیق کا دَرد اُسے بے چین رکھتا ہے، جیسے عورت دردِ زہ میں بے چین رہتی ہے، بندۂ مومن پر یہ دَرد ہروقت غالب ہے، ہر تخلیق کے بعد اُسے سکون ملتا ہے اور پھر تخلیق کا کرب اس پر سوار ہوجاتا ہے ؎

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم — سفال[1] آفریدی، ایاغ[2] آفریدم
بیاباں و کہسار و زاغ آفریدی — خیاباں و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ[3] سازم

۱؎ مٹی کا برتن ۲؎ شراب پینے کا پیالہ ۳؎ آبِ حیات

یہ بندۂ مومن کی صفت خالقی ہے، اسی کا تماشا، اسی کا اظہار، اسی کا جلوہ اس عالمِ کون ومکان میں ہر وقت نمایاں ہے اور نمایاں رہے گا، تا آنکہ قیامت آجائے گی اور اللہ تعالیٰ انسان کو اس کے تخلیقی کارناموں کا اجر بخشنے کے لیے میدانِ حشر قائم فرمائیں گے، پیغمبروں کے ساتھ ان کی اُمتوں کا حشر فرما کر ان کو ان کے مقام پر پہنچا دیں گے، جس کی ابتدا ہے، انتہا نہیں۔

اس پردۂ دنیا پر صبح وشام، تاریکی وروشنی، ایمان وکفر اور ضلالت وہدایت کے جلوے آتے رہیں گے، جاتے رہیں گے، انسان ٹھوکر کھائے گا، پھر سنبھلے گا، گرے گا، پھر اُٹھے گا، سوئے گا، پھر جاگے گا، ٹھوکر کھانے والے کے لیے سنبھالنے والا، گرنے والوں کو اُٹھانے والا اور سونے والوں کو جگانے والا پیدا ہوتا رہے گا، جو منشائے قدرت ہے وہ پورا ہوتا رہے گا، اسی گونا گونی سے، ڈوبنے اور اُبھرنے سے کائنات کی رونق ہے۔

حضور سرورِ کائنات سرکارِ دوعالم ﷺ امت کو شرف حاصل ہوا کہ نبوت کی مشقت اور سعادت اس کی فطرت میں چھپا دی گئی، اب اس کائنات میں اندھیرے اُجالے، ڈوبنے اور اُبھرنے کا، گرنے اور سنبھلنے کا نظام اس امت کو تفویض ہوا ہے، قیامت تک یہ ذمہ داری اس کے سپرد ہے، یہ امانت اس کے حوالے ہے، اس کی ادائیگی اس کے خمیر میں رکھی گئی ہے، یہ چاک امت مسلمہ کے حوالے کر دیا گیا ہے، یہ چاک چلتا رہے گا اور اندھیرے اُجالے کا تماشا ہوتا رہے گا، ایمانی اور عملی سطح پر زلزلے آتے رہیں گے، جاتے رہیں گے، کانٹے اُگتے رہیں گے، پھول کھلتے رہیں گے، خزاں آتی رہے گی، بہاریں لہلہاتی رہیں گی، کوڑے کھاتے رہیں گے، مرہم لگتا رہے گا، جیل جاتے رہیں گے، رِہا ہوتے رہیں گے، کاروبارِ دار ورَسن چلتا رہے گا، یہی زندگی ہے ؎

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں　　　وہ گلستاں کہ جہاں تاک میں نہ ہو صیاد

یہ جہانِ رنگ و بو فرشتے نہیں، انسان بساتے رہیں گے، آراستہ کرتے رہیں گے، جگمگاتے رہیں گے ؎

جہانِ شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں　　　ان ہی کا کام ہے یہ، جن کے حوصلے ہیں زیاد

اس میدانِ شوق سے کفن بدوش، غزل بلب وہی گزریں گے جن کے حوصلے زیادہ ہیں ؎

کھنچی ہے شمشیر ناز، قاتل چلے ہیں مشتاق اپنے گھر سے
کفن لپیٹے ہوئے کمر سے، کوئی اُدھر سے، کوئی اِدھر سے

زنجیروں کی جھنکار گونجتی رہے گی، دیوانے اپنا کام کرتے رہیں گے، یہ کاروبارِ شوق چلتا رہے گا۔

یہ مختصر تمہید اس حقیقت کی ہے کہ وارثانِ نبوت کے کندھوں پر اس کائنات کی امانت ہے، انہیں ہر وقت کمر بستہ رہنا ہے، بجھتے چراغوں کو اپنا لہو ڈال کر پھر روشن کرتے رہنا ہے، یہ علماءِ ملت کا مقدرِ مقسوم ہے، انہیں ایک ایک لمحہ ہوشیار اور چوکنا رہنا ہے ؎

خواہم کہ خار از پا کشم، منزل نہاں شد از نظر　　　یک لمحہ غافل می شدم، صد سالہ منزل دور شد

اور [1] چوکنا رہنا تاریخ ہے......امت مسلمہ کی داستان سو! یہ کہانی کس تسلسل سے چلی آرہی ہے، ایک گر رہا ہے، دوسرا اُٹھ رہا ہے، ایک سپر ڈال رہا ہے، دوسرا شمشیر بکف جگہ لے رہا ہے، حضرت تھانویؒ، حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ، حضرت

---

[1] ہوشیار اور چوکنا رہنا امت مسلمہ کی تاریخ ہے جس کی سو داستان موجود ہے۔

مولانا قمر الزمان مدظلہ العالی......قطار لگی ہوئی ہے، یہ سلسلہ اوپر سے آرہا ہے اور گزر رہا ہے، یہ جاگنے اور جگانے کا عمل جاری ہے اور جاری رہے گا ؎

خدا دَرد والوں کو آباد رکھے　　کہ جاگے ہوئے ہیں، جگائے ہوئے ہیں

یہ کفن بدوش، غزل بلب حضرات اس سلسلۂ کارواں کی کڑیاں ہیں جو چودہ سو سال پہلے مدینہ منوّرہ سے روانہ ہوا ہے اور چل رہا ہے، سمندر آرہے ہیں، پہاڑ آرہے ہیں، سمندر میں کودتے پہاڑوں پر چھلانگ لگاتے یہ کارواں گزر رہا ہے اور گزرتا رہے گا، ان کا بوجھ کبھی ہلکا نہ ہوگا، یہ کبھی سبک دوش نہیں ہوں گے۔

حضرت مولانا قمر الزمان صاحب کی تصنیفات پڑھ کر آنکھیں روشن ہوگئیں، دِل منور ہو گیا، کس سادگی اور سلاست سے اپنا پیغام پہنچا رہے ہیں، دِل میں اُتار رہے ہیں، نہ ڈھول ہے نہ باجہ ہے، نہ جلسہ ہے نہ جلوس ہے، نہ نعرہ ہے نہ ترانہ؛ لیکن سب کچھ ہے اور اس خاموشی سے ہے کہ پتہ نہیں چلتا کہ کس راہ سے بات چلی اور کس طرح شیشۂ دل میں اُتر گئی، یہ سادگی اور صفائی، سلاست اور رَوانی زورِ بازو سے نہیں، عنایتِ خدائے بخشندہ ہے، اللہ تعالیٰ کام لے رہے ہیں اور لیتے رہیں گے، جسے چاہیں گے نوازیں گے، جسے چاہیں گے سرفراز کریں گے، مولانا تو کڑی سے لگے ہوئے ہیں، چراغوں کی قطار میں ایک چراغ ہیں، اس چراغ سے لَو نکل رہی ہے اور دیے جل رہے ہیں، روشنی صفحۂ قرطاس پر بکھر رہی ہے، آنکھوں میں سما رہی ہے، رَگ وپے میں دوڑ رہی ہے، خدا کرے ''اقوالِ سلف'' کا سلسلہ جاری رہے، ایسے دیے اور بھی روشن ہوتے رہیں، الٰہ آباد سے سلسلۂ شمع افروزی چلے اور دور دور تک چراغاں ہوجائے۔　　کلیم احمد عاجزؔ

۱۷/ مارچ/ ۲۰۱۲ء

اولیاءِ مقربین وعلماءِ ربانیین تیرھویں صدی ہجری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سراج الہند حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ متوفی ۱۲۳۹ھ

نام ونسب: نام شاہ عبدالعزیز خطاب سراج الہند اور حجۃ اللہ ہے، آپؒ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بڑے صاحب زادے ہیں۔

ولادت: آپؒ پنجشنبہ کی رات ۲۵ / رمضان/۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے، جیسا کہ آپؒ کے تاریخی نام ''غلامِ حلیم'' سے معلوم ہوتا ہے۔

تعلیم وتربیت: آپؒ نے قرآن شریف کے حفظ سے فراغت پائی اور اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، آپؒ نے ان سے قراءت وسماعت کے ذریعہ پوری تحقیق ودرایت اور توجہ سے علم حاصل کیا، جس سے آپؒ کوعلوم میں ملکۂ راسخہ حاصل ہوگیا، جب آپ سولہ (۱۶) سال کے تھے تو آپؒ کے والد ماجدؒ نے انتقال کیا، اس کے بعد آپؒ نے شیخ نور اللہ بڈھانوی اور شیخ محمد امین کشمیری سے استفادہ کیا، آپؒ کو اجازتِ علمی شاہ محمد عاشق بن عبیداللہ پھلتی سے حاصل ہوئی، جو آپؒ کے والد ماجد کے تربیت یافتہ اور محرمِ راز تھے۔

پچیس سال کی عمر میں آپؒ متعدد اذیت رساں امراض مثلاً مراق، جذام اور برص میں مبتلا ہو گئے، جس کی وجہ سے آپؒ نے تدریسی ذمہ داری اپنے

دونوں بھائیوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر صاحبان کے سپرد کر دی، مگر اس کے ساتھ خود بھی درس دیتے تھے، تصنیف، افتا اور وعظ کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، ہر سہ شنبہ کو خانقاہ جامع مسجد دہلی میں آپؒ کا ہفتہ وار وعظ قرآن مجید کی تفسیر پر مشتمل ہوتا تھا۔

اخیر عمر میں آپؒ مجلس میں تھوڑی دیر بھی نہیں بیٹھ سکتے تھے، اس لیے اپنے قدیم و جدید مدرسہ کے درمیان ٹہلتے رہتے اور لوگ بڑی تعداد میں اس حالت میں بھی استفادہ کرتے اور آپؒ کا درس و افتا اور وعظ ہوتا رہتا، اسی طرح عصر و مغرب کے درمیان دو آدمیوں کی مدد سے مدرسہ اور جامع مسجد کی درمیانی سڑک پر نکلتے تھے، لوگ راستے میں آپؒ کے منتظر رہتے اور اپنی مشکلات حل کراتے، اپنی بیماری و تکلیف کے متعلق خود امیر حیدر بن نور الحسنین بلگرامی کو خط میں لکھتے ہیں:

''اگر آپ اپنے محب کا حال پوچھتے ہیں تو وہ بہت خراب ہے اور صبح و شام اس میں اِضافہ ہی ہوتا رہتا ہے اور اسے ظاہری و باطنی آلام گھیرے ہوئے ہیں، قرار و سکون چھن گیا ہے اور قلق و اضطراب بڑھ گیا ہے اور یہ سب ایسے امراض ہیں جن میں سے ایک مرض بھی آدمی کو پریشان اور غمزدہ کرنے کے لیے کافی ہے، جیسے بواسیر، معدہ اور آنتوں میں ریاح کا رُکنا، اس حد تک فقدانِ اشتہا کہ کئی رات دِن کھانا چکھنے کی بھی نوبت نہیں آتی، بخارات جب قلب کی طرف چڑھتے ہیں تو دم گھٹنے کی کیفیت ہو جاتی ہے، یہ جب دماغ کی جانب پہنچتے ہیں تو تکلیف دہ درد شروع ہو جاتا ہے، جو ہاون دستہ کے ضرب کی طرح محسوس ہوتا

ہے،...... فإلی اللہ المشتکیٰ، وھو المستعان، یہ حالت ایک لفظ بھی بولنے کی اِجازت نہیں دیتی، چہ جائے کہ کوئی کتاب املا کرا سکے، یا کوئی پیغام لکھوا سکے۔'' (تاریخ دعوت وعزیمت: ۵/ ۳۵۰)

ف: اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اپنی بیماری وکمزوری کا حال احباب سے بیان کرسکتا ہے، اس میں کچھ مضائقہ نہیں، ہاں! اس میں اللہ تعالیٰ کی شکایت کا پہلو نہ ہونا چاہیے۔ (مرتب)

فضل وکمال: آپ کو حیرت ہوگی کہ آپؒ ان موذی امراض کے باوجود لطیف الطبع، حاضر جواب اور خوش گفتار رہے اور تواضع وبشاشت اور مہر ومحبت کی وہی ادا قائم رہی جو شروع سے تھی۔

آپؒ کی صحبت ذہن وفکر کو جلا بخشتی تھی، علماء علمی استفادہ کی غرض سے، شاعر وادیب اپنا کلام دِکھانے کے لیے، ضرورت مند سفارش کے مقصد سے، مریض علاج کی غرض سے اور اہل جذب وسلوک آپؒ سے روحانی استفادہ کے لیے حاضر ہوتے تھے، اگر آپؒ کے پاس کوئی مخالف یا ایسا شخص بیٹھتا جسے دینی مسائل میں کچھ اختلاف ہوتا تو آپؒ اپنی سحر بیانی سے اس کو مطمئن کر دیتے اور وہ آپ سے متفق اور ہم خیال ہو کر جدا ہوتا۔

آپؒ کی حاضر دماغی، حاضر جوابی اور قادر الکلامی تمام لوگوں میں مسلم تھی، حسن تعبیر اور خوبیٔ تحریر میں بھی اہل نظر نے آپؒ کو سب پر فائق تسلیم کیا ہے، اسی طرح آپؒ بے مثل فراست کے حامل تھے، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تعبیر خواب کی امتیازی صلاحیت عطا کی تھی، مختصرا یہی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

آپؒ کی ذات میں نوع بہ نوع اور گونا گوں فضائل جمع کر دیے تھے، اس صورت میں آپؒ کے مفاخر و فضائل کا شمار کون کر سکتا ہے۔ (تاریخ دعوت وعزیمت: ۴/ ۳۴۶)

آپؒ کے بصیرت افروز ملفوظات: ایک مرید نے عرض کیا کہ بعض وہ اعمال جو برائے رفع حاجات دینی و دنیوی جو احادیث میں آئے ہیں (مثلاً نمازِ حاجت یا دعائیں) وہ اعمال اس زمانہ میں اپنی تاثیر کیوں نہیں دِکھاتے؟ ارشاد فرمایا کہ علماء نے اس کا جواب تین طریقے سے دیا ہے:

(۱) شرائطِ قبولیت مفقود ہیں، جب شرط نہ پائی گئی تو مشروط بھی فوت ہوا۔

(۲) ان احادیث میں آیا ہے کہ اس دعا کا یہ خاصہ ہے، یہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ایسا ہی ہو جائے گا، اگر سائل کی مرضی کے مطابق ہر دعا قبول کر لی جائے تو ایک محذورِ عظیم لازم آئے گا، مثلاً ایک شخص دعا کر کے بارش چاہتا ہے، دوسرا اپنی کسی وقتی مصلحت کی وجہ سے بارش نہ ہونا چاہتا ہے، اسی پر اور باتوں کو قیاس کر لو۔

(۳) تیسرا جواب یہ ہے اور یہی حقیقی جواب ہے کہ کثرتِ ظلماتِ گناہ کے سبب نورانیتِ دعا اپنا کھلا ہوا نتیجہ اور فائدہ برآمد نہیں کر رہی ہے۔

دیکھو! موسم برسات میں اگر اندر خشک جگہ میں سامان رکھا ہو تو اس میں کچھ نہ کچھ نمی اور تری کا اثر آ جاتا ہے، یبوست چنداں اپنا کام نہیں کرتی، اور موسم گرما میں اس کے برعکس ہے، اسی طرح جب فضا ظلماتِ معاصی سے پر ہو جاتی ہے تو استجابت دعا کم ہوتی ہے، یا ہوتی ہے مگر مفہوم نہیں ہوتی، کبھی اللہ تعالیٰ قدرے دعا قبول کر لیتا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ میرے دادا قوتِ نسبت اور کشف کے جامع تھے، ایسے

جامع اشخاص کم ہوا کرتے ہیں، جس کسی میں نسبت قوی ہوتی ہے اس کو کشف کم ہوتا ہے، اور جس کو کشف زیادہ ہوتا ہے نسبت کمزور ہوتی ہے۔

ایک شخص نے عرض کیا کہ باوجود اشتدادِ امراض حضرت والا کے ہوش و حواس بالکل بجا اور صحیح ہیں، یہ قوتِ ملکیہ ہے، طاقت بشری نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا کہ یہ مشہور بات ہے اور تجربہ میں بھی آئی ہے کہ خادمِ علم حدیث کے ہوش و حواس خراب نہیں ہوتے، اگرچہ اس کی عمر سو سے بھی متجاوز ہو جائے، بندہ کا تو بچپن ہی سے حدیث کا مشغلہ رہا ہے۔

ف: کیوں نہ یہ شرف حاصل ہو جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا ان کے ساتھ ہے، چنانچہ ارشادِ پاک ہے:

”نَضَّرَ اللّٰہُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِیْ، فَحَفِظَهَا، وَ وَعَاهَا، وَ أَدَّاهَا۔“

(مشکوٰۃ المصابیح: ۳۷/کتاب العلم)

یعنی اللہ تعالیٰ اس بندے کو تر و تازہ رکھے جس نے میرے ارشاد کو سنا اور محفوظ کیا اور اس کو (دوسروں تک) پہنچایا۔ (مرتب)

ارشاد فرمایا: ”دو ماہ ہوئے روضۂ سلطان المشائخ پر حاضر ہوا تھا، عجیب کیفیت نمودار ہوئی، وہاں کوئی شخص مزامیر سے گا رہا تھا، میں اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور مجھے کوئی ظلمت بھی اس وقت محسوس نہیں ہوئی، پھر کسی نے مزار پر سجدۂ تعظیمی کیا، اس کی ظلمت مجھے محسوس ہوئی۔“

اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا برابر حضرت والد ماجد کی صحبت اقدس میں رہنے اور ان کی مجلس اقدس میں بیٹھنے کا

بے حد شوق رکھتا تھا، صحبت ومجالست سے مناسبت روحانی کے محاسن اور استعدادِ علمی کے کمالات جلوہ گر ہوا کرتے ہیں۔

ف: مگر افسوس کہ دریں زمانہ اہل اللہ کی مصاحبت ومجالست کا بالکل اہتمام نہیں کیا جاتا، جس کی وجہ سے اہل علم بھی باطنی کمال ونسبت سے محروم رہ جاتے ہیں۔(مرتب)

مولانا رحیم بخش کا بیان ہے کہ ہفتہ میں دو بار مجلس وعظ منعقد ہوتی تھی، جس میں عوام وخواص کا بڑا مجمع ہوتا تھا اور آپؒ کی تقریروں میں وہ اثر ہوتا تھا کہ بڑے سے بڑا معترض بھی معتقد ہوکر واپس ہوتا تھا۔ فرمایا کہ مجھے قتل کیے جانے کا بھی خوف نہ رہا، صرف یہ وسوسہ رہتا ہے کہ اگر اسی حالت میں قتل کردیا جاؤں تو جو کام پیش نظر ہے وہ ادھورا رہ جائے گا۔

ف: حضرت شاہ صاحبؒ کو لوگ نرم کہتے ہیں، مگر دیکھ لیجیے اس موقع پر کتنی ہمت وجرأت کا مظاہرہ فرما رہے ہیں کہ ''اب مجھے قتل کیے جانے کا بھی خوف نہ رہا۔'' یقیناً ہمارے اکابر کا یہی حال تھا کہ موقع پر حق کے مقابلہ میں اپنے مال وجان کی قطعاً پروانہ کرتے تھے اور حق بات کہہ ڈالتے تھے۔(مرتب)

حضرت شاہ صاحبؒ کی حاضر جوابی: حضرت شاہ صاحبؒ کے زمانے میں مختلف قسم کے فتنے سر اُٹھائے ہوئے تھے، جن میں کا ایک فتنہ مصنوعی صوفیوں کا غلبہ تھا، جس کا اثر بادشاہ پر، شاہزادوں پر اور عوام پر تھا، اس لیے ان کی جرأت اور گستاخی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ علماء کے پاس آکر بدکلامی کرتے تھے اور یہاں تک کہتے تھے کہ ہم کو پیسہ دو، ہم شراب پئیں گے، بھنگ

پئیں گے، اور علماء کو مجبوراً کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا، لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

چنانچہ صوفیوں کا ایک فرقہ ''امام شاہی'' تھا، جو چار ابرو کا صفایا اور بیہودہ باتیں کرتا تھا، اس فرقہ کا موجد ایک شخص امام شاہ تھا، یہ فرقہ شکار پور سے نکلا تھا، چوں کہ امام شاہ کی قبر باغیچہ میں تھی اس لیے اس کے سلسلہ والے اپنا نام باغ کی مناسبت سے رکھتے تھے، کسی کا نام گلاب شاہ تھا، کسی کا چنبیلی شاہ، کسی کا بہار شاہ، وغیرہ وغیرہ، ان ہی میں کا ایک شخص نسیم خاں نامی تھا، جو وہاں کا سجادہ نشین ہو گیا تھا، اس کی طرف لوگوں کی کافی رجوعات تھیں، اس نے ایک مرتبہ دلی کا سفر کیا اور حضرت شاہ صاحب ؒ کی خدمت میں پہنچا، چوں کہ رجوعات کی وجہ سے نسیم خان کا دماغ آسمان پر پہنچ چکا تھا، اس لیے اس نے شاہ صاحب ؒ کی کوئی تعظیم وتکریم نہیں کی، بلکہ آزادانہ آپ ؒ کے پاس گیا اور اپنے محاورہ کے مطابق سلام کیا اور کہا کہ شاہ صاحب! شریعت کی قید میں کب تک رہو گے؟ نکلو اس قید سے اور چھوڑو اس شریعت کو، شاہ صاحب ؒ نے نہایت اخلاق سے فرمایا: ''آیئے شاہ صاحب! تشریف لایئے''، اور اپنے پاس بٹھایا اور بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، اس کے بعد باتوں ہی باتوں میں شاہ صاحب ؒ نے فرمایا کہ ''میاں صاحب! آپ نے قرآن بھی پڑھا ہے:؟'' اس نے کہا: ''ہاں'' اس کے بعد پوچھا کہ ''کچھ فارسی بھی پڑھی ہے؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں''، پھر پوچھا کہ ''کچھ عربی بھی پڑھی ہے؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں''، میر قطبی تک پڑھی ہے، اس کے بعد پوچھا کہ ''کچھ گھوڑے کی سواری بھی سیکھی ہے؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں''، پھر پوچھا: ''فنونِ سپہ گری بھی سیکھے ہیں؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں، پھکیتی بکیتی اور تیر اندازی وغیرہ سب

سیکھے ہیں''، پھر پوچھا کہ ''آپ پہلے کیا کام کرتے تھے؟'' اس نے کہا: ''فوج میں رسالدار تھا''، پھر پوچھا کہ ''قرآن کتنے زمانے میں پڑھا؟ اور فارسی کتنے زمانے میں؟ اور عربی کتنے زمانے میں؟ اور فنونِ سپہ گری کتنے زمانے میں سیکھے؟ اور ملازمت کتنا زمانہ کی؟'' اس نے تمام باتوں کا جواب بھی دیا، پھر پوچھا کہ ''اس سلسلہ میں کب سے داخل ہوئے؟'' اس نے اس کا بھی جواب دیا، جب شاہ صاحبؒ نے ان تمام باتوں کا اقرار لے لیا تو للکار کر فرمایا کہ ''فقیر! سنبھل کر بیٹھ اور سن، تو نو مہینہ ماں کے پیٹ میں رہا اور اس سے باختیارِ خود نہ نکل سکا، اور اتنے دنوں تو ماں کے پستانوں کی قید میں رہا اور اس سے نہ نکل سکا، اور اتنے دنوں تک تو انگلی پکڑنے کی قید میں رہا، اور اتنے دِن مونڈھوں کی قید میں رہا، اور اتنے دِن تو قرآن کی قید میں رہا، استاذ نے تھپڑ بھی لگائے ہوں گے، قمچیاں بھی لگائی ہوں گی، مگر تو اس قید سے نہ نکل سکا، اور اتنے دِن تو فارسی کی قید میں رہا اور اتنے دِن تو عربی کی قید میں رہا، اور اتنے دِن تو کشی کی قید میں رہا، اور اتنے دِن پھکیتی کی قید میں رہا، اتنے دِن بکیتی کی قید میں رہا، اتنے دِن سواری کی قید میں رہا، اتنے دِن تیراندازی کی قید میں رہا، اتنے دِن تو انگریزوں کی قید میں رہا اور اب چار ابرو کی صفائی کی قید میں ہے، پھر تو اپنے آپ کو آزاد کیسے کہہ سکتا ہے؟ الحاصل اس عالم میں کوئی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی قید میں نہ ہو، اور ہم شریعت کی قید میں ہیں، مگر یاد رہے کہ تمہاری قید کچی چاندی ہے، تم اس کی قیمت مانگو گے تو اس کو تپایا جائے گا اور بغیر تپائے کوئی نہ لے گا، اور ہماری قید پر سکۂ شاہی لگا ہوا ہے، جہاں چاہیں گے بھنا لیں گے، وہ فقیر نہایت شرمندہ ہوا اور اُٹھ کر چلا گیا۔ (ملخص از: ارواحِ ثلاثہ)

اصلاح وتربیت کے تین طریقے: ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کا زمانہ بے حد فتنوں سے پر تھا، تاہم آپؒ نے اپنی خداداد فراست اور کمالِ صلاحیت سے دین کو سنبھالا اور امت کی اصلاح فرمائی، چنانچہ آپؒ نے اصلاح وتربیت کے لیے تین طریقے جاری فرمائے تھے:

(۱) درس وتدریس: جس کا حلقہ اتنا وسیع ہوا کہ پورے ہندوستان میں ایک عالم بھی ایسا نہ رہا جس کا تعلق براہِ راست یا بالواسطہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے نہ ہو۔

(۲) روحانی تربیت: جس کے لیے صوفیہ کے طریقے اختیار کیے جاتے تھے اور اس کا سب سے ضروری اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ جو کچھ بتایا جاتا ہے عملی طور پر اس کا عادی بنایا جائے، خودغرضی، نفس پرستی اور اقتدار پسندی جیسی صفات سے دل کو پاک کیا جائے، صبر وضبط، جفاکشی، محبت وشفقت اور ہر ایک مادّی غرض سے بالا ہو کر مخلوقِ خدا کی خدمت اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

(۳) پبلک جلسوں اور عام اجتماعات میں تقریر: چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ کا مقررہ پروگرام تھا کہ ہفتہ میں دو مرتبہ عام اجتماع میں تقریر ضرور کیا کرتے، دہلی اور بیرونِ دہلی کے ہزاروں آدمی ان اجتماعات میں شریک ہوتے، پروگرام کی پابندی یہاں تک تھی کہ مرض الموت میں بھی جب تک بولنے کی طاقت رہی اس تقریر کے پروگرام پر عمل ہوتا رہا۔ (علماءِ ہند کا شاندار ماضی: ۲/ ۴۱)

ف: حضرت شاہ صاحبؒ کے ان طریقوں سے امت کو بے حد نفع پہنچا، جو محتاجِ بیان نہیں، مگر ان طرقِ ثلاثہ کے علاوہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری

رکھا اور متعدد ایسی کتابیں تصنیف وتالیف فرمائیں کہ جن کی مثال ملنی مشکل ہے، علماءِ اعلام نے ان کو قبول فرمایا اور سند قرار دیا، ان میں سے تفسیر قرآن مسمیٰ بہ ''فتح العزیز''، تحفۂ اثنا عشریہ اور بستان المحدثین مشہور ومعروف ہیں۔

مرشدی حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے علوم ومعارف سے خاص مناسبت تھی، تفسیر عزیزی کا بڑے ذوق کے ساتھ ہم لوگوں کو درس بھی دیا کرتے تھے۔ (مرتب)

تصانیف: آپؒ کی مشہور تصانیف میں یہ کتابیں ہیں: تفسیر قرآن مسمیٰ بہ ''فتح العزیز''(۱) جسے آپؒ نے شدتِ مرض اور ضعف کی حالت میں املا کرایا تھا، یہ کئی بڑی جلدوں میں تھی، جس کا بڑا حصہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا اور صرف شروع اور اخیر کی دو جلدیں بچ گئیں، ان ہی میں ''الفتاویٰ فی المسائل المشکلۃ'' بہت ضخیم تھی، مگر اب اس کا خلاصہ دو جلدوں میں ملتا ہے، ان ہی کتابوں میں ''تحفۂ اثنا عشریہ'' (جو مذہب شیعہ کی تنقید وتردید میں ہے) ایک بے مثال کتاب ہے، دوسری کتابوں میں ''بستان المحدثین'' ہے، جو کتب حدیث اور محدثین کی تفصیلی فہرست اور تذکرہ ہے، جو نامکمل رہی، ''العجالۃ النافعۃ'' اصولِ حدیث میں ایک فارسی رسالہ ہے، طلبۂ حدیث کے حفظ کے لیے بھی ایک رسالہ ہے، ''میزان البلاغۃ'' علم بلاغت کا ایک بہترین متن ہے، اسی

---

(۱) اس حقیر نے اپنی سعادت سمجھ کر اس نہایت مفید اور مؤثر تفسیر کا اردو میں ترجمہ شروع کرادیا ہے تاکہ حضرتؒ کے علوم ومعارف کو عام کیا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ آمین (مرتب)

طرح ’’میزان الکلام‘‘ علم کلام میں ایک متن ہے، ایک رِسالہ ’’**السر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل**‘‘ ہے، جس میں خلفاءِ راشدینؓ کے فرقِ مراتب پر گفتگو ہے، ایک رِسالہ ’’**سر الشھادتین**‘‘ جو شہادت حضرات حسنینؓ کے بیان میں ایک عمدہ رِسالہ ہے، ایک رِسالہ انساب میں ہے، ایک رِسالہ تعبیر رؤیا پر ہے، ان کے علاوہ اور بھی رسائل ہیں، منطق وحکمت کی کتابوں میں ’’میرزاہد رسالہ‘‘ ’’میرزاہد ملا جلال‘‘، ’’میرزاہد شرحِ مواقف‘‘ پر آپؒ کے حواشی ہیں، ’’حاشیۂ ملا کوسج‘‘ پر ’’عزیزیہ‘‘ کے نام سے آپؒ کا حاشیہ ہے، صدرشیرازی کی ’’شرحِ ہدایت الحکمۃ‘‘ پر بھی آپؒ کا حاشیہ ہے، ’’ارجوزۂ اصمعی‘‘ کی شرح بھی لکھی ہے، علماء واُدباء کے نام آپؒ کے بہت سے خطوط بھی ہیں، اپنے والد ماجد کے قصائد بائیہ وہمزیہ کی نفیس تخمیس بھی کی ہے، نظم ونثر، قوتِ تحریر، حسن انشا اور خوبیٔ تعبیر میں آپؒ اپنی مثال تھے، آپؒ کی تحریریں برجستگی، بدیہہ گوئی، قلم کی روانی اور زودنویسی کی اچھی مثالیں ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے خصوصی کاموں کی توسیع وتکمیل: شاہ صاحبؒ کے تجدیدی کارنامہ کو ہم پانچ شعبوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

(۱) قرآن مجید کی ترجمانی، مسلمانوں میں اس کی تعلیمات ومضامین کی اشاعت عام، اس کے ذریعہ سے عقائد کی اصلاح اور دین خالص سے عوام کے براہِ راست ربط وتعلق کی سعی جمیل۔

(۲) حدیث کی نشر واشاعت، اس کے درس واجازت کے سلسلہ کا احیا، اس کے حلقہائے درس کا اجرا اور اساتذۂ حدیث اور شارحین کتب حدیث کی

تربیت۔

(۳) فتنۂ رفض وتشیع کا مقابلہ، صحابۂ کرامؓ اور قرآنِ عظیم کو مجروح و مشکوک بنانے والی کوششوں اور سازشوں کا سدِ باب۔

(۴) جہاد فی سبیل اللہ کا احیا اور ہندوستان میں اسلامی اقتدار اور مسلمانوں کی آزادی کے لیے سب سے بڑے خطرے اور چیلنج کا مقابلہ۔

(۵) اُن مردانِ کار کی تربیت جو حالات اور وقت کے تقاضوں اور دین کے حقیقی مطالبوں کے مطابق دعوت واصلاح کا کام انجام دیں۔

اشاعت وتبلیغ قرآن: جہاں تک عوام تک قرآن مجید پہنچانے اور اس کے ذریعہ عقائد باطلہ اور رسومِ فاسدہ کی اصلاح اور ربط مع اللہ کی کوشش کا تعلق ہے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اس سلسلہ میں اپنے والد بزرگوار کے کام کو بہت ترقی دی اور اس میں بڑی عمومیت اور وسعت پیدا کردی، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا درسِ قرآن سورۂ نساء کی آیت {اِعۡدِلُوۡا هُوَ أَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى} تک پہنچا تھا کہ آپؒ کی وفات ہوگئی، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے یہیں سے درس شروع کیا، سورۂ حجرات کی آیت {إِنَّ أَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ أَتۡقٰكُمۡ} تک پہنچے تھے کہ یہ سلسلہ بھی آپؒ کے سلسلۂ حیات کے ساتھ ختم ہوا، آپؒ کی وفات کے بعد آپؒ کے نواسہ (جو کلیۃً آپؒ ہی کے تربیت یافتہ اور آپؒ کے صحیح جانشین تھے) شاہ محمد اسحاق صاحبؒ نے درس شروع کیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا درسِ قرآن ہر ہفتہ سہ شنبہ وجمعہ کے روز ہوتا تھا، جس میں خواص بطریق خاص اور عوام بڑے ذوق وشوق سے شریک

ہوتے تھے، اس درس میں آپ ؒ کی طبیعت اپنے پورے جوش پر ہوتی تھی اور مضامین کی آمد سیل رواں کی طرح، اس درس سے دارالسلطنت دہلی میں (جو علماء و فضلاء کا بھی مرکز تھا) قرآن مجید کا ذوق عام ہوا، اصلاحِ عقائد کی ایک طاقتور رو چلی اور ترجمۂ قرآن اور درسِ تفسیر کا وہ مبارک سلسلہ شروع ہوا جو اس وقت تک اس برصغیر میں جاری ہے، اور جس سے لاکھوں انسانوں کی اصلاح ہوئی اور ان کے دل و دماغ حلاوتِ توحید اور لذتِ قرآن سے آشنا ہوئے، خود مدارسِ عربیہ میں اسی درس کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ علماء کے اثر سے متن قرآن کے درس و افہام وتفہیم کا سلسلہ شروع ہوا، جس کو نصابِ درس میں مختصر تفسیر کی شکل میں تبرکاً جگہ دی گئی تھی، اور علماءِ دنیا کا پھیلایا ہوا یہ طلسم ٹوٹا کہ قرآن مجید کی اشاعت عوام میں بڑے دینی خطرات، بلکہ ضلالت کا پیش خیمہ ہے، اس میں یہ مخفی اندیشہ کام کر رہا تھا کہ عوام ان پیشہ ور علماء کے ہاتھ سے نکل جائیں گے، جنہوں نے قرآن کو چیستان بنا رکھا تھا اور عوام کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔

حدیث کی تدریس وترویج : جہاں تک درسِ حدیث اور اس کی ترویج واشاعت کا تعلق ہے ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، آپ ؒ کے درسِ حدیث کی مدت تقریباً چونسٹھ (۶۴) سال کی ہے، اس مدت میں آپ ؒ نے نہ صرف صحاح کا درس دیا بلکہ ''بستان المحدثین'' اور ''العجالۃ النافعۃ'' جیسی مفید کتابیں تصنیف کیں، جو حدیث کا صحیح ذوق، طبقاتِ حدیث سے واقفیت اور محدثین کا مرتبہ شناس بناتی اور اصول سے واقف کراتی ہیں، اور جن میں سیکڑوں صفحات کا عطر آ گیا ہے، آپ ؒ نے حدیث کے ایسے اساتذۂ

کاملین اور تلامذۂ راشدین پیدا کیے جنہوں نے ہندوستان ہی میں نہیں حجاز میں بھی درسِ حدیث کا فیض عام کیا اور ایک عالم کو مستفید کیا، آپؒ کے ان باکمال تلامذہ کی تعداد جن کے تراجم صرف ''نزہۃ الخواطر'' کی جلد ہفتم میں موجود ہیں چالیس (۴۰) سے اوپر ہے، ان میں سے بہت سے تلامذہ وہ ہیں جن سے حدیث کے درس کے حلقے قائم ہوئے اور انہوں نے حدیث کے دوسرے شیوخ واساتذہ پیدا کیے۔

نصرتِ سنت وردِّ شیعیت: جہاں تک فتنۂ رفض وتشیع کے مقابلہ اور اس کے اثر سے اہل سنت کو محفوظ رکھنے کے کارنامہ کا تعلق ہے اور جس کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی بے نظیر کتاب ''ازالۃ الخفائ'' سے کی تھی، اس کی تکمیل اور تقویت حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی نادرۂ روزگار تصنیف ''تحفۂ اثنا عشریہ'' سے کی، جو ان کتابوں میں ہے جن کو تاریخ ساز کہا جا سکتا ہے، اور جس طرح ملا محب اللہ بہاریؒ کی تصانیف ''سلم العلوم'' اور ''مسلم الثبوت'' نے تقریباً سو برس تک علماءِ ہند کو اپنی شرح وتحشیہ میں مشغول رکھا اور ان کی بہترین ذہانتوں اور توانائیوں کو مرکوز کر لیا، اسی طرح اس کتاب کے جواب نے ممتاز ترین شیعہ علماء کو تصنیف وتالیف میں مشغول کر دیا۔

انگریزی اقتدار کی مخالفت اور مسلمانوں کا ملی تحفظ: جہاں تک ہندوستان میں اسلامی اقتدار کی حفاظت اور مسلمانوں کی آزادی کی راہ میں پیش آنے والے خطرے اور چیلنج کے مقابلہ کا تعلق ہے تو شاہ صاحبؒ نے اس سلسلہ میں حالات کے اس حقیقت پسندانہ جائزہ، بیدار مغزی، دور بینی اور شانِ

عزیمت کا وہ نمونہ پیش کیا جو ایک صاحب بصیرت وفراست عالم دین، داعی و مصلح اور اپنے وقت کے دینی رہنما کے شایانِ شان ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے زمانہ میں وقت کا سب سے بڑا مسئلہ مرہٹوں کی تاخت اور ان کی اس فوج کشی وغارت گری کو روکنا تھا جو ایک روزمرّہ کا واقعہ بن گیا تھا، اور جس سے ایک طرف سلطنت مغلیہ بے بس، بے اثر اور ذلیل ہو رہی تھی، دوسری طرف مسلمانوں کی عزت و ناموس محفوظ نہیں رہے، اور شہروں کی معمول کے مطابق زندگی باقی نہیں رہی تھی، اس وقت اس خطرے کو دور کرنا اور اس کے روکنے کے لیے کسی امکانی امداد کو حاصل کرنا ایسا ہی تھا جیسے کسی گھر یا محلہ میں آگ لگنے کے وقت آگ بجھانے والے انجن و دستہ (Fire Brigade) کو طلب کیا جاتا ہے، اور شاہ صاحبؒ کی نظر میں احمد شاہ ابدالی اور اس کی فوج کی یہی حقیقت تھی، اور ان سے یہی شرط ہو گئی تھی کہ اس آگ کو بجھانے کے بعد واپس چلے جائیں گے، شاہ صاحبؒ کی نظر میں یہ سلطنت مغلیہ کو سنبھلنے کا موقع دینے کے لیے اور کسی بہتر نظام کو اس کی جگہ لینے کے لیے (اگر اس کے بغیر چارہ نہیں ہے) ایک عارضی انتظام اور تدبیر کے درجہ کی چیز تھی، جو اس وقت کے مغل تاجدار شاہ عالم کی دوں ہمتی اور کوتاہ نظری کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوسکی، اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان کی زمامِ اقتدار سنبھالنے، پھر اس وسیع ملک پر سات سمندر پار کی ایک ملک کی حکومت قائم ہوجانے کے وہ آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے جو شاہ صاحبؒ کی توجہ کو پورے طور پر اس پر مرکوز کر دیتے۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مردانِ کار کی تربیت : جہاں تک ان مردانِ کار کی تربیت کا تعلق ہے جو حالات اور وقت کے تقاضوں اور دین کے حقیقی مطالبوں کے مطابق دعوت واصلاح کا کام انجام دیں اور جہد و جہاد کا بیڑہ اٹھائیں تو یہ تقدیر اور حکمت الٰہی کی بات ہے کہ اس میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا حصہ اپنے بہت سے مشائخ و اسلاف اور بعض ایسے حضرات سے بھی بڑھا ہوا ہے جن کا درجہ ممکن ہے (اور قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان سے بڑھا ہوا ہو، شاہ صاحبؒ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایسے متعدد عالی استعداد اور بلند ہمت وعزیمت رکھنے والے صاحب تاثیر نفوس کی تربیت کا کام لیا، جنہوں نے ہزاروں انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کردیا اور ایک پوری صدی سنبھال لی، شاہ صاحبؒ کے علم اور زندگی کے دریا کی سطح ساکن تھی، لیکن بقولِ اقبال:

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

(تاریخ دعوت وعزیمت: ۵/ ۳۵۴)

کارپردازانِ حکومت کا سلوک : مغل بادشاہ عموماً اس خاندان کا احترام کرتے رہے ہیں، مگر افسوس ہے کہ بادشاہ خود اپنے اختیار میں نہیں تھے، اور جو کارپرداز بااختیار تھے ان میں عموماً وہ تھے جن کو یہ اصلاحات پسند نہیں تھیں۔

چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور آپؒ کے ساتھیوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی گئیں، مثلاً:

غنڈہ گردی : حضرت شاہ صاحبؒ کا خود بیان ہے کہ جب میں پرانے شہر

میں تھا تو خود اپنوں کے ہاتھوں مجھے تکلیف پہنچائی جاتی تھی، آبرو باختہ، آوارہ گردوں کو اُکسا دیا جاتا تھا، وہ میرے مکان کے قریب چھت پر تعزیہ رکھ دیتے تھے اور تبرا وغیرہ کی ایذا رساں حرکتوں سے ناطقہ بند کر دیتے تھے، رمضان شریف میں تراویح ہو رہی تھی، ایک بازاری عورت کو شراب پلا کر وہاں پہنچا دیا گیا، وہ حافظ شیرازی کا ایک شعر پڑھ رہی تھی اور غنڈوں کا ہجوم ڈھول بجا رہا تھا اور طرح طرح کی آوازیں کس رہا تھا، ان غنڈوں کا اگر جواب دیا جاتا تو بلوہ کی نوبت آتی، جو مقاصد تحریک کے لیے خطرناک تھا۔

ضبطیٔ جائداد: غنڈہ گردی سے کامیابی نہ ہوئی تو حضرت شاہ صاحبؒ کا مکان ضبط کرلیا گیا اور ان کو دہلی سے نکال دیا گیا، حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ نے اس وقت خاص طور پر مدد فرمائی اور آپؒ کے قیام کا انتظام کیا، پھر اپنے تعلقات کو کام میں لاکر بادشاہ کے ذریعہ حویلی واپس دلوائی۔

شہر بدری: یہ قصہ رفع دفع ہوا تو کوئی نیا قصہ کھڑا کیا گیا اور آپؒ کو مع اہل وعیال شہر بدر کر دیا گیا، اس مرتبہ حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ کے تعلقات بھی کام نہ آسکے، چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور آپؒ کے بھائیوں کو شاہدرہ تک مع متعلقین پیدل جانا پڑا، شاہدرہ سے حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ نے متعلقین کے لیے سواری کا انتظام کر دیا۔

قتل کی سازش: صرف اسی پر قناعت نہ کی گئی، بلکہ دو مرتبہ آپؒ کو زہر بھی دیا گیا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے زہر نا کام رہا، مگر جسمانی صحت پر بڑا اثر پڑا، یہ بھی روایت ہے کہ آپؒ کے بدن پر چھپکلی کا اُبٹن مَل دیا گیا تھا، جس سے برص ہو گیا تھا۔

بہر حال ان تمام سزاؤں کے نتیجہ میں (۱) بینائی جاتی رہی (۲) برص ہو گیا (۳) خون میں حدت آگئی (۴) مختلف امراض پیدا ہو گئے۔

(علماءِ ہند کا شاندار ماضی: ۲/ ۴۷)

ف: افسوس صد افسوس، حضرت شاہ صاحبؒ جیسے عالم ربانی، شیخ نورانی، ولیٔ کامل کے ساتھ ان کے ہم عصر اور حکومت کے کار پردازوں کا یہ جور و ستم، توبہ توبہ، کیا ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ حدیث قدسی ہے: ''مَنْ عَادیٰ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ۔'' یعنی جو میرے کسی ولی سے عداوت کرتا ہے تو میں خود اس سے اعلانِ جنگ کرتا ہوں۔

مگر افسوس کہ فُساق و فجار اور ظالم حکام پر جب نفسانیت و شیطنت کا بھوت سوار ہوتا ہے تو صالحین کی تحقیر و تذلیل اور ایذا رسانی ہی کو اپنا کمال سمجھتے ہیں اور اپنی عاقبت کو خراب و برباد کرتے ہیں، اعاذنا اللہ منہ۔ (مرتب)

وفات: آپؒ نے نمازِ فجر کے بعد ۷/ شوال المکرم/ ۱۲۳۹ھ بروزِ یکشنبہ اَسی (۸۰) سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور شہر دہلی مہدیان میں اپنے والد محترم کے جوار میں مدفون ہوئے، نور اللہ مراقدہم۔ (تاریخ دعوت و عزیمت: ۵/ ۳۵۴)

خوش نصیبی: الحمد للہ! متعدد بار آپؒ کے مزار پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان حضرات کے علوم و معارف اور فیوض و برکات سے مستفیض فرمائے، آمین۔ (مرتب)

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دہلویؒ متوفی ۱۲۳۳ھ

نام ونسب : علامہ رفیع الدین عبدالوہاب، والد کا نام حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم عمری دہلوی ہے، آپؒ اپنے وقت کے مشہور محدث، متکلم، اصولی، مسند وقت، فرید عصر اور نادرۂ دہر تھے، آپؒ شاہ صاحبؒ کے دوسرے نمبر کے صاحبزادے ہیں۔

ولادت : آپؒ کی ولادت ۱۱۶۳ھ مطابق: ۱۷۴۹ء کو دہلی میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت : صغرسنی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے تھے، اس لیے برادرِ اکبر شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ سے تحصیل علم کی اور ایک مدت تک ان کے ساتھ رہے، طریقت میں شاہ محمد عاشق بن عبیداللہ پھلتی سے استفادہ کیا، بیس سال کی عمر میں علم وافتا اور درس میں امتیاز وشہرت حاصل کی اور اکابر علماء میں شمار ہونے لگے، شاہ عبدالعزیزؒ کے آنکھوں سے معذور ہونے کے بعد درس وتدریس کا کام آپؒ نے سنبھال لیا، طلبہ کا ہجوم ہوا اور انہوں نے بقدرِ استطاعت آپؒ کے علمی افادات سے فائدہ اُٹھایا، علماءِ آفاق نے آپؒ کے علم وفضل کا اعتراف کیا۔ (تاریخ دعوت وعزیمت: ۵/ ۳۸۲)

آپؒ کے برادرِ معظم شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے شیخ احمد بن محمد شروانی کو شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے بارے میں لکھا تھا:

''اب برادرِ یگانہ اور خلیق زمانہ کا وقت ہے، جو نسباً میرے حقیقی بھائی ہیں اور فنونِ علم وادب میں (جن کا لوگ مجھ سے انتساب کرتے ہیں) میرے

شریک ہیں، وہ عمر میں مجھ سے کچھ ہی چھوٹے ہیں، مگر فن وحکمت میں میرے برابر ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ان کی پرورش میرے ہاتھوں کی اور ان کی تکمیل کا مجھے ذریعہ بنا کر مجھ پر احسان کیا، وہ چند دنوں کے سفر کے بعد واپس آئے تو مجھے ایک مختصر مگر قیمتی رِسالہ کا تحفہ دیا، جو ایسے لطائف ونکات پر مشتمل ہے جن میں وہ منفرد ہیں اور ان سے پہلے انہیں کسی نے نہیں لکھا، ان کی یہ انفرادیت آیت نور کی تفسیر اور اس کے اندر پوشیدہ معانی کی رونمائی کے سلسلہ میں ہے، میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس باب میں ان کے بیانات ایسے حیرت انگیز ہیں جن کے ذریعہ انہوں نے مغزِ سخن کو ظاہر کر دیا اور دلوں کے چراغ روشن کر دیے اور اپنے اسلوب کی انفرادیت سے سعید روحوں کو تازہ دم کر دیا ہے۔'' (تاریخ دعوت وعزیمت: ۵ / ۳۸۲)

ف: سبحان اللہ! حضرت شاہ صاحبؒ کے اندر کس قدر للّٰہیت اور فنائیت تھی کہ اپنے شاگرد اور برادرِ خورد کی اس درجہ مدح وستائش اور ان کے کمالات کا برملا اعتراف فرما رہے ہیں، جو کہ اس زمانہ میں تو یقیناً نادر الوقوع ہے۔ (مرتب)

آپؒ کا ایک رِسالہ بزبان فارسی ''رِسالۂ بیعت'' ہے، جس سے ایک فارسی عبارت کا ترجمہ نقل کرتا ہوں، جو خالی از نفع نہیں:

''بہر حال بیعت شریعت، پس اس کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی عامی شخص جس نے اپنی عمر کو غفلت اور معصیت کے کاموں میں صرف کیا ہو، جب اس کو اپنے اس حال پر تنبہ ہو (یعنی اس کی درستگی کا خیال آئے) اور حالاتِ گذشتہ پر نادم ہو کر تقویٰ اور طاعت کے کاموں کی جانب رجوع کرنا چاہے تو یہ چیز بدونِ

کسی عالم کے جو ظاہراً و باطناً متقی ہو اپنے اوپر حاکم بنائے ہوئے یوں ہی بطورِ خود عادۃً وقوع پذیر نہیں ہوا کرتی، کیوں کہ شریعت کی کتابوں کا مطالعہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی طب کی کتاب کی مراجعت کی جائے، (اور یہ سب جانتے ہیں کہ) بیمار کے لیے بغیر اس کے کہ طب اور معالجہ میں اس کو ملکہ اور مہارت حاصل ہو، محض کتب بینی کے ذریعہ اصلاح کر لینا اور مرض کا دفع کرنا دشوار ہے۔‘‘

اس کے بعد انتخابِ شیخ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

’’اسی طرح سے ہر عالم کے قول پر عمل کر لینا تحیّر اور تشتُّت کا سبب ہے، کیوں کہ ہر عالم بھی تو صحیح الفکر اور صحیح الحواس نہیں ہوا کرتا، لہٰذا اس ضرورت کے تحت کسی کو اپنا شیخ اور مصلح بنانے کے لیے کسی ایسے شخص کا انتخاب کرنا چاہیے جو علاوہ علم و تقویٰ کے دو اور اوصاف سے متصف ہو، ایک یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں تساہل اور مداہنت کو روا نہ رکھتا ہو، دوسرے یہ کہ طالب کے مناسب حال اسہل اور افضل جو امور ہوں ان کی شناخت میں ماہر ہو۔

پس ایسے شخص کا انتخاب کر کے اپنے تمام امور کی لگام اس کے ہاتھ میں دے دے اور اس کی اتباع کو اپنے اوپر لازم پکڑے، تاکہ اپنی مراد کو پہنچے اور اس کا ثمرہ اور نتیجہ آخرت میں نجاتِ کلی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رسائی اور مولیٰ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ (رسالۂ بیعت/صفحہ:۲۷، منقول از تالیفاتِ مصلح الامت: ۴/ ۱۱۸)

ف: سبحان اللہ! کس قدر مفید مضمون ہے، جو آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، خصوصاً یہ بات تو عجیب فرمائی اور سچ فرمائی کہ ’’ہر عالم صحیح الفکر اور صحیح الحواس نہیں ہوا کرتا۔‘‘ اور یہ حقیر کہتا ہے کہ بہت سے عالم تو صحیح العقیدہ بھی نہیں، تو اس کی

اصلاح کیسے کریں گے؟ (مرتب)

علم ریاضی میں مہارت : حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی صاحبؒ تفسیر قرآن، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور عربی زبان وادب میں مہارتِ تامہ کے ساتھ ساتھ علم ریاضی میں بھی حیرت انگیز دستگاہ رکھتے تھے، آپؒ کو تو اس مشکل فن میں ''موجد'' ہونے کی حیثیت حاصل تھی، آپؒ کے معاصرین نے آپؒ کے اس وہبی کمال کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے، خود شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ''مولوی رفیع الدین در ریاضیات چنداں ترقی کردہ اند کہ شاید موجد آں نہ کردہ باشد۔'' مولوی رفیع الدین نے ریاضیات میں اس قدر ترقی کی کہ اس فن کے موجد نے بھی اس سے زیادہ نہ کی ہوگی۔ (ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیزؒ/صفحہ:۴۰، کمالاتِ عزیزی/صفحہ:۵۶)

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''در فن ریاضی نظیر مولوی رفیع در ہند و ولایت نخواہد بود۔'' مولوی رفیع الدین کا فن ریاضی میں ہند اور ولایت میں مثل نہ تھا۔ (کمالاتِ عزیزی/صفحہ:۳)

قرآن مجید کا اُردو ترجمہ : شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ترجمۂ کلام پاک کی جو انقلابی تحریک چلائی اسے آپؒ کے جلیل القدر صاحب زادگان نے آگے بڑھایا، شاہ صاحبؒ کے بعد سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے قرآن مجید کا با محاورہ اردو ترجمہ کیا، ان کے بعد حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے تحت اللفظ اُردو ترجمہ فرمایا۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے ترجموں میں جو واضح فرق ہے اس کو بڑی حد تک ظاہر کرتے ہوئے بابائے اُردو مولوی

عبدالحق رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

’’یوں تو دونوں ترجمے لفظی ہیں، لیکن شاہ رفیع الدینؒ نے ترجمہ میں عربی جملے کی ترکیب اور ساخت کی بہت زیادہ پابندی کی ہے، ایک حرف اِدھر سے اُدھر نہیں ہونے پایا، ہر عربی لفظ بلکہ ہر حرف کا ترجمہ خواہ اُردو زبان کے محاورے میں کھپے یا نہ کھپے انہیں کرنا ضروری ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ میں اس قدر پابندی نہیں کی گئی ہے، بلکہ وہ مفہوم کی صحت اور اصل لفظ کے حسن کو برقرار رکھنے کے علاوہ اُردو زبان کے روزمرے اور محاورے کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ دوسری خوبی ان کے ترجمہ میں ایجاز کی ہے، یعنی وہ ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم الفاظ میں پورا مفہوم صحت کے ساتھ ادا ہو جائے۔‘‘

مذکور الصدر مولوی عبدالحق صاحبؒ کی بات میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے زیادہ تر لفظی ترجمہ کا اہتمام کیا ہے، لیکن اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ بامحاورہ ترجمہ بالکل نہیں کیا ہے، بلکہ کہیں کہیں بامحاورہ ترجمہ بھی کیا ہے اور بڑا ہی دل چسپ کیا ہے۔

تصنیف وتالیف : شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کثیر التصانیف عالم دین اور شیخ طریقت تھے، آپؒ کی گراں قدر تصانیف وتالیفات حسب ذیل ہیں:

اُردو ترجمۂ قرآن مجید، مقدمۃ العلم، تکمیل الاذہان، اسرار المحبۃ، قیامت نامہ، دمغ الباطل، اثبات شق القمر، تحقیق الوان، حجاب، برہانِ تمانع، عقد انامل، رِسالہ میر زاہد پر حاشیہ اور تکمیل الصناعۃ وغیرہ۔

حضرت شاہ رفیع الدینؒ کی اکثر کتابیں اس دور میں کم یاب ہی نہیں بلکہ نایاب بھی ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ اس دور میں ایسی علمی اور تحقیقی کتابوں کی کھپت نہیں، مکتبہ والے بھی ان کتابوں کی اشاعت وترویج کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

شیخ محسن بن یحيٰ ترہتی رحمۃ اللہ علیہ ''الیانع الجنی'' میں شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے کمالاتِ علمیہ اور تصانیف انیقہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان مروجہ علوم کے علاوہ حضرت شاہ صاحبؒ کو علومِ اوائل میں بھی مہارتِ تامہ حاصل تھی، جو ان کی طرح بہت کم اہل علم کے حصہ میں آتی ہے، ان کی تصانیف بہت عمدہ اور مرصع ہیں...... میں نے بعض کتابیں دیکھیں تو آپؒ کی علمی وفنی عبارتوں میں ایسے اسرار ورموز نظر آئے جن کے رمز آشنا کم ہی ہوتے ہیں، تھوڑے لفظوں میں آپؒ بہت سے مسائل جمع کر دیتے ہیں، جس سے آپؒ کی علمی گہرائی اور دقت فہم کا اندازہ ہوتا ہے۔'' (الواح الصنادید:۱/۱۷۶، بحوالہ: تاریخ دعوت وعزیمت ۵/۳۸۳)

وفات: آپؒ نے اپنے برادرِ بزرگ شاہ عبدالعزیزؒ کی حیات ہی میں ۶/شوال ۱۲۳۳ھ کو دہلی میں وفات پائی اور شہر دلی میں اپنے والد ماجد وجد امجد کے پاس مہدیان میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (تاریخ دعوت وعزیمت:۵/۳۸۵)

شاہ عبدالعزیزؒ کی کیفیت: شاہ رفیع الدینؒ جیسے جلیل القدر شیخ طریقت اور امام وقت کو جب لوگ دفن کر کے فارغ ہوئے تو اس وقت شاہ عبدالعزیزؒ پر عجیب وغریب کیفیت طاری تھی اور بڑے سوز ودرد کے ساتھ ارشاد فرمایا:

''رفیع الدین سے میرا چار طرح کا رِشتہ تھا، ایک تو حقیقی بھائی تھے، دوسرے یہ کہ قبلہ گاہی (والد ماجدؒ) نے ایک تقریب میں انہیں میرے سپرد کر

کے کہا تھا کہ ''یہ تمہارا لڑکا ہے۔'' تیسرے ہم نے اور انہوں نے ایک ہی دائی کا دودھ پیا تھا، چوتھے وہ میرے شاگرد تھے۔''

کسی نے اس سلسلہ میں ان سے عرض کیا کہ شاہ رفیع الدینؒ سے اس خاندان کی بڑی عزت تھی، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس وقت برجستہ فرمایا اور حقیقت یہ ہے کہ ایک سچی اور خالص محبت کی اس سے اچھی تعبیر نہیں ہوسکتی ''اگر وہ جاہل بھی ہوتے تو مجھے اُن کا اسی قدر درد ہوتا۔'' (تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ / صفحہ: ۲۸۳)

اولاد: شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کے چار صاحب زادے تھے، مولوی محمد موسیٰ، مولوی عیسیٰ، مولوی مخصوص اللہ اور مولوی حسن جان رحمہم اللہ، اور یہ چاروں صاحب زادگان بھی فضل وکمال میں ولی اللہی خاندان کی یادگار تھے۔

ف: بجاطور پر کہا جاسکتا ہے کہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔'' کثر اللہ أجرهم۔ (مرتب)

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر دہلویؒ متوفی ۱۲۳۰ھ

نام ونسب: نام شاہ عبدالقادر، والد کا نام حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم عمری دہلوی ہے، آپؒ وقت کے شیخ، عالم کبیر اور عارفِ شہیر تھے، آپؒ کی ولایت اور جلالت پر لوگوں کا اتفاق ہے، آپؒ حضرت شاہ صاحبؒ کے تیسرے نمبر کے صاحب زادے ہیں۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۱۶۷ھ کو دہلی میں ہوئی۔

فضل وکمال: جب آپ کے والد ماجد کی وفات آپؒ کے بچپن میں ہوگئی تو آپؒ نے اپنے برادرِ بزرگ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے تحصیل علم کیا اور شاہ عبدالعدل دہلویؒ سے طریقت کی تعلیم پائی اور علم وعمل، زہد وتواضع اور حسن سلوک میں امتیاز کے مالک ہوئے، ان فضائل کے سبب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں آپؒ کی محبت پیدا کر دی اور آپؒ اپنے شہر میں مرجع عام بن گئے اور علم روایت و درایت، اصلاحِ نفس اور روحانی تربیت میں آپؒ سے رجوع کیا جانے لگا۔

آپؒ کے تلامذہ: آپؒ درس وافادہ میں مشغول اور دہلی کی اکبر آبادی مسجد میں مقیم رہتے تھے، آپؒ سے مولانا عبدالحی بن ہبۃ اللہ بڑھانویؒ، مولانا محمد اسماعیل بن شاہ عبدالغنی دہلویؒ، مولانا فضل حق بن فضل امام خیر آبادیؒ، مرزا حسن علی شافعی لکھنویؒ، شاہ اسحاق بن شاہ افضل عمری دہلویؒ (مدفون مکہ مکرمہ) مولانا سید محبوب علی جعفریؒ، مولانا سید اسحاق بن عرفان رائے بریلویؒ (برادرِ معظم

حضرت سید احمد شہیدؒ) اور بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا۔

آپؒ کا تفسیری کارنامہ: آپؒ پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عنایت یہ تھی کہ آپؒ کو ہندوستانی زبان میں قرآنِ کریم کے ترجمہ وتفسیر کی توفیق ملی، علماء نے اس کی بڑی قدردانی کی اور اسے معجزاتِ نبوی میں سے ایک معجزہ قرار دیا، والد ماجدؒ نے ''مہر جہاں تاب'' میں لکھا ہے کہ شاہ عبدالقادرؒ نے یہ ترجمہ لکھنے سے پہلے خواب دیکھا تھا کہ آپؒ پر قرآن نازل ہوا، اسے آپؒ نے اپنے بھائی شاہ عبدالعزیزؒ سے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے، مگر چوں کہ اب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وحی آنے کا سلسلہ موقوف ہوگیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے قرآن کی بے مثال خدمت لے گا، چنانچہ یہ بشارت ''موضح القرآن'' کی صورت میں پوری ہوئی۔

اس کی خصوصیت میں سے یہ ہے کہ انہوں نے زبان کے مقابلہ میں ایسی زبان اختیار کی ہے جس میں عموم وخصوص، اطلاق وتقیید اور محل استعمال کا پورا لحاظ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی عنایت ہے جس کے لیے وہ چند ہی لوگوں کو مخصوص کرتا ہے۔ (تاریخ دعوت وعزیمت: ۵/۳۸۶)

حضرت شاہ صاحبؒ نے قرآن پاک کے متعلق اپنے مقدمہ ''موضح القرآن'' میں نہایت سادہ اور دل نشین انداز میں جس اہم حقیقت کا اظہار فرمایا ہے وہ درجِ ذیل ہے:

''بتانے والے بہتیرا بتائیں، جیسا اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے ویسا کوئی نہیں بتا سکتا اور جیسا اثر اور راہ پانا اللہ تعالیٰ کے کلام میں ہے کسی

کے کلام میں نہیں۔‘‘ (تاریخ دعوت وعزیمت:۵/ ۱۴۱)

ف: سبحان اللہ! کتنا جامع اور بصیرت افروز ارشاد ہے، جو شاہ صاحبؒ کے کلامِ الٰہی سے غایت مناسبت اور کمالِ معرفت پر دال ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے بہرہ ور فرمائے، آمین۔ (مرتب)

شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے بعد اُن ہی کے برادرِ بزرگ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۲۳۳ھ) نے قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ کیا، جو اپنی احتیاطوں اور مصنفؒ کے علمی تبحر واخلاص کی وجہ سے بہت مقبول ہوا اور بعض حلقوں میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا بامحاورہ ترجمہ اور بعض حلقوں میں شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا تحت اللفظ ترجمہ رائج اور قابل ترجیح پایا۔

یہ دونوں ترجمے مسلمانوں کے گھروں میں ایسے عام ہوئے اور قرآن مجید کی تلاوت کے ساتھ اس کے پڑھنے کا ایسا رِواج ہوا جس کی مثال کسی دوسری دینی کتاب کے بارے میں نہیں مل سکتی، جہاں تک اصلاحِ عقائد اور عقیدۂ توحید کی اشاعت کا تعلق ہے ان دونوں ترجموں سے فائدہ اُٹھانے والوں کی کوئی تعداد نہیں بیان کی جاسکتی کہ وہ لاکھوں سے متجاوز ہوگی، حقیقت میں کوئی اسلامی حکومت بھی اپنے وسائل کے ساتھ دعوت واصلاح کا اتنا بڑا کام انجام نہیں دے سکتی تھی جو ان تینوں ترجموں نے انجام دیا۔ (مراد اس سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا فارسی ترجمہ اور دوم شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور سوم شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا اُردو ترجمہ۔ مرتب) جو ایک ہی شجرۂ طوبیٰ کی شاخیں ہیں۔ **ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ**۔ (تاریخ دعوت وعزیمت:۵/ ۱۴۹)

درس و تدریس: حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے تصنیف و تالیف اور عبادت و ریاضت کے ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی ہمیشہ جاری رکھا، اس لیے آپؒ نے دہلی کی اکبرآبادی مسجد کا انتخاب فرمایا، آپؒ نے اس تاریخی مسجد میں ایک عرصہ تک بیٹھ کر ظاہری و باطنی علوم و معارف کے دریا بہائے اور طالبانِ علم و معرفت کو سیراب کرتے رہے، آپؒ کی اس ایمانی و روحانی درسگاہ سے فیض یاب ہونے والوں میں دنیائے اسلام کی مشہور و مقتدر شخصیتیں شامل ہیں، مولانا عبدالحی بن ہبۃ اللہ بڑھانوی، مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ بن شاہ عبدالغنی دہلویؒ، مولانا فضل حق بن مولانا فضل امام خیرآبادیؒ، مرزا حسن علی شافعی لکھنویؒ، شاہ اسحاق محدث دہلویؒ، مولانا سید محبوب علی جعفریؒ، مولانا سید اسحاق بن عرفان رائے بریلویؒ جیسی شہرہ آفاق شخصیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو حضرت کے فیضانِ علم کی بدولت دین اسلام کے صحیح مبلغ اور مکتبِ ولی اللہی کے امین بن کر اُفق عالم پر چمکے اور پورے عالم کو علومِ ولی اللہی سے منور کر دیا۔

زہد و ورع: حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ خاندانِ ولی اللہی میں مسلم الثبوت صوفی اور ولی اللہ تھے، آپؒ زہد و ورع اور اخلاص و للّٰہیت میں اپنے بھائیوں میں بھی ممتاز و منفرد حیثیت کے مالک تھے۔

حضرت شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ فرماتے تھے کہ ”شاہ صاحبؒ کے صاحب زادوں میں صاحب نسبت بزرگ شاہ عبدالقادرؒ تھے۔“ اور صاحب نسبت ہونے کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ”صاحب نسبت وہ ہے کہ جس بات کا ارادہ کر لے اللہ تعالیٰ اسے پورا فرمائے۔“ (مقالاتِ پروفیسر خلیق احمد نظامی)

کشف وکرامات: اس کے ساتھ ساتھ آپؒ کا شمار زبردست صاحب کشف بزرگوں میں ہوتا تھا، جس کے معتقد آپؒ کے برادرِ محترم اور استاذ و مربی اور صاحب کشف و کرامات بزرگ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ بھی تھے، جیسا کہ مولانا امیر شاہ خان تحریر فرماتے ہیں کہ ''اس کا پتہ چلانے کے لیے کہ عید کا چاند تیس کا ہوگا یا اُنتیس کا، ہمیشہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ رمضان کی پہلی تاریخ کو آدمی بھیج کر دریافت کراتے: ''میاں عبدالقادر نے آج کتنے سپارے پڑھے ہیں؟'' اگر آدمی آکر یہ کہتا کہ آج دو پڑھے ہیں، تو شاہ صاحبؒ فرماتے کہ عید کا چاند تو اُنتیس ہی کا ہوگا، یہ بات دوسری ہے کہ ابر وغیرہ کی وجہ سے دِکھائی نہ دے اور صحت شرعی نہ ہونے کی وجہ سے ہم رویت کا حکم نہ لگا سکیں۔''

(امیر الروایات/صفحہ:۱۰۵)

کیوں کہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ کو رمضان کا چاند ہوتے ہی اپنے کشف صادق سے پتہ چل جاتا تھا کہ یہ رمضان ۲۹ دِن کا ہوگا یا ۳۰ دِن کا، اور پہلی شب میں آپؒ اسی اعتبار سے تراویح میں قرآن پڑھتے۔ اور آپؒ کا یہ مکاشفہ زبان زدِ خاص و عام تھا، حتیٰ کہ دہلی کے دھوبی اور درزی بھی حضرتؒ کی پہلی تراویح کو اپنے کام کے نظم کی بنیاد قرار دیتے۔

شاہ صاحبؒ کے کشف وکرامات بیان کیے جائیں تو ایک مستقل کتاب تیار ہو جائے گی۔ ایک مختصر واقعہ مولانا امیر شاہ خانؒ کے لفظوں میں ملاحظہ فرمایئے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ شاہ عبدالقادرؒ کس قدر صاحب کشف بزرگ تھے، امیر شاہ خانؒ بیان فرماتے ہیں کہ ''سلام کرنے والے کے سلام

سے ہی آپؒ پر منکشف ہو جاتا کہ سلام کرنے والا شخص شیعہ ہے یا سنی، لہٰذا جب بھی آپؒ کو کوئی سلام کرتا تو آپؒ زبانی جواب کے ساتھ ساتھ شیعہ صاحبان کو بائیں ہاتھ اور سنی صاحبان کو دائیں ہاتھ سے اشارہ فرماتے اور اکثر شیعہ صاحبان بطورِ آزمائش آپؒ کو سلام کرتے اور بعض شیعہ صاحبان تو اس آزمائش پر ہی اپنے عقیدے سے توبہ کر کے سنی بن گئے تھے۔''

جلالتِ شان: اگرچہ آپؒ بے پناہ متواضع و منکسر المزاج تھے، مگر آپؒ کی جلالتِ شان اور قدرتی رعب کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے اُمراء اور رؤساء بھی آپؒ کی جلالتِ شان کے آگے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے، اور استغنا بھی اتنا تھا کہ اُمراء اور اغنیاء آپؒ کی زیارت کو آتے اور تحفے و تحائف پیش کرتے تو آپؒ باوجود تہی دست ہونے کے نہ صرف یہ کہ ان کا ہدیہ قبول نہیں کرتے تھے؛ بلکہ ان اُمراء کی مدارات اس طرح فرماتے کہ اُن کو آپؒ کے تہی دست ہونے کا احساس بھی نہ ہوتا، جیسا کہ ''آثارالصنادید'' میں سرسید احمد خانؒ لکھتے ہیں:

''باوجود اس کے کہ بسبب کثرتِ اخلاق کے کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ کرتے اور کسی کو نہ فرماتے کہ اِدھر بیٹھ یا اُدھر، لیکن من جانب اللہ لوگوں کے دل میں آپؒ کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ رؤسائے شہر جب آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے بسبب ادب کے دور دور خاموش بیٹھتے اور بدونِ آپؒ کی تحریک کے مجالِ سخن نہ پاتے اور ایک یا دو بات کے سوا یارا نہ دیکھتے کہ کچھ اور کلام کریں۔''

(آثارالصنادید/صفحہ:۵۷۴، الواح الصنادید:۱/۱۸۸)

وفات: آپؒ کی وفات چہار شنبہ/ ۱۹/ رجب/ ۱۲۳۰ھ میں ہوئی اور اپنے

والدؒ کے پاس دفن ہوئے، اس وقت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ حیات تھے، اس لیے قدرتی طور پر انہیں بہت صدمہ ہوا، وہ حضرات ان کے دفن کے وقت کہہ رہے تھے کہ ہم ایک انسان کو نہیں؛ بلکہ سراپائے علم وعرفان کو دفن کررہے ہیں۔ رحمهم الله رحمة واسعة۔

عجوبۂ قدرت: یہ عجائبِ زمانہ میں سے ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے چار صاحب زادے اِرادت خاتون بنت سید ثناء اللہ صاحبؒ سے تھے، جن میں بڑے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، پھر شاہ رفیع الدین صاحبؒ، پھر شاہ عبدالقادر صاحبؒ، پھر سب سے چھوٹے شاہ عبدالغنی صاحبؒ (مولانا محمد اسماعیلؒ کے والد) تھے، مگر سب سے پہلے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی وفات ہوئی، پھر ان کے بعد شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی، پھر شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی، پھر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی وفات ہوئی، یہ سب بھائی علم وعمل، افادہ اور فیض رسانی میں (شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے سوا، کیوں کہ ان کی وفات عنفوانِ شباب میں ہوگئی تھی) فضلائے زمانہ میں ممتاز تھے، شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے صاحب زادۂ گرامی قدر حضرت مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی توفیق عطا کی جس سے انہوں نے اپنے والد ماجد کی طرف سے پوری تلافی کر دی۔ (تاریخ دعوت وعزیمت: ۵/ ۳۸۷)

حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ متوفی ۱۲۰۳ھ

نام ونسب: نام شاہ عبدالغنی، آپ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سب سے چھوٹے صاحب زادے ہیں اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے والد ہیں۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۱۷۱ھ مطابق: ۱۷۵۷ء یا ۱۷۵۸ء کو دہلی میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت: حضرت شاہ ولی اللہؒ کی وفات کے وقت آپؒ کی عمر پانچ سال کی تھی، شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ درسیات کی تمام کتابیں اپنے بھائیوں سے پڑھی تھیں؛ مگر حدیث مسلسل بالاولیۃ کی اجازت اور سند خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے حاصل کی تھی۔ (شاہ ولی اللہ کے اجدادِ گرامی/صفحہ: ۱۳۰)

زہد وورع: حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ ذہانت، فطانت، زہد وورع اور صبر وقناعت میں بے نظیر تھے، اتباعِ سنت میں آپؒ کا قدم بہت آگے بڑھا ہوا تھا، وضع قطع اور لباس و پوشاک میں اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بے حد مشابہ تھے، آپؒ میں بہت سے اخلاق ایسے تھے جو کہ دوسروں میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔

علم وکمال: شاہ عبدالغنی صاحبؒ علم وفضل میں فخر روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ باطنی فیض میں بھی شہرتِ عام رکھتے تھے، آپؒ اکثر اوقات درس وتدریس، دعوت وارشاد اور طلبہ کی تربیت میں مصروف رہتے تھے۔

مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ کا شرفِ تلمذ: حضرت مفتی الٰہی بخشؒ نے جو ہندوستان کے جلیل القدر عالم دین اور فقیہ تھے، شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے رفیق وہم درس تھے، انہوں نے حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مسلسل بالاولیۃ کی اِجازت حاصل کی تھی، جیسا کہ مفتی صاحبؒ کی بیاض میں یاد داشت تحریر ہے:

"حديث مسلسل بالأولية: و هو أول ما سمعته من الحديث، حدّثنا الشيخ عبدالغني رحمه الله عن أبيه الشاه ولي الله المحدّث، و هو أول ما سمعته منه، وهو يروى عن السيد عمر بن الشيخ عبدالله البصري المكي۔" (حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اجدادِ گرامی اور اخلافِ کرام/صفحہ:۱۳۰)

ازدواج و نکاح: شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلویؒ کا نکاح مولوی علاءالدین پھلتی رحمۃ اللہ علیہ کی صاحب زادی بی بی فضیلت سے ہوا تھا، جن سے دو صاحب زادیاں رُقیہ اور اُم کلثوم اور ایک بلند اقبال وفخر زمانہ فرزند حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ تھے۔

شیخ محمد اکرامؒ لکھتے ہیں کہ "شاہ ولی اللہؒ کے چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنیؒ تھے، ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں، لیکن اگر وہ باقی بھائیوں کی طرح مشہور نہیں ہوئے تو ان کی کمی ان کے صاحب زادے شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ نے پوری کردی، جنہوں نے شاہ عبدالعزیزؒ سے شاہ ولی اللہؒ کا علم وفضل سیکھ کر جمہور میں عام کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کردیا۔"

(رودِکوثر/صفحہ:۵۹۷)

شاہ عبدالغنی محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادرؒ ہی کی طرح محدث، مفسر، فقیہ، معلم اور روحانی شخص تھے، لیکن افسوس! آپؒ کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی۔

وفات : آپؒ ۱۶ / رجب/ ۱۲۰۳ھ مطابق : ۱۲ / اپریل/ ۱۷۸۹ء کو ۲۸ سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے قریب ہی دہلی، مہدیان میں آسودۂ راحت ہیں۔ نوراللہ مرقدہٗ۔

(الواح الصنادید: ۱ / ۱۹۲)

حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید دہلویؒ متوفی ۱۲۳۶ھ

نام ونسب : نام محمد اسماعیل، والد کا نام مولانا شاہ عبدالغنی ابن حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہے،آپؒ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ،شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ کے نامور اور محبوب بھتیجے اور مایۂ ناز شاگرد ہیں۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۱۹۳ھ کو دہلی میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت: آپؒ کے والد حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ کا انتقال آپؒ کی کم عمری میں ہو چکا تھا، اس لیے آپؒ اپنے چچا شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی تربیت میں رہے اور ان سے تعلیم حاصل کرتے رہے،ساتھ ہی اپنے دونوں چچا شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ رفیع الدین دہلویؒ سے بھی فیض یاب ہوتے رہے، اس طرح یہ فن منقول ومعقول میں بحر ذخار بن گئے۔(نزہۃ الخواطر:۷/ ۱۲۵)

فضل وکمال: آپؒ نے گہوارۂ علم وفضل میں آنکھیں کھولیں اس وقت آپؒ کے خاندان کا سکّہ پورے ہندوستان میں رائج تھا، آپؒ ان اولوالعزم، عالی ہمت، ذکی، جری اور غیر معمولی افراد میں سے ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ آپؒ اپنی ممتاز صلاحیتوں، مجتہدانہ دماغ اور غیر معمولی ذکاوت وذہانت کی وجہ سے اپنے خاندان میں بہت جلد ممتاز ہو گئے،معقول ومنقول اور تقریر وتحریر میں آپؒ کی امامت مسلم ہے،جس کی شہادت آپؒ کی بے نظیر

کتابیں: ''منصب امامت''عقبات''اور''تقویۃ الایمان''دیتی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو غیر معمولی دینی غیرت و اسلامی حمیت سے نوازا تھا اور آپؒ کے اندر دعوت و تبلیغ کا بے پناہ جذبہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلیقہ اور کتاب و سنت سے استدلال کی بے نظیر صلاحیت واستعداد پیدا فرمائی تھی۔

ان فنون (سپہ گری، شہسواری اور تیر اندازی وغیرہ) میں بھی آپؒ کے کمالاتِ علمی ودماغی کم نہیں تھے، سرحدی جنگوں میں آپؒ کی مردانگی اور پختگی کے جوہر کھلے اور معلوم ہوا کہ یہ شخص مفسر ومحدث اور فقیہ وصوفی ہونے کے ساتھ ساتھ کتنا بڑا جرنیل اور کتنا ہی بہتر سپاہی ہے، چنانچہ آپؒ لشکر مجاہدین کے سپہ سالار تھے۔

آپؒ سید احمد شہیدؒ کی خدمت میں: غایت مناسبت اور باطنی موافقت کی بنا پر بجائے اپنے بڑے والد شاہ عبدالعزیزؒ کے حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ سے بیعت ہوئے، اور یہ بیعت محض رسمی نہ تھی؛ بلکہ بیعت کے بعد آپؒ کا حال یہ تھا کہ سید صاحبؒ کی جوتیاں اُٹھاتے، پالکی کے پیچھے پیدل چلتے، رِکاب تھامتے، شکار بند پکڑ کر چلتے، بلکہ رائے بریلی کے قیام سے لے کر بالاکوٹ کی شہادت تک آپؒ کا یہی طور وطریقہ رہا، مولوی عبداللہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ بالاکوٹ میں مولوی محمد اسماعیلؒ نے حضرت سید صاحبؒ سے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت چاہی، حضرت سید صاحبؒ نے فرمایا: ''اس لڑائی میں ہماری فتح نہیں ہے، آپ نہ جایئے، آپ کے جہادِ لسانی سے بندگانِ خدا کو بہت

فائدہ پہنچے گا۔'' مولوی صاحبؒ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ ''حضرت! یہ سر تصدق کرنے کو لایا ہوں، آپ مجھ کو اجازت ہی دے دیجیے۔'' سید صاحب خاموش ہو گئے، آپ میدانِ جنگ میں کود ے اور ایک گولی انگوٹھے پر لگی، سید صاحبؒ نے اپنی بات دہرائی، لیکن باصرار اجازت چاہی اور تشریف لے گئے، مجھے یاد ہے کہ سید صاحبؒ نے تین مرتبہ روکا، آخر کو مولانا اسماعیل صاحبؒ کی پیشانی پر ایک زخم کاری لگا اور بروزِ جمعہ ۱۲۴۶ھ میں آپ شہید ہو گئے۔ رحمہ اللّٰہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم　　سو اس عہد کو ہم وفا کر چکے

مقالاتِ حکمت: آپؒ اللہ تعالیٰ کے ارشاد {اُدْعُ إِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ} (یعنی آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ بلایئے) پر پورے طور پر کاربند تھے۔

آپؒ کی جرأتِ ایمانی کا واقعہ: چنانچہ ایک روز آپؒ دہلی میں جامع مسجد کے حوض پر بیٹھے وعظ فرما رہے تھے، اتنے میں تبرکات نکلے اور لوگ ان کے ساتھ بہت زور و شور سے نعت پڑھتے ہوئے آئے، مگر مولاناؒ نے التفات نہ فرمایا اور برابر وعظ کہتے رہے، یہ بات لوگوں کو ناگوار ہوئی، یہاں تک کہ بادشاہ اکبر ثانی کو اس کی شکایت پہنچی، بادشاہ نے مولاناؒ کو بلوایا اور ان سے واقعہ دریافت کیا، مولاناؒ نے واقعہ بیان کیا اور فرمایا کہ یہ تبرکات مصنوعی ہیں اور ان کی تعظیم ہمارے ذمہ نہیں ہے، بادشاہ نے تیز لہجہ میں کہا کہ عجب بات ہے کہ آپ مصنوعی کہتے ہیں، مولاناؒ نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں کہا: ''میں تو کہتا ہی ہوں اور

آپ اس کو مصنوعی سمجھتے بھی ہیں اور معاملہ بھی ان کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں'' اکبرشاہ نے تعجب سے پوچھا کہ ''یہ کیسے؟'' مولاناؒ نے فرمایا کہ ''اس کا ثبوت یہ ہے کہ سال بھر میں دو دفعہ وہ تبرکات آپ کی زیارت کے لیے آتے ہیں اور آپ ایک دفعہ بھی اس کی زیارت کے لیے نہیں جاتے'' یہ سن کر اکبرشاہ چپ ہورہے، پھر آپؒ نے کسی سے کہا: ''ذرا قرآن شریف اور بخاری لاؤ'' آپؒ نے ان کو ہاتھ میں رکھ کر واپس کردیا، اس کے بعد فرمایا کہ ''ان تبرکات میں اول تو یہی کلام ہے کہ وہ مصنوعی ہیں یا اصلی؟ لیکن اگر ان کو اصلی مان بھی لیا جائے تب بھی اکثر تبرکات جیسے چادر اور قدم وغیرہ ایسے ہیں جن میں کوئی شرفِ ذاتی نہیں؛ بلکہ ان میں محض تلبّسی شرف آیا ہے، لیکن قرآن کے شرف ہونے میں کسی کو شبہ نہیں، اسی طرح بخاری شریف بھی قریب قریب بالاتفاق اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، اس لیے اس کا بھی کلامِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونا ناقابل انکار ہے، اور کلام اللہ اور کلام رسول کا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اوڑھی ہوئی چادر وغیرہ سے اشرف ہونے میں بھی کسی کو کلام نہیں ہوسکتا، مگر باوجود ان تمام ناقابل انکار باتوں کے کلام اللہ اور کلامِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے سامنے آیا، مگر آپ نے کوئی تعظیم نہ کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرات تبرکات کی تعظیم ان کے شرف کی وجہ سے نہیں کرتے؛ بلکہ محض ایک رسم پرستی ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

ایک سبق آموز واقعہ: اس قسم کا ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمایئے اور آپؒ کی موعظت وحکمت کی داد دیجیے!

آپؒ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام کے کونڈوں کو منع فرمایا کرتے

تھے، شاہی خاندان کی ایک بڑی بی بڑی تُند خو تھیں، ان سے لوگوں نے جا کر کہا، اُنھوں نے حضرت شہیدؒ کو بلا کر کہا: ''بیٹا! ہم نے سنا ہے کہ تم بی بی فاطمہؓ کے کونڈوں کو منع کرتے ہو'' حضرت شہیدؒ نے فرمایا: ''میری کیا مجال کہ حضرت بی بی صاحبہؓ کے کونڈوں کو منع کروں، میں نے منع نہیں کیا، کسی نے آپ سے غلط کہا؛ بلکہ بی بی صاحبہؓ کے ابا جان منع کرتے ہیں'' کہنے لگیں: ''کس طرح؟'' مولاناؒ نے کہا: ''كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔'' اور اسی پر ایسی تقریر کی کہ بڑی بی نے اس بری رسم سے ہمیشہ ہمیش کے لیے توبہ کر لی۔

جذبۂ دعوت وتبلیغ: مولاناؒ کے اندر دعوت الی اللہ کا بے پناہ جذبہ تھا، جس کی وجہ سے ان کو کسی کروٹ چین نہ آتا تھا جب تک کہ دعوت وتبلیغ کا کام نہ کر لیں۔

چنانچہ آپؒ کا مشہور واقعہ ملاحظہ فرمائیں، صاحب ''ذکر جلی'' مولوی حیدر علی رامپوری کی زبانی تحریر فرماتے ہیں:

''ایک روز مولوی محمد اسماعیل صاحبؒ مولوی شاہ عبدالعزیزؒ کے مدرسہ کے دروازہ پر کھڑے تھے، آپؒ نے دیکھا کہ بہت سی جوان اور خوبصورت عورتیں بلا پردہ چلی جارہی ہیں، مولوی صاحبؒ نے پوچھا کہ یہ کون عورتیں ہیں؟ اس شخص نے کہا کہ یہ سب کسبیاں (طوائف) ہیں، فلانی بڑی کسبی کے گھر کچھ تقریب ہے، وہاں جارہی ہیں، مولوی صاحبؒ نے دریافت کیا کہ کیا یہ مسلمان ہیں؟ اس شخص نے کہا کہ ہاں، مسلمان ہیں، تو مولاناؒ نے فرمایا کہ تب ہماری بہنیں ہیں، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے نہیں پوچھے گا کہ اس قدر مسلمان عورتیں بدکاری میں مبتلا تھیں، تم نے انہیں نصیحت نہیں کی؟ جب شام ہوئی تو مولانا صاحبؒ

درویشوں کا بھیس بدل کر اس کسبی کے مکان پر پہنچے اور صدا لگائی، ان چھوکریوں نے دروازہ پر آ کر پوچھا: کون ہے؟ آپؒ نے جواب دیا: فقیر ہے، کچھ صدا سنائے گا اور تماشا دِکھائے گا، وہ سمجھیں کہ کوئی تماشا گر فقیر ہے، دروازہ کھول کر اندر بلا لیا، مولانا صاحبؒ اندر تشریف لے گئے، دیکھا کہ بڑی بی بی صاحبہ بڑے تزک وشان سے مہمانوں کے ساتھ جشن کر رہی ہیں، مولاناؒ چوں کہ نامی گرامی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے باوجود بھیس بدلنے کے وہ پہچان گئیں اور مؤدب آ کر بیٹھ گئیں اور بولیں کہ حضرت! آپ نے کیوں تکلیف کی؟ مولانا نے فرمایا: گھبراؤ نہیں، میں کچھ صدا سنانے کو آیا ہوں، مولانا صاحبؒ نے قرآن شریف کھول کر ایسی خوش الحانی سے تلاوت کی کہ وہ سب لوٹ پوٹ ہو گئیں، پھر دنیا کی بے ثباتی بیان کی کہ یہاں نہ حسن و جوانی کو قیام ہے، نہ مال وزندگی کو، یہاں کی ہر چیز فانی اور زوال پذیر ہے، یہ بیان ایسا گرم ہوا کہ کسبیوں کی ہچکیاں بندھ گئیں، پھر توبہ کی فضیلت اور نکاح کی برکت نہایت خوبی سے بیان کی، نتیجہ یہ ہوا کہ جس قدر جوان عورتیں تھیں انہوں نے توبہ کر کے نکاح کر لیے، اور جو بوڑھی نائکہ وغیرہ تھیں انہوں نے محنت و مزدوری سے اپنی گذران شروع کر دی۔''

ارواحِ ثلاثہ میں قدرے فرق کے ساتھ یہ قصہ مذکور ہے، مگر مفہوم ایک ہی ہے، اخیر میں اتنا اضافہ ہے کہ جب مولاناؒ اس اہم کام سے فارغ ہو کر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر پہنچے ہیں تو میں نے (یعنی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ) مولاناؒ سے کہا کہ میاں اسماعیل! تمہارے دادا ایسے تھے اور تمہارے چچا ایسے تھے اور

تم ایسے خاندان کے ہو جس کے سلامی بادشاہ رہے ہیں، مگر تم نے اپنے آپ کو بہت ذلیل کرلیا، اتنی ذلت ٹھیک نہیں ہے، اس پر مولاناؒ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور حیرت سے میری طرف دیکھا اور کھڑے ہو گئے اور مجھ سے فرمایا کہ آپ نے یہ کیا فرمایا؟ آپ اس کو میری ذلت سمجھتے ہیں؟ یہ تو کچھ بھی نہیں، میں تو اس روز سمجھوں گا کہ آج میری عزت ہوئی ہے جس روز دلّی کے شہدے میرا منہ کالا کر کے اور گدھے پر سوار کر کے مجھے چاندنی چوک میں نکالیں گے اور میں کہتا ہوں گا کہ ''قال اللہ کذا و قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کذا۔'' (یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں فرمایا) یہ سن کر میری یہ حالت ہوئی کہ میں کہنے کو تو کہہ گیا، مگر مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا اور زبان بند ہو گئی اور اس کے بعد کبھی مجھے آنکھ ملا کر بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

ف: اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے اکابر نے اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے نہ عزت و آبرو کی پروا کی اور نہ جان کی۔ **فھنیأً لھم۔** (مرتب)

اقتباس از منصب امامت: حضرت شہیدؒ اپنی معرکہ آرا تصنیف ''منصب امامت'' میں امامت کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

امامت کی حقیقت: ''امام نائب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اور امامت ظلِ رسالت ہے، نائب کے احکام کی حقیقت منیب (اصل) کے احکام سے پہچاننی چاہیے اور سایہ کی حقیقت اصل کی حقیقت سے جاننی چاہیے۔ بنابریں اس مقام پر حضرات انبیاء علیہم السلام کے چنداں کمالات کا ذکر جن کا معنیٰ امامت میں دخل ہے لازم آیا، نظر برآں گذارش کرتا ہوں کہ مقاماتِ انبیاء اور کمالاتِ مرسلین اگرچہ بہت

زیادہ بلکہ حدشمار سے خارج ہیں اور ہم جیسے آدمیوں کے لیے جو آحادِ (افراد) امت سے ہیں ان کا اِحاطہ اور احصاء دشوار ہے، لیکن چند وہ کمالات کہ معنیٔ امامت کی تحقیق میں دخل رکھتے ہیں (جن کا مرجع وجاہت، ولایت، بعثت، ہدایت وسیاست ہے) پانچ تنبیہات میں بیان کیے جاتے ہیں۔''

مگر ہم یہاں اختصار کوملحوظ رکھتے ہوئے نمونہ کے طور پر صرف وجاہت کے معنیٰ کی نقل پر اکتفا کرتے ہیں، جس کو تفصیل مطلوب ہو اس کو اصل کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیے، واللہ ولی التوفیق۔ (مرتب)

(تنبیہِ اوّل) وجاہت کے بیان میں:

''باید دانست کہ انبیاء علیہم السلام را بحضورِ حضرتِ رحمان بہ نسبت جمیع افرادِ انسان نوعے از امتیاز ثابت است کہ بنگاہِ مہربانی منظور اند و بلطف ِ ربانی مسرور، و بمزیت انعام سرفراز اند و بمزید اکرام ممتاز، یاسمین چمن محبوبیت اند و اورنگ نشین انجمن مقبولیت، اخترانِ افلاکِ انس اند، افسرانِ املاکِ قدس اند، بہ تفویض مناصب عظیمہ لائق اند و در سرانجام مہماتِ فخیمہ

ترجمہ: جاننا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کو بحضورِ حضرت رحمان بہ نسبت جمیع افرادِ انسان ایک نوع کا امتیاز ثابت ہے کہ منظورِ نظرِ عنایاتِ خداوندِ ذو الجلال ہیں اور بہ لطف ربانی مسرور و خوش حال ہیں، بہ ازدیادِ انعام الٰہی ممتاز ہیں اور بہ ترقی اکرامِ نامتناہی سرفراز، محبوبیت کے چمن کے یاسمین ہیں اور مقبولیت کی انجمن کے اورنگ نشیں، انس کے افلاک کے اختر ہیں

فائق، سردارانِ محافل کرو بیاں اند وسران عساکر قدوسیاں، ہمت ایشاں مفتاحِ اغلاقِ ابواب است و دعاءِ ایشاں بلا ریب مستجاب، محب ایشاں محبوبِ حضرتِ رب الارباب است، ومبغضِ ایشاں مبغوضِ آں جناب، محبت ایشاں باعث رفع درجات است وتوسل ایشاں وسیلۂ نجات، انسلاک در سلک ایشاں جالب عطیات است وانہماک در اتباعِ ایشاں دافع بلیات، منبع فیضِ غیب اند، مخزنِ اسرار بلا ریب، ادنائے مساعیٔ متوسل ایشاں بغایت مشکوراست وقبح معاصی منبع ایشاں فی الحال مغفور، بسیار ریاضت شاقہ است کہ از مرتاضِ بے گانہ بہ نسبت ایشاں بظہور می رسد آخر بمشابہ ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' می شود، وبسا اعمال سہل

اور قدس کے افلاک کے سردفتر، مناصب عظیمہ کی تفویض ان ہی کی ذاتِ بابرکت کو زیبا ہے اور مہماتِ فخیمہ کا سرانجام ان ہی کے انفاسِ قدسیہ کے ساتھ خوش نما ہے، کرو بیاں کی محفل کے سردار ہیں اور قدوسیوں کے لشکر کے سربراہِ کار ہیں، ان کی ہمت اور اولو العزمی درہائے بستہ کی کلید ہے اور ان کی دعا بلا ریب مقبولِ بارگاہِ ربِ مجیب ہے، ان کا دوست محبوبِ حضرتِ رب الارباب ہے اور ان کا دشمن دشمن آں جناب ہے، ان کی محبت باعثِ ترقیٔ درجات ہے اور ان کا توسل وسیلۂ نجات ہے، ان کے سلسلہ سے منسلک ہو جانا جالب عطیات ہے اور ان کا اتباع دافع بلیات ہے، منبع فیض غیب ہیں، مخزنِ اسرارِ لا ریب ہیں، ان کے

است کہ از متوسل ایشاں سر برمی زند بلا ریب مثمر ثمراتِ جزیلہ در دنیا و آخرت می گردد، وتقرب الی اللہ بتوسل ایشاں شاہراہ است کہ سلوکِ آں بر راہِ نوردان طریق اطاعت بغایت سہل است وآسان، وبدونِ توسل ایشاں محض ہرزہ گردی ست بے سرو سامان۔ پس مراد از وجاہت ہمیں است کہ مذکور گردید۔" (منصب امامت/صفحہ:۴)

متوسلین کی ادنیٰ سی سعی بدرجۂ غایت مشکور ہے، ان کے متبعین کا بڑے سے بڑا گناہ فی الحال مغفور ہے، بہت سے ریاضاتِ شاقہ جو ان کے بیگانوں سے عمل میں آتے ہیں آخر کار "کوہ کندن وکاہ برآوردن" (پہاڑ کھودنا اور گھاس حاصل کرنا) کے مصداق کہلاتے ہیں، اور بہت سے آسان اور سہل اعمال جو کہ ان کے متوسلین کی ذات سے صدور پاتے ہیں وہ بلا ریب مثمر ثمراتِ نجاتِ دنیا و آخرت بن جاتے ہیں، بارگاہِ خداوندی کا قرب ان کے توسل سے وہ شاہراہ ہے جس کا طے کرنا سالکانِ طریقت پر نہایت سہل اور آسان ہے، اور بدون ان کے توسل کے محض ہرزہ گردی وکوچہ نوردی اور بے سرو سامانی ہے۔ پس مراد وجاہت سے یہی ہے جو مذکور ہوا۔

ف: پوری کتاب نہ سہی، اگر کوئی حسد وعناد کی عینک کو علیحدہ کر کے صرف مندرجہ بالا عبارت ہی کا مطالعہ کر لے تو ان شاء اللہ مولانا شہیدؒ کے علم ومعرفت اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ آپؒ کی محبت ونسبت کی بلاتوقف شہادت دے گا، مگر افسوس کہ حاسدین اور معاندین نے ان علمی وعملی کمالات اور دینی وملی خدمات کے باوجود کن کن برائیوں بلکہ بداعتقادیوں سے آپؒ کو متہم ومطعون کیا کہ اللہ کی پناہ، اس لیے مخدومِ مکرم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ''سیرتِ سید احمد شہیدؒ '' حصہ دوم میں نہایت دردِ دل وسوزِ جگر سے درد انگیز الفاظ میں حضرت شہیدؒ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے درج کرتا ہوں، ملاحظہ فرمائیں: (مرتب)

افسوس ناک اظہارِ حقیقت: ''مولاناؒ کی دوسری خصلتیں تو رہیں برطرف، ان کی شہادت مسلم ہے اور شہداء کی مغفرت مسلم، لیکن ۲۴/ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ سے لے کر آج تک کم وبیش ایک سو چھتیس سال کے عرصے میں شاید ہی کوئی ایسا دِن ہوا ہو جس کی صبح کو اس شہید اسلام کی تکفیر وتضلیل کا کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو، لعنت اور سب وشتم کا کوئی صیغہ نہ استعمال کیا گیا ہو، فقہ وفتاویٰ کی کوئی دلیل ایسی نہیں جو اس کے کفر کے ثبوت میں پیش نہ کی گئی ہو، وہ ابولہب اور ابوجہل سے زیادہ دشمن اسلام، خوارج ومرتدین سے زیادہ مارِق من الدین، خارج از اسلام، فرعون اور ہامان سے زیادہ مستحق نار، کفر وضلالت کا بانی، بے ادبوں اور گستاخوں کا پیشوا، شیخ نجدی کا مقلد بتایا گیا، یہ ان لوگوں نے کہا جن کے جسم نازک میں آج تک اللہ کے لیے ایک پھانس بھی نہیں چبھی، جن کے پیروں میں اللہ کے راستے میں کبھی کوئی کانٹا نہیں گڑا، جن کو (خون چھوڑ کر کہ اس کا ان کے یہاں کیا ذکر؟) اسلام

کی صحیح خدمت میں پسینے کا ایک قطرہ بہانے کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی، یہ ان لوگوں نے کہا جن کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزت وعصمت بچانے کے لیے اس نے سر کٹایا، کیا اس کا یہی گناہ تھا؟ اور کیا دنیا میں احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر نظیر مل سکتی ہے؟ جس وقت پنجاب میں مسلمانوں کا دین وایمان، جان ومال اور عزت وآبرو محفوظ نہ تھی، سکھ اپنے گھروں میں مسلمان عورتیں ڈال لیتے تھے، مساجد کی بے حرمتی ہورہی تھی اور ان کے گھوڑے باندھے جاتے تھے، اس وقت یہ غیرتِ ایمانی اور حمیت اسلام کے مدعی کہاں تھے؟''

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف آج کچھ درد میرے دل میں سِوا ہوتا ہے

(سیرتِ سید احمد شہیدؒ: ۲/ ۴۵۱)

تالیف تقویۃ الایمان کے اسباب: آپؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''تقویۃ الایمان'' پر مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے جو بصیرت افروز تعارف تحریر فرمایا ہے اس کو بصیرت کے لیے نقل کرتا ہوں:

''پیش نظر کتاب ''تقویۃ الایمان'' ایسی کتاب ہے جو توحید کی دعوت اور حقیقت توحید کو بے لاگ طریقہ پر بیان کرنے کا رمز وشعار بن گئی ہے، برصغیر ہندوستان میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب سے اتنی بڑی تعداد کو فائدہ پہنچایا جس کا شمار محال ہے، ان کی تعداد بلا شبہ (جیسا کہ بعض اہل نظر نے لکھا ہے) لاکھوں انسانوں تک پہنچتی ہے، جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی تھی دینی تعلیم یکسر نایاب نہ تھی؛ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی کثیر تعداد یہاں کی اکثریت کے خیالات، عادات، اطوار اور رسوم سے متأثر ہو چکی تھی، دوسری طرف جرأت مندانہ اور عام

فہم طریقہ پر دین خالص کی دعوت وتفہیم کی کوششیں اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہوگئی تھیں۔

اسی صورتِ حال کو دیکھ کر مصنف کتاب کا دِل زخمی اور پارہ پارہ ہوتا تھا، کتاب کی تاثیر ومقبولیت کو اسلام پر آنسو بہانے والی ان آنکھوں اوراس دین کو زندہ کرنے کی راہ میں بہائے جانے والے ان کے پاکیزہ خون اور مسلم معاشرہ کو جاہلیت کے اثرات سے پاک کرنے والی کوششوں اورایسی شرعی حکومت کے قیام کی (جو شریعت کی اساس پر ہو) ان کی ان کاوشوں نے بھی بڑھا دیا، مصنف کتابؒ نے دعوت کے ساتھ ساتھ دعاوانابت، الحاح وتضرّع، جہاد کے ساتھ کوشش وکاوش اوراعلانِ حق کے ساتھ راہِ حق میں جانِ عزیز تک جان آفریں کو پیش کردی، یہی توحید کی اصل روح، اخلاص کا منتہا، کمالِ صداقت اور تمغۂ وفاداری ہے، ایسے ہی وعدوں کے سچوں اورعہد کے پکوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ڮ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا } (الأحزاب: ۲۳)

مومنوں میں کتنے ہی شخص ایسے ہیں کہ جو اقرار انہوں نے اللہ سے کیا تھا اس کو سچ کر دِکھایا، توان میں بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کررہے ہیں اورانہوں نے (اپنے قول کو) ذرا بھی نہیں بدلا۔

اس کتاب کو وہ مقبولیت اور تاثیر حاصل ہوئی جو کبارِ مخلصین، علماءِ ربانیین اور تجدیدی کام کرنے والے داعیوں کی کتابوں کو حاصل ہوتی ہے۔''

کتاب کی قوتِ تاثیر کا سبب حقائق کو بے لاگ اور دوٹوک طریقہ پر

بیان کرنا اور معاشرہ میں پھیلے ہوئے امراض، مشرکانہ رسوم اور دین سے انحراف کی شکلوں کی نشان دہی ہے، جو دُکھتی رَگ پر ہاتھ رکھتی ہے، اخیر زمانہ میں مشائخ اور بزرگوں کی تقدیس و تعظیم میں مسلمان جس غلو، جہالت اور ہمسایہ اقوام کی نقل وتقلید کے جس فتنہ میں مبتلا ہو گئے تھے، کتاب ان ساری کمزوریوں کو خوب کھول کر بیان کرتی ہے، لوگوں کا یہ مزاج بن گیا تھا کہ وعظ وتقریر یا علمی مضامین میں شرک وتوحید کا جو اجمالی اور عمومی ذکر ہوتا تھا وہ خود کو اس کا مخاطب نہیں سمجھتے تھے، ضرورت تھی کہ ان کمزوریوں اور بیماریوں کو کھول کر بیان کیا جائے، جن میں یہ مبتلا تھے اور ان غلطیوں کی نشان دہی کی جائے جن کے وہ عادی ہو گئے تھے، ان شخصیتوں، جگہوں اور رسوم و رِواج کی حقیقت کو جن کو انہوں نے مقدس قرار دے رکھا تھا واضح کیا جائے، جب تک ایسا نہ کیا جائے گا سمجھیں گے کہ اس تردید وتنقید کا تعلق پرانے زمانے کے مشرکین اور زمانۂ جاہلیت کے لوگوں سے ہے۔

لیکن یہ واعظ و مضمون نگار جب ان کی زندگی کے اندر اُتر کر غلط باتوں کو بیان کرتا ہے اور ان کے غلط عقیدوں اور بیماریوں کی نشان دہی کرتا ہے، متعین طور پر ان فتنوں کو اس طرح بتاتا ہے کہ اس سے انکار کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے، تو وہ اس مقرر اور واعظ کے مخالف ہو جاتے ہیں اور کھلّم کھلاّ اس سے دشمنی کرنے لگتے ہیں، یہ خطرہ وہی داعی مول لے سکتا ہے جو مخلص ہو اور دعوت اس پر طاری ہو جائے، احساسِ فرض کا اس پر غلبہ ہو، اس کو قرآنِ کریم اور انبیاءِ کرام علیہم السلام کے طریق دعوت کا حقیقی لطف آنے لگے، پھر اس کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ لوگ پسند کریں گے یا ناراض وخفا ہوں گے، اس کو بس اس کی فکر دامن

گیر رہتی ہے کہ قرآن کا پیغام سنائے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرے، اپنے ضمیر کو مطمئن کرے اور ادائیگی فرض سے سبکدوش ہو۔

اس موقع پر ''تاریخ دعوت وعزیمت'' میں دوسری صدی ہجری کے شروع میں حضرت حسن بصریؒ کی قوتِ تاثیر اور اس وقت کے معاشرہ پر ان کے گہرے اثرات کے بارے میں جو کچھ راقم نے لکھا ہے اس کو نقل کرنا مناسب ہوگا، اس کا کیا راز تھا کہ اس وقت کا معاشرہ اس سے تجاہل نہیں برت سکا۔

''خواجہ حسن بصریؒ کی دعوت واصلاح کی طاقت وتاثیر میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ انہوں نے زندگی کا ایک سرا پکڑ لیا اور سوسائٹی کی اصل بیماری کی طرف توجہ کی، ان کے زمانہ میں بہت سے واعظ اور داعی تھے؛ لیکن اس زمانہ کے معاشرہ نے کسی کے وجود اور کسی کی دعوت کو اس طرح محسوس نہیں کیا جس طرح حسن بصریؒ کے وجود اور ان کی دعوت کو محسوس کیا، اس لیے کہ ان کی تقریروں اور ان کے درسوں سے اس بگڑے ہوئے معاشرہ پر زد پڑتی تھی، وہ نفاق کی حقیقت بیان کرتے تھے اور یہ نفاق ایک مرض تھا جو اس سوسائٹی میں پھیل رہا تھا، وہ منافقین کے اوصاف واخلاق بیان کرتے تھے اور یہ اوصاف واخلاق بہت سے لوگوں میں پائے جاتے تھے جو حکومت، فوج اور تجارت میں پیش پیش تھے اور زندگی میں نمایاں تھے، وہ آخرت فراموشی اور دنیا طلبی کے بحران کی مذمت کرتے تھے اور بکثرت لوگ اس وبا کا شکار تھے، وہ موت اور آخرت کی تصویر کھینچتے تھے اور ان حقیقتوں کو مستحضر کراتے تھے اور مترفین اور غافلین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کی زندگی ان چیزوں کے بھلائے رکھنے میں تھی۔

غرض ان کی دعوت، ان کے مواعظ اوران کے اصلاحی درس اس زمانے کی خواہشات واغراض سے اس طرح متصادم تھے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کے لیے ان سے غیر متعلق رہنا مشکل ہو گیا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ بکثرت لوگ ان کی تقریروں اور مجلسوں سے چوٹ کھا کر پچھلی زندگی سے تائب ہوتے تھے اور نئی زندگی اختیار کرتے تھے۔‘‘

کتاب میں جن رسوم وعادات اور مقامات کا تذکرہ آتا ہے ان کی تشریح کردی گئی ہے، اس لیے کہ مرورِ زمانہ اور بُعدِ مکانی کی وجہ سے اس عہد اور نسل کے اکثر لوگ ان سے ناواقف ہیں۔

ہم نے بعض دیگر علماءِ کرام اور ائمۂ عظام کی وہ عبارتیں بھی نقل کردی ہیں جن سے اس کتاب میں مندرج بعض ان عبارتوں اور اندازِ بیان کی تائید ہوتی ہے، جن کے بارے میں بعض حلقوں کی طرف سے سخت اعتراض اور مخالفت کی آواز بلند ہوئی اور فتوے بھی جاری ہوئے، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ زمانۂ ماضی کی مستند اور متفق علیہ شخصیتوں نے بھی اس میں صاف بیانی سے کام لیا۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ اور دینی اصلاح وتجدید کی تحریکوں اور کوششوں سے واقفیت رکھنے والے اصحابِ نظر واہل علم کو معلوم ہے کہ ہندوستان کی پچھلی صدیوں میں قرآن مجید کی تعلیم وتفہیم (عربی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر اور معقولات وفنون کی تعلیم وتدریس کے غلبہ کی وجہ سے) اور حدیث کی کتابوں کی تعلیم وتدریس میں سخت انحطاط آ گیا تھا، پھر وہ وقت آیا کہ اللہ تعالیٰ نے کھل کر دین وعقیدہ کی دعوت دینے، حق وباطل میں فرق کرنے اور مغز وپوست میں تمیز

پیدا کرنے کے لیے کچھ مخلص علماءِ دین اور مصلح داعیوں کو کھڑا کیا، جن میں سب سے پیش پیش امامِ ربانی مجددِ الف ثانی حضرت شیخ احمد بن عبدالاحد سرہندیؒ اور اُن کے خلفاء تھے، ان کے بعد حکیم الاسلام شاہ ولی اللہؒ (بن شاہ عبدالرحیم دہلویؒ) اور ان کا خاندان تھا، پھر وہ علماءِ کبار، فقہاء اور محدثین بھی اس قافلہ میں شامل ہوئے جنہوں نے اس خاندان سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔

یہ وہ اسباب و محرکات تھے جنہوں نے مؤلف کتاب کو جو خالص ہندوستانی ماحول اور اس تہذیب کے مرکز میں پلے بڑھے تھے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ذکاوتِ حس اور صاف گوئی سے کام لیں اور دین کی بات پوری قوت کے ساتھ پیش کریں، کسی کی تنقید و ملامت اور خواص و عوام کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہ کریں، اگر ان کی زندگی وفا کرتی اور ان کو ہندوستان میں رہنے اور دعوت دینے کا موقع ملتا تو وہ یہ کام تدریجاً انجام دیتے اور آہستہ آہستہ ذہنوں کو تیار کرتے اور مناسب خوراک دیتے؛ لیکن وہ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور تھے، راہِ خدا میں جہاد و شہادت کا حُدی خواں شوق آ گیں آواز میں انہیں آواز دے رہا تھا، لہٰذا اتمامِ حجت اور ادائیگیٔ فرض کے احساس نے ان سے یہ کتاب لکھوائی اور انہوں نے اپنے پیچھے یہ یادگار چھوڑی کہ اس کے ذریعہ لوگ حق کی طرف لوٹیں۔'' (پیش لفظ تقویۃ الایمان:۹)

شہادت : آپؒ کی شہادت مشہدِ بالاکوٹ میں ۲۴ / ذوالقعدہ/ ۱۲۳۶ھ کو ہوئی، -نوّر اللہ مرقدہٗ- اور وہیں مدفون ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب دہلویؒ متوفی ۱۲۸۲ھ

نام ونسب: نام محمد یعقوب، والد کا نام شاہ محمد افضل ہے، آپؒ شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نواسہ ہیں۔

ولادت: ماہِ ذی الحجہ/ ۱۲۰۰ھ کو دہلی میں آپؒ کی ولادت ہوئی۔

تعلیم وتربیت: آپؒ اپنے نانا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ذوقِ خاص اور علومِ دینیہ کی نشر واشاعت میں آپؒ کے جانشین تھے، شرحِ جامی کے تین سبق شاہ عبدالعزیزؒ سے پڑھے، شاہ صاحبؒ نے ٹہلتے ہوئے ان کو جلالین بھی پڑھا دی تھی، باقی کتبِ درسیہ شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے پاس پڑھیں، حدیث کی سند شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے عنایت فرمائی۔ آپؒ نے دہلی میں ایک مدت تک درس وافادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ **فجزاهم الله أحسن الجزاء۔**

ہجرتِ مکہ: آپؒ نے ۱۲۵۸ھ میں اپنے بڑے بھائی شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے ساتھ مکہ مکرّمہ کی طرف ہجرت فرمائی اور وہیں متوطن ہوگئے۔

آپؒ سے نواب صدیق حسن خان قنوجی والئ بھوپال اور حضرت مولانا سید خواجہ احمد حسنی نصیر آبادیؒ اور ایک جم غفیر نے استفادہ کیا ہے۔

وفات: بروزِ جمعہ ۲۷/ ذوالقعدہ/ ۱۲۸۲ھ مکہ معظّمہ میں آپؒ کا انتقال ہوا، -إنا لله وإنا إليه راجعون- اور جنۃ المعلیٰ میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ونوّر مرقدہٗ۔ (تاریخ دعوت وعزیمت: ۵/ ۳۸۰)

حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ متوفی ۱۲۶۲ھ

نام ونسب : نام شاہ محمد اسحاقؒ، والد کا نام شاہ محمد افضلؒ ہے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے نواسے ہیں۔

ولادت : آپؒ کی ولادت ۸ / ذی الحجہ/ ۱۱۹۶ھ مطابق : ۱۷۸۱ء اور ایک روایت کے مطابق ۸ / ذی الحجہ/ ۱۱۹۷ھ مطابق : ۱۷۸۲ء کو دہلی میں ہوئی، آپؒ نسباً فاروقی ہیں۔

تعلیم وتربیت : آپؒ نے کتب صرف اور کافیہ تک علم نحو کی کتابیں حضرت مولانا عبدالحی بڑھانویؒ سے پڑھیں، باقی درسی کتابوں کی تکمیل حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے حلقۂ درس میں کی، علم حدیث کے لیے ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد حدیث کی سند اُن سے لی۔

راہِ سلوک : آپؒ نے سلوک کے منازل حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی خدمت میں رہ کر طے کیے اور ان ہی سے اجازت وخلافت حاصل کی اور آپؒ کے جانشین ہوئے۔

درس وتدریس : حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اپنی زندگی ہی میں آپؒ کو تدریس علم حدیث پر مامور فرما دیا تھا، چنانچہ پورے بیس سال آپؒ نے شاہ صاحبؒ کے سامنے اور ان کی نگرانی میں یہ اہم خدمت انجام دی، آپؒ نے

۱۲۴۰ھ میں ارضِ حجاز کا عزم کیا اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی، بعد ازاں اپنے وطن ہندوستان کو مراجعت فرمائی اور پہلے کی طرح دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی مسند درسِ حدیث پر رونق افروز ہوئے، حج سے واپسی کے بعد پورے سولہ سال تک یہ عظیم الشان خدمت انجام دیتے رہے، پھر ۱۲۵۸ھ میں اپنے بڑے بھائی حضرت مولانا محمد یعقوبؒ و دیگر افرادِ خانہ کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظّمہ کے لیے رخت سفر باندھا اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کر لی، آپؒ کے تلامذہ میں حضرت مولانا محمد یعقوبؒ، حضرت مولانا نذیر حسن دہلویؒ، حضرت مولانا شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادیؒ، قاری عبدالرحمن پانی پتیؒ اور حضرت مولانا عبدالغنی مجددی دہلویؒ جیسے نامور علماء شامل ہیں۔

آپؒ کا علمی کارنامہ: آپؒ کے علمی کارناموں میں ''مأتہ مسائل'' ''مسائل اربعین'' اور ''تذکرۃ الصوم'' مشہور و معروف ہیں۔

(تذکرۂ اکابر/صفحہ:۴۱)

فضل و کمال: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ''تاریخ دعوت وعزیمت'' میں تحریر فرمایا ہے کہ آپؒ حجاز مقدس میں حدیث کی تدریسی خدمت میں سرتاپا غرق و منہمک رہے اور ہندوستان کے صدہا علماء نے آپؒ سے حدیث کا درس لیا اور بڑے بڑے علماء اور اساتذۂ حدیث نے مختلف بلاد و امصار سے آ کر آپؒ سے استفادہ کیا اور حدیث کی سند لی، جن میں شیخ عبداللہ سراج مکیؒ اور دوسرے کبارِ علماء شامل ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا

کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شاہ اسماعیلؒ (بھتیجا) اور شاہ محمد اسحاقؒ (نواسہ) کی شکل میں دوقوتِ بازو اور عصائے پیری عطا فرمائے اور اکثر یہ آیت پڑھتے:

{اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ}

(إبراهيم: ٣٩)

وفات: ماہِ رجب المرجب ۱۲۶۲ھ مطابق: ۱۸۴۵ء میں مکہ معظّمہ میں آپؒ کا انتقال ہوا، جنۃ المعلیٰ مکہ میں مدفون ہیں۔ نور اللہ مرقدہٗ۔

(تاریخ دعوت وعزیمت: ۵/ ۳۸۰)

مولانا شاہ اسد اللہ قادری برہان پوریؒ متوفی ۱۲۰۵ھ

نام ونسب : شاہ اسد اللہ بن شاہ فتح محمد بن شاہ ولی اللہ بن شاہ فرید الدین گنج معرفت بن شاہ درویش محمد چشتی بن شاہ عبد الحکیم ابو المعالی بن شاہ بہاء الدین باجن علیہ الرحمۃ۔آپؒ اپنے والد ماجدؒ کے مرید وخلیفہ تھے،آپؒ کا اصلی وطن برہان پور ہے۔

تعلیم وتربیت : آپؒ کے خاندان میں چشتیہ سلسلہ سات پشت سے نسلاً بعد نسلٍ جاری تھا،آپؒ کے والد ماجدؒ طریقۂ قادریہ شطاریہ میں حضرت شاہ برہان الدین رازِ الٰہی کے مرید ہوئے،آپؒ اوائل عمر سے علم دوست تھے اور مشائخ کی صحبت میں رہتے تھے، ہر ایک مقام سے فیض یاب ہوتے تھے، والد ماجدؒ کے مرید وخلیفہ ہوئے، خادمانہ و طالبانہ والد کی خدمت میں حاضر وکمربستہ رہتے تھے،علی الصباح ہمیشہ حضرتؒ کو وضو کراتے تھے،ایامِ سرما میں ہر وقت پانی گرم رکھتے تھے،جب آپؒ کی عمر بیس برس کی ہوئی تب آپؒ کے والد فوت ہوئے،نہایت غمگین ہوئے،مزار شریف کی مجاوری اختیار کی، دن کو روزہ رکھتے تھے اور شام کو افطار کے بعد ایک آبخورہ پانی اور قدرے غذا تناول فرماتے تھے،اسی طرح آپؒ نے دو چلے بسر کیے۔

بیعت واجازت : پھر آپؒ کو عالمِ رویا میں والد ماجدؒ سے بشارت ہوئی کہ آپ کا حصہ مخدوم شاہ محمد قادریؒ کی خدمت میں ہے، آپؒ علی الصباح ملک ارکاٹ قصبۂ میلاپور میں جو مخدوم صاحبؒ کی سکونت گاہ تھا روانہ ہوئے،اور مخدوم صاحب کو حضرت محبوبِ سبحانیؒ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ اسد اللہ نامی شخص آپ کی خدمت میں آرہا ہے، جو کچھ نعمت آپ کے پاس ہے اس کو عنایت کیجیے، یہاں

مخدوم صاحبؒ آپؒ کے منتظر تھے، آپؒ مخدوم صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے، دیکھتے ہی مخدوم صاحبؒ نے پہچان لیا، استقبال فرمایا، پھر آپؒ نے اسداللہ صاحبؒ کو ازسرنو بیعت میں لیا اور خلافت کا خرقہ عطا فرمایا، اور اپنے فرزندوں کو وصیت کی کہ اگر تم کو شوقِ الٰہی ہو تو میاں اسداللہ سے طلب کرو، مخدوم صاحبؒ کے دو صاحب زادے مسمّٰی ناصر صاحب و احمد صاحب دونوں اسداللہ صاحبؒ کے مرید و خلیفہ ہوئے، پھر اسداللہ صاحبؒ نے برہان پور کی جانب مراجعت فرمائی۔

''انوار الاخیار'' کے مؤلف نے لکھا ہے کہ اسداللہ صاحبؒ قطبِ زمانہ تھے، جب شہر میں کفار کی حکومت قائم ہوئی تب برہان پور سے حیدرآباد میں آئے، یہاں دوسری شادی کی اور شہر میں سکونت اختیار کی۔

علمِ تصوّف میں کمال: جناب السید غلام علی الموسوی القادریؒ نے ''مشکوٰۃ النبوۃ'' میں لکھا ہے کہ میں حضرتؒ کی خدمت میں چار سال تک رہا، علم تصوّف میں آپؒ سے چند کتابیں پڑھیں، آپؒ تصوّف وتعرف میں کامل تھے، حقائق و دقائق کے عارف تھے، ایک ہندو لڑکے نے آپؒ سے مثنوی پڑھی، عقائد باطلہ سے منحرف ہوا اور دائرۂ اسلام میں داخل ہوا، شہر میں اکثر علماء وفضلاء آپؒ سے تصوّف میں سند لیتے تھے، صاحب تصانیف تھے، مثنوی وغیرہ کتب کی شروح اور سوانح لکھی ہیں، مگر فی زمانناناد رالوجود ہیں۔

وفات: آپؒ کی وفات ۲۸ / جمادیٰ الاولیٰ/ ۱۲۰۵ھ میں ہوئی، اور آپؒ اندرونِ شہر حیدرآباد محلہ حسینی علم کی مسجد کے صحن میں مدفون ہوئے، جو زیارت گاہِ عوام وخواص ہے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔ (محبوب التواریخ:۱/ ۹۹)

حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ بلگرامی ثم زَبیدیؒ متوفی ۱۲۰۵ھ

(مؤلف: تاج العروس، اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء العلوم للغزالی [۱])

نام ونسب: نام سید محمد مرتضیٰ، کنیت ابوالفیض، لقب محی الدین یا محب الدین ہے، والد کا نام محمد حسینی ہے، دادا کا نام سید قادری ہے، جو سیر وسلوک، تصوّف وحقائق میں شیخ کامل تھے، فقہ وتفسیر اور حدیث میں بھی بلند مقام رکھتے تھے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۱۴۵ھ مطابق: ۱۸۳۲ء میں قصبہ بلگرام ضلع قنوج یوپی میں ہوئی، آپؒ کو یمن کے مشہور قصبہ زَبید کی طرف نسبت کرتے ہوئے زَبیدی کہا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپؒ کی ولادت بلگرام میں ہوئی، متعدد سال زَبید میں بغرض تحصیل علوم گزارے، اس لیے ''زَبیدی'' سے مشہور ہوئے۔

تعلیم وتعلم: کئی کتابوں میں اسی بات کی صراحت ملتی ہے کہ سید مرتضیٰ بلگرامی زَبیدیؒ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، اور بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ اپنے شہر کے معروف اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد سندیلہ اور خیر آباد میں آکر وہاں کے اساتذہ سے پڑھا۔

مقبول احمد صمدانیؒ بھی اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ ''ابتدائی تربیت وتعلیم کے مدارج وطن میں طے ہوئے۔'' صاحب برنامجہ نے تین سوشیوخ واساتذہ

---

[۱] الحمدللہ یہ دونوں معرکہ آرا کتابیں اس حقیر کے کتب خانہ دارالمعارف الاسلامیہ الہ آباد میں دستیاب ہیں۔

کے نام تحریر کیے ہیں جن سے سید مرتضیٰ نے استفادہ کیا تھا، محدث علامہ محمد فاخر بن یحيٰ الہ آبادی المتخلص بہ زائر اور شیخ ولی اللہ دہلویؒ صاحب حجۃ اللہ البالغہ اور مولوی خیر الدین سورتیؒ کے نامِ نامی ان میں ممتاز ہیں، خانوادۂ قادریہ میں سید یٰسین حمویؒ کے مرید تھے، شیخ جعفر علوی مدنیؒ سے بھی سندِ اجازت پائی تھی، یہ بزرگ دمشق سے ہندوستان آئے تھے۔

بغرضِ علم الہ آباد و دہلی آمد : سید مرتضیٰ بلگرامیؒ کے تعلیمی سفر سے متعلق سید سلیمان ندویؒ اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں:

''سید مرتضیٰؒ نے وطن کو خیر باد کہا، اور شروع شروع میں الہ آباد پہنچے، یہاں اس وقت مولانا فاخر الہ آبادیؒ المتخلص بہ زائر کے درس وتدریس کا طوطی بول رہا تھا، کچھ دن ان سے پڑھتے رہے۔''

''الہ آباد کے بعد وہ دہلی پہنچے، دلّی اس زمانہ میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی دلّی تھی، حکیم الہندؒ کے درس میں تحقیق وتدقیق کا دریا موجیں مار رہا تھا، سید مرتضیٰؒ زانوئے تلمذ تہہ کر کے بیٹھ گئے، اپنی ایک یادداشت میں نہایت جوش ومسرت کے ساتھ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر کیا ہے، صحیح طور پر اگرچہ یہ معلوم نہیں ہے کہ دہلی کے علمی حلقہ میں سید علامہؒ کب تک رہے، تاہم ان کی تالیفات میں جو تحقیق وجامعیت کا رنگ پایا جاتا ہے اس میں ولی اللّٰہی مذاق کا بہت کچھ دخل ہے۔''

سفرِ حج : ابھی عنفوانِ شباب ہی تھا کہ حج کا شوق مستولی ہوا اور نوعمری میں حجاز کے لیے روانہ ہوئے، چنانچہ مولانا صدیق حسن خانؒ نے لکھا ہے کہ آپؒ

سنہ ۱۱۶۴ھ میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔

سفر یمن: دیگر مؤلفین و مصنفین نے بھی سید مرتضیٰ زبیدیؒ کے یمن جانے اور وہاں علم حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے، مقبول احمد صمدانیؒ لکھتے ہیں:

''علم کا شوق بلکہ عشق سید مرتضیؒ کو وطن سے یمن لے گیا، وہ مقام زَبید (بفتح الزائ) میں عرصہ تک رہے، جو یمن میں ساحل مغرب کے قریب ایک مشہور اور قدیم شہر ہے، وہاں اتنی مدت گزار دی کہ خود ''زَبیدی'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

بیعت و اجازت: آپؒ زَبید سے مکہ مکرمہ بہ ارادۂ حج آئے ہوئے تھے کہ عیدروسی طریقہ کے ایک ''حبیب'' سید عبدالرحمن بن مصطفی العیدروسیؒ کی زیارت نصیب ہوئی، اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ سید محمد مرتضیٰ بلگرامی نے ان میں کیا دیکھا کہ بلگرام، الٰہ آباد، دہلی اور زَبید کی گلیوں میں گھوم گھوم کر جو سرمایہ اتنی طویل مدت میں جمع کیا تھا اس کو اس عیدروسی درویش کے قدموں پر نثار کر دیا۔

چنانچہ شیخ عبدالرحمن العیدروسیؒ سے مختصر السعد پڑھی، اور ان کے ساتھ ہر وقت رہنے لگے، شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو خرقہ پہنایا اور اپنی مرویات و مسموعات کی اجازت دی، وہ فرماتے ہیں کہ شیخ عبدالرحمنؒ نے مصر کے علماء، ادباء اور وہاں کے مشاہدات اور اچھی تاریخی یادگاروں کا ذکر کر کے مجھے وہاں جانے کا شوق دلایا، تو میرا اشتیاق بڑھ گیا۔

چنانچہ سید سلیمان ندویؒ اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں:

''میں کہہ چکا ہوں کہ سید علامہؒ پر بیعت کے بعد دوسرا رنگ چڑھ گیا تھا،

وہ اپنی مرضی اور ارادہ سے دست بردار ہو چکے تھے، اب ان کی ہر جنبش اور ہر سکون پیر کے اشارۂ چشم کے ساتھ وابستہ تھا۔"

سفرِ مصر: "تاج العروس" کے خاتمہ نگار کا بیان ہے کہ سید مرتضیٰؒ اپنے پیر کے حکم وترغیب سے بجائے ہندوستان کے جوان کا وطن تھا عرب سے سیدھے مصر کی طرف روانہ ہوئے، مصر آنے کے وقت ان کی عمر بائیس سال تھی، وہ ۹/صفر/۱۱۶۷ھ میں قاہرہ پہنچے، اور ایک زمانہ تک خان الصاغہ کی سرائے ان کی قیام گاہ تھی، درویش پیر نے اپنے مرید مخلص کو مصر کس لیے بھیجا تھا اس کو کون جان سکتا ہے؟ لیکن سید مرتضیٰؒ نے اپنے اس قیام کو غنیمت خیال کیا، اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے مجھ پر جو احسانات ہیں ان میں ایک بڑا احسان یہ ہے کہ میں جب مصر پہنچا تو بے کار پڑا نہ رہا، بلکہ فرصت نکال کر میں یہاں بھی طلبِ علم میں منہمک رہا، اور اس کے رموز واسرار کے حل میں مصروف ہو گیا۔"

بہر حال اب سید علامہؒ نے کسی خاص مقام پر جم کر کام کرنے کا ارادہ کیا، ان کے پیر ومرشد کا حکم مصر میں رہنے کا تھا، پھر وہ مصر کے سوا کہاں جاتے؟ مصر ہی میں مقیم ہو کر تعلیم وتدریس اور افادہ واستفادہ میں مصروف ہو گئے، مسندِ ارشاد وتلقین کو زینت بخشی، اور اخیر وقت تک مسندِ درس پر متمکن رہے۔

اس شہر میں آپؒ "شیخ الشیوخ محدث" کے خطاب سے شہرت رکھتے تھے، وہاں کے لوگ ان کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے، جب ان کی شہرت خوب پھیل گئی تو بہت سے لوگ قریب شہروں اور قصبات سے ان کے پاس پہنچنے

لگے، قیمتی ہدایا پیش کرنے لگے، آپؒ کا حال اچھا ہو گیا، لباسِ فاخرہ زیب تن کرنے لگے، سواری کے گھوڑے خرید لیے، آپؒ دُبلے پتلے سُرخ وسفید رنگت کے تھے، متناسب الاعضاء، حجازی پوشاک علماءِ ازہر کی پوشاک کے خلاف پہنتے تھے، ان کی پوشاک کی ندرت وغرابت بھی لوگوں کے ان کی طرف متوجہ ہونے کا ایک سبب تھی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں کہ ''آپؒ لباس عمدہ پہنتے تھے، اچھے لباس کے وہ بہت شوقین تھے، بدن پر ہمیشہ صاف ستھرا جامہ ہوتا تھا، انہیں ادبی اور علمی لطائف بکثرت یاد تھے، برجستہ جواب دینے اور برمحل گفتگو کرنے میں ماہر تھے، عقلِ رسا پائی تھی، معلومات کا دائرہ وسیع تھا، ترکی اور فارسی زبان سے واقف تھے، اکابر اور رؤساء کے اس محلے کے لوگ ان سے واقف ہو گئے تھے اور انہیں ان سے اُنس پیدا ہو گیا تھا، وہ ان کی بہت قدر ومنزلت کرنے لگے تھے، علامہ موصوفؒ ان کے سامنے وعظ کہتے تھے، اوران کی سیرت وکردار سنوارنے والی باتیں کرتے تھے، انہیں اوراد واحزاب (مخصوص قرآنی آیات) کی تلقین کرتے تھے، اس طرح سید مرتضیٰ زَبیدیؒ بلگرامی عوام الناس میں بہت مشہور ہو گئے، اب انہوں نے سلف کے طریقہ پر احادیث بیان کرنا اور املا کرانا شروع کرا دیا، وہ اپنے حافظہ سے راویوں کے نام اور مختلف اسناد سے احادیث بیان کرتے تھے۔

حدیث کے درس کے زمانہ میں جامعۃ الازہر کے کچھ عالم ان سے ملے اور حدیث میں فضیلت کا اجازہ (سند) مانگا، انہوں نے کہا کہ اجازت اس وقت

دوں گا جب آپ لوگ اوائل کتب حدیث میری نگرانی میں پڑھ لیں، اس کے لیے طے ہوا کہ ہر پیر اور جمعرات کے دن شیخوں کی جامع مسجد میں اجتماع ہوا کرے، سید علامہؒ نے وہاں صحیح بخاری سے ابتدا کی، اس درس میں جامعۃ الازہر کے دوسرے علماء بھی شریک ہونے لگے، صحیح بخاری کی چند احادیث کے درس کے بعد وہ فضائل اعمال سے متعلق حافظہ سے کچھ احادیث اوران کی اسناد بیان کرتے، پھر علماء کو کچھ اچھے اشعار بھی سناتے، حاضرین ان کی لیاقت، خوش بیانی اور علم پر گہری نظر رکھنے پر سر دھنتے، ان کی شہرت، وجاہت اور قدر و منزلت میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔‘‘

سید علامہؒ نے محلہ ’’عاطفۃ الغسال‘‘ میں ایک مستقل مکان لے لیا اور وہیں سکونت اختیار کی، اچانک آپؒ نے ’’دمیاط‘‘ کے ایک بزرگ ذوالفقار دمیاطیؒ جو غالباً ان کے عقیدت مندوں میں سے تھے ان کی دختر نیک اختر سے جن کا نام زبیدہ تھا نکاح کرلیا، اور تصنیف و تالیف کو اپنا خاص موضوعِ شغل قرار دیا، عاطفۃ الغسال میں رہنے کے باوجود بھی ’’خانِ صاغۃ‘‘ سے ان کا تعلق ختم نہیں ہوا، بلکہ مسلسل جاری رہا۔

قاموس کی شرح بنام ’’تاج العروس‘‘: ’’قاموس‘‘ فن لغت میں گویا ایک متن متین ہے، کیوں کہ علامہ محمد مجد الدین فیروز آبادیؒ نے نہایت مختصر الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی و مطالب کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے، سید علامہؒ کی غالباً سب سے پہلی نگاہِ انتخاب اسی پر پڑی، اور کامل چودہ سال گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر آپؒ نے اس ٹھوس اور جامع کتاب کی ایک ضخیم شرح نو جلدوں میں لکھی، اور

تقریباً ہر جلد کے صفحات پانچ سو سے کم نہیں ہیں، حالاں کہ اس کتاب کا طول و عرض بے حد غیر معمولی ہے، اگر چھوٹی تقطیع پر شائع کی جائے تو اس کی ضخامت نو جلدوں کے بجائے اٹھارہ جلدوں تک پہنچ جائے گی۔

''تاج العروس'' کی تکمیل : جب ''تاج العروس'' شرحِ قاموس مکمل ہوگئی اور اس کا کام ختم ہو گیا تو آپؒ نے قدیم دستور کے مطابق مصر کے تمام اعیان واشراف کی دھوم دھام سے ایک دعوت کی، جس میں علماء، صلحاء، مشائخ، طلبۂ علم اور ادباء غرض ہر طبقہ کے لوگ شریک تھے۔

دعوت کے بعد آپؒ نے سب کو ایک مجلس میں جمع کیا اور اپنی محنت ان کے سامنے پیش کی، لوگ انگشت بدنداں تھے، انہیں حیرت تھی کہ ہندوستان کے غریب الوطن مسافر نے یہ کیا کارنامہ انجام دیا، اور بالاتفاق سبھی حاضرین نے ان کی جلالتِ قدر کا اعتراف کیا، مصر کے مسلم الثبوت اساتذہ اور سربرآوردہ علماء نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ اس پر اپنی تقریظیں ثبت کیں۔

الحمدللہ یہ تقریب ۱۱۸۱ھ میں ''غیط المعدیہ'' میں ہوئی، زبانِ حال پر اس وقت بلند پایہ قدیم شاعر کا یہ مشہور ومعروف شعر آ گیا ہوگا: ؎

أنا ابن جلا و طلاع الثنايا متىٰ أضع العمامة تعرفوني

ترجمہ: میں اس شخص کا بیٹا ہوں جس کا ہر امر واضح تھا اور گھاٹیوں کو پار کرنے والے کا بیٹا ہوں، جب میں اپنے سر پر عمامہ (خود) رکھوں گا تب تم مجھے پہچانو گے۔

آپؒ کی تالیف مفکر اسلامؒ کی نظر میں : مولانا سید ابوالحسن علی حسنی

ندویؒ نے حیدرآباد شہر میں ۱۱/اکتوبر/ ۱۹۸۲ء میں منعقد عربک سیمنار میں اپنی تقریر میں سید مرتضیٰ زَبیدیؒ بلگرامی کی معرکہ آرا تصنیف ''تاج العروس'' کی افادیت اور اس کے محرک کے سلسلہ میں کہا ہے:

''میں نے ابھی آپ کے سامنے قاموس کا نام لیا ہے، میں جن زبانوں سے واقف ہوں ان میں میری معلومات میں کسی لغت کی اتنی مفصل شرح نہیں ملتی جیسے ''قاموس'' کی شرح ''تاج العروس'' ہے، جس کے مصنف ہمارے جوار (اودھ، یوپی) کے ایک فرزند فخر ہندوستان علامہ سید مرتضیٰ بلگرامیؒ ہیں، جو ''زَبیدی'' کی نسبت سے مشہور ہیں، یہاں تک کہ بہت سے اچھے پڑھے لکھے لوگ ان کو یمنی سمجھتے ہیں، اس کتاب کو مصنفؒ ہی کی زندگی میں (مجازاً نہیں حقیقۃً) سونے میں تولا گیا، اس وقت کے عظیم ملوک وسلاطین نے ان کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور ان سے سند لی۔

ف: ''تاج العروس'' کی اس قدردانی کو معلوم کر کے دل باغ باغ ہو گیا، مگر افسوس کہ جماعت علماء اس کی عظمت و منزلت سے واقف ہی نہیں تو قدر کیا کریں گے؟ واللہ الموفق۔

اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہؒ ایک ادب کی کتاب ''**كفاية المتحفظ**'' کے درس کے سلسلہ میں ہر کلمہ کی تحقیق کے لیے قاموس وصراح کے مطالعہ کی تاکید فرماتے تھے۔ افسوس کہ ''تاج العروس'' آپ کے کتب خانہ میں موجود نہ تھی، ورنہ اس کو خود بھی دیکھتے اور ہم سب کو اس کا امر فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس اہم کتاب کا انتظام اس حقیر

کے کتب خانہ دار المعارف الاسلامیہ میں فرما دیا ہے۔ (مرتب)

"شرح احیاء العلوم" لکھنے کے اسباب: سید علامہؒ نے شرحِ احیاء العلوم کے لکھنے کے اسباب اپنی شرح "**اتحاف السادۃ المتقین**" کے جزءِ اوّل میں بیان کیا ہے، چنانچہ علامہ موصوفؒ رقم طراز ہیں:

"اس کتاب کی شرح لکھنے کے تین اسباب ہیں: (۱) سب سے بڑا سبب تو یہ ہے کہ اس کتاب میں اہل دین اصحابِ خیر صالحین کے تذکرے ہیں، اوران کی محبت ہی اس کتاب کی شرح لکھنے کی سب سے بڑی محرک ہے۔

(۲) دوسرا اہم سبب اس کتاب کی شرح لکھنے کا یہ ہے کہ جو بھی اس کتاب کا مطالعہ کرے وہ اس سے نفع حاصل کرے، اس لیے کہ اس میں اعمالِ صالحہ اور امورِ مہمہ کا ذکر ہے، اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اعمالِ خیر پر ثواب کا وعدہ فرمایا ہے، موت کے بعد آنے والی صدیوں پر مشتمل زندگی میں نفع پہنچانے والے اعمال کا ذکر ہے۔

(۳) تیسرا سبب اس تالیف کا نفس کو آمادہ کرنا ہے ان صالح امور پر چلنے اوران کی حمایت کرنے پر اور اخلاقِ سیئہ سے باز رہنے پر، ان باتوں کو گرہ میں باندھ لینے پر جو اللہ تعالیٰ سے قرب کا سبب بنتی ہوں، محنت اور کوشش پر جو آخرت کے فوز وفلاح پر منتج ہو، اُمید ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے وہاں نفع بخش ثابت ہو، اس لیے کہ نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ سے اس کا تدارک فرمادے، اور شیطان دھوکہ سے نفس کی ہلاکت پر حریص ہے، اللہ تعالیٰ کا لطف واعانت اور طاعت میں مجاہدۂ نفس، امورِ حسنہ میں

مخالفت پیش آجانے سے نفس کا رُک جانا بچاؤ کا ذریعہ بن سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا}

ترجمہ: جن لوگوں نے ہماری راہ پر چلنے کی کوشش کی ہم ان کو اپنی راہوں کی ہدایت عطا کردیتے ہیں۔

آپؒ کی طرف عام رجوعات: چنانچہ محبین وشائقین ہر چہار طرف سے اڈتے آتے تھے، مختلف آرزوئیں، مختلف سوالات اور مختلف مشکلات لے کر آتے اور تشفی حاصل کر کے جاتے، ارشاد وہدایت، درس وتدریس، وعظ وتذکیر اور خط وکتابت کا دریا بہہ رہا تھا، اور تشنہ کام اپنی تشنگی کو دور کررہے تھے، وفات کے کچھ روز پیشتر تک اللہ تعالیٰ کی توفیق عمیم کا یہ بحر ذخار اسی طرح موجیں مار رہا تھا، کہ یکا یک اللہ جانے آپؒ نے کیا محسوس کیا کہ "تاج العروس" کا خاتمہ نگار لکھتا ہے:

"لَزِمَ دَارَهُ وَاحْتَجَبَ عَنْ أَصْحَابِهِ، وَاعْتَكَفَ بِدَاخِلِ الْحَرِيْمِ، وَأَغْلَقَ الْبَابَ، وَتَرَكَ الدُّرُوْسَ وَالإِقْرَائَ۔"

آپؒ نے اپنے گھر کو لازم کرلیا، اپنے اصحاب سے پردہ فرمالیا، گھر کے اندرون میں رہے اور دروازہ بند کرلیا، اور پڑھنا پڑھانا چھوڑ دیا۔

وفات: اسی کے کچھ دن بعد قاہرہ میں طاعون کی وبا آئی، یہ ۱۲۰۵ھ کے شعبان کا مہینہ تھا، "جامع الکبروی" جو سید علامہؒ کے مکان کے روبرو واقع تھی وہیں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے، نماز سے فارغ ہوئے کہ

طاعون کا اثر محسوس کیا، وہاں سے لوٹے تو طاعون نے پوری طرح گھیر لیا، گھر لائے گئے، ان کی زبان بند ہوگئی، ہفتہ کا دِن اسی خاموشی میں گزرا، اور اتوار کے روز علم وعرفان کا وہ آفتاب جو گنگا کے ساحل پر طلوع ہوا تھا نیل کی وادی میں غروب ہوگیا۔ إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون۔

''تاج العروس'' کے خاتمہ نگار نے لکھا ہے کہ سید علامہؒ نے اپنی زندگی میں مصر کے اندر ایک قبر اپنے لیے درسگاہِ سیدہ رُقیہ میں بنوائی تھی، اور وہ اسی میں مدفون ہوئے۔ نوّر اللّٰہ مرقدہٗ۔

(ماخوذ از: ''سید مرتضیٰ بلگرامی زَبیدیؒ'' مؤلفہ: ڈاکٹر رخسانہ نکہت اور اُم ہانی)

حضرت خواجہ نور محمد صاحب مہارویؒ متوفی ۱۲۰۵ھ

شاہ نور محمد صاحب مہارویؒ شاہ فخر الدین صاحبؒ کے محبوب ترین خلفاء میں سے تھے، مولانا غلام سرورؒ کا بیان ہے کہ حضرت مولانا کی جو عنایت بے غایت اور بے حد لطف و کرم ان پر تھا اتنا اپنے خلفاء میں سے کسی پر نہ تھا۔

ولادت اور خاندان: شاہ نور محمد صاحبؒ ۱۴/ رمضان المبارک ۱۱۴۲ھ مطابق: ۲/ اپریل ۱۷۳۰ء کو چوٹالہ میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد کا نام ہندال تھا، قوم سے کہرل تھے۔

ابتدائی تعلیم اور بچپن کے حالات: شاہ نور محمدؒ کے والد چوٹالہ سے مہار آگئے تھے اور وہیں مستقل قیام فرما لیا تھا، جب شاہ نور محمدؒ کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو والد ماجد نے قرآن پاک پڑھنے کے لیے حافظ محمد مسعود کے پاس بٹھایا، ان ہی کی خدمت میں رہ کر شاہ صاحبؒ نے قرآن پاک حفظ کیا، اس کے بعد والد اور بھائیوں کی رائے سے طے ہوا کہ ان کو کسی کاروبار میں لگایا جائے، لیکن ان کی قسمت میں علم و عرفان اور سلوک و باطن کے اعلیٰ منازل مقدر ہو چکے تھے، اس لیے انہوں نے اس رائے کو پسند نہیں کیا اور تعلیم جاری رکھنے پر اصرار کیا، اور موضع بڈھیران تشریف لے گئے، وہاں کچھ عرصہ تحصیل علوم کے بعد موضع ببلانہ آئے، یہاں شیخ احمد کھوکر سے چند کتابیں پڑھیں، اس کے بعد ڈیرہ غازی خان چلے گئے، یہاں شرحِ جامی تک علم حاصل کیا۔

لاہور میں تحصیل علم : ڈیرہ غازی خان کچھ عرصہ قیام کے بعد شاہ صاحب ؒ لاہور آ گئے، جب شاہ صاحب ؒ لاہور آئے تو ان کے والدین کو اس کی خبر نہ تھی، چنانچہ بہت عرصہ تک ان کو سخت پریشانی رہی، انہوں نے لاہور میں سخت تکلیفیں اٹھائیں، بعض اوقات گدائی کر کے پیٹ پالنا پڑا، لیکن شوق و ذوق میں کمی نہیں آئی، بلکہ اور زیادہ انہماک کے ساتھ کسبِ علوم میں مشغول ہو گئے۔

دہلی میں آمد: لاہور سے شاہ نور محمد ؒ نے تکمیل تعلیم کے لیے دہلی کا رُخ کیا، اس زمانہ میں نواب غازی الدین خان کے مدرسہ کی بہت شہرت تھی، چنانچہ اسی مدرسہ میں داخل ہو گئے اور حافظ برخوردار جی سے کافیہ پڑھنا شروع کر دیا، شاہ فخر صاحب ؒ ابھی اورنگ آباد سے دہلی نہیں آئے تھے، میاں برخوردار جی اس مدرسہ میں درس دیتے تھے، ان کے متعلق شاہ نور محمد صاحب ؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''میاں برخوردار جیؒ اچھے آدمی تھے اور صاحبِ نسبت تھے۔'' وہ چشتیہ سلسلہ میں بیعت تھے، شاہ نور محمد ؒ پر خاص التفات تھا، دن میں ایک مرتبہ کھانا کھاتے تھے اور شاہ نور محمد ؒ کو ساتھ کھلاتے تھے، انہوں نے اپنے اس عزیز شاگرد کو قطبی کا درس دینا شروع کیا، ابھی تکمیل نہ ہوئی تھی کہ ان کو گھر جانا پڑا اور شاہ نور محمد ؒ کا سلسلۂ تعلیم یک لخت منقطع ہو گیا۔

شاہ فخر صاحب ؒ سے تحصیل علم : شاہ نور محمد ؒ صاحب اب طالب کی حیثیت سے شاہ فخر صاحب ؒ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے، آپ شاہ فخر صاحب ؒ کے تبحر علمی کو دیکھ کر حیرت زدہ سے ہو گئے، اب تک آپ چھوٹے چھوٹے مدرسوں میں معمولی معمولی استاذوں سے پڑھ رہے تھے، اب ایک ایسے عالم کے پاس پہنچے

کی سعادت حاصل ہوئی تھی جو علم کا ایک بحرِ ذخار تھا، چنانچہ ایک مرتبہ ان کے تبحر علمی کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار پکار اٹھے تھے: ''سبحان اللہ، بحر علوم بودند۔''

شاہ نور محمدؒ نے قطبی کا سبق لینا شروع کیا، ابھی کتاب ختم نہ ہوئی تھی کہ شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ''تم علمِ ظاہری میں اپنا وقت ضائع نہ کرو، جتنا پڑھ لیا ہے وہ ضرورت کے لیے کافی ہے، اب اُس علم میں مشغول ہو جاؤ جس کے تم لائق ہو۔'' اس بیان سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے علومِ ظاہری کا خاتمہ قطبی ہی پر کر دیا تھا، لیکن ''تکملۂ سیر الاولیاء'' سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نور محمد صاحبؒ نے اور زیادہ اکتسابِ علوم کیا تھا اور حدیث کی سند بھی لی تھی۔

بیعت: شاہ نور محمد صاحبؒ نے ۱۱۶۵ھ مطابق: ۱۷۵۱ء میں شاہ فخر صاحبؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی، شاہ فخر صاحبؒ کے دہلی تشریف لانے کے بعد وہ پہلے شخص تھے جس نے ان سے بیعت کی۔

پاک پٹن اور مہار میں قیام: بیعت کرنے کے کچھ عرصہ بعد شاہ فخر صاحبؒ نے پاک پٹن کا قصد کیا، شاہ نور محمد صاحبؒ اس سفر میں ان کے ہمراہ روانہ ہوئے، جب دونوں پاک پٹن پہنچ گئے تو شاہ فخر صاحبؒ نے شاہ نور محمدؒ کو مہار جا کر اپنی والدہ سے ملنے کا حکم دیا، تعمیل ارشاد میں وہ وطن روانہ ہو گئے، کچھ دن یہ قافلہ پاک پٹن میں مقیم رہا، اس کے بعد شاہ فخر صاحبؒ دہلی تشریف لے آئے اور یہ لوگ وطن واپس ہو گئے۔

مہار میں قیام کی ہدایت: ایک دِن شاہ فخر الدین صاحبؒ نے شاہ نور محمدؒ سے فرمایا: ''اے نور محمد! خلق را با تو کار خواہد بود۔'' یہ سن کر آپؒ کی حیرت و تعجب

کی انتہا نہ رہی، عرض کیا: ''میں ایک کمترین پنجابی ہوں، کس طرح اس اعلیٰ مرتبہ کے لائق سمجھا گیا؟'' لیکن وہ مرشدِ کامل جس کی نظر میں کیمیا کا اثر تھا اس پنجابی کی صلاحیتوں سے واقف تھا، اس نے اپنے مرید کے تعجب کو دیکھا اور خاموش ہو گیا، کچھ دنوں بعد خلافت عطا فرما کر مہار میں قیام کا حکم دیا، مرید نے فوراً تعمیل کی اور مہار روانہ ہو گئے۔

مہار میں قیامِ خانقاہ: مہار پہنچ کر شاہ نور محمد صاحبؒ نے مسندِ ارشاد بچھائی، خلوص وحقانیت کا اثر یہ ہوا کہ بہت ہی جلد خلقت کا ہجوم ہونے لگا، ایک مرتبہ ایک شخص مہار سے دہلی آ رہا تھا، شاہ نور محمدؒ نے اس سے کہا کہ شاہ فخر صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونا، سلام عرض کرنا اور کہنا کہ آں جناب کی توجہ سے یہاں خوب روشنی دیکھی، وہ شخص دہلی آیا، اور جب شاہ فخر الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر پنجابی زبان میں سلام عرض کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی توجہ سے خوب روشنی دیکھی، اپنے مرید کی کوششوں کی کامیابی کا حال سن کر شاہ فخر صاحبؒ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی، کئی مرتبہ یہ جملہ دوہروا کر سنا، پھر فرمایا: ''میاں نور محمد مردِ خوب است ونسبتِ شائستہ بہم رسانیدہ۔'' (میاں نور محمد بہت اچھے آدمی ہیں، اور انہوں نے مناسب نسبت مع اللہ حاصل کی ہے۔)

شاہ نور محمد صاحبؒ کی خانقاہ کے متعلق ''نافع السالکین'' میں لکھا ہے کہ ہزاروں آدمی وہاں حاضر ہوتے ہیں اور زیارت کرتے ہیں۔

درستیٔ اخلاق واتباعِ شریعت کی عظمت: شاہ نور محمدؒ اپنے مریدوں کو درستیٔ اخلاق اور اتباعِ شریعت کا درس دیتے تھے، ان کے ملفوظات میں ان ہی

دو چیزوں پر جگہ جگہ زور دیا گیا ہے، اخلاقی تعلیم میں خاص طور سے ان باتوں پر زور دیتے تھے:

(۱)......اوّل یہ کہ کسی پر غصہ نہ کریں، غصہ باطن میں جوہر ہے، اس کے اظہار سے نورِ معرفت ختم ہوجاتا ہے۔

ف: سبحان اللہ، کیسی حقیقت آشکارا فرمائی، جو ہر وقت یاد رکھنے کے لائق ہے۔مرتب۔

(۲)......دوسرے یہ کہ اگر کوئی کسی کی شکایت کرے تو اس کو خیر کی طرف مائل کرنا چاہیے۔(یعنی اس کی اچھی تاویل کرنی چاہیے۔مرتب)

(۳)...... عام امور میں محاسبہ نہیں کرنا چاہیے۔ (یعنی معاملات میں لوگوں سے محاسبہ کرنے سے وحشت و اجنبیت پیدا ہوگی، جو یقینا باہم دوری کا سبب ہوگا۔واللہ اعلم۔مرتب)

ان تینوں ہدایتوں میں اخلاقی اصلاح کا راز مضمر تھا، اور تمام اخلاقی زندگی ان ہی کے گرد گھومتی ہے۔خواجہ گل محمد احمد پوریؒ نے ان اصولوں کی تشریح کی ہے، ان کی حقیقت و ماہیت کو سمجھایا ہے۔

ف: کاش کہ اس کی تشریح کا علم ہوتا تو بصیرت حاصل ہوتی۔(مرتب)

شاہ نور محمد صاحبؒ اتباعِ شریعت کی بھی خاص تلقین فرمایا کرتے تھے، ان کے دل میں شریعت کا بڑا اہتمام تھا، آپؒ کے اتباعِ شریعت کا یہ حال تھا کہ کہا کرتے تھے کہ ''جو چیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی نہ ہو اس پر بغیر ضرورت کیوں عمل کیا جائے؟

ف: ماشاءاللہ، کیا خوب بات ارشاد فرمائی۔(مرتب)۔

شاہ نور محمد صاحبؒ اپنے مریدوں کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے درمیان رہ کر اصلاحی جدوجہد کرنے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے، افاضۂ خلق ان کی نظر میں اہم ترین کام تھا، ایک مرتبہ ایک بزرگ کا قصہ سنایا کہ ان کے دل پر عنایاتِ الٰہی نازل ہونی شروع ہوئیں، تو اس خیال سے کہ تنہائی میں شاید اس میں اور ترقی ہو گوشہ نشین ہو گئے، فوراً قلبی کیفیات بند ہو گئیں، شاہ صاحبؒ اپنے مریدوں کو سمجھایا کرتے تھے کہ ''عوام میں رہ کر ان کی اصلاح کی کوشش کرنا سب سے بڑی عبادت ہے۔''

ف: ماشاءاللہ، کتنی اچھی تعلیمات و ہدایات ہیں، جن پر ہم سب کو عمل کرنا موجب سعادت و کرامت ہے۔ واللہ الموفق۔(مرتب)۔

وحدت الوجود کے متعلق شاہ صاحبؒ کا مسلک وہی تھا جو شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کا تھا، اس مسئلہ میں عوام کی گفتگو کو ناپسند فرماتے تھے۔

ف: حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا بھی یہی مسلک تھا۔(مرتب)۔

قبلۂ عالم کے ارشاد و تلقین کا اثر مریدوں پر بہت گہرا ہوتا تھا، ایک مرتبہ فرمارہے تھے کہ ''جو کسی سے ناخوش ہو تو اسے خوش کرنا چاہیے۔'' حافظ محمد جمالؒ پر اِن کلمات کا ایسا اثر ہوا کہ فوراً وہاں سے اٹھ کر اپنے دشمن کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

ف: سبحان اللہ! یہ عمل ہے تعلیم شیخ پر، لیکن اب ایسا نہیں ہے، بلکہ جس قدر شیخ

اخلاقیات پر کلام کرتا ہے اس کا کوئی اثر مریدین قبول نہیں کرتے، بلکہ برعکس حال دیکھا جاتا ہے،تو پھر باطنی ترقی کیسے ہو؟ (از: مرتب عفی عنہٗ)

''مناقب المحبوبین'' میں ایک عورت کا واقعہ درج ہے کہ تھوڑی دیر ان (حضرت شیخ مذکور الصدر) کی مجلس میں بیٹھ کر اس کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ کلامِ عرفانِ توحید بیان کرنے لگی۔

وفات: ۳/ ذی الحجہ/ ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۰ء کو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کسی نے تاریخ وفات کہی ہے: ''حیف واویلا! جہاں بے نور گشت۔''
۱۲۰۵ھ

مزار مبارک تاج سرور میں ہے، وہاں حضرت بابا فریدؒ کے پوتے اور شیخ بدرالدین سلیمانؒ کے تاج الدین سرور آسودہ ہیں، اور ان ہی کی نسبت سے اس جگہ کا نام تاج سرور ہو گیا،فریدی خانوادہ کے لوگ بکثرت وہاں آباد ہیں، اس بنا پر اسے بستیٔ چشتیاں بھی کہا جاتا ہے،شاہ نور محمد صاحبؒ کو تاج سرور صاحبؒ کے مزار سے بڑی عقیدت تھی، ہر جمعہ کو وہاں جاتے تھے، اور وہیں خانقاہ بھی قائم کر لی تھی۔ (تاریخ مشائخ چشت/صفحہ:۲۲،مؤلفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی)

حضرت سید علی رمز الٰہی حیدرآبادی متوفی ۱۲۱۰ھ

نام ونسب: آپؒ ساداتِ حسینی میں سے تھے،نسب کا شجرہ اس طرح ہے: سید علی بن سید عبدالحسین راز بن سید مرتضیٰ اصفہانی بن سید علی المشہدی عرف مرزا بزرگ۔

ایران سے ہند میں آمد: آپؒ کے نانا سید محمد بن سید ابراہیم ایران سے ہمایوں بادشاہ کے ہمراہ ہند میں آئے تھے،آپؒ کے آبا واجداد امامیہ مذہب سے متعلق تھے، اوائل جوانی میں اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت سے آپؒ کے دل میں فقراء کی محبت پیدا ہوئی کہ آپؒ والدین کے عقائد کے منکر ہوئے، رفتہ رفتہ والد کو یہ بات معلوم ہوئی، سخت ناخوش ہوئے، فرمایا: ''کیا کروں؟ محبت پدری مانع ہے،نہیں تو ابھی اس کا کام تمام کردیتا'' اور فرمایا: ''اگر کوئی یہ کام کرے تو میں اس سے قصاص نہیں چاہوں گا'' تمام اعزہ واقارب جانی دشمن بن گئے، آپؒ کے والدین حضرت بندہ علی قادری سے محبت واعتقاد رکھتے تھے۔

بیعت وخلافت: ایک روز وہ اتفاقاً حضرتؒ کی خدمت میں آئے اور آپؒ بھی ہمراہ تھے، حضرتؒ نے آپؒ کے حال پر ایسی مہربانی اور شفقت کی کہ آپؒ حضرت پر فریفتہ ہو گئے، کبھی کبھی حضرت کی خدمت میں آمد و رفت کرتے رہے، حضرتؒ کی صحبت کی برکت سے تصوّف ومعرفت الٰہی کا شوق دل میں موجزن ہوا، یہاں تک کہ آپؒ ۱۱۷۴ھ ماہِ رمضان شبِ جمعہ کو حضرتؒ کی بیعت سے مشرف ہوئے، آپؒ کی توجہ کی برکت سے منازلِ سلوک طے کرنے لگے،

آہستہ آہستہ غضب وغصہ سے خارج ہوئے، پھر آپؒ کو استخارہ کی اجازت ملی۔

آپؒ کے وظائف: چند روز کے بعد وظیفۂ استغفار پر مامور ہوئے، پھر چند مدت تک درود شریف کا وظیفہ جاری رکھا، پھر ذاکرین کے حلقہ میں شریک ہوئے، یعنی اسم ذات ''اللہ'' کا شغل شروع کیا، پھر ذکر قلبی ''اللہ'' یا حبس دم کا وظیفہ کرتے رہے، اس ریاضت شاقہ ومحنت شدیدہ کے بعد آپؒ کو کشفِ باطن وتصفیۂ دل حاصل ہوا، آپؒ کے پیر نے فرمایا: ''با خدا دیوانہ و با مصطفی ہشیار باش۔'' یعنی شریعت کے طریقہ پر ثابت قدم وراسخ دم رہ، ہشیاری سے یہی مراد ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں دیوانہ وآشفتہ رہ، آپؒ سے منقول ہے کہ آپؒ رات دن میں اٹھارہ ہزار مرتبہ ذکر اللہ کرتے تھے، سات سال تک برابر مداومت فرماتے رہے، اور غذائے قلیل ایک وقت کی کھاتے تھے۔

ف: حضرت مصلح الامتؒ اسمِ ذات کے ذکر کی تلقین ہی نہیں؛ تاکید فرماتے تھے، چھ ہزار کم ازکم، اوسط بارہ ہزار اور اعلیٰ درجہ چوبیس ہزار فرماتے تھے، یوں اس سے بھی زیادہ ہمارے مشائخ کا وِرد ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ذکر کثیر کی توفیق مرحمت فرمائے، تاکہ تصفیہ وتزکیۂ نفس کی دولت نصیب ہو۔ (مرتب)

زیارتِ قبور کی عادت: مرشد کی اجازت سے قبور کی زیارت کو جایا کرتے، بعض وقت آپؒ کو کشفِ قبور بھی ہوتا تھا، آپؒ ایک روز ایک قدیم قبر کے پاس بیٹھے، معلوم ہوا کہ قبر میں آگ کے شعلے افروختہ ہیں، یہ حالت دیکھ کر آپؒ مکان پر لوٹ آئے اور مرشدؒ سے اس کا ذکر کیا، مرشدؒ نے فرمایا: ''تعجب ہے کہ آپؒ نے کچھ نہیں کیا، وہاں کچھ پڑھنا، تلاوت کرنا چاہیے تھا اور توجہ دینا چاہیے

تھا، تا کہ قبر کی آگ فرو ہوتی، پس وہاں جاؤ۔'' آپؒ متواتر تین روز تک آتے رہے، مگر کچھ نہیں ہوا، آخر چوتھی مرتبہ میں فرمایا کہ ''قبر کے پائیں رہو اور قرأت کرتے جاؤ، ایک ہفتہ تک اسی طرح عمل کیا، پھر آپؒ کے مرشدؒ رونق افزا ہوئے اور قبر پر بیٹھے، خوب گریہ وزاری کی، قبر کی آگ اس روز سے فرو ہوگئ، آپؒ نے ۱۲۰۲ھ میں عالمِ رویا میں چند اشغالِ قادریہ حضرت سید عبدالقادر ملکا پوریؒ سے پائے، اور ''مشکوٰۃ النبوۃ'' کے مؤلف آپؒ کی خدمت میں فیض یاب ہوئے ہیں، ''مشکوٰۃ النبوۃ'' میں آپؒ کے واقعات وحالات شرح وبسط سے لکھتے ہیں۔

عبرت ناک واقعہ: مؤلف مذکور ایک مقام میں لکھتے ہیں کہ میں ایک روز جناب رمزِ الٰہی کا رسالہ نقل کر رہا تھا، حضرتؒ کے نام کے ساتھ جو لقب تھا اس کو تخفیفاً ترک کر دیتا تھا، ایک روز آپؒ آئے اور کہا کہ ''اے علی پیراں! میں نے مکتوباتِ مجددیہ میں دیکھا ہے کہ مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت باقی باللہؒ کے لقب میں اختصار فرمایا، اس رات آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں باریاب نہیں ہوئے، دوسرے دن مشرف ہوئے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے احمد! تو نے ہمارے شیخ کے نام کو سہواً ترک کر دیا، اس لیے ہماری مجلس سے محروم رہا۔'' آپؒ نے سہو کی مغفرت چاہی، علی پیراں کہتے ہیں کہ میں یہ نقل سنتے ہی نادم و پشیمان ہوا اور اپنے قصور کا معترف ہوا، اور یہ امر حضرت رمزِ الٰہیؒ کی کرامات سے تھا۔

ف: مگر افسوس کہ عموماً ہم لوگ القابِ شیخ میں اختصار کو اختیار کرتے ہیں، اس واقعہ سے خوب معلوم ہوا کہ اس سے اجتناب کرنا چاہیے، اس لیے کہ یہ فیض باطن سے حرمان کا سبب بن سکتا ہے۔ (مرتب)

ارشادات: ''مشکوٰۃ النبوۃ'' میں مذکور ہے کہ آپؒ نے فرمایا کہ ''کشفِ قبور دو قسم کا ہے، ایک علمِ دعوت سے متعلق ہے، اور یہ اہل قبور کے معاینہ اور مشاہدہ پر موقوف ہے، دوسرا تصفیۂ باطن و مکاشفۂ روحانی سے متعلق ہے، یہ قسم صرف دوستانِ حق کو نصیب ہوتی ہے۔

تصانیف: آپؒ صاحب تصانیف تھے، آپؒ کے چند رسائل تصوف میں ہیں، مثلاً ''کنزِ مخفی، واعظ المجانین، فتاویٰ العشاق، توحید نامہ'' وغیرہ۔

وفات: ۱۲ /محرم الحرام/ بروز پنجشنبہ/ ۱۲۱۰ھ میں آپؒ کی وفات ہوئی۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔ مکہ مسجد میں نمازِ جنازہ ادا کر کے بیرونِ شہر حیدرآباد دکن محلہ یاقوت پورا میں مشرقی جانب رستم دل خان مرحوم کے احاطہ کے اندر صحن مسجد میں مدفون ہوئے، بعد میں علیحدہ مسجد کے صحن میں بطریق اہل سنت والجماعت دفن کیے گئے۔ نور اللہ مرقدہ۔ (محبوب التواریخ: ۱/ ۵۴۹)

حضرت مجاہد ملت سراج الدولہ شہیدؒ متوفی ۱۱۷۱ھ

نام ونسب: نام مرزا محمد، خطاب سراج الدولہ، والد کا نام زین الدین احمد خان، نانا کا نام علی وردی خان ہے، جو حاکمِ بنگال تھے۔

ولادت: بعض حضرات نے تاریخ ولادت ۱۷۱۹ء کہی ہے، لیکن اغلب یہ ہے کہ ۱۷۳۸ء میں ولادت ہوئی۔

تعلیم وتربیت: سراج الدولہؒ کے نانا علی وردی خان نے سراج الدولہؒ کو گود لے کر ان کی پرورش اور تعلیم وتربیت اپنے ذمہ لی، بہترین اساتذہ مقرر کیے، اور وہ تھوڑے ہی عرصہ میں تمام علومِ مروّجہ سے فارغ ہو گئے، فن سپہ گری کے نکات خود علی وردی خان نے انہیں سکھائے تھے، تدبر اور تنظیم کے امور ذہن نشین کرائے اور ہر معرکہ میں انہیں ساتھ رکھا، میدان داری کی عملی ترتیب دی، پھر ملک کی عنان ان کے سپرد کر کے خود ان کے حسن انتظام کا مشاہدہ کیا اور جب سمجھ لیا کہ یہ نوعمر شہزادے حکومت کا بوجھ اُٹھا سکتے ہیں تو اپنے جانشین بنا کر سند دے دی۔

علی وردی خان کی حکومت کے آخری چار برس میں سراج الدولہؒ ملک کے عملی حکمراں تھے، ان کا اندازِ حکومت بالکل علی وردی خان کے طرز پر تھا، اور علی وردی خان اپنے لگائے ہوئے پودے کو سرسبز ہوتا دیکھ کر مطمئن تھے، انہوں نے آپؒ کے لیے ''سراج الدولہ'' کا خطاب عالمِ شہزادگی میں دربارِ دہلی سے حاصل کیا تھا اور آپؒ اسی نام سے مشہور ہوئے، آپؒ کا نکاح ایرج خان کی لڑکی لطف النساء سے ہوا تھا۔

شاہی لباس میں درویش کامل : سراج الدولہؒ ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھے، آپؒ کو علی وردی کبھی اپنی آنکھوں سے دور نہ ہونے دیتے، انہوں نے آپؒ کی پرورش اپنے بیٹے کی طرح کی، ہر معاملہ میں ان کو فوقیت دیتے، اسی خصوصی تربیت کی وجہ سے سراج الدولہؒ میں وہ تمام خصائل موجود تھے جو خود علی وردی خان میں تھے، وہ جس بات کا ارادہ فرماتے اس کی تکمیل میں تمام صلاحیتیں صرف فرما دیتے، آپؒ غریبوں کے ہمدرد تھے، آپؒ سے کسی کی تکلیف برداشت نہ ہوتی، دشمنوں پر بھی رحم کے قائل تھے، اپنے جانی دشمنوں کو بھی آپؒ نے امان دی تھی، ہمیشہ بزرگوں کا ادب کرتے، حتیٰ کہ میر جعفر جیسے شخص کو بھی آپؒ نے معاف کر دیا اور یہی آپؒ کی بربادی کا سبب ہوا۔

ف: ممکن ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ یہی عمل آخرت کی شادابی کا سبب ہو جائے۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز۔** (مرتب)

دیگر شہزادوں یا حکمرانوں کی طرح آپؒ عورتوں کی مجلس منعقد نہیں کرتے تھے، نہ ہی آپؒ کو رقص و سرود سے کوئی دل چسپی تھی، آپؒ ابتداء ہی سے ان تمام باتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، نظم و نسق میں علی وردی خان کی طرح بڑی فیاضی سے کام لیتے تھے، نماز، روزے اور تلاوت کے پابند تھے، آپؒ کے حسن تدبر اور شجاعت کے دشمن بھی قائل تھے، انگریزوں کو بھی آپؒ کی قابلیت کا احساس تھا، جبھی انہوں نے اندرونی سازشیں کر کے آپؒ کے دورِ حکومت کو ناکام بنانے کی کوششیں کی تھیں۔

نواب سراج الدولہؒ کا دربار: نواب سراج الدولہؒ نے جب ۱۰ / اپریل/ ۱۷۵۶ء کو زمامِ حکومت سنبھالی اور صوبہ داری کی مسند پر بیٹھے تو آپؒ کے دربار میں

ملکی اور غیر ملکی امراء وعہدہ دار اور تاجر سب حاضر تھے، حاسدوں کو سراج الدولہؒ کی مسند نشینی ناگوار تھی، مگر کچھ نہ کر سکتے تھے، چوں کہ سراج الدولہؒ ان کی توقعات کے خلاف مسند پر بیٹھے تھے اس لیے سب کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔

رسمِ مسند نشینی: رسم مسند نشینی کا قاعدہ یہ تھا کہ ہر امیر باری باری سراج الدولہؒ کے حضور علی وردی خان کی موت کی تعزیت کرتا، پھر مسند نشینی کی مبارک باد دے کر نذر پیش کرتا، اُمراء کے بعد تاجروں نے بھی نوابؒ کی خدمت میں نذریں گزاریں، جن میں فرانسیسی کمپنیوں کے نمائندے بھی تھے، لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی آدمی دربار میں شریک نہیں ہوا، سراج الدولہؒ کو جب یہ بات محسوس ہوئی تو آپؒ نے میر جعفر کو مخاطب کیا اور سوال کیا کہ انگریزوں کا نمائندہ کیوں نہیں آیا؟ چوں کہ سراج الدولہؒ نے بھرے دربار میں صرف میر جعفر کو مخاطب کیا تھا اس لیے میر جعفر کو احساس ہوا کہ شاید سراج الدولہؒ پر اس کی خفیہ حرکات کا انکشاف ہو چکا ہے۔ (سراج الدولہؒ/صفحہ:۴۴)

ف: چنانچہ پلاسی کی جنگ کے دوران ننگ ملک وقوم میر جعفر کا انگریزوں کے ساتھ رابطہ عیاں ہو گیا اور اس نے کھل کر انگریزوں کا ساتھ دیا اور ملک وقوم کو تباہ و برباد کیا۔ اسی کو علامہ اقبالؒ نے یوں کہا ہے: ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگ آدم، ننگ دین، ننگ وطن

اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، چوں کہ ہر زمانہ میں مارِ آستین منافقین اور اعداءِ ملک وقوم پیدا ہوتے رہے ہیں، جنہوں نے معمولی دنیوی وجاہت و دولت کے لیے ایمان اور دین ودیانت کو برباد کر دیا، نیز آخرت کو بھی تباہ کر دیا۔ چنانچہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غزوۂ اُحد کے موقع پر منافقین بھی گئے،

مگر راستہ سے واپس ہو گئے، جس کی نحوست سے شاید ابتدائی مرحلہ میں شکست کی صورت پیدا ہوئی، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برکت سے مبدل بہ فتح ہو گئی، اسی طرح منافقت و خباثت کا معاملہ بادشاہِ عادل سراج الدولہؒ کے ساتھ میر جعفر نے کیا، جس کی وجہ سے سراج الدولہؒ کی فوج شکست کھا گئی۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔ (مرتب)

اب عبرت و نصیحت کے لیے ذرا پلاسی کی جنگ کی روئداد پڑھئے:

پلاسی کی جنگ: ۲۳/جون ۱۷۵۷ء کو سراج الدولہؒ مع اپنے لشکر کے پلاسی (بنگال) کے میدان میں خیمہ زن تھے، آپؒ کے ساتھ اٹھارہ ہزار سوار، پچاس توپیں اور کچھ فرانسیسی سپاہی تھے، کلائیو کی فوج دریا کے اُس پار تھی، لیکن خوف زدہ تھی، اس معمولی سی فوج کا سراج الدولہؒ کے لشکر سے ٹکراؤ ظاہر کر رہا تھا کہ فرنگیوں کی مٹی خراب ہونے والی ہے، کلائیو بار بار میر جعفر کے بھاری لشکر کو دیکھ رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ جنگ کی صورت میں اس کی فوج سراج الدولہؒ کے لشکر کے سامنے چند گھنٹے بھی نہ ٹھہر سکے گی، اس کا دل خوف کے مارے دھڑک رہا تھا، اس کے پاس صرف ۳۲۰۰ سپاہی تھے، جن میں ۱۱۰۰ گورے اور ۱۰ توپیں تھیں، وہ بہت پریشان تھا، اسی پریشانی میں اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ دریا پار کیا جائے، ابھی فوجیں دریا پار کر رہی تھیں کہ اسے میر جعفر کا ذب کا پیغام ملا، اس نے پیغام پڑھا تو یاس کے اندھیروں میں کچھ روشنی نظر آئی، میر جعفر نے اطلاع دی تھی کہ سراج الدولہؒ کا ارادہ منصورہ گنج جانے کا ہے، وہ وہیں مورچہ بنائے گا، اب تساہل کا وقت نہیں ہے، عجلت سے کام لیا جائے، جنگ میں جب آپ ہمارے قریب پہنچیں گے

تو میں اپنی فوجوں کے ساتھ آپ سے آملوں گا اور آپ کی پوری مدد کروں گا، چنانچہ یہ باتیں ہورہی تھیں کہ اسی درمیان نواب سراج الدولہؒ کی فوج نے گولہ باری شروع کردی، کلائیو انگریز کی فوجیں مقابلہ کے لیے تیار نہیں تھیں، لہٰذا اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگیں، کلائیو نے ان کو روکا اور چھوٹی توپوں سے جوابی گولہ باری کرائی، اتفاقاً نوابؒ کا قابل اعتماد سالار میر مدن جو انگریزوں کے سروں پر پہنچ چکا تھا کہ ایک گولی کا نشانہ بن گیا اور وہیں اس کی وفات ہوگئی۔ إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون۔

چنانچہ اس کی وفات کے فوراً بعد اچانک جنگ کا نقشہ بدل گیا اور بارش کی وجہ سے توپ خانے کی بارود بے کار ہوگئی، ایسے میں غدار میر جعفر اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے آگے بڑھا، اس نے ان سرداروں کو طلب کیا جن کو اس نے رشوت دے رکھی تھی، وہ سب کے سب سردار میر جعفر کے خیمے میں آگئے اور میدان خالی ہو گیا، میر جعفر کے سپاہی پہلے ہی ہٹ چکے تھے، اب سراج الدولہؒ نے حملہ کا حکم دیا تو سوائے چند جاں نثاروں کے کوئی آگے نہ بڑھا، فرنگیوں نے ان کو قتل کرنا شروع کردیا اور آگے بڑھ کر نواب سراج الدولہؒ کے تمام مورچوں پر قبضہ کرلیا، خیمے خالی ہو چکے تھے، غداروں نے نواب سراج الدولہؒ پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی، مگر وفادار فریز فرانسیسی اور موہن لال مصروفِ جنگ تھے، سراج الدولہؒ لڑتے لڑتے دور نکل گئے تھے، بعد میں جب آپؒ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا، اب سراج الدولہؒ کو بڑی مایوسی ہوئی، آپؒ نے ساتھ رہ جانے والے چند مشیروں سے مشورہ کیا اور جنگ کے میدان سے خیمے کا رُخ کیا تو معلوم ہوا کہ فرنگیوں نے خیمے پر قبضہ کرلیا ہے، آخر کوئی صورت نہ دیکھ کر وہ ایک اونٹنی پر چند جاں نثاروں کے ساتھ

مرشدآباد روانہ ہوگئے، ۲۳/ جون ۱۷۵۷ء مطابق: ۱۱۷۱ھ شام تک حاکم بنگال بے یارومددگار ہو چکے تھے۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔ (سراج الدولہؒ/ صفحہ: ۸۳)

سراج الدولہؒ کی گرفتاری: آخر کار مرشدآباد پہنچ کر آپؒ نے اپنی بیوی لطف النساء اور اپنی لڑکی کو ساتھ لیا اور بھیس بدل کر ہجرت کا ارادہ کیا، نوابؒ نے ایک غریب مزدور کا لباس پہنا اور آپؒ کی زوجہ نے فقیر کا چولا اختیار کیا، دونوں مرشدآباد کو خیرباد کہہ کر رات کی تاریکی میں دریا کے کنارے آ پہنچے، جہاں ایک وفادار خواجہ سرا نے ان کے لیے کشتی کا انتظام کر رکھا تھا، وہ اس کشتی میں سوار ہو گئے اور چند دن بعد راج محل جا پہنچے، میاں، بیوی، لڑکی اور خواجہ سرا دریا کے کنارے کنارے جا رہے تھے، بھوک اور پیاس نے بہت پریشان کیا تو ایک باغ میں ٹھہر گئے، چوں کہ تین روز سے بھوکے پیاسے تھے لہٰذا خواجہ سرا نے کھچڑی پکائی اور اس چھوٹے سے قافلے نے کھائی، کھانا کھا کر کمریں سیدھی کرنے کو لیٹے ہی تھے کہ ایک راہ گیر نے پہچان لیا، جس نے راج محل کے حاکم میر جعفر کے چھوٹے بھائی کو خبر کر دی اور اس نے ان سب کو گرفتار کر لیا، میر جعفر کے داماد میر قاسم نے ان کے جواہرات چھین لیے اور انہیں زنجیروں میں جکڑ کر مرشدآباد پہنچا دیا، یہ زنجیریں ان کے ہاتھ پیروں میں نہیں بلکہ پوری قوم کے بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں کو پہنائی گئی تھیں، جن کی جھنکار دو سو برس تک ہندوستان کے گوشے گوشے میں سنی گئی۔ فیا ویلاہ ویا حسرتاہ۔

سراج الدولہؒ کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ میر جعفر قرآنِ پاک پر ہاتھ رکھ کر غداری کرے گا اور کلائیو سے مل جائے گا، آپؒ کو اس قوم پر رونا آ رہا

تھا جس میں میر جعفر جیسے غدار بھرے ہوئے تھے، مرکزی حکومت کا آخری حصار گر چکا تھا، اس لیے کلائیو نے غدار میر جعفر کو سراج الدولہؒ کی جگہ نواب بنا دیا اور اس سے انعامات کے علاوہ سارے جنگی اخراجات وصول کیے۔

سراج الدولہؒ کا قتل اور بنگال کی بدنصیبی: جب ۱۴ / رمضان المبارک ۱۱۷۱ھ مطابق: ۲ / جولائی ۱۷۵۷ء کو میر جعفر کے سامنے دربار میں سراج الدولہؒ کو پیش کیا گیا تو آپؒ نے درباریوں سے کہا کہ میر جعفر غدار ہے، جس نے انگریزوں سے ملک وملت کا سودا کیا ہے اور آج نواب بن کر ہمارے سامنے بیٹھا ہے، اگر اس کو یہی خواہش تھی تو مجھ سے کہہ دیتا، میں اس کے حق میں تخت سے دست بردار ہو جاتا، تاکہ یہ معصوموں کی آہوں کا سودا نہ کرسکتا، قوم کی عورتوں کی عصمت نہ لٹتی، جوانوں کا خون نہ بہتا، دوستو! ابھی وقت ہے کہ ہم سب متحد ہو جائیں اور دشمنوں کو نکالنے کی کوشش کریں، سراج الدولہؒ کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ میر جعفر نے اپنے بیٹے میرن کی طرف اشارہ کیا، اس نے یہ سمجھ کر کہ کہیں آپؒ کی تقریر سے بغاوت نہ ہو جائے سراج الدولہؒ کے قتل کا حکم دے دیا۔

احسان فراموش قاتل: میرن نے جب سراج الدولہؒ کے قتل کا حکم دیا تو لوگوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا، کوئی شخص خونِ ناحق کرنے پر رضامند نہ تھا، ہر ایک نے قتل کرنے سے انکار کر دیا اور اس امر پر نفرت کا اظہار کیا، آخر بڑی جدو جہد کے بعد ایک شخص ملعون مہدی بیگ آمادہ ہوا، جس پر ہر شخص نے لعنت بھیجی، یہ وہی تھا جو زین الدین احمد خان کے ٹکڑوں پر پلا تھا اور جس پر علی وردی خان نے بھی کافی عنایتیں کی تھیں، اس کی شادی بھی اشرف النساء بیگم زوجہ علی وردی

خان نے کی تھی اوراس پر ہمیشہ شفقت کا اظہار کیا تھا۔

قیدخانہ میں جب وہ سراج الدولہؒ کے سامنے آیا توسراج الدولہؒ نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ اسے قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟اس پر اس ملعون نے نہایت حقارت سے اثبات میں جواب دیا،نوابؒ موت کوسر پر منڈلاتے دیکھ کرآخری سجدے میں جا گرے اوراللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگے، پھر مہدی بیگ سے کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اس نے تلوار کا وار کردیا،نواب مجروح ہوکر سر کے بل گر گئے اور سر سجدے میں رکھ کر بارگاہِ باری میں آہ وبکا کرتے رہے، اِدھر بدبخت مہدی بیگ نے پے درپے وارکر کے آپؒ کوشہید کردیا۔

آپؒ شہادت کی سعادت سے مشرف ہوگئے اوراللہ تعالیٰ کے ارشاد:{وَلاَ تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ أَمْوٰتٌ بَلْ أَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لاَ تَشْعُرُوْنَ} کے بموجب حیاتِ جاویدانی سے نوازے گئے۔إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔

تدفین: آپؒ کی تدفین مرحوم علی وردی خان کے قبرستان خوش باغ،مقام لال باغ،ضلع مرشدآباد،مغربی بنگال میں ہوئی۔نوّراللہ مرقدہٗ۔(سراج الدولہ: مؤلفہ مکرم رئیس احمد بدایونی)

ف: حضرت سراج الدولہؒ صادق کی شرافت ونجابت اورمیر جعفر کاذب کی رذالت ومنافقت کے حالات پڑھ کر دلی صدمہ وقلق ہوا، کہ کریم وشریف اورلئیم ورذیل کے احوال وخصال میں کس قدر تفاوت ہوتا ہے، چوں کہ سراج الدولہؒ کی علمی ودینی تربیت ان کے نانا علی وردی خان نے کی تھی،اورمیر جعفراس سے بالکل نابلد تھا،تو پھر ہرایک سے وہی ثمرہ عیاں ہوا جوفطرت وسرشت میں پنہاں تھا۔اللہ تعالیٰ ہم سب کوریا اورحب دنیا جیسی باطنی بیماریوں سے پناہ میں رکھے،آمین۔(مرتب)

مجاہد آزادی والیٔ میسور حیدر علیؒ متوفی ۱۱۹۶ھ

نام ونسب: نام حیدر علی، والد کا نام فتح محمد اور دادا کا نام محمد علی ہے، صحیح روایت کے مطابق آپؒ کے مورثِ اعلیٰ جزیرۃ العرب میں مکہ مکرمہ کے باشندے تھے، سولہویں صدی عیسوی میں ہجرت کر کے ایران و بغداد ہوتے ہوئے گل برگہ کو اپنا مستقر بنایا، اس کے بعد محمد علیؒ بیجاپور میں مقیم ہو گئے۔

ولادت: حیدر علیؒ کی تاریخ ولادت میں کئی اقوال ملتے ہیں، زیادہ مشہور سنہ ۱۱۳۴ھ مطابق: سنہ ۱۷۲۲ء ہے۔

ابتدائی حالات: حیدر علیؒ کی پیدائش کے چار پانچ سال بعد تک اس خاندان میں بڑی خوشحالی رہی، اس لیے کہ اس وقت فتح محمد خانؒ صوبہ سرا میں ڈوڈا بالا پور کے قلعہ کی کمان سنبھالے ہوئے تھے، فتح محمد خانؒ کے انتقال کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور اچانک خوشحالی و آرام کی زندگی تنگ دستی و عسرت سے بدل گئی، اپنے والد فتح محمدؒ کے قرض کی ادائیگی کے لیے حاکم سرا کے وارثوں کے دباؤ اور ظلم وستم سے تنگ آ کر یہ خاندان میسور منتقل ہو گیا، اس وقت حیدر علیؒ کی عمر چھ (٦) سال اور شہباز کی گیارہ (۱۱) سال تھی، اس طرح بچپن ہی سے یہ دونوں لڑکے اپنے والد کی تربیت سے محروم رہے، والدہ ناسازگار حالات میں پھنس چکی تھیں، مالی وسائل بھی نہ ہونے کے برابر تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان بچوں کی ابتدائی تعلیم کا نظم بھی نہیں ہو سکا، حالاں کہ اس زمانہ میں مسلم خاندانوں کے اندر تعلیم کا رِواج

عام تھا۔

کوئی مشغلہ نہ ہونے کی وجہ سے حیدر علیؒ اپنا زیادہ تر وقت شکار میں گزارتے تھے، گھوڑ سواری و سپہ گری ان کا محبوب مشغلہ تھا، اس طرح تعلیم میں نہ سہی جنگی فنون میں حیدر علیؒ کو مہارت حاصل ہونے لگی، تیرہ (۱۳) سال کی عمر تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اس خاندان کے معاشی حالات میں کوئی قابل ذکر سُدھار نہیں آیا۔ (سیرتِ سلطان ٹیپو شہیدؒ /صفحہ:۸۶)

ملازمت: سری رنگا پٹنم میں ایک چھوٹے سے فوجی دستے کی کمان آپؒ کو سونپ دی گئی، ۱۷۴۹ء میں میسوری افواج کی طرف سے دیون ہلی کے محاصرہ کے دوران حیدر علیؒ نے اپنی غیر معمولی قابلیت و مہارت کا مظاہرہ کیا، جس سے متاثر ہو کر نندراج نے آپؒ کو ترقی دی اور ’’خان‘‘ کا خطاب دے کر باقاعدہ دو سو پیادہ اور سو سواروں کا افسر مقرر کر دیا، اس طرح جلد ہی حیدر علیؒ نے اپنی فطری صلاحیتوں و قابلیتوں کا مظاہرہ کر کے میسور کی فوج میں اپنا ایک مقام بنا لیا، راجہ اور اس کے وزیروں کے دلوں میں بھی آپؒ کی قابلیت و صلاحیت کا سکہ بیٹھ گیا۔

معمولات: زندگی کا ایک بڑا حصہ بالخصوص میسور کی حکمرانی کے بعد جنگوں اور اسفار میں گزرا، اس لیے روزانہ کے معمولات طے نہیں تھے، حالات اور تقاضوں کے لحاظ سے اُن میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی، البتہ جب اپنے مستقر سری رنگا پٹنم میں مقیم ہوتے تو عام طور پر صبح صادق کے وقت ہی اوّل وقت میں بیدار ہوتے اور آٹھ نو بجے تک اپنی ذاتی ضروریات و معمولات سے فارغ ہو کر اپنے وزراء و فوجی افسران سے گذشتہ رات سے اب تک کے حالات سنتے، موصولہ

خطوط اور درخواستوں کو پڑھ کر اسی وقت اُن کے جوابات لکھواتے، پھر ناشتہ کے بعد محل میں پالے گئے ہاتھیوں و چیتوں وغیرہ کو دیکھتے، پیار سے ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے اور ان کی حرکتوں سے کچھ دیر تک محظوظ ہوتے رہتے، ساڑھے دس بجے ایک شامیانہ میں دربارِ عام لگتا، خود اس میں ایک طلائی کرسی پر جلوہ افروز ہوتے، عوام حاضر ہو کر اپنے مسائل بیان کرتے، جن کو سن کر اسی وقت اُن کے حل کے لیے احکامات بھی جاری کرتے، سفراءِ سلطنت سے بھی اسی دوران ملاقات ہوتی، یہ سلسلہ ۲ / ۳ بجے ظہر تک چلتا، ۳ سے ۵ بجے تک آرام کرنے کے بعد فوجیوں کا معاینہ کر کے ضروری احکامات جاری کرتے، پھر گھوڑے پر تفریح کے لیے نکلتے، واپس آ کر پھر دربار میں بقیہ درخواستوں کو سنتے، مغرب کے بعد کھانا ہوتا، تھوڑی دیر چہل قدمی کرتے، رات کو ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک محفل جمتی، جس میں شعر و شاعری کا سلسلہ چلتا، اس محفل میں نواب صاحب کے رشتہ دار و وزراء بھی حاضر رہتے، ہفتہ میں دو تین مرتبہ حسب سہولت شکار کے لیے بھی جاتے، کھانے میں عام طور پر سادہ کھانا پسند کرتے، رائی کی روٹی پسندیدہ غذا تھی، سفر میں عام طور پر چاول کو ترجیح دیتے، جب کہیں جاتے یا سری رنگا پٹنم واپس آتے تو ان کا شاہانہ جلوس عوام کے لیے سب سے زیادہ کشش کا باعث ہوتا۔ (سیرتِ ٹیپو سلطان شہیدؒ / صفحہ: ۱۴۶)

ہمت و بہادری: ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا کی تاریخ میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ حاکم سلطنت یا بادشاہِ وقت نے خود میدانِ جنگ میں آ کر اپنے دشمنوں کا دوش بدوش مقابلہ کیا ہو، حیدر علیؒ اپنے بیٹے ٹیپو کی طرح دنیا

کے ان چند سلاطین میں سرفہرست ہیں جنہوں نے خود کو اپنی فوج و سپاہیوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں ہمیشہ آگے رکھا، میسور کی حکمرانی سے پہلے اور اس کے بعد جتنے مقابلے سلطنت میسور کے دوسری اقوام و افواج کے ساتھ ہوئے اس میں آپؒ نہ صرف شریک رہے بلکہ دشمنوں کی صفوں میں گھس کر ان کا مقابلہ کیا، آپؒ کی اسی بہادری و شجاعت کو آپؒ کے چہرے سے بھانپ کر راجہ میسور نے ۱۷۵۲ء میں صرف ۲۹ سال کی عمر میں میسور کے قریب ڈنڈیگل کا ان کو گورنر مقرر کیا تھا۔

انسانی ہمدردی و انصاف پسندی: نظامِ حکومت کو چلانے میں آپؒ جہاں ایک طرف سخت گیر منتظم تھے تو دوسری طرف رحم دل حکمران بھی تھے، یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ خصوصی شفقت و محبت کا معاملہ کرتے، دربار میں امیر و غریب کی کوئی تفریق نہیں تھی، مذہب و مسلک کی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیاز نہیں برتا جاتا تھا، رعایا پر محاصل کی وصولی کے سلسلہ میں کوئی جبر نہیں کیا جاتا تھا، عوام کی مدد کے لیے ہر جگہ پولس چوکیاں قائم کردی گئی تھیں، رعایا کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ اپنے علاقوں کے گورنروں کے خلاف کسی وقت بھی دربار میں حاضر ہوکر شکایت کریں، عدل و انصاف کا یہ عالم تھا کہ اپنے چہیتے شہزادہ ٹیپو کو بھی ایک دفعہ کسی غلطی پر کوڑے لگوائے، مرہٹوں پر فوج کشی کے بعد مالِ غنیمت کی رپورٹ تاخیر سے دینے پر خود ٹیپو کی جیب خاص سے چھ ہزار روپے بطورِ جرمانہ وصول کیے، مالدیپ پر حملہ کے بعد جب امیر البحر نے وہاں کے راجہ کو گرفتار کر کے اس کی آنکھیں نکلوا دیں تو اس کی اس حرکت پر اس کو اس کے عہدہ سے فوراً معزول

کر دیا، راجہ سے اس پر خود معافی مانگی اور اس کی تلافی کے لیے اس کو ایک بڑی جاگیر بھی دی۔

غرض یہ کہ حیدر علیؒ کو ہمیشہ اس بات کا بڑا خیال رہتا کہ ان کی سلطنت میں کسی بھی شخص کے ساتھ ناانصافی اور ناروا سلوک نہ ہو، اگر کوئی مجرم جرم کر کے بھاگ جاتا تو محکمۂ خفیہ کی پولس اس کو تلاش کر کے حیدر علیؒ کے پاس حاضر کرتی، جس کے بعد اس کو سزا دی جاتی۔

مذہبی رواداری : مذہبی رواداری اور دوسرے مذاہب کی تحقیر نہ کرنا عین اسلامی اصول ہے، مسلم سلاطین کو اسلام نے ہدایت دی کہ وہ اپنے عہد حکومت میں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو جبراً اِسلام میں داخل نہ کریں، اسی طرح ان کے معبودانِ باطلہ کو برا بھلا بھی نہ کہیں، ارشادِ خداوندی ہے :

{وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ}

کہ ’’تم ان کے معبودانِ باطلہ کو برا بھلا مت کہو، کہیں وہ جہالت میں اللہ کو بھی گالی نہ دیں۔‘‘ مجموعی طور پر اسلامی تاریخ اس اسلامی اصول و ہدایت پر عمل کی شاہد ہے، حیدر علیؒ نے بھی بحیثیت ایک مسلم حکمراں کے ان اصولوں کا پاس رکھا۔

مسلمانوں کی شکست باہمی نااتفاقی کی وجہ سے ہوتی ہے: آپؒ کا مشہور مقولہ تھا کہ مسلمانوں کی شکست و کمزوری ان کی آپسی نااتفاقی کی وجہ سے ہوتی ہے، اس لیے آخری دم تک خود بھی اس بات کی کوشش کی کہ مسلم حکمرانوں کے خلاف ان کی فوج صف آرا نہ ہو، بلکہ انگریزوں کے خلاف ان مسلم ریاستوں کا

آپس ہی میں اتحاد ہو جائے، نواب ارکاٹ محمد علی اور نظام حیدرآباد سے ہمیشہ صلح کی کوشش کرتے رہے، لیکن افسوس کہ ذاتی مفادات نے ہمیشہ ان دونوں کو حیدر علیؒ کے خلاف اسلام دشمن انگریزوں کا حلیف بنائے رکھا۔ العیاذ باللہ۔

سیاسی تدبر وفوجی حکمت عملی: مغربی مؤرخین نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ سیاسی تدبر وفوجی حکمت عملی میں اُس وقت پورے ملک میں آپؒ کا کوئی مقابل نہیں تھا، آپؒ انگریزوں کے سخت دشمن تھے، لیکن نواب محمد علی اور نظام حیدرآباد سے آپؒ کی دشمنی انگریزوں کے ساتھ ان کے تعاون کی وجہ سے وقتی تھی، آپؒ کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی سلطنتیں متحد ہو کر ملک کی سرزمین سے انگریزوں کو نکال باہر کردیں، لیکن ہزار کوششوں کے باوجود آپؒ کی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی، آپؒ ہمیشہ اپنے دوستوں سے کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو میں اپنے وطن کو مشرک فرنگیوں سے پاک کر کے ہی رہوں گا، آپؒ کو انگریزوں کی فوجی طاقت اور جنگی صلاحیت کا بخوبی احساس تھا، آپؒ چاہتے تھے کہ مغربی فوج کا توڑ مغربی فوج ہی سے کیا جائے، اسی لیے فرانسیسیوں سے فوجی مدد لی، اس وقت عالمی سطح پر فرانس اور برطانیہ ایک دوسرے کے سیاسی حریف تھے، ان دونوں کے درمیان جنگ تک کی نوبت پہنچ گئی تھی، انگریزوں کی طرح فرانسیسیوں کے بھی ہندوستان میں کچھ مقبوضات تھے۔ (سیرتِ ٹیپو سلطان شہیدؒ / صفحہ:۱۵۷)

حیدر علیؒ نے جب ۱۷۶۱ء میں میسور کا تخت سنبھالا تو اس وقت انگریز بنگال کے علاقہ پر نواب سراج الدولہؒ کو شکست دے کر قابض ہو چکے تھے، اس

طرح ہندوستان میں انگریزوں کا سیاسی دورشروع ہوکران کا وجوداب ایک مُسلَّم حقیقت بن چکا تھا، چنانچہ میسور میں بھی انگریزوں کے ساتھ کئی مرتبہ جنگ ہوئی اورحیدرعلیؒ کے ہاتھوں انگریزوں کو پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔

حیدرعلیؒ کی بیماری : نومبر/ ۱۷۸۲ء میں جب کہ انگریزوں کے ساتھ مقابلہ جاری تھا حیدرعلی بیمار ہوگئے، آپؒ کے بدن پر دنبل نکل آئے تھے، معالجوں نے اس کو معمولی پھوڑا سمجھ کر علاج کیا، لیکن یہ پھوڑے درحقیقت سرطان (کینسر) کا پیش خیمہ تھے، جس کا اس وقت تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا تھا، یہی آپؒ کی وفات کا سبب بن گئے۔

وفات: یکم محرم الحرام/۱۱۹۶ھ مطابق : ۱۷۸۲ء کی شب اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

آپؒ کی تدفین سری رنگاپٹنم، لال باغ، صوبہ کرناٹک میں ہوئی۔ رحمہ اللّٰہ تعالیٰ۔ (سیرتِ سلطان ٹیپوشہیدؒ /صفحہ:۱۴۲)

مجاہد ملت اسلامیہ سلطان ٹیپو شہید رح[۱] متوفی ۱۲۱۳ھ

نام ونسب: آپ رح کے والد رح نے آپ رح کا نام ارکاٹ کے ولی ٹیپو مستان شاہ کے نام پر ٹیپو اور اپنے والد فتح محمد رح کے نام پر ''فتح علی'' رکھا، لیکن مقدم الذکر نام ہی سے آپ رح نے شہرت پائی اور بعد میں ''سلطان'' کا اضافہ ہوا، والد کا نام حیدر علی بن فتح محمد ہے۔

ولادت: ٹیپو سلطان رح کی ولادت ۲۰ / ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ مطابق: ۱۰ / نومبر ۱۷۵۰ء سنیچر کی صبح کو کولار کے شمال مغرب میں بنگلور سے ۳۳ کلومیٹر دور شمال میں دیون ہلی نامی قصبہ میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت: نواب حیدر علی رح نے خود ناخواندہ ہونے کے باوجود اپنے فرزند اور جانشین شیر میسور، سلطان ٹیپو رح مجاہد کی تعلیم کا خصوصی بندوبست کیا اور بچپن ہی میں ہر فن کی دینی و دنیاوی تعلیم اس کے ماہر اساتذہ سے دلوائی، ایک فوجی ماہر غازی خان کی نگرانی میں فوجی وجنگی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا، نتیجہ یہ تھا کہ وہ آغازِ جوانی ہی سے کسی بھی علمی موضوع یا فن پر کھل کر بول سکتے تھے، اس طرح ان کا شمار بھی چوٹی کے علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ میں ہوتا تھا، علمِ نجوم، سائنس، طب، انجینیر نگ اور موسیقی سے بھی ان کو بڑی حد تک واقفیت تھی، خطاطی میں بھی وہ

---

۱ مولانا محمد الیاس صاحب ندوی نے آپ رح کی سیرت تحریر کی ہے، جس کا نام ''سیرتِ سلطان ٹیپو رح'' ہے، اسی سے یہ مضامین مقتبس ہیں۔

مہارت رکھتے تھے، مختلف موضوعات پر انہوں نے پینتالیس سے زائد کتابیں خود لکھیں یا اپنی سرپرستی میں دوسروں سے لکھوائیں، کھانے کے دسترخوان پر فضول گفتگو کے بجائے وہ ہمیشہ کوئی اچھی دینی کتاب پڑھواتے، اُن کے دربار میں بھی مسلم علماء کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ موجود رہتی تھی، وہ عام گفتگو اور خط وکتابت کے لیے بالعموم فارسی ہی کو استعمال کرتے تھے، لیکن کنڑ، مراٹھی، تیلگو اور عربی میں بھی ان کو دسترس حاصل تھی، اردو تو وہ اچھی طرح جانتے ہی تھے، فرانسیسی بھی انہوں نے سیکھ لی تھی، انگریزی بھی وہ ایک حد تک جانتے تھے، اس طرح وہ متعدد یورپی زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے، مذہب وتصوف کی کتابوں سے ان کو بڑی دل چسپی تھی، منطق، فلسفہ، تاریخ، تفسیر، حدیث وفقہ کی کتابیں بھی ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں، رات کے وقت بستر پر لیٹ کر نیند آنے تک وہ کوئی کتاب ضرور پڑھتے رہتے تھے، خود ان کے محل میں ان کا ذاتی کتب خانہ موجود تھا۔

ف: ماشاءاللہ! نہایت اعلیٰ علمی ذوق کی علامت ہے، مگر افسوس کہ عموماً علماءِ کرام کے اندر بھی یہ ذوق مفقود ہوتا جا رہا ہے، اس لیے عموماً علم میں ترقی نہیں ہو رہی ہے، حالاں کہ حضورِ پاک ﷺ کو زیادتیٔ علم کی طلب کا امر فرمایا گیا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری ہے: {قُلْ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا} (آپ کہیے کہ اے میرے رب! میرے علم کو زیادہ فرمائیے۔) (مرتب)

تقویٰ و دین داری: ذاتی طور پر آپؒ کی دین داری اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ جنگوں میں مسلسل مصروف رہنے کے باوجود بلوغ کے بعد آپؒ کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی، جنگ کے ایام ہوں یا امن کے، انہوں نے فجر کے بعد کی تلاوت کا

کبھی ناغہ نہیں کیا، عام حالات میں ایک گھنٹہ قرآن مجید کی تلاوت کے لیے خاص تھا، آپؒ نے فوج میں بھی مسلمان سپاہیوں کے لیے نماز باجماعت کا حکم جاری فرمایا تھا، خود ہمیشہ باوضو رہنے کے عادی تھے، سر پر سرخ عمامہ رہتا تھا، لیکن اخیر میں علماء کے کہنے پر آپؒ نے سبز عمامہ پہننا شروع کر دیا تھا، جہاں تک چہرے پر داڑھی کا سوال تھا خود آپؒ کے معاصر ''نشانِ حیدری'' کے مصنف میر حسین علی کرمانیؒ کا کہنا تھا کہ آپؒ کے چہرے پر بال نہ ہونے کے برابر تھے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و اہل بیت سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا، خاص کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑی عقیدت تھی، اپنے تمام ہتھیاروں پر ان کا لقب ''اسد اللہ الغالب'' کندہ کروایا تھا، انبیاءِ کرام علیہم السلام سے بھی بڑی محبت تھی، حضرت الیاس علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے نام پر دو جہاز خضری و الیاسی بنوا کر اپنے بحری بیڑہ میں شامل کر دیے تھے، اپنی حکومت کو سلطنت حیدری یا سلطانی کے بجائے سرکارِ احمدی یا سرکارِ اسد اللہی اور زیادہ تر سلطنت خداداد سے موسوم کرتے تھے، آپؒ کا عقیدہ تھا کہ مجھے یہ سلطنت میری کسی ذاتی صلاحیت یا قابلیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملی ہے۔

ف : یہ نہایت معرفت کی بات ہے کہ اپنے کسی کمال پر نظر نہ ہو، بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا ثمرہ سمجھیں۔(مرتب)

تمام سرکاری خطوط وفرامین کے اوپر خود اپنے ہاتھ سے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھتے تھے، علمِ تصوف سے بھی بڑی دل چسپی تھی، آپؒ کے کھانے کے دسترخوان پر بھی وقت ضائع کرنے کے بجائے کوئی دینی کتاب ہمیشہ پڑھی جاتی

تھی، آپؒ کی زبان سے کبھی کسی نے کوئی فحش کلمہ نہیں سنا، آپؒ کے دشمنوں نے خود گواہی دی ہے کہ آپؒ نے کبھی کسی کا ناحق خون نہیں کیا۔

سادگی کا یہ عالم تھا کہ ۱۷۹۲ء میں انگریزوں کے ہاتھوں اپنی شکست کے بعد چارپائی پر سونا چھوڑ دیا تھا، اور شہادت تک زمین پر سادہ ٹاٹ بچھا کر سوئے، اس وقت پورے ہندوستان میں یہ رواج تھا کہ بادشاہ مسجد میں آتے تو وہاں بھی لوگ ان کی تعظیم میں کھڑے ہوتے تھے، آپؒ نے اس سے بچنے کے لیے ہی ایک الگ دروازہ اپنے محل سے مسجد آنے کے لیے بنوایا تھا، تاکہ مسجد میں آپؒ کی آمد کا لوگوں کو علم بھی نہ ہو۔ ہر سال سرکاری مصارف پر سینکڑوں لوگوں کو حج بیت اللہ کے لیے روانہ کیا جاتا تھا، مکہ و مدینہ جا کر عمرہ کرنے والوں کے لیے بھی سال بھر بحری جہازوں کی سہولیات فراہم کی گئی تھیں۔

وہ خود بھی اپنی نجی زندگی میں صاف ستھرے رہتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی نصیحت فرماتے تھے، زنا سے اس قدر نفرت تھی کہ زانی کے لیے بلاتفریق مذہب موت کی سزا مقرر تھی، آپؒ کے حرم میں کبھی کوئی غیر شادی شدہ عورت نہیں رہی، عام حکمرانوں کی طرح آپؒ نے کثرت سے شادیاں بھی نہیں کیں، بیک وقت آپؒ کے نکاح میں دو سے زائد بیویاں نہیں رہیں، مالابار کے فوجدار ارشد بیگ کی جب ایک عورت سے شناسائی ہوگئی تو آپؒ نے اس پر اس کی تنبیہ فرمائی اور اس عورت کو قید کر کے شہر بدر کر دیا، انگریز سپاہیوں کے ساتھ جب چند مسلم خواتین کے ناجائز تعلقات کا ثبوت ملا تو ان سب مسلم خواتین کو پھانسی دے دی گئی، جنگ کے دوران جب آپؒ کے مسلم سپاہیوں نے دشمن کی خواتین کے ساتھ

بدسلوکی کی تو ان کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا، شاہی محل کے جس کمرہ میں آپؒ کے گھر کی خواتین رہتی تھیں وہاں جانے والے راستے میں شیر بندھے رہتے تھے، تاکہ بدنیتی کے ساتھ کوئی ادھر جانے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکے۔

ف : ماشاء اللہ، کس قدر حزم و احتیاط کی علامت ہے، جو مؤمن صادق کی خاص صفت ہے۔ (مرتب)

کرمانیؒ نے آپؒ کے زہد وتقویٰ کا ایک عجیب وغریب واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپؒ کے محل میں کام کرنے والی دونو جوان اور حسین ملازماؤں کی نیت بگڑ گئی، اور وہ رات کے وقت سلطانؒ کے حجرہ میں داخل ہوکر آپؒ کے پیر دبانے لگیں، جب سلطانؒ کی آنکھ کھلی تو آپؒ غضب سے لال پیلے ہو گئے، اور آپؒ نے ان دونوں کو ان کی اس نازیبا حرکت پر سخت سزائیں دینے کا حکم دے کر ملازمت سے بھی بے دخل فرما دیا، شعائر دین اور اسلام کی نسبت سے ہر چیز کی آپؒ کے دل میں بڑی عظمت تھی، ۱۷۸۶ء میں حیدر آباد کے ایک امیر محمد خان بہادر نے آپؒ کو ایک تسبیح اور جانماز بھیجی تو آپؒ نے ان کو شکریہ کا خط یوں لکھا کہ ہدایا سے خوشی ہوئی، اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارے پاس دنیاوی تحائف بہت ہیں، لیکن یہ تحفہ دینی ہونے کی وجہ سے ہمیں نہایت عزیز ہے، آپؒ کے حکم سے ہر گاؤں میں سرکاری خرچ پر ایک ایک مسجد اور بڑے شہروں میں بقدرِ ضرورت مساجد تعمیر کی گئی تھیں، ہر مسجد میں دینی تعلیم کے مدرسے بھی قائم تھے، مؤذن، امام اور اساتذہ کی تنخواہیں سرکاری خزانہ سے دی جاتی تھیں۔

ف : دل سے دعا ہے کہ اللہ رب العزت آپؒ کو ان تمام کارہائے خیر کا خوب ہی خوب

اجروثواب مرحمت فرمائے اوراپنے قربِ خاص وقبول سے نوازے۔آمین۔(مرتب)

حیاء: سلطانؒ کی طبیعت میں حیا کا یہ عالم تھا کہ آپؒ کی زندگی میں آپؒ کے جسم کے کسی بھی حصہ کوسوائے ہاتھ پیراور چہرہ کے کسی نے کھلانہیں دیکھا،خود آپؒ کے اہل خانہ کا کہنا تھا کہ حمام کے اندر بھی آپؒ اپنے پورے جسم کو ڈھانک کر غسل فرماتے تھے،ملیبار میں گرمی کی وجہ سے ہندوعورتیں اپنا سینہ کھلا رکھ کر گھر سے نکلتی تھیں،آپؒ نے اس پر سختی سے پابندی لگادی تھی اورسرکاری حکم جاری فرمایا تھا کہ کوئی بھی عورت خواہ ہندو ہی کیوں نہ ہوسوائے چہرہ اور ہاتھوں کے اپنے جسم کا کوئی بھی حصہ کھلا رکھ کر گھر سے نہ نکلے،اس کی خلاف ورزی پر سزاؤں کا بھی اعلان کیا تھا،خود آپؒ کے معاصرین کا کہنا تھا کہ آپؒ نے زندگی میں کبھی ایسا کپڑا نہیں پہنا جس سے نماز جائز نہ ہوتی ہو،مطلب یہ کہ آپؒ باریک اور پتلا کپڑا پہننے کے عادی نہ تھے۔

مبارک خواب: ۱۷۹۴ء میں سلطانؒ نے ایک رات آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؒ کوشہادت کی خوش خبری سنا رہے ہیں،صبح بیدار ہوکر نمازِ شکرانہ ادا کی اوراللہ تعالیٰ کا اس پر شکرادا کیا۔عمامہ کی سنت کے نہ صرف خود آخر تک پابند رہے بلکہ اس کو اپنے فوجیوں کے لباس میں بھی شامل فرما دیا تھا،اپنے والد حیدر علیؒ کی وفات کے بعد جب آپؒ نے اپنا پہلا دربار لگایا تواس کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے کرایا،جب قاری نے سورۂ حشر کی آخری آیات:

{لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ}

پڑھیں تو آپؒ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے، اس کے بعد سلطنت کا تاج بھی اپنے سر پر ایک بڑے عالم کے ذریعہ ہی رکھوایا، اس کے بعد فقراء اور مساکین پر صدقات و خیرات کی بارش کی گئی۔

غرض یہ کہ سلطان ٹیپوؒ تقویٰ و زہد میں نہ صرف اپنے دور کے مسلم حکمرانوں بلکہ ماضی کے اکثر بادشاہوں میں بھی ممتاز و نمایاں تھے۔

حضرت ٹیپو سلطانؒ کی ولایت کا ظہور: ۱۲۰۴ھ مطابق: ۱۷۹۰ء کو عیدالفطر کے دن سلطانؒ کی خاص مسجد کا باقاعدہ افتتاح کیا گیا، سلطانؒ کی دعوت پر پوری سلطنت کے علماء و مشائخ بھی وہاں جمع تھے، سلطانؒ کی خواہش تھی کہ کوئی ایسا بزرگ اس مسجد کا افتتاح کرے جو صاحب ترتیب ہو، یعنی بلوغ کے بعد جس کی کوئی فرض نماز قضا نہ ہوئی ہو، حاضرین جن میں علماء و مشائخ وقت کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی کسی کو بھی خود کے متعلق اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ صاحب ترتیب ہے، جب کوئی صاحب ترتیب نہیں نکلا تو خود سلطانؒ نے آگے بڑھ کر امامت فرمائی اور کہا کہ الحمدللہ، میں صاحب ترتیب ہوں۔ اس بات کو معلوم کر کے لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

ف: یقیناً آپؒ کو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے فرائض کی ادائیگی کا اہتمام نصیب ہوا، جو آپؒ کی ولایت کی خاص علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔ (مرتب)

حیدر علیؒ کی وفات اور سلطان ٹیپوؒ کی جانشینی: سلطان ٹیپوؒ ملیبار کی اس مہم میں مصروف ہی تھے کہ حیدر علیؒ کو ایک مختصر بیماری کے بعد پیغامِ اجل آ گیا،

اس طرح جس عظیم اسلامی سلطنت کی بناء ان کے والد نواب حیدر علیؒ نے رکھی تھی اس کی آبیاری اب ان کے لائق فرزند ٹیپو سلطانؒ کے ذمہ ہوگئی، وفات کے وقت حیدر علیؒ نے اپنے امراءِ سلطنت کو وصیت کی تھی کہ جس وفاداری سے آپ لوگ میری خدمت انجام دے رہے تھے اسی طرح میرے بعد ٹیپو کا بھی تعاون کریں، وفات سے ایک روز قبل واپس آنے کے لیے ٹیپوؒ کو حیدر علیؒ نے خط بھی لکھا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ پہنچتے ان کی وفات ہوگئی۔

بروزِ سنیچر ۲۰/ محرم الحرام ۱۱۹۶؁ھ مطابق: ۲۷/ دسمبر ۱۷۸۲؁ء کو باضابطہ تختِ شاہی پر بیٹھنے سے قبل آپؒ نے اپنی والدہ کی خدمت میں حاضری دی، ان کی دعائیں لیں اور دو رکعات نفل پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے بارِ امانت کو سنبھالنے کے لیے توفیق کی دعا مانگی، پھر دربار میں آ کر تختِ شاہی پر رونق افروز ہوئے، دربارِ شاہی کی پہلی مجلس کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا، قاری نے سورۂ حشر کے آخری رکوع کی تلاوت کی، قاری نے جب {لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلىٰ جَبَلٍ لَرَ أَيْتَهٗ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ} کی تلاوت کی تو چوں کہ آپؒ عالم تھے اور عربی زبان سے واقف بھی، اس لیے ان آیات کو سن کر آپؒ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے، پوری مجلس پر بہت دیر تک سکتہ طاری رہا، پھر اس کے بعد اس مجلس میں موجود ایک بڑے عالم کے دست مبارک سے تاجِ سلطنت کو اپنے سر پر رکھا، اس وقت پوری سلطنت کے گورنروں کے نام آپؒ نے فرمان جاری فرمایا کہ اقتدار کی منتقلی کے باوجود نظمِ سلطنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، ہر شخص پہلے کی طرح اپنی جگہ اپنی ذمہ داری کو ادا کرے، تخت نشینی کے دیگر مراسم

جنگ کے جاری رہنے کی وجہ سے ادا نہیں کیے جا سکے، اس کی نوبت ۸۴ے۱ء کے اختتام پر آئی، جب میسور کی دوسری جنگ مکمل ہو چکی تھی۔

عوام کے نام پہلا سلطانی فرمان: عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ نے اپنی رعایا کے نام جو پہلا سرکاری فرمان جاری فرمایا اس میں آپؒ کے نیک عزائم اور رعایا کی خدمت کے جذبات اور حسن نیت اور ہمدردی کی عکاسی تھی، فرمان کا مضمون کچھ یوں تھا:

(۱) میں سطان ٹیپو بحیثیت حکمران ریاستِ میسور سلطنت خداداد اس بات کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہوں کہ بلاتفریق مذہب وملت اپنی رعایا کی اخلاقی اصلاح کروں۔

(۲) ان کی خوش حالی اور معاشی وسیاسی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہوں۔

(۳) آخری دم تک سلطنت خداداد کی ایک ایک انچ زمین کی حفاظت کروں۔

(۴) مسلمانوں کی دینی واخلاقی بنیادوں پر اصلاح کے لیے خصوصی قدم اٹھاؤں۔

(۵) انگریزوں کو اس ملک سے باہر کرنے کے لیے جو ہمارے حقیقی دشمن ہیں پورے ہندوستان کے لوگوں کو متحد کروں۔

(۶) مظلوم وبے بس عوام کو جاگیرداروں اور زمین داروں کے ظلم وستم سے نجات دلاؤں اور عدل وانصاف کی بنیاد پر ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کروں۔

(۷) ملک کے باشندوں کے درمیان پائی جانے والی مذہبی، لسانی وطبقاتی عصبیت کو ختم کر کے ملک کے دفاع کے لیے ان سب کو متحد کروں۔

(۸)بوقتِ ضرورت مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے غیر ملکیوں سے بھی فوجی تعاون سے دریغ نہ کروں، سلطنت میسور میں غیر ملکی تجارت ومصنوعات کو ممنوع قرار دے کرخود یہاں کے تاجروں کی ترقی وخوش حالی کی فکرکروں۔

روزانہ کی عبادات اور کار ہائے سلطنت کے معمولات: جنگ کے حالات ہوں یا امن کے ایام، سلطانؒ ہمیشہ علی الصباح بیدار ہونے کے عادی تھے، غسل کے بعد نمازِ فجر محل سے متصل مسجد اعلیٰ ہی میں جماعت کے ساتھ ادا فرماتے، اس کے بعد ایک گھنٹہ تلاوتِ کلامِ پاک میں مصروف رہ کر کچھ دیر ورزش بھی کرتے، جس کے بعد ہلکا سا ناشتہ ہوتا، جس میں عام طور پر پرندوں کا گوشت وغیرہ ہوتا، پھر کچھ دیر بعد دربار میں حاضر ہوتے، جہاں فوج کے اعلیٰ افسران سے مختصر ملاقات ہوتی، اس دوران آپؒ کے ہاتھ میں برابر تسبیح بھی رہتی، جس سے آپؒ اپنے روزانہ کے اوراد ووظائف مکمل فرماتے، دربار سے سیدھے محل کے کمروں میں تشریف لے جاتے، جہاں قیمتی ہیرے و جواہرات وغیرہ رکھے ہوتے، ان کی حفاظت پر مامور لوگوں سے ان کے بارے میں اطمینان حاصل کر لینے کے بعد ان کو مختلف ہدایات دے کر چہل قدمی کے لیے نکلتے، تھوڑی دیر سیر کر کے پھر واپس دربار میں آجاتے، جہاں اپنے چند اعلیٰ افسران اور دو تین شہزادوں کے ساتھ مل کر ناشتہ کرتے، جس میں عام طور پر پھل اور دودھ کے علاوہ اخروٹ اور بادام وغیرہ ہوتے، ناشتہ کے دوران ہی ماضی کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے مستقبل کے لیے فوجی منصوبے تیار کیے جاتے، اور مختلف محکموں کے سکریٹریوں کے نام ہدایات پر مشتمل خطوط بھی املا کرائے جاتے، اس کے بعد فوج کا معاینہ کرتے ہوئے دوبارہ

دربار میں پہنچتے، اعلیٰ افسران اس موقع پر حاضر ہوتے، پھر ڈاکیہ حاضر ہوکر خطوط و عرضیوں پر مشتمل ایک تھیلا پیش کرتا، جس کو وہیں کھولا جاتا، مختلف شعبوں کے ذمہ داران بھی حاضر ہوکر گذشتہ روز کی کارروائی سناتے، ان کے مالی حسابات کو سلطان ؒ خود دیکھتے، عام طور پر خطوط فارسی، اردو، کنڑ اور تیلگو وغیرہ میں ہوتے، اسی کے حساب سے دربار میں ان زبانوں پر عبور رکھنے والے سکریٹری مقرر تھے، جو اپنے حصوں کے خطوط نکال کر باری باری سلطان ؒ کو سناتے، جس کے بعد آپ ؒ اسی وقت مطلوبہ زبانوں میں جوابات خود املا کراتے، یہ سلسلہ دوپہر کے ڈھائی تین بجے تک چلتا رہتا تھا، عام لوگ اپنی درخواستیں دربار میں موجود ایک عرضی بیگ کے ذریعہ سلطان ؒ کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔

جب دربار برخاست ہوتا تو سلطان ؒ اپنے حجرہ میں آکر ظہر کی نماز ادا فرماتے، دوپہر کے کھانے کا معمول نہیں تھا، دن میں صرف دو وقت غذا یعنی صبح کا ناشتہ اور شام کے کھانے کے عادی تھے، نمازِ ظہر کے بعد آرام کیے بغیر شہر کے فوجی اسلحہ کے کارخانوں میں جاکر خود ان کا معاینہ فرماتے، فوج کا جائزہ لیتے اور ان کے لیے پیش آمدہ مسائل میں فوری احکام بھی جاری فرماتے، اگر اس دن دارالسلطنت کے قلعہ کی مرمت و اصلاح چل رہی ہوتی تو اس کو بھی دیکھتے، عصر کی نماز پڑھ کر بازار کا رُخ فرماتے، جہاں سے محل کو واپسی مغرب کے بعد ہی عام طور پر ہوتی تھی، بعد مغرب محل میں پھر دربار لگتا، بقیہ خطوط کی پیشی ہوتی، ان کے جوابات لکھوائے جاتے، یہاں تک کہ رات کے کھانے کا وقت آجاتا۔

رات کے کھانے پر بھی کچھ افسرانِ فوج، وزراءِ سلطنت اور بعض شہزادے

سلطانؒ کے ساتھ شریک دسترخوان ہوتے، کھانے کے دوران اکثر و بیشتر علمی و دینی گفتگو چلتی، اچھے اشعار سنائے جاتے، یا کوئی دینی کتاب پڑھوائی جاتی، کھانے سے فارغ ہو کر تنہا چہل قدمی کے لیے نکلتے، عشاء کی نماز کے بعد اپنے کمرہ میں آ کر بستر پر لیٹ جاتے، اور جب تک نیند نہ آتی کسی کتاب کا مطالعہ کرتے رہتے، علی الصباح بیداری سے لے کر رات کو بستر پر جانے تک آپؒ کسی بھی وقت آرام نہیں فرماتے تھے، بلکہ روزانہ مسلسل سولہ گھنٹے مصروفِ عمل ہی رہتے تھے۔

شکایتی خط کا اصولی جواب: ۱۷۸۶ء میں ایک دفعہ تربیت علی خان نائطہ نے سلطانؒ کو شکایتی خط لکھا کہ خطوط کے جوابات بہت تاخیر سے دیے جاتے ہیں، اس پر سلطانؒ نے اس کو لکھا کہ ''آپ لوگوں کو سوائے سونے، کھانے اور خوش گپیوں کے کوئی کام نہیں، ہم صبح سے رات گیارہ بجے تک مسلسل امورِ سلطنت میں مشغول رہتے ہیں، اور جب بھی فرصت ملتی ہے خطوط کے جوابات لکھے جاتے ہیں۔''

جب کسی دن سلطانؒ بہت تھک جاتے تو آرام کرنے کے بجائے دربار ہی میں لوگوں سے تفننِ طبع کے لیے قصے یا لطیفے سنتے، عام لوگوں کی طرح آپؒ کے پاس تفریحی مشاغل کے لیے وقت ہی نہیں تھا، اور آپؒ دوسروں کے لیے بھی اس چیز کو پسند نہ فرماتے تھے، ناچ گانے اور رقص و سرود کی محافل کے لیے آپؒ کے پاس کوئی گنجائش نہ تھی، آپؒ خود اپنے ہاتھ سے فارغ اوقات میں اپنا روزنامچہ تحریر فرماتے، جس میں عام طور پر رات میں دیکھے جانے والے خوابوں کی تفصیلات اور ان کی تعبیر ہوتی تھی، اپنی اس ذاتی ڈائری کو سلطانؒ بڑی حفاظت سے دوسروں بلکہ خود اپنے گھر والوں کی نظروں سے بھی چھپائے رکھتے تھے۔

اسلامی معاشرہ کے قیام کی کوشش: سلطانؒ اپنی سلطنت میں ایک مثالی اسلامی معاشرہ کا قیام چاہتے تھے، آپؒ عام مسلمانوں کو اسلامی شریعت کی پابندی کے ساتھ جس حالت میں دیکھنا چاہتے تھے اس کا ایک ہلکا سا خاکہ اس حکم نامہ میں آ گیا ہے جو آپؒ نے اپنی سلطنت کے تمام قاضیوں کے نام بڑے اہتمام کے ساتھ جاری فرمایا تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

از: سلطنتِ خداداد سلطان ٹیپو

یہ حکم نامہ شہر بنگلور اور اس کے ماتحت علاقوں کے تمام موجودہ اور آنے والے قاضیوں اور خطیبوں کے لیے ہے:

(۱) آپ کو منصب قضا اور ایک شرعی عہدہ پر مقرر کیا گیا ہے، چاہیے کہ آپ خود نماز روزہ کی پابندی کریں، اور نواہی سے اجتناب کریں۔

(۲) کسی کی بے جا رعایت اور طرف داری نہ کریں۔

(۳) رشوت نہ لیں۔

(۴) لوگوں کو طاعات کی ترغیب دیں۔

(۵) نشہ آور چیزوں کے استعمال سے منع کریں۔

(۶) زانیوں اور شرابیوں کو سزائیں دیں۔

(۷) نمازِ جمعہ وعیدین میں جمہور مسلمین کو جمع کریں۔

(۸) اہل دنیا و دین، بوڑھے، جوان اور بچوں کو دینی و دنیاوی علوم وفنون سکھائیں۔

(۹) مردوں اور عورتوں کی ان کی مرضی معلوم کرنے کے بعد ہی شادی کریں۔

(۱۰) مساجد کو آباد کریں، ان میں اذان ونماز کا پوری طرح اہتمام کریں۔

ان تمام کاموں میں جزء سے لے کر کل تک کسی کام میں اس قانونِ اعظم کے مطابق جس کا نام شرعِ محمدی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) ہے، کسی بھی حال میں رعایت وتعطل نہ ہو، ان نیک کاموں کو بجالانا افضل طاعات ہے۔

اہل دین و دنیا کا حال و مآل درست کرنا اس دولت خداداد کی ترقی و پائداری کا باعث ہوگا، اسی بنا پر خلق اللہ کی بہتری و بہبودی کے لیے بعض احکام ذیل میں لکھے جاتے ہیں، انہیں بغیر کسی کوتاہی کے فوراً عمل میں لائیں، آپ کی گزراوقات کے لیے سرکار سے معاش (وظیفہ) مقرر ہے، لہٰذا آپ کو سرکاری احکام کے مطابق اپنے کام میں ہمیشہ مستعد وسرگرم رہنا چاہیے۔

(۱) مسجد کے استاذ کو چاہیے کہ تمام اہل اسلام کے بچوں کو جمع کر کے ہر روز سبق دے اور مشق کرائے۔

(۲) تمام مسلمان بچوں کے نام مع ولدیت اور ان کی کتابوں کی تفصیلات کے ساتھ جو پڑھتے ہیں حضوری میں بھیج دیے جائیں۔

(۳) اگر کوئی بچہ ناغہ کرے یا پڑھنے نہ آئے تو استاذ اس کی اطلاع دے اور اس علاقہ کا تعلق دار بچوں کو طلب کر کے استاذ کے حوالہ کرے۔

(۴) اس قسم کے مدارس ومساجد اور دوسری جگہوں پر قائم کیے جائیں۔

(۵) بچوں کو پہلے پہاڑے، پھر حساب سکھائے جائیں۔

(۶) اگر خود استاذ حساب سے ناواقف ہو تو پہلے وہ خود کسی محاسب سے

اس کو سیکھے، پھر بچوں کو سکھائے۔

(۷) اس کے بعد بچوں کو علمِ انشا اور لکھنا پڑھنا سکھائے۔

(۸) مسجدوں کے خطیب اور مؤذن اپنے مقررہ کام سے فراغت کے بعد بچوں کو درس دیں۔

(۹) پانچ آدمیوں کو ختم قرآن کے لیے جمعہ کے روز مقرر کریں، جو ایک دن اور رات میں پورا قرآن ختم کریں، ختم قرآن کے بعد جمعہ کی شب میں وہ مملکت کی ترقی اور اس کے دشمنوں کی شکست کے لیے دعا کریں۔

(۱۰) قاضی کو چاہیے کہ جمعہ کے دن تمام اہل اسلام کو اعلان کے ساتھ نماز کے لیے طلب کرے، اگر کوئی بلا وجہ حاضر نہ ہو تو اس پر ایک روپیہ جرمانہ عائد کرے، اگر وہ جرمانہ کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو حدیث شریف کے مطابق اس پر جو سزا مقرر ہے اس کے مطابق اس پر حد شرعی جاری کرے۔

(۱۱) قاضی کو چاہیے کہ اس امر کا پورا اہتمام کرے اور تاکید کرے کہ کوئی بھی شخص زنا جیسے فعل شنیع کا مرتکب نہ ہو، کیوں کہ اس کی وجہ سے شہروں اور ملکوں پر بلائیں اور آفتیں آتی ہیں، اولاد نا جائز پیدا ہوتی ہے، اور مختلف قسم کے مذموم فعل لوگوں میں پھیل جاتے ہیں، کیوں کہ زنا و شراب نوشی ام الخبائث ہیں اور افعالِ شنیعہ میں سب سے بدتر ہیں، اگر خود قاضی ان کاموں سے لوگوں کو منع کرنے اور ان چیزوں کو بند کرنے کا اہتمام نہ کرے تو شریعت کے مطابق خود اس کو بھی سزا دی جائے گی۔

(۱۲) قاضی اپنے علاقہ کی مردم شماری کرائے، جس میں مکانات،

مردوں، عورتوں اور بچوں مع ان کے مشاغل کی پوری تفصیلات ہوں، پھر اس سے سرکار کو مطلع کرے، اور اس کی ایک نقل اپنے پاس بھی رکھے۔

(۱۳) اگر کسی مسلمان کے گھر بچہ پیدا ہوتو قاضی کو چاہیے کہ وہ اس کو اپنے سامنے طلب کرے، اس کا نام رکھے، چار سال چار ماہ بعد اس کی بسم اللہ خوانی بھی کرائے۔

(۱۴) ماہِ رمضان المبارک میں سرکار کی طرف سے مفت کھانا پکوا کر محتاجوں اور مسکینوں میں مفت تقسیم کیا جائے، اس کے لیے ایک شخص کو اس جگہ ذمہ دار بھی مقرر کیا جائے، ان تمام اخراجات کے لیے ایک محاسب بھی ہو، جو پورا حساب و کتاب رکھے، اور اس کی اطلاع کے بغیر ایک آنہ بھی خرچ نہ کیا جائے۔

(۱۵) قاضی کو چاہیے کہ ہر ماہ خطیب، ملا، استاذِ قرآن وغیرہ کی حاضری کی کیفیت سے سرکار کو مطلع کرے۔

(۱۶) اگر قاضی چوری، زنا، رشوت اور شراب وغیرہ کے باب میں شرعی حدود کو جاری نہ کرے تو اس کو عہدۂ قضا سے معزول کیا جائے گا۔

(۱۷) اگر قاضی خود رشوت لے یا ناانصافی کا مرتکب ہوتو وہ بھی جہنم کی وعید میں داخل ہے، اس پر اس کو منصب قضا سے معزول کر کے اس کی جگہ دوسرے کو مقرر کیا جائے گا، اسی طرح اگر وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دے تو وہ کافر گردانا جائے گا۔

(۱۸) قاضی کو چاہیے کہ اپنے علاقہ کے تمام اہل اسلام کے کسب اور ذریعۂ معاش کی پوری تحقیق کرے، اگر کوئی شخص تجارت کر سکتا ہو، لیکن اپنی

ناداری کی وجہ سے تجارت نہ کرے تو اس کو سرکار کی طرف سے پچاس سے سو روپئے تک دلائے جائیں۔

(۱۹) زراعت پیشہ لوگ اگر تنگ دستی کی وجہ سے کاشتکاری نہ کرتے ہوں تو ہر ایک کو دو ہل اور بیلوں کے علاوہ بالائی خرچ کے لیے بیس سے تیس روپئے سرکار کی طرف سے دیے جائیں، اس علاقہ کا عامل اس کو قابل کاشت جگہ بھی دے، اور بیج بھی اس کو بقدرِ ضرورت فراہم کیے جائیں، اگر دو سال بعد اس کی حالت اچھی ہو تو وہ سرکار کا قرض قسط وار ادا کرے، ان کاموں کے لیے جو روپیہ عامل سے لیا جائے اس کی رسید خود قاضی اپنی دستخط اور مہر کے ساتھ اس کو دے۔

(۲۰) قاضی کو چاہیے کہ مساجد و عبادت گاہوں کو گرد و غبار سے پاک رکھے، سفیدی کرائے، فرش صاف رکھے، صحن مسجد کو جھاڑو دے، اس کو خس و خاشاک سے پاک رکھے، مختلف قسم کے پھول کے درخت لگا کر مساجد کو مزین و منور رکھے، تاکہ اس سے نہ صرف مسلمانوں کو ترغیب ہو، بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی یہ مساجد کشش کا باعث بنیں، قاضی خود مسلمانوں کی عبادات کی نگرانی کرے، اس طرح کہ وہ ضلالت و گمراہی کے طریقوں کو چھوڑ کر شریعت و دین ہدیٰ کی طرف رجوع ہوں۔

(۲۱) قاضی ہمیشہ غیر مسلم مردوں و عورتوں کی خبر گیری رکھے، ان سے ہمدردی کا اظہار کرے، پند و نصیحت اور شیریں کلام سے ان کے دلوں کو مسخر کرے، اور بالکل رازداری سے اس طور پر کہ ان کے گھر والوں کو بھی خبر نہ ہو ان کو اسلام کی دعوت دے، اور جو لوگ مسلمان ہونا چاہیں ان کو اسلام میں داخل

کرے، اگر تالیف قلب کے لیے ان نو مسلموں کو قرض کی بھی حاجت ہو تو سرکار کی طرف سے اس کا بندوبست کرے، جو نو مسلم تجارت کر سکتا ہو اس کو پچاس سے سو روپئے دے، زراعت میں دل چسپی رکھنے والوں کو دو ہل اور بیل اور بالائی خرچ کے لیے بیس سے تیس روپئے تک اور زراعت کے لیے بیج کے علاوہ قابل کاشت زمین کا بھی انتظام کرے۔

(۲۲) اگر قاضی خود کو اپنے منصب کا اہل نہ پائے یا امر ونہی کے احکام جاری کرنے میں تغافل سے کام لے تو حکومت کو اس سے آگاہ کرے۔

(۲۳) بچوں کی تعلیم کے لیے ہر گھر سے ماہانہ پاؤ فلم (سکہ) وصول کیا جائے۔(اس زمانہ میں اس میں مناسب ترمیم کی جاسکتی ہے۔مرتب)

(۲۴) نکاح خوانی، بسم اللہ خوانی اور بچوں کا نام رکھنے کے لیے بھی ایک ایک روپیہ وصول کرے۔

(۲۵) ہر مسلمان کے گھر سے قاضی سالانہ ایک فلم وصول کرے۔

(۲۶) قاضی کی طرف سے گائے کو ذبح کرنے کے لیے پاؤ فلم اور بکرے کے لیے ایک آنہ لیا جائے۔

ف: سبحان اللہ! کیسی خوبی کے ساتھ پند ونصائح اور احکام وقوانین کی تشریح فرمائی، جو آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں، بلکہ انہیں اس ملک میں اداروں کے علماء، مشائخ اور دار القضا کے مفتیوں اور قاضیوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ (مرتب)

ملت فروشوں کی خفیہ سرگرمیاں: ایک طرف انگریز ٹیپو سلطانؒ کو اپنے

راستے سے ہٹانے کے لیے کمر بستہ تھے اور اپنی تیاریاں مکمل کر چکے تھے، تو دوسری طرف انگریزوں ہی کی ہدایت پر سلطانؒ کے نمک خوار بعض وزراء وافسران خود اپنے محسن آقا کے خاتمہ کے لیے انگریزوں کو مواقع فراہم کرنے کے منصوبوں پر غور وخوض کر رہے تھے، اس میں ان سب کی قیادت وزیر اعظم سلطنت خداداد میر صادق کر رہا تھا، ملت فروشی کی ان خفیہ سرگرمیوں میں اس کے ساتھ میر معین الدین، میر قمر الدین، غلام علی لنگڑا اور پورنیا وغیرہ شامل تھے، ان کی اکثریت شیعہ مذہب سے تعلق رکھتی تھی، ان میں سے ہر ایک ایسا تھا کہ ٹیپو سلطانؒ نے ان کی کسی بھیانک غلطی یا سازش کی وجہ سے ان کے عہدوں سے ان کو معزول کر دیا تھا، یا پھر بعض کو کچھ دنوں کے لیے نظر بند بھی کر دیا تھا، لیکن بعد میں اپنے حسن اخلاق اور انسانی سلوک کی وجہ سے ان میں سے اکثر کو معاف کر کے ان کے سابقہ عہدوں پر بحال کر دیا تھا، یہی وجہ تھی کہ اپنی توہین کو لے کر سلطانؒ کے سلسلہ میں ان کے دلوں میں اب بھی رنجش باقی تھی، چنانچہ انتقام لینے کے لیے اس سلسلہ میں چند مخصوص افراد کی ایک خفیہ مشاورتی نشست بھی ہوئی، جس کے بعد انگریزوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی گئی کہ حملہ کے لیے کون کون سے راستے محفوظ ہیں، اور کن کن قلع داروں کو رشوت دے کر خریدا جا سکتا ہے۔

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے پوری ملت کی طرف سے اپنے اشعار میں اس کی یوں ترجمانی فرمائی ہے:

جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن
ناقبول و نا امید و نامراد — ملّتے از کارِ شاں اندر فساد

معرکۂ حق و باطل کا فیصلہ کن دِن : ۱۷۹۹ء مئی کی چوتھی تاریخ تھی، سلطانؒ نے آج بھی حسب معمول نمازِ فجر مسجد اعلیٰ ہی میں ادا کی، نماز کے بعد سلطانؒ کے پرائیویٹ سکریٹری میر حبیب اللہ نے عرض کیا کہ وقت کا تقاضا ہے کہ حضور جانِ عزیز پر رحم فرمائیں اور اپنے شہزادوں کی یتیمی و اسیری کا تصور کریں، دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ دشمنوں سے صلح کرلیں، سلطانؒ نے جواب دیا کہ ہم سالوں سے اس سلطنتِ خداداد کو جو ہماری رعایا بالخصوص مسلمانوں کی ملکیت ہے، بچانے کی فکر کررہے ہیں، لیکن وزراء وافسرانِ سلطنت ہی درپردہ اس کی تباہی کے درپے ہیں، انسان کو صرف ایک دفعہ موت آتی ہے، اس سے ڈرنا لاحاصل ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ وہ کب آئے اور کہاں آئے؟ میں اپنی ذات کو مع اپنی اولاد کے دین محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام پر نثار کرنے کا فیصلہ کرچکا ہوں، یہ سن کر میر حبیب اللہ خاموش ہوگیا۔

ادھر آفتاب معمول کے مطابق طلوع ہورہا تھا، لیکن ادھر سلطانؒ کا نیّرِ اقبال ڈوب رہا تھا، آج تاریخ انسانی خودداری وآزادی کا ایک باب ختم کرکے غلامی کا ایک نیا باب شروع کرنے والی تھی، سرزمین سری رنگاپٹنم بھی اپنے مالک حقیقی سے گریہ کناں تھی کہ آج سے اس کی پشت پر پاک روحوں کی جگہ ناپاک روحوں کی حکمرانی کا آغاز ہونے والا ہے، انگریز اپنے منصوبے کے مطابق اپنی تمام تیاریوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے تھے، ابلیس لعین اپنے چیلوں کے ذریعہ اپنے ناپاک عزائم کو عملی جامہ پہنتے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سمارہا تھا، قلعہ کے اندر اور باہر ہر جگہ سازشیں مکمل ہوچکی تھیں، ضمیر فروشی وملت فروشی کا سودا مکمل ہو

چکا تھا، اور غدارانِ ملک وملت کی طرف سے سلطانؒ کی تیاریوں کی تمام خبریں بھی پوری تفصیل کے ساتھ ویلزلی کو مل رہی تھیں، میر صادق اپنے اخوان الشیاطین کے ساتھ مل کر انگریزوں کو قلعہ پر حملہ کا پورا منصوبہ سمجھا چکا تھا، اس خبیث ننگِ دین وننگِ وطن کی باتوں اور وعدوں پر انگریزوں کے بھروسہ نہ کرنے کی سابقہ تجربات کی روشنی میں کوئی وجہ بھی نہیں تھی، انگریزوں کو اس سلسلہ میں خود اپنے سپاہیوں سے زیادہ سلطانی افواج کے ان ضمیر فروشوں پر بھروسہ تھا، جو سلطانؒ کی پیٹھ میں پہلے ہی چھرا گھونپ چکے تھے، نا اُمیدی و مایوسی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی اُمید کی ایک شمع ابھی بھی روشن تھی، یہ سلطانؒ کے وفادار وجاں نثار سپاہیوں کا وہ دستہ تھا جس نے اپنے وطن ومذہب کی حفاظت کے لیے آخری دم تک آپؒ کے شانہ بشانہ لڑنے کا اپنے رب سے عہد کیا تھا، ان کے رب نے بھی ان کے ارادوں کو ان کی منشا و دعا کے مطابق اب تک غیر متزلزل ہی رکھا تھا، وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں اپنے رب سے ملنے اور جنت میں پہنچنے کا اشتیاق بڑھ ہی رہا تھا، یہ سید عبدالغفار کی کمان والی وہ جمعیت تھی جس کے بعض سپاہیوں کے ناموں سے خود سلطانؒ بھی ناواقف تھے، لیکن ان کے چہروں کی نورانیت و بشاشت یہ گواہی دے رہی تھی کہ یہ اپنے خون کے آخری قطروں سے ملت ووطن کی ایک سنہری تاریخ لکھنے جا رہے ہیں، اس طرح آج نہ صرف تاریخ اسلامی بلکہ تاریخ انسانی کا ایک اہم حادثہ وقوع پذیر ہونے والا تھا، اور وہ وطن کی مکمل صبح آزادی کا خواب دیکھنے والے اس کے فرزندِ جلیل کی زندگی کا تقدیر الٰہی کے مطابق آخری دِن بھی تھا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

سلطان ؒ کا شوقِ شہادت و بے قراری: دوپہر کا وقت تھا، سلطان ؒ قلعہ کی مختلف فصیلوں کا معاینہ کر کے ایک سایہ دار درخت کے نیچے تشریف فرما تھے، کھانا لایا گیا، بسم اللہ پڑھ کر آپ ؒ نے اس میں سے پہلا لقمہ لیا ہی تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر اطلاع دی کہ سید عبدالغفار شہید ہو گئے ہیں اور انگریزی افواج قلعہ میں داخل ہو گئی ہیں، سلطان ؒ تو قلعہ میں دشمن کی افواج کے داخلہ کا انتظار کر ہی رہے تھے اور اپنی شہادت کے یقین کے ساتھ صبح ہی سے اس کے منتظر تھے، آپ ؒ نے اپنے رفقاء سے فرمایا کہ "لگتا ہے کہ ہم بھی اب کچھ ہی دیر کے مہمان ہیں۔" یہ فرما کر آپ اٹھے اور بغیر ہاتھ دھوئے اپنے طاؤس نامی گھوڑے کو منگوایا، تلوار سنبھالی، دونالی بندوق تھامی، جسم پر قباء تھی، بغیر کسی توقف کے گھوڑے پر سوار ہوئے اور دشمن کی طرف چل پڑے، راستہ میں نمک حرام وضمیر فروش وزراء ملے، اس میں میر صادق بھی تھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا سلطان ؒ نے کہا کہ ایسی بات نہیں ہے کہ ہم تمہاری غداری سے واقف نہیں، تم اپنی اس بے وفائی کا جلد ہی مزہ چکھو گے، تمہاری آئندہ آنے والی نسلیں تمہارے ان سیاہ کارناموں کی نحوست سے ایک ایک دانہ کی محتاج ہوں گی، میر صادق نے فوراً دشمنوں کو اطلاع بھیجی کہ سلطان ؒ محل سے نکل کر فلاں دروازے کے قریب پہنچ رہے ہیں، ایک روایت کے مطابق سلطان ؒ نے اس صبح کو غداروں کی ایک فہرست تیار کی تھی، جن کو دوسرے دن پھانسی دینی تھی، اس میں سر فہرست میر صادق کا نام تھا، اس کی اطلاع میر صادق کو بھی ہو چکی تھی۔

خس کم جہاں پاک، میر صادق موت کے گھاٹ: سلطان ؒ تیزی سے ڈوڈی دروازہ سے باہر نکلے اور دہلی دروازہ کے پاس پہنچے، اور بڑی دیر تک

انگریزی افواج سے مقابلہ کرتے رہے، جب دشمنوں کا ہجوم بڑھتا گیا، تو ڈوڈی دروازہ سے واپس شہر میں سلطانؒ نے داخل ہونے کی کوشش کی، لیکن میر صادق اس طرف سلطانؒ کو واپس آتے ہوئے دیکھ کر اس دروازہ کو بند کر کے خود کمک لانے کے بہانے باہر نکل چکا تھا، سلطانؒ کے کڑپہ کے ایک وفادار سپاہی احمد خانؒ سے اس کی یہ کمینہ حرکت دیکھی نہیں گئی، اس نے فوراً میر صادق پر یہ کہتے ہوئے وار کیا کہ سلطانؒ کو دشمنوں کے منہ میں دے کر خود کہاں بچ کر جا رہا ہے؟ ایک ہی وار میں اس کا سر تن سے جدا ہو گیا، چار دن تک اس کی لاش اسی جگہ پڑی سڑتی رہی، پورا حلیہ بگڑ گیا تھا، بعد میں چند لوگوں نے بدبو سے پریشان ہو کر اس کی لاش کو زمین میں دفن کر دیا، اس کی قبر کے پاس سے جب بھی کوئی گزرتا تو اس پر ضرور تھوکتا، غدار میر معین الدین بھی اسی دن ایک خندق میں گر کر مر گیا۔

سلطانؒ کی شہادت کے آخری لمحات: شہر میں دوبارہ داخل ہونے کے لیے جب سلطانؒ نے ڈوڈی دروازہ کو بند پایا، تو شمالی دروازہ کی طرف بڑھے، لیکن معلوم ہوا کہ میر معین الدین کی غداری سے دشمن اس دروازہ کے علاوہ مشرقی وجنوبی فصیل پر بھی قبضہ کر چکے ہیں، قلع دار سے آپؒ نے اس دروازہ کو کھولنے کی درخواست کی، لیکن اس بدبخت نے بھی سنی اَن سنی کر دی، اس طرح اب سلطانؒ تینوں طرف سے محصور ہو گئے تھے، پھر بھی آپؒ نے دشمنوں پر فائر کیے، جس سے پانچ سپاہی اسی وقت مارے گئے، ہر طرف سے آپؒ پر بھی گولیوں کی مسلسل بوچھار ہو رہی تھی، جس سے سلطانؒ کو کئی زخم آ چکے تھے، لیکن اب تک آپؒ دشمنوں کے سامنے ڈٹے ہوئے تھے۔

مغرب کا وقت تھا، گھمسان کی لڑائی جاری تھی، مرد تو مرد، ہندو و مسلم خواتین تک بڑھ بڑھ کر دشمنوں پر حملہ کررہی تھیں، ایک ایک کر کے اکثر جاں نثار شہید ہوکر اپنی وفاداری کا ثبوت دے چکے تھے، اوران کی لاشیں ہر جگہ بکھری پڑی تھیں، اسی دوران سلطان ؒ کے ایک نومسلم خادم راجہ خان نے سلطان ؒ کوآواز دی کہ حضور! اگراب بھی اپنی جان کی حفاظت کے لیے خودکودشمن کے حوالہ کریں تو وہ آپ کے منصب کا پاس رکھ کرآپ کی جان کوبخش دیں گے، سلطان ؒ یہ الفاظ سن کرجلال میں آگئے، غصہ سے کانپتے ہوئے پلٹ کر بلندآواز سے فرمانے لگے کہ

"میرے نزدیک شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے بہتر ہے۔"

کچھ ہی دیر میں سلطان ؒ کے گھوڑے طاؤس کی پیٹھ میں گولی لگی، جس سے وہ گر گیا، اورسلطان ؒ بھی اب زمین پرآ گئے اورآپ ؒ کی دستار بھی سر سے الگ ہوگئی، اب سلطان ؒ پیدل ہی لڑ رہے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے کئی انگریز افسر سلطانی تلوار کی زد میں آ کرجہنم رسید ہوگئے، گولیوں کے دوشدید زخموں سے اب سلطان ؒ کی طاقت جواب دے رہی تھی، نقاہت وکمزوری کااثر لمحہ بہ لمحہ ظاہر ہورہا تھا، پھر بھی شیردل سلطان ؒ تھک کر بیٹھنے کے بجائے لڑہی رہے تھے، آپ ؒ کے جاں نثار سپاہی جو گولے دشمن کی ناپاک فوج پر پھینک رہے تھے ان میں بارود کے بجائے خبیث، منافق میر صادق کی سازش کے مطابق مٹی بھری ہوئی تھی، جس کی وجہ سے دشمنوں کوکوئی نقصان نہیں ہورہا تھا، منافقوں اورغداروں کی مخبری کی بنا پر دشمنوں کی پوری طاقت اس جگہ سمٹ کرآ گئی تھی جہاں مجاہد ملت حضرت سلطان ٹیپو ؒ خبیثوں سے لڑ رہے تھے، آخر دشمن کے ایک سپاہی نے دور سے سلطان ؒ کی کن

پٹی کو نشانہ بنایا، جس سے آپؒ زمین پر گر گئے اور اسی وقت ان کی پاکیزہ روح دارِ آخرت کی طرف پرواز کر گئی۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔

یہ مغرب کا وقت تھا، تاریکی پھیل رہی تھی، ہر طرف لاشوں کا انبار تھا، بارہ ہزار سلطانی سپاہی صرف اسی دن وطن کی حفاظت کے خاطر اپنی جان نثار کر چکے تھے، جس کے ثمرات سے وہ اپنے مزاروں میں خوش وخرم ہوں گے۔

ملت اسلامیہ کی تاریخ کا یہ المناک حادثہ ۲۸ / ذوالقعدہ ۱۲۱۳ھ مطابق: ۴/مئی ۱۷۹۹ء کو پیش آیا۔ فیا ویلاہ و یا حسرتاہ۔ اس وقت سلطانؒ کی عمر سن عیسوی کے لحاظ سے ۴۹ سال تھی اور سن ہجری کے اعتبار سے ۵۰ سال، جو یقیناً ہم جیسے نکموں کی عمروں سے لاکھوں گنا بہتر ہے۔

کیوں کہ ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما...... اور

{هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ}

اور اپنی اس تجارتِ رابحہ کے ثمرات پر دارِ آخرت میں شاداں وفرحاں ہے۔

چنانچہ مجاہد ملت سلطان ٹیپو شہیدؒ اور آپؒ کے سپاہیوں کے لیے اس آیت مبارکہ میں مژدۂ جاں فزا ہے:

{وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوٰتٌ بَلْ أَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ}

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس مجاہد ملتؒ کے طفیل اس ملت میں آپؒ جیسے مجاہد بار بار پیدا فرماتا رہے جو احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی خدمت انجام دیتے رہیں۔ واللہ الموفق۔ (سیرت سلطان ٹیپو شہید)

ف: الحمد للہ، یہ فقیر آپؒ کے مزار پر حاضر ہوا ہے۔ (مرتب)

حضرت شاہ موسیٰ قادری حیدرآبادیؒ متوفی ۱۲۱۵ھ

نام ونسب : سید شاہ موسیٰ قادریؒ کے نسب کا سلسلہ اکیسویں پشت میں حضرت غوثِ صمدانی محبوب سبحانی قدس سرہٗ سے ملتا ہے۔

ولادت و پرورش: آپؒ کی ولادتِ باسعادت ۱۱۵۲ھ میں ہوئی، آپؒ کے والد ماجد نے آپؒ کو اپنی ہمشیر صاحبہ کی فرزندی میں عطا کیا، آپؒ پھوپھو صاحبہ کی آغوشِ شفقت میں پرورش پائے، ایامِ شباب تک پھوپھو صاحبہ کی خدمت میں رہے۔

بیعت وارشادِ امت : آپؒ ۱۱۶۶ھ میں اپنے والد ماجدؒ کے مرید وخلیفہ ہوئے، خلائق کو ہدایت وارشاد فرمانے لگے، ۲۱ / ماہِ ذی الحجہ ۱۱۷۱ھ میں انیس سال کی عمر میں والد ماجد کے سجادہ نشین ہوئے، سجادہ نشینی کے بعد چودہ سال والد ماجدؒ کی خدمت میں رہے، نمازِ پنجگانہ والد ماجدؒ کے ساتھ جماعت سے ادا کرتے تھے، ہر وقت درود شریف پڑھتے رہتے تھے، فرائض وسنن اور تہجد و نوافل کا اہتمام فرماتے تھے، آپؒ زیورِ صدق وصفا سے آراستہ اور لباسِ تسلیم و رضا سے پیراستہ تھے، فرشتہ خصال، شیریں کلام، صاحبِ اخلاق، خوش مزاج، پسندیدہ صورت اور فرخندہ سیرت تھے، قناعت وتوکل کے میدان میں ثابت قدم اور ریاضت وعبادتِ الٰہی میں اولوالعزم ومستحکم تھے، سخی تھے، غرض کہ آپؒ کی ذاتِ بابرکات جامع الصفات تھی، آپؒ کی سخاوت اس درجہ تھی کہ اگر کوئی سائل

بار بار بھی آتا تھا تو آپؒ اُسے ہر وقت دیتے جاتے تھے، کبھی سائل کو مایوس نہیں فرماتے تھے اور اُسے اُف تک بھی نہیں کہتے تھے، گویا آپ {وَ أَمَّا السَّائِلَ فَلاَ تَنْهَرْ} کے مضمون پر پوری طرح عمل پیرا تھے، توکل وقناعت کی وہ شان تھی کہ کبھی کسی سے سائل نہیں ہوئے، اور نہ اپنی حاجت روائی کے خواہاں ہوئے، جو کچھ چاہا اللہ جل شانہ سے چاہا، جو کچھ ملا اس پر اللہ تعالیٰ شکر ادا کیا، کبھی شکایت کا حرف زبان پر نہیں لائے، بڑے حلیم وصابر تھے، ہر چند دنیا میں مصائبِ شدیدہ کا سامنا ہوتا رہا، لیکن آپؒ کبھی بھی سراسیمہ و بےقرار نہیں ہوئے، ثابت قدمی و استقلال سے راضی برضاءِ حق رہے، خندہ رو وکشادہ پیشانی تھے، نورانی چہرہ سے تبسم معلوم ہوتا تھا، حسن خلق کا وہ عالم تھا کہ ایک عالم مسخر تھا، سب کے ساتھ نرمی و مُدارا سے پیش آتے تھے، آپؒ کے نزدیک دوست ہو یا دشمن، دونوں مساوی تھے، حلم و بردباری کی وہ عظمت تھی کہ مدۃ العمر کسی کی طرف قہر وغضب سے نہیں دیکھا، اگر کسی نے گستاخی وشوخی کی تو اسے درگذر کر دیا، اس شوخ گستاخ کو نرمی وشیریں زبانی سے مسخر فرمایا، آخر شوخ اپنی شوخی سے باز آیا اور آپؒ سے معافی کا خواہاں ہوا، قدموں میں گرا، گویا آپؒ حافظ شیرازی کے اس شعر کے مصداق تھے:

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف ست   بادوستاں تلطف، بادشمناں مدارا

ف: آپؒ کے اخلاقِ حسنہ پڑھ کر رشک ہوا اور حضرت شاہ موسیٰ قادریؒ سے دل میں بہت عقیدت وعظمت جاگزیں ہوئی، دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل سے اُن اخلاقِ حمیدہ سے مشرف فرمائے جو صوفیۂ صافیہ کی خاص شان وعلامت

ہے۔واللہ ولی التوفیق۔(از: مرتب، ٦ / ذوالحجہ/ ۱۴۳٦ھ، وصی آباد)

آپؒ کا علمی کمال: آپؒ نے علم ظاہری میں معمولی تعلیم پائی تھی، فارغ التحصیل نہ تھے، لیکن تائیدِ وہبی سے مذاکرۂ علمیہ میں مسائل مشکلہ کو اس طرح حل فرماتے تھے کہ تمام علماء حیران ہوتے تھے۔

آپؒ کے اخلاقِ فاضلہ: آپؒ خوش مزاج وخوش کلام تھے، ہر ایک کے ساتھ نرمی وخوش کلامی سے پیش آتے تھے، آپؒ کے نزدیک جوان اور پیر سب مساوی تھے، یہاں تک کہ بچوں کو بھی نہایت محبت و اُلفت سے چاہتے تھے، دعائیں دے دے کر خوش کرتے تھے، صاحبِ دل تھے، دل شکنی سے بہت ڈرتے تھے اور فرماتے تھے: ''دل بدست آور، کہ حجِ اکبراست۔'' یعنی کسی کے دل کو خوش کرنا حج اکبر کا ثواب رکھتا ہے۔ آپؒ نواب مغفرت مآب آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں زندہ تھے، اکثر اُمراءِ دولت آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، نذر وتحفہ پیش کرتے تھے، جو کچھ آتا تھا حضرت اس کا نصف حصہ فقراء وغرباء پر تقسیم فرمادیتے تھے، نصف متعلقین کے لیے نکال لیتے تھے، غرباء وفقراء کی پرورش آپؒ کے مدِنظر رہتی تھی۔

دیکھو! اس وقت کے بزرگوں کی کیا شان تھی کہ غرباء کی حاجت روائی اپنے مطالب ومقاصد پر مقدم جانتے تھے، آپؒ کی تصنیفات میں سے دیوانِ موسوی، ایک رقعات عربی اور چند رسائل تصوّف ہیں، دیوان کے دیکھنے سے محبت الٰہی کا دل میں جوش وولولہ پیدا ہوتا ہے۔

کرامات: آپؒ صاحبِ خرقِ عادات وکرامات تھے، مریدوں کی تعداد

قریب تیس سے چالیس ہزار تک تھی، ہر ایک مرید آپؒ کی تازہ تازہ کرامت بیان کرتا تھا، ممکن نہیں کہ وہ سب کرامتیں اس مختصر میں لکھی جائیں، مگر تبرکاً ایک نقل کرتا ہوں:

منقول ہے کہ نواب سردار الملک عرف گھانسی میاںؒ آپؒ کے مرید و معتمد تھے، ایک وقت انہوں نے دوسو روپیہ نذرانہ بھیجا، آپؒ کے برادر زادہ سید غلام علی الموسویؒ نے اس میں سے امتحاناً پانچ روپیہ نکال کے حضرت کی خدمت میں پہنچائے، حضرت نے خلافِ عادت فرمایا: ''روپئے کتنے ہیں؟'' برادر زادہؒ نے عرض کیا: ''دوسو'' فرمایا: ''شمار کرو'' آپؒ کے برادر زادہؒ لکھتے ہیں کہ اس وقت میرے ہوش باختہ ہوئے، میں نے حکمتِ عملی سے پانچ روپئے ان روپیوں میں ڈال دیے، اس وقت آپؒ نے فرمایا: ''اب شمار کی ضرورت نہیں۔''

ف: یقینا یہ آپؒ کی کرامت ہی کہی جائے گی جو عین حق و صواب ہے۔ (مرتب)

وفات: آپؒ نے اِس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف ۲۱/ ذوالقعدہ ۱۲۱۵ھ میں رحلت فرمائی، والد ماجدؒ کے روضہ میں دفن ہوئے، آپؒ کا روضہ حیدرآباد پرانے پل کے قریب اندرونِ شہر واقع ہے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔

(محبوب التواریخ: ۲/ ۹۶۸)

حضرت مولانا محمد خلیل اللہ بالا پوریؒ متوفی ۱۲۲۱ھ

نام ونسب: آپؒ کا نام محمد خلیل اللہ اور والد کا نام مولوی سید کلیم اللہ بن عنایت الٰہی بالا پوری ہے۔

تعلیم وتربیت: آپؒ نے ابتدائی پرورش کے بعد اپنے والد ماجدؒ وغیرہ علماء سے کتبِ درسیہ پڑھیں، آپؒ نے ''عنایت الٰہی'' کے تکملہ میں لکھا ہے کہ ''مولوی نورالہدیٰ صاحب ۱۲۰۱ھ میں بالا پور آئے، چند روز قیام پذیر رہے، اس وقت میں نے مولاناؒ سے میزان وغیرہ شروع کیں۔''

فضل وکمال: کتبِ درسیہ کے ختم ہونے کے بعد آباءِ کرام کے موروثی طریقۂ مشیخت میں والد ماجدؒ سے بیعت کی اور خلافت کا خرقہ لیا، ہدایت وارشاد کے دروازہ کو کشادہ کیا، اور خلائق کو مستفید فرماتے رہے، نیک خلق، رحم دل، پاک طینت اور فرشتہ سیرت تھے، مہمان دوست وفقراء پرور تھے، علماء وفضلاء کی صحبت کو غنیمت جانتے تھے، خانقاہ میں آپؒ کی ذاتِ بابرکات سے رونق تھی، واردین وصادرین کی خبر گیری رکھتے تھے، نمازی و پرہیزگار تھے، متشرع، دیندار، حلیم الطبع وسلیم الوضع تھے، درویشانہ مزاج تھا، سیدھی سادی وضع رکھتے تھے، تکلف وتصنع سے دور رہتے تھے، ہمیشہ اسلاف کے طریقہ کا پاس ولحاظ رکھتے تھے۔

وفات: آپؒ نے ۱۲۲۱ھ میں اس دارِفانی سے بہشتِ بریں کو رحلت فرمائی۔ اور ظہیرالدین کے مقبرہ میں مدفون ہوئے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔ (محبوب التواریخ: ۲/۱۰۷۹)

حضرت مولانا سید کلیم اللہ بالا پوریؒ متوفی ۱۲۲۲ھ

نام،نسب اور ولادت: آپؒ مولانا سید شاہ معصوم صاحب نقشبندیؒ کے چوتھے صاحب زادے ہیں،آپؒ کی ولادت ۱۱۶۲ھ میں ہوئی،آپؒ کے تولد کے قبل میر زین العابدین نقشبندی دختر زادۂ مولانا شیخ مظفر نقشبندی برہان پوریؒ بالا پور میں مولوی شاہ امام الدینؒ کی ملاقات کے لیے آئے،اور میر موصوفؒ نے شاہ صاحبؒ سے فرمایا کہ ''یہ ہماری آخری ملاقات ہے،آئندہ نہ ہوگی،میں چاہتا ہوں کہ آپ کے بھائی کے گھر میں فرزندِ نرینہ کا تولد ہوگا تو اس کو میرے نام سے مسمّٰی کیجیے گا۔'' سید امام الدینؒ نے میر موصوفؒ کے ارشاد کی تعمیل کی،آپؒ کا لقب زین العابدین اور نام کلیم اللہ رکھا،اور مولود کو اپنی فرزندی میں لیا،آپؒ کی تعلیم وتربیت کے کفیل ہوئے۔

ابتدائی تعلیم: پرورش کے بعد آپؒ کی بسم اللہ خوانی کا زمانہ آیا،اُس وقت مولوی امام الدین صاحبؒ جو آپؒ کے مربی اور بجائے والد تھے فوت ہوگئے، آپؒ کے والد کو سخت اندوہ وغم لاحق ہوا،اسی وجہ سے بسم اللہ خوانی کی تقریب موقوف ہوئی،پھر مولوی سید شمس الدین صاحبؒ اورنگ آباد سے آئے اور آپؒ کے لیے پارچۂ ملبوس وغیرہ ہمراہ لائے،بسم اللہ خوانی کی رسم ادا کی،تسمیہ کے بعد آپؒ نے سات سال کی عمر میں قرآن پاک مکمل کیا،پھر والد ماجد اور شریف چچاؤں سے کتبِ درسیہ کی تحصیل کی۔

عقدِ نکاح اور بیعت: تحصیل کے بعد ۱۱۸۱ھ میں جناب مولانا سید قمر الدینؒ کی دختر دوم حور النساء بیگم سے منسوب ہوئے، عقدِ نکاح شرعی طور سے ہوا، آپؒ کو ابتداءِ عمر سے خدا طلبی اور معرفتِ الٰہی کا شوق تھا، اس بنا پر ۱۱۸۳ھ میں والدؒ کے مرید ہوئے، طریقۂ نقشبندیہ میں بیعت کی، ریاضت و عبادت میں مصروف ہوئے اور وظائف میں مشغول ہوئے، چند روز کے بعد آپؒ کو والد ماجد نے چاروں طریق نقشبندیہ، چشتیہ، قادریہ اور سہروردیہ کی خلافت عطا کی، آپؒ طالبین کو والد ماجد کے سامنے توبہ کرا کے طریقہ میں داخل فرماتے تھے، والد کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے، والد آپؒ سے بہت ہی خوش تھے اور فرماتے تھے: ''اللہ تعالیٰ فرزند دے تو ایسا دے جیسا کہ میرا فرزند کلیم اللہ ہے، جو دارین میں سعید ہے۔'' (اللہ الموفق والمعطی)

آپؒ کے والد محترم نے آپؒ کو شہر برہان پور کسی مزار کی تعمیر کے لیے بھیجا، جب یہ خدمت انجام دے کر بالاپور مراجعت فرمائی تو ۱۱۸۸ء میں والد ماجد نے آپؒ کو حضرت سید ظہیر الدینؒ کی خانقاہ کا متولی بنایا، اور مرحوم کا خرقہ اور اپنی کلاہ عنایت کی، اور نصیحت فرمائی کہ اعزہ و اقارب سے حسن سلوک و محبت رکھنی چاہیے، آپؒ نے ان ہی ایام میں مولانا قمر الدینؒ سے حزب البحر وغیرہ اعمال کی اجازت حاصل کی۔

فضل وکمال: آپؒ متقی و پرہیزگار، صوم وصلوٰۃ کے پابند اور تہجد و اشراق گزار تھے، ماہِ رمضان کے سوا صیامِ نوافل بھی برابر ادا کرتے تھے، مدۃ العمر ناغہ وقضا نہیں کیے، مثلاً عشرۂ محرم، نوروزِ ذی الحجہ، سہ ایامِ بیض اور ہفتہ میں دوشنبہ

وجمعہ، آپؒ دنیاداروں سے نہایت نفرت کرتے تھے، صبح کی نماز کے بعد ظہر تک گھر میں عبادت خانہ میں دروازہ بند کر کے بیٹھتے تھے، اور ظہر کے بعد سے عشاء تک مولانا سید ظہیر الدینؒ کے روضہ میں تشریف فرما ہوتے، آپؒ کی یہ عادتِ مستمرہ تھی، کبھی اعزہ و اقارب سے تنازع و خصومت نہیں کی، سبحان اللہ! کیا بزرگانِ اسلاف ملائکہ صفات و پاکیزہ ذات تھے، اب بخلافِ بزرگانِ کرام پس ماندگانِ اخلاف جو باہم تنازع و خصومت کررہے ہیں حالات دیکھ کر افسوس و رنج ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ سب کو باہم اتفاق سے رکھے، غنیمت ہیں یہ سب گلزارِ عنایت الٰہی کے شگوفے ہیں اور چمن سیادت کے پھول ہیں۔

وفات: آپؒ نے ۲۶ / ماہ شوال/ بروز شنبہ ۱۲۲۲ھ میں خلد بریں کی جانب رحلت فرمائی، آپؒ کا مدفن بالاپور میں ہے، سید ظہیر الدینؒ کے پائیں کے حصار میں مدفون ہوئے، آپؒ کی زوجہ محترمہ ۲ / رمضان المبارک/ بروز جمعہ ۱۲۲۹ھ میں اس دارِ فانی سے دار البقا کو روانہ ہوئیں، آپؒ کے صاحب زادے مولوی خلیل اللہؒ نے آپؒ کا علیحدہ مقبرہ اور والدہ کا بھی علیحدہ مقبرہ تعمیر کرایا، آپؒ کے احاطہ میں چار قبور ہیں، مولوی سید مجاہد الدینؒ، دوم آپؒ کی قبر، سوم مولوی مجاہد الدینؒ کی زوجہ، چہارم سید ابوالبقاؒ کی زوجہ، اور دوسرے مقبرہ میں بھی چار قبریں ہیں: ایک زوجۂ سید خلیل اللہ، دوم زوجہ سید کلیم اللہؒ، سوم ہمشیر کلیم اللہؒ، چہارم عمۂ بزرگوار۔ نوّر اللہ مراقدہم۔ (محبوب التواریخ: ۲ / ۷۲۳)

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ متوفی ۱۲۲۵ھ

نام ونسب: نام قاضی ثناء اللہ، لقب علم الہدیٰ ہے، آپؒ شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے ہیں، آپؒ کا سلسلۂ نسب حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے، یہ خاندان ہمیشہ علم و فضل کا گہوارہ رہا اور اس خاندان میں یکے بعد دیگرے بہت سے افراد زینت آرائی منصبِ قضا رہے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۱۴۳ھ کو پانی پت میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت: قاضی صاحبؒ پر آغاز ہی سے وہ آثار نمایاں تھے جو آپؒ کے علم وفضل کا پتہ دے رہے تھے، ذہانت وذکاوت، قوتِ فکر اور سلامتیٔ عقل میں قدرت نے آپؒ کو غیر معمولی حصہ عطا فرمایا تھا، سات سال کی عمر میں آپؒ نے حفظ مکمل کرلیا تھا اور سولہ سال کی عمر میں قاضی صاحبؒ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور تمام علومِ عقلیہ ونقلیہ کے عالم باعمل تھے، علومِ ظاہری کے حصول کے بعد آپؒ نے علومِ باطنی کی طرف توجہ فرمائی۔ (ظفر المحصلین / صفحہ: ۴۷)

کمالات: آپؒ علماءِ ربانی اور مقربانِ بارگاہِ یزدانی میں سے تھے، علومِ عقلیہ ونقلیہ میں آپؒ کو کمال تجربہ تھا، فقہ واصول میں اجتہاد کے رُتبہ تک پہنچے تھے، آپؒ کی تصنیفات مثلاً تفسیر مظہری، مالابد منہ اور تحفۃ السالکین معروف ومشہور ہیں اور امت نے تلقی بالقبول فرمایا ہے، آپؒ حضرت شاہ ولی اللہ قدس

سرہٗ کے خاص شاگرد ہیں، مگر اخذ طریقہ ابتداء میں آپ ؒ نے حضرت شیخ الشیوخ خواجہ محمد عابد سنامی قدس سرہٗ سے کیا اور ان کی خصوصی توجہات سے فناءِ قلبی کے مقام تک پہنچے، بعدازاں ان ہی کے ایما سے حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں شہیدؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کسب فیض شروع کیا اور بکمالِ سُرعت تمام سلوک طریقۂ احمدیہ میں حاصل کیا، غرض اٹھارہ سال ہی کی عمر میں تحصیل علومِ ظاہری و باطنی سے فارغ ہوئے، حضرت مرزا صاحب قدس سرہٗ نے آپ ؒ کو علم الہدیٰ کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔

نیز حضرت مرزا شہیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''اگر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے روز مجھ سے دریافت کیا کہ میری درگاہ میں تو کیا تحفہ لایا؟ تو قاضی ثناء اللہ کو پیش کروں گا۔''

منقول ہے کہ جس وقت حضرت قاضی صاحبؒ حضرت مرزا صاحبؒ کی مجلس میں آنے کو ہوتے تھے تو مرزا صاحبؒ پہلے ہی سے ان کے واسطے اپنے قریب کی جگہ خالی کرا دیتے تھے، یہاں تک کہ اُسی اثناء میں تشریف لاتے اور اُس جگہ بیٹھ جاتے، ایک روز کسی نے حضرت مرزا صاحبؒ سے دریافت کیا کہ ''آپ کو از روئے کشف ان کے آنے کی خبر معلوم ہو جاتی ہے کہ آپ ان کے واسطے جگہ خالی کرائے رکھتے ہیں؟'' فرمایا: ''نہیں؛ بلکہ جب میں دیکھتا ہوں کہ فرشتے تعظیماً کھڑے ہونے لگتے ہیں تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ قاضی صاحب آ رہے ہیں، اس لیے ان کے واسطے جگہ خالی کرا دیتا ہوں۔'' (ماخوذ از: مشائخ نقشبندیہ)

ف: نظر کشفی سے حضرت مرزا صاحبؒ کا فرشتوں کو دیکھنا ان کے اللہ تعالیٰ

کے نزدیک قربِ الٰہی پر دال ہے اور حضرت قاضی صاحبؒ کے عند اللہ فضل وکمال پر شاہد ہے۔ **فللّٰہ الحمد**۔ اس واقعہ کو مرشدی حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ گاہے گاہے بعض خاص مواقع پر بیان فرماتے تھے۔ (مرتب)

آپؒ کے نام مرزا صاحبؒ کے خطوط: نیز حضرت مرزا صاحبؒ کے خطوط سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت قاضی صاحبؒ کی عظمت وحرمت آپؒ کے قلب مبارک میں بے حد تھی، مثال کے طور پر آپؒ کا ایک مکتوبِ گرامی جو حضرت قاضی صاحبؒ کو تحریر فرمایا ہے وہ درجِ ذیل ہے، ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ''حمد وصلاۃ کے بعد! فقیر جانِ جاناں کی طرف سے جناب فضیلت وولایت مآب مولوی صاحب سلمہ الرحمن مطالعہ کریں، اللہ تعالیٰ (آپ جیسے) شریعت کو رِواج دینے والے، طریقت کو منور کرنے والے اور دین ودیانت کے نورِ مجسم کو سلامت رکھے۔ کثّر اللہ أمثالکم ویسّر آمالکم۔

آپ کا اچھا برا بعینہٖ فقیر کا اچھا برا ہے، فقیر کا اعتقاد ہے کہ تمام موجودات میں آپ کا وجود عزیز ترین ہے اور بہت سے انوار وبرکات کا مصدر ہے، مردوں میں تم سے زیادہ عزیز اور عورتوں میں بہو جیو یعنی تمہاری بیوی سے زیادہ ہمارا کوئی مخلص نہیں ہے، اہل دنیا سے کوئی توقع نہیں ہے، خالی زبانی جمع خرچ کرتے ہیں، اور اگر وعدہ پورا کر دیتے ہیں تو گردن پر احسان کا بہت بڑا بوجھ رکھ دیتے ہیں اور لڑتے ہیں، میں دیوانہ آدمی ان مکروہات کی تاب نہیں رکھتا۔''

ف: اللہ اللہ، اتنے بڑے شیخ کے ساتھ جب اس زمانہ کا حالِ زار یہ تھا تو اِس زمانہ میں جو نہ ہو جائے سب کم ہے، اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے، آمین۔ (مرتب)

''برخوردار احمد اللہ کی بیماری کی خبر سے سخت تشویش ہوئی، میری عمر طبعی آخر ہو چکی ہے، ورنہ میں خود اپنی زندگی اس برخوردار کو بخش دیتا، اللہ تعالیٰ اس کی عمر دراز کرے، پیر علی کی قسمت میں دنیا نہیں ہے، حالاں کہ لاکھ ہاتھ پیر مارتا ہے، علی رضا خان نے فقیر سے طریقہ حاصل کیا ہے اور لطائف خمسہ کا ذکر جاری ہو گیا ہے اور انہوں نے نفی و اثبات شروع کر دیا ہے، آپ کی خدمت میں پہنچیں گے اور آپ کے حلقہ میں شامل ہوں گے، ان کے لطیفۂ قلب پر توجہ ضروری ہے، پہلے یہی لطیفہ منظور ہے، پریشانیاں اور فتوحاتِ ظاہری کا انسداد تحریر میں نہیں آتا اور شکر باطنی بھی نہیں کیا جاتا۔ ''ہر چہ بشود، یار سلامت ماند''

یارانِ حلقہ مقصد کی طرف متوجہ ہیں اور ترقی کر رہے ہیں اور مخصوصانِ غائب فیوض و برکات کے حاصل کرنے میں حکمِ حاضراں رکھتے ہیں۔ والسلام۔''

(مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط/صفحہ:۱۹۷)

ف: ظاہر ہے کہ یہ مکتوب قاضی صاحبؒ کی عظمت و حرمت پر بین ثبوت ہے، نیز حضرت مرزا صاحبؒ کی تعلیمات کی جھلک اور ان کے تجربات کی روئداد پر مشتمل ہے، اس لیے اس کا مستحضر رکھنا ہر طالب صادق بلکہ مرشد کامل کے لیے مفید ہے۔ اس کے بعد ایک اور خط نقل کرنا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ حضرت مرزا صاحبؒ نے اصلاح و تربیت کے باب میں حضرت قاضی صاحبؒ جیسے مفسر، محدث اور فقیہ کو جوان کی اصلاح کے لیے ضروری سمجھا بلا تکلف تحریر فرمایا اور ذرا بھی رعایت نہ فرمائی، اور حضرت قاضی صاحبؒ نے بھی ان کی ہر فرمائش کو قبول فرمایا، جس کی وجہ سے ان کے علومِ مرتبت کی شہادت خود ان کے شیخ علیہ الرحمہ نے دی، جیسا کہ مذکور ہوا۔

اب وہ مکتوب ملاحظہ فرمائیں:

(۲)''میرے بھائی! عجیب بات ہے، پانی پت کا ہر شخص تمہاری شکایتوں سے بھرا ہوا آتا ہے، معلوم نہیں، تم کیا کرتے ہو؟ اگر تمہاری سچائی اور دیانت لوگوں کی تکلیف کا سبب ہے تو ایسے راستے سے باز آؤ، لوگوں کی دل جوئی اور حفظِ حرمت کے لیے تاویل سے کام لیا کرو، کیوں کہ (تمہارے عمل سے) طریقہ اور پیرانِ طریقہ بدنام ہوتے ہیں اور کمالاتِ ظاہری اور باطنی کے باوجود لئیموں کی خاطر دوسروں کو آزردہ کرنا اور خود کو بدنام کرنا عقل سے دور ہے، لوگوں کی ناراضگی رُشد و ہدایت کے سلسلہ کو نقصان پہنچاتی ہے۔''......الخ (خطوطِ مرزا مظہر جانِ جاناںؒ /صفحہ:۲۰۰)

ف: اس مکتوبِ گرامی کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اصلاح و تربیت کے باب میں عنف و سختی کے بجائے رفق و نرمی اختیار کرنا چاہیے، اس لیے کہ اس میں نفع و کامیابی زیادہ ہے، قرآنِ پاک اور احادیث نیز کتبِ تصوف مثلاً احیاء العلوم وغیرہ کے مطالعہ سے اسی کی تائید ہوتی ہے؛ بلکہ اس کی ترغیب و تاکید پائی جاتی ہے۔

نیز یہ عقلی بات ہے کہ آدمی حق کو اس کی تلخی کی وجہ سے ترک کرتا ہے، پس اگر مصلح کی بات شیرینی سے خالی ہوگی تو وہ شخص حق سے مزید دوری اختیار کرے گا، لہٰذا حق کی کڑواہٹ کو دعوت کی مٹھاس سے دور کرنا چاہیے، تاکہ مدعو داعیٔ حق کے قریب ہو اور حق کو قبول کرے۔

ہاں، عنف و سختی کے بھی مواقع ہیں اور اس کی ضرورت بھی پڑا کرتی ہے، مگر شاذ و نادر، اس لیے ہم جیسے قاصر البصیرت کو تو رِفق کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔

واللہ ولی التوفیق۔ (مرتب)

اقتباسات: اب ہم آپؒ کی تصنیفات سے چند عبارتیں نقل کرتے ہیں، جو درحقیقت طریق کی جان ہیں اور حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ اکثر و بیشتر جنہیں سنایا کرتے تھے اور اپنی تصنیفات میں درج فرمایا ہے۔

تاثیر صحبت کا ثبوت: ''ارشاد الطالبین'' ترجمہ ''تحفۃ السالکین'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''بے شمار لوگوں کی ایک جماعت جن کا جھوٹ پر متفق ہونا عقل محال سمجھتی ہے اور وہ اس قسم کی جماعت ہے کہ اس کا ہر ایک فردِ بشر تقویٰ و علم کے سبب ایسا درجہ رکھتا ہے کہ اس پر جھوٹ کی تہمت لگانا جائز نہیں ہے، زبان قلم سے اور قلم زبان سے خبر دیتی ہے کہ ہم کو مشائخ کی صحبت کی وجہ سے جن کی صحبت کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتا ہے عقائد اور فقہ کے سوا (جن سے ان کی صحبت سے پیشتر بھی بہرہ یاب تھے) باطن میں ایک نئی حالت پیدا ہوگئی ہے اور اس حاصل شدہ حالت سے ان کے دل میں اللہ اور اللہ کے دوستوں سے محبت اور اعمالِ صالحہ کا شوق اور نیکیوں کی توفیق اور سچے اعتقادات اور زیادہ راسخ ہو گئے ہیں، یہی حالت ہے جس کو کمال کہنا چاہیے اور یہی حالت بہت سے کمال کی موجب ہے۔'' (ارشاد الطالبین)

ف: حضرت مصلح الامتؒ نے فرمایا کہ ''حضرت قاضی صاحبؒ نے کمال کی کتنی عمدہ شناخت بتلا دی، جو شاید ہم میں سے اکثر کو معلوم نہ ہو، اس سے ایک بات یہ بھی سمجھ لیجیے کہ یہ کمال یعنی اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اولیاء سے محبت اور اعمالِ صالحہ کے ذوق و شوق کا دوسروں میں پیدا کرنا تکمیل کہلاتا ہے، اور اس خدمت کے انجام دینے والے کو مکمِل کہا جاتا ہے۔'' (مرتب)

صحبت کی فضیلت: قاضی صاحبؒ فرما رہے ہیں: "**العُزْلَةُ خَيْرٌ مِنْ جَلِيْسِ السُّوْئِ، وَ الجَلِيْسُ الصَّالِحُ خَيْرٌ مِنَ العُزْلَةِ۔**" یعنی گوشہ نشینی برے ہم نشین سے اچھی ہے، اور نیک ہم نشین کی صحبت گوشہ نشینی سے بہتر ہے۔"

نیز فرمایا کہ "صوفیوں، اصحابِ دل اور ولیوں کی ہم نشینی و صحبت اللہ تعالیٰ کے ذکر و عبادت سے بھی زیادہ مفید ہے، صحابہ کرامؓ کہا کرتے تھے: "**اِجْلِسْ بِنَا نُؤْمِنْ سَاعَةً۔**" یعنی ہمارے ساتھ بیٹھو، تاکہ ہم آپس میں ایمان تازہ کریں۔" (**بخاری شریف / کتاب الایمان / باب قول النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: بني الإسلام على خمس**)

ولایت کی علامت: حضرت قاضی صاحبؒ اپنی مشہور فقہ کی کتاب "مالا بدمنہ" میں ارقام فرماتے ہیں:

ولی در قرآن متقی را فرمودہ، و در حدیث اولیاء اللہ را فرمودہ کہ در صحبتِ او خدا یاد آید، یعنی محبتِ دنیا در صحبتِ او کم شود، و محبتِ حق زیادہ گردد۔ واللہ اعلم۔	قرآن میں ولی متقی کو فرمایا گیا ہے اور حدیث میں ولی اسے فرمایا ہے جس کی صحبت میں اللہ یاد آئے، یعنی محبت دنیا اس کی صحبت میں کم ہو وے اور اللہ کی محبت زیادہ ہووے۔ واللہ اعلم۔
ہر کسے کہ متقی نباشد او ولی نباشد۔	اور جو شخص متقی نہیں ہے وہ اللہ کا ولی بھی نہیں ہے۔
اے بسا ابلیس آدم روے ہست	پس بہر دستے نشاید داد دست

ترجمہ: ہر آدمی کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیے، اس لیے کہ بہت سے ابلیس آدمی کی صورت میں رونما ہیں۔

خرقِ عادات لازمِ ولایت نہیں: اس سلسلہ میں قاضی صاحبؒ ''تحفۃ السالکین'' میں یوں رقم طراز ہیں: ''خرقِ عادات لوازمِ ولایت نیست۔'' الخ یعنی خرقِ عادات لوازمِ ولایت سے نہیں ہیں۔ بہت سے اولیاء اللہ اور مقربانِ بارگاہ سے کرامت کا ظہور نہیں ہوا ہے، چنانچہ اکثر صحابہؓ سے خرقِ عادات وکرامات کا ثبوت نہیں ہے۔

کہا گیا ہے کہ کشف وخرقِ عادات اور عالم میں تصرف ریاضت سے بھی حاصل ہو جاتا ہے، اسی لیے اشراقی اور ہندوستان کے جوگی بھی اس سے بہرہ ور ہوتے ہیں، مگر یہ کمالات اہل اللہ کے نظر اعتبار سے ساقط ہیں اور یہ حضرات اسے جوَ اور منقی کے عوض بھی خریدنے کو تیار نہیں، ہاں، اگر وہ خرقِ عادات شرع کی متابعت اور اس پر استقامت کے ساتھ ہو تو ولایت پر دلیل بن سکتا ہے۔

ف: اگر کوئی کہے کہ بددین شخص بھی تو خرقِ عادات کے ساتھ دھوکہ دینے کے لیے شرع کی متابعت کرسکتا ہے؟ اس کا جواب حضرت مصلح الامتؒ نے یہ دیا کہ ایسے بددین شخص کو اس پر قدرت ہی نہ ہوگی، یعنی اللہ تعالیٰ اس کو شریعت وسنت کے اتباع کی توفیق ہی نہ دیں گے۔

مگر قوی دلیل وہی ہے جو حدیث سے ثابت ہے کہ اس کے دیکھنے سے اللہ تعالیٰ کی یاد آجائے۔ (مسند أحمد/مسند الشاميين/ حديث عبدالرحمن بن غنم الأشعری) (مرتب)

درویشوں کی صحبت کی ترغیب: چنانچہ حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''مالابدمنہ'' میں یوں رقم طراز ہیں:

بداں-اسعدک اللہ تعالیٰ-ایں ہمہ کہ گفتہ شد صورتِ ایمان و اسلام وشریعت ست، ومغز وحقیقت او در خدمت درویشاں باید جست، وخیال نباید کرد کہ حقیقت خلافِ شریعت است کہ ایں سخن جہل وکفر است۔	جان لو! -اللہ تعالیٰ تم کو سعادت بخشے- یہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایمان و اسلام اور شریعت کی فقط صورت ہے، رہی اس کی حقیقت اور مغز، تو اس کو درویشوں کی خدمت میں ڈھونڈنا چاہیے اور یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ حقیقت خلافِ شریعت ہے، اس لیے کہ یہ بات جہالت اور کفر ہے۔

چند سطور کے بعد یوں رقم طراز ہیں:

نورِ باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم را از سینۂ درویشاں باید جست، و بداں نور سینۂ خود را روشن باید کرد، تا ہر خیر و شر بفراست صحیحہ دریافت شود۔ (مالابدمنہ)	حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نورِ باطن کو درویشوں کے سینہ سے حاصل کرنا چاہیے اور اس نور سے اپنے سینہ کو روشن کرنا چاہیے، تاکہ فراست صحیحہ سے ہر خیر وشر کی دریافت ہو سکے۔

اور اگر صدق وخلوص کے ساتھ کسی درویش کی خدمت میں رہنے کے باوجود صحبت سے جو نفع مطلوب ہے محسوس نہ ہوا اور باطنی فیض جو مقصود ہے حاصل نہ ہوا تو پھر ایسے شخص سے کنارہ کشی لازمی وضروری ہے، جیسا کہ قاضی

صاحبؒ ہی ’’ارشاد الطالبین‘‘ میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

مسئلہ: اگر کوئی شخص ایک مدت تک کسی شیخ کی خدمت میں حسن اعتقاد کے ساتھ رہا اور اس کی صحبت میں تاثیر نہیں پائی، تو اس پر واجب ہے کہ اس شیخ کو چھوڑ دے اور دوسرا شیخ تلاش کرے، ورنہ اس کا مقصود و معبود وہ شیخ ہوگا، نہ کہ اللہ تعالیٰ، اور ظاہر ہے کہ یہ شرک ہے۔

حضرت عزیزان علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ جو طریقۂ نقشبندیہ کے شیخ ہیں فرماتے ہیں:

با ہر کہ نشستی و نہ شد جمع دلت   و ز تو نہ رمید محبت آب و گلت

زنہار ز صحبتش گریزاں می باش   ورنہ نکند روحِ عزیزاں بحلت

جس کے ساتھ تو بیٹھے اور تجھ کو دل جمعی حاصل نہ ہو اور تیرے دِل سے دنیا کی محبت دور نہ ہو تو اس کی محبت سے قطعاً دور بھاگ، ورنہ عزیزان کی روح تجھ کو معاف نہ کرے گی۔ مگر اُس شیخ سے حسن ظن رکھے، اس لیے کہ ممکن ہے وہ شیخ کامل و مکمل ہو؛ لیکن اس کا حصہ اس کے پاس نہ رہا ہو۔ اسی طرح کوئی شیخ کامل و مکمل ہو اور اس دنیا سے رحلت فرما جائے اور مرید درجۂ کمال تک نہ پہنچا ہو تو اس مرید کے لیے واجب ہے کہ دوسرے شیخ کی صحبت تلاش کرے، اس لیے کہ مقصود اللہ تعالیٰ ہے، نہ کہ غیر۔

حضرت مجددِ الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ’’صحابۂ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے جو بیعت کی تھی وہ محض دنیوی نہیں؛ بلکہ ان حضراتِ

خلفاء سے کمالاتِ باطنی کی تحصیل بھی مقصود تھی، اگر کوئی کہے کہ اولیاءِ کرام کا فیض ان کی وفات کے بعد بھی باقی رہتا ہے، اس لیے دوسرے شیخ کی تلاش بے کار ہے، تو اس سے کہا جائے گا کہ وفات کے بعد اولیاء کا فیض اس درجہ نہیں رہ جاتا کہ ناقص کو درجۂ کمال تک پہنچا دے، مگر شاذ و نادر۔ (**والنادر کالمعدوم**)۔

اگر وفات کے بعد بھی فیض اسی طرح جاری رہتا جیسا کہ حیات میں ہوتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت سے لے کر اب تک کے تمام اہل مدینہ صحابۂ کرامؓ کے برابر ہوتے اور کوئی شخص اولیاء اللہ کی صحبت کا محتاج نہ ہوتا، اور مردہ کا فیض مثل زندہ کے کیسے ہو سکتا ہے؟ جب کہ فیض پہنچانے والے اور فیض حاصل کرنے والے کے درمیان مناسبت شرط ہے، جو رحلت کے بعد مفقود ہو جاتی ہے، البتہ فنا و بقا کے بعد جب کہ مناسبت باطنی حاصل ہو جائے تو قبور سے فیض حاصل کیا جا سکتا ہے، مگر وہ بھی اس قدر نہیں ہو سکتا جتنا کہ حیات میں ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (ارشاد الطالبین)

بیعت کی حقیقت فتاویٰ رشیدیہ سے: نیز قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ''فتاویٰ رشیدیہ'' میں بیعت کی حقیقت و منزلت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اگر ایک شخص سے کوئی مرید ہوا، پھر معلوم ہوا کہ وہ بدعتی ہے، یا کسی وجہ سے قابل بیعت کرنے کے نہیں ہے، تو اس کی بیعت کا فسخ کرنا واجب ہے، اگر بیعت فسخ نہ کرے گا تو گنہگار ہوگا۔

حدیث میں آیا ہے: ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ'' آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے، سو اگر بدعتی سے محبت کرے گا تو اس کے ہی ساتھ جائے گا، اور بدعتی سے محبت حرام ہے، اور وہ پیر جو قابل بیعت کرنے کے ہے، مگر مرید کو

اس سے فائدہ نہیں پہنچتا، تو بھی دوسرے پیر سے مرید ہونا درست ہے، مگر پہلے پیر سے بھی اعتقاد رکھے، اور جو پہلے پیر سے باوجود فائدہ ہونے کے بیعت فسخ کر دے اور دوسرے سے مرید ہو جائے تو بھی گناہ نہیں، پیری مریدی دوستی ہے، آدمی جس سے چاہے دوستی دین کی کر لیوے، کوئی گناہ نہیں، مگر اچھے پیر اہل سنت کو چھوڑنا بلا وجہ اچھا نہیں، کہ ایسے مرید پر مشائخ التفات نہیں کرتے، لہٰذا اس کو فائدہ نہیں ہووے گا، ورنہ کوئی گناہ کی بات نہیں، یہ سب کتب تصوف میں مشائخ صوفیہ نے لکھا ہے، اور پہلے پیر کے چھوڑنے کو کفر کہنا (یا کوئی اور فتویٰ صادر کرنا) تو یہ کسی نے بھی نہیں لکھا ہے، یہ مقولہ بالکل کسی جاہل ناواقف کا ہے کہ اپنے دنیا کمانے کے لیے مکر پھیلایا ہے، یہ قول بالکل غلط اور مردود ہے، مشائخ قدیمہ دو دو، تین تین اور زیادہ سے بیعت ہوئے ہیں، چنانچہ کتب سلاسل سے ظاہر ہے، اس شخص کے قول پر سب پر کفر عائد ہووے گا۔'' (فتاویٰ رشیدیہ کامل/صفحہ:۲۱۰)

ف: غور فرمایئے کہ یہ طریق کی کتنی اہم باتیں ہیں، جن کو علماءِ اعلام اور مشائخ عظام نے جمع فرما دیا ہے، جن سے طریق حق بالکل واضح ہو چکا ہے، اب کوئی اپنی جہالت و ناواقفیت سے نہ مانے تو یہ اس کا قصور ہے۔

اس لیے عوام تو عوام، خواص کے لیے بھی ضروری ہے کہ ایسی کتابوں کو اپنے مطالعہ میں رکھیں، تاکہ خود غلط فہمیوں کے شکار نہ ہوں اور عوام کو صحیح باتوں کی تعلیم کر سکیں۔ (مرتب)

وفات: آپؒ کی وفات ۱۲۲۵ھ میں ہوئی اور شہر پانی پت میں مدفون ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔ (مقامات مظہری)

بحر العلوم حضرت مولانا عبد العلی لکھنویؒ[1] متوفی ۱۲۲۵ھ

ولادت ونام ونسب: آپؒ کی ولادت ۱۱۴۲ھ مطابق: ۱۷۲۹ء میں استاذ الہندؒ کی زوجۂ ثانیہ کے بطن سے ہوئی۔آپؒ کا نام عبد العلی ہے، آپؒ استاذ الہند مولانا محمد نظام الدین صاحبؒ کے فرزند ہیں۔آپؒ کو ''بحر العلوم'' کا خطاب ملا۔

تعلیم وتربیت: آپؒ نے تمام کتبِ درسیہ والدؒ سے پڑھیں اوراٹھارہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے، اسی سال استاذ الہند نے آپؒ کا نکاح قصبہ کاکوری میں کردیا اور چھ مہینے کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔

مولانا عبد العلیؒ اگرچہ نہایت ذی استعداد طالب علم تھے اور تمام درسی کتب انہماک سے ختم کی تھیں، لیکن شروع شروع میں طبیعت میں لاپرواہی تھی، اور آپؒ کو آبائی مشاغل (تدریس، تصنیف، تحقیق) سے دل چسپی نہیں تھی، لیکن ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے مولانا عبد العلیؒ کی زندگی کا رُخ بدل دیا اور انہیں بحر العلوم بننے پر مجبور کردیا۔

واقعہ کی تفصیل مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محلیؒ نے یہ بیان فرمائی ہے: ''میں نے اپنے اکابر سے سنا ہے کہ چوں کہ استاذ الہند (علامہ نظام الدین)

---

[1] ''مشائخ علماءِ فرنگی محل اوران کی علمی خدمات'' کے عنوان سے جو مجموعہ مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے تیار کیا ہے،اس سے اقتباس نقل کررہا ہوں۔(مرتب)

کے یہی ایک صاحب زادے تھے، اور آخر عمر میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے محبت اور پیار زیادہ ملا، والد ماجدؒ کے انتقال کے وقت گو کتب درسیہ کی تحصیل سے فارغ ہو چکے تھے، مگر علم کی جانب رغبت نہ تھی، اس زمانے میں دستور تھا کہ فاتحۃ الفراغ پڑھنے والے شاہ پیر محمد صاحبؒ کے عرس کے موقع پر حاضر ہوتے، اور اس عرس میں اکابر علماءِ وقت موجود ہوتے، ان کے سامنے دستار بندی ہوتی، استاذ الہندؒ کی زندگی میں استاذ الہندؒ ہی اس مجلس کے صدر و مسند نشین ہوتے، جس سال حضرت استاذ الہندؒ کی وفات ہوئی اُسی سال آپؒ کی وفات کے بعد جب یہ دستار بندی کا موقع آیا تو حضرت بحر العلومؒ بھی معمول کے مطابق وہاں گئے، مگر صرف تماشا دیکھنے کی غرض سے، چنانچہ بٹیروں کی ''کابک'' ہاتھ میں تھی، جس وقت دستار بندی کی رسم ادا ہونے لگی تو کسی نے زور سے ان کو دھکا دیا اور کہا کہ ''کہاں بڑھے چلے جا رہے ہو؟'' علامہ بحر العلومؒ نے جواب دیا کہ ''مجھ کو نہیں جانتے؟ میں علامہ نظام الدینؒ کا لڑکا ہوں'' اس شخص نے کہا: ''سبحان اللہ، اگر تم استاذ الہندؒ کے بیٹے ہوتے تو مسند صدارت پر ہوتے یا یہاں بٹیروں کی ''کابک'' ہاتھ میں لیے پھر رہے ہوتے؟'' تیر نشانہ پر لگا اور بحر العلومؒ کا بحر حمیت جوش میں آگیا، کابک وہیں توڑ ڈالی، بٹیریں اڑا دیں، گھر آکر کتاب بغل میں لی اور والد بزرگوارؒ کے مزار پر حاضر ہو کر دیر تک گریاں رہے۔

(تذکرۂ علماءِ فرنگی محل/صفحہ:۱۳۸)

مولانا بحر العلوم جب اپنی سابقہ لاپرواہیوں پر متنبہ ہو کر آبائی شغل کی طرف متوجہ ہوئے تو ان کے استاذِ ثانی ملا کمال الدین سہالویؒ نے ان کی عمر کے

لحاظ سے ان کی عظیم لیاقت کی داد دی، بلکہ دوسرے مؤرخین بھی جنہوں نے علامہ بحر العلوم کو دیکھا نہ تھا صرف ان کا زمانہ پایا تھا یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں:

''وہ اپنے والد ماجدؒ کے سوا اس جماعت (مذکور گروہِ علماء) میں سے کسی کے شاگرد نہ تھے، انہوں نے شرحِ سلم کے سلسلہ میں مولوی حمد اللہ سندیلویؒ پر بہت سے اعتراضات کیے ہیں، وہ علامہ کمال الدینؒ کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے، کہتے ہیں کہ جو تبحر ان میں تھا وہ ان کے والد میں بھی نہ تھا۔''

ف: اس کے بعد آپؒ نے شاہجہاں پور، رامپور اور بنگال کا سفر فرمایا، جس کی تفصیل اصل کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اب ہم مدراس کے سفر کا مضمون نقل کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)۔

مدراس کا سفر: بہر حال اس شان وشوکت کے ساتھ مدرسہ منشی صدرالدین میں علامہ بحر العلومؒ درس وتدریس کا فرض ادا کرتے رہے، اور بالآخر وہاں تلامذہ کی کثرت اور دور دور سے طالبین علم کی آمد منشی صدرالدین کے ذرائع آمدنی کے لیے بھی وجہِ آزمائش بن گئی، اس صورتِ حال کی شہرت ہوتے ہی نظام حیدرآباد، سلطان ٹیپو شہیدؒ اور نواب ارکاٹ (مدراس) تینوں نے بیک وقت مولانا بحر العلومؒ کی خدمت میں اپنے اپنے یہاں قدم رنجہ فرمانے کی درخواستیں بھیجیں، مولاناؒ نے نواب ارکاٹ کی عرض داشت کو شرفِ قبولیت اس لیے بخشا کہ وہ اصلاً قصبہ گوپامؤ (ضلع ہردوئی، اودھ) کے رہنے والے تھے، اور ان کو حق جوار حاصل تھا، مولاناؒ کے اس فیصلہ پر نوابِ والا جاہ ارکاٹ (مدراس) کو کتنی مسرت ہوئی اور ہم چشموں میں انہوں نے خود کو کتنا سربلند اور سرخ رو محسوس کیا اس کا

اندازہ اس اندازِ پذیرائی سے کیا جاسکتا ہے جو بحرالعلومؒ کے وہاں پہنچنے پر نوابِ والا جاہ نے اختیار کیا۔

مدراس پہنچے تو بیرونِ شہر آکر علماء و اعیانِ دولت نے استقبال کیا، آپؒ (علامہ بحرالعلومؒ) پالکی پر سوار اور تمام اعیانِ دولت پا پیادہ ہمراہ، اس شان سے نواب کے دولت خانہ پر پہنچے، نواب نے دروازے پر مع شاہزادوں کے استقبال کیا، آپؒ نے پالکی سے اترنے کا ارادہ فرمایا، نواب نے کسی طرح اترنے نہ دیا اور خود پالکی کو کاندھا دے کر صدر مقام تک لے گیا، مولانا کو صدر میں بٹھایا اور خود مؤدبانہ سامنے بیٹھا۔

(تذکرۂ علماءِ فرنگی محل، از مولانا عنایت اللہ فرنگی محلیؒ/ص:۱۳۹)

خانوادۂ قاضی بدرالدولہ کے مصنف نے علامہ بحرالعلومؒ اور ان کے ہمراہی اعزہ واقارب کے سلسلہ میں ایک جگہ لکھا ہے:

''نواب محمد علی والا جاہ کا جب ۱۲۱۰ھ میں انتقال ہوا اور نواب عمدۃ الامراء بہادر سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انہوں نے ملا عبدالعلی بحرالعلومؒ کو ملک العلماء کا خطاب دیا اور نذر کی پہلی تھالی ان کے دامن میں ڈال دی، نواب عمدۃ الامراء نے ضلع چنگل پیٹھ میں چنور اور جعفرا پیٹھ کے دو قریہ بطورِ جاگیر عنایت کیے تھے، جو نواب کی وفات ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء کے بعد ضبط ہو گئے تھے، ان کے بدلے ماہوار رقم مقرر کردی گئی تھی، بحرالعلومؒ نے انگریزوں کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا، اور جب ۱۳/ رجب ۱۲۲۵ھ کو بحرالعلومؒ کا انتقال ہوگیا تو دو دن بعد ۱۵/ رجب کو ان کے داماد مولوی علاء الدین احمدؒ کو

’’ملک العلماء‘‘ کا خطاب دے کر مدرسہ کلاں کا صدر مدرس بنا دیا تھا، اس مدرسہ میں سلطان العلماء مولوی عبدالرب (بن بحر العلوم) اور قطب العلماء مولوی عبدالواجدؒ بن مولوی عبدالاعلیٰ (بن بحرالعلومؒ) کے علاوہ اور کئی اساتذہ کام کرتے رہے تھے۔ (خانوادۂ قاضی بدرالدولہ/صفحہ:۴۰۸، مطبوعہ: ۱۹۶۳ء)

ملک العلماء علامہ علاء الدین احمدؒ بھی مدراس میں آخر عمر تک مقیم رہے اور علامہ بحرالعلومؒ کی جانشینی کے فرائض انجام دیتے رہے، ان کے انتقال کے بعد ان کے اکلوتے بیٹے علامہ جمال الدین احمد فرنگی محلیؒ مدراس میں آخر عمر تک قیام پذیر رہے، علامہ جمال الدین احمد فرنگی محلیؒ نے لکھنؤ میں اپنے چچا ملا نورالحق سے درسیات کی تکمیل کی تھی، پھر مدراس چلے گئے تھے، جہاں مدرسہ والا جاہی میں مدرس ہوئے اور درس وتدریس کے فرائض انجام دینے لگے، اور اپنے والدؒ (ملک العلماء علامہ علاء الدین احمدؒ) کا رُتبہ پایا اور ان کے جانشین ہوئے۔

۱۲۷۶ھ مطابق: ۱۸۶۰ء میں علامہ جمال الدین احمد فرنگی محلیؒ کے انتقال کے بعد مدراس میں علامہ بحرالعلومؒ کی مسند تدریس ان کے گھرانے کے افراد سے خالی ہوگئی، لیکن علامہ بحرالعلومؒ کے ذریعہ بانیٔ درسِ نظامی علامہ نظام الدین فرنگی محلیؒ کا دریائے فیض جو رواں ہوا تھا وہ جنوبی ہند میں شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کے ذریعہ پھیلتا رہا۔

تصنیف وتالیف: درس وتدریس، وعظ وارشاد اور قضا وافتا کے علاوہ ملا بحرالعلومؒ کی خدمات کا ایک اور میدان بھی ہے، جسے ہم تصنیف وتحقیق سے تعبیر کر سکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ خاندانِ فرنگی محل میں ملا مبینؒ تک کثرتِ تصانیف

میں آپ ؒ کا کوئی ہمسر نہیں ہے، آپ ؒ کے بعد خانوادۂ فرنگی محل میں کثرتِ تصانیف میں ملا مبین ؒ مولانا ولی اللہ ؒ، علامہ عبدالحی ؒ اور مولانا عبدالباری ؒ کو آپ ؒ کی یادگار سمجھا جاسکتا ہے، کثرت سے قطع نظر میدانِ تصنیف میں آپ ؒ کی بڑی خصوصیت اعلیٰ معیاری تحقیق و تدقیق ہے، اس وصف میں آپ ؒ علماءِ متقدمین جیسے ابن ہمام ؒ، جلال دوانی ؒ اور صدر الشریعہ ؒ سے لگا لگاتے نظر آتے ہیں۔

ف : آپ ؒ کی مفید و مشہور تصانیف کے اسماء اصل کتاب میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔(مرتب)

وفات : آپ ؒ کی وفات ۱۳ / رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء کو مدراس میں ہوئی اور مدراس میں ’’والا جاہی‘‘ کے فناءِ مسجد میں مدفون ہوئے۔ **رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔** (مشاہیر علماءِ فرنگی محل اور ان کی علمی خدمات/صفحہ:۳۷)

حضرت مولانا حافظ محمد جمال ملتانیؒ [۱] متوفی ۱۲۲۶ھ

فضل وکمال: حافظ محمد جمال صاحبؒ کا ابتدائی زمانہ تھا کہ مرشد کی تلاش شروع ہوئی، اسی جستجو اور فکر میں حضرت شیخ رکن الدین ملتانیؒ کے مزارِ مقدس پر حاضر ہوئے اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے، ہر شب کو ایک کلامِ پاک ختم کرتے تھے اور پیر کامل کے لیے دعا مانگ کر سو جاتے تھے، ایک رات کو خواب میں اشارہ پایا کہ حضرت شیخ نور محمد مہارویؒ کی خدمت میں حاضر ہو، چنانچہ فوراً مہار کو روانہ ہو گئے اور قبلۂ عالمؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید کرنے کی درخواست کی، قبلۂ عالمؒ نے پوچھا: ''تم نے کچھ ظاہری علم بھی حاصل کیا ہے؟'' کسرِ نفسی سے عرض کیا کہ ''قرآنِ پاک اور نماز و روزہ سے متعلق کچھ مسائل پڑھے ہیں۔'' قبلۂ عالمؒ کا یہ اصول تھا کہ علماء کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے تھے، کھانے کے وقت جب مولوی محمد حسینؒ نے (جو قبلۂ عالمؒ کے عزیز مرید اور محرمِ راز تھے) حافظ صاحبؒ کو دیکھا تو کھڑے ہو گئے، معانقہ کیا اور حالات دریافت کیے، قبلۂ عالمؒ نے یہ دیکھا تو فوراً دریافت کیا: ''کیا تم ان کو جانتے ہو؟'' مولوی محمد حسینؒ نے عرض کیا: ''ہم دونوں نے ایک ہی استاذ سے پڑھا ہے، یہ بڑے جید عالم ہیں، ہم لوگ جوان کے ہم جماعت تھے ان کو اپنی طالب علمی کے زمانے میں ''علامۃ العصر'' کہا کرتے تھے۔'' یہ سن کر قبلۂ عالمؒ حافظ صاحبؒ

[۱] ''از: تاریخ مشائخ چشت'' مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامیؒ۔

کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: ''آپ نے اپنا علم ہم سے کیوں چھپایا تھا؟''
عرض کیا:

''قبلۂ من! شنیدہ ام کہ گروہِ فقراء از فرقۂ علماء نفرت دارند، لہٰذا علمِ خود را از حضور پنہاں داشتم۔''

ترجمہ: قبلۂ من! میں نے سنا ہے کہ فقراء علماء سے نفرت رکھتے ہیں، لہٰذا میں نے اپنے علم کو حضور سے پوشیدہ رکھا۔

قبلۂ عالمؒ نے جواب دیا:

''حافظ صاحب! ما یاں طالبانِ عالمانیم، مارا علماء می شناسند، جاہل چہ خواہد شناخت؟ ما یاں از فرقۂ علماء بسیار خوشیم۔''

ترجمہ: حافظ صاحب! ہم تو علماء کے چاہنے والے ہیں، ہمیں تو علماء ہی سمجھ سکتے ہیں، جاہل بے چارہ کیا سمجھے گا؟ ہم فرقۂ علماء سے بہت خوش ہیں۔

اسی دن سے حافظ صاحبؒ قبلۂ عالمؒ کی خدمت میں حاضر رہنے لگے، پیر سے تعلق رفتہ رفتہ عشق کی حد تک پہنچ گیا، اور سفر و حضر تک میں اپنے شیخ سے جدا نہ ہوتے تھے، عرصہ تک انہوں نے وضو کرانے کی خدمت انجام دی، قبلۂ عالمؒ کی خانقاہ میں لنگر کا اہتمام ان ہی کے سپرد تھا، آپؒ خواجہ صاحبؒ کے عظیم المرتبت خلیفہ ہوئے، ایک طرف علمی و روحانی اعتبار سے ان کا پایہ بلند تھا، تو دوسری طرف شجاعت، مجاہدانہ جذبات اور سرفروشی میں لاثانی تھے، ملتان میں سلسلۂ چشتیہ کی ترویج و تبلیغ کے لیے بھیجے گئے تھے۔

علمی تبحر اور درس و تدریس کا شغل: حضرت حافظ صاحبؒ کے علمی تبحر

اور علمی دل چسپیوں کا اندازہ ملفوظات سے ہوتا ہے، وہ قرآنِ پاک کی آیات اور احادیث کے فقرے پڑھتے تھے، مریدوں سے معنیٰ پوچھتے تھے اور خود سمجھاتے تھے، ان کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ باریک سے باریک اور دقیق سے دقیق مسائل ان سے پوچھے جاتے تھے، اور وہ نہایت شافی اور مکمل جواب دیتے تھے، مسئلۂ وحدت الوجود سے خاص دل چسپی تھی، شیخ اکبرؒ اور مولانا جامیؒ کی تصانیف پر خاص عبور تھا، جس وقت ان کے غوامض و رموز کو سمجھاتے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا ایک سمندر موجیں مار رہا ہے۔

حضرت حافظ صاحبؒ نے ملتان میں اپنا مدرسہ بھی قائم کیا تھا، یہ مدرسہ علم و فضل کا اعلیٰ مرکز تھا، خواجہ گل محمد احمد پوریؒ نے دو سال تک اس مدرسہ میں پڑھا تھا اور حافظ صاحبؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا تھا۔

ف: الحمدللہ، ہمارے صوفیۂ صافیہ عموماً علم و عمل کے جامع ہوتے تھے اور تعلیم و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے اور تزکیۂ نفس کا فریضہ بھی بخوبی ادا فرماتے تھے۔ **فھنیئًا لھم۔** (مرتب)

اخلاق: حضرت حافظ صاحبؒ نہایت بااخلاق بزرگ تھے، ''مناقبِ فخریہ'' میں ان کے متعلق لکھا ہے: ''حافظ محمد جمال ملتانی از کمالِ باطن و تہذیبِ اخلاق و کمالات آراستہ۔'' یعنی حافظ محمد جمال ملتانیؒ باطنی خوبیوں، تہذیبِ اخلاق اور (دیگر) کمالات سے آراستہ تھے۔

غریبوں کی دل جوئی کو وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، غریب اور امیر سب کے یہاں دعوتوں میں جاتے، لیکن غریب کے یہاں اس طرح جاتے کہ خوشی کا اثر

چہرے پر ظاہر ہونے لگتا۔ کبھی کھانے میں عیب نہیں نکالتے تھے، بلکہ اگر کوئی ایسی حرکت کرتا تو اس کو ملامت کرتے تھے۔ ان کا دستور تھا کہ جب تک سب مریدین اور متعلقین کھانے سے فارغ نہ ہو جاتے تھے خود کھانا تناول نہ فرماتے تھے۔ بچوں سے بڑی خوشی سے باتیں کرتے تھے۔ اگر کوئی بات ناگوار ہوتی تو صراحۃً منع نہیں کرتے تھے، بلکہ اشارہ اور مثال سے سمجھاتے تھے۔ اپنے پیر بھائیوں سے بڑی محبت کرتے تھے، ہر دکھ درد میں ان کی امداد کے لیے تیار رہتے تھے۔ قاضی محمد عاقل صاحبؒ جب قید میں تھے تو انہوں نے پریشان ہو کر حافظ صاحبؒ کو خط لکھا تھا، جس میں یہ شعر اور ایک مصرع لکھا تھا:

بہ لبم رسیدہ جانم، تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نمانم، بچہ کار خواہی آمد
بجنازہ گر نیائی، بمزار خواہی آمد

ترجمہ: میری جان میرے لب تک پہنچ چکی ہے، تم آؤ، تا کہ میں زندہ رہ سکوں، پس جب میں نہ رہوں گا تو تم ہمارے کس کام آسکو گے؟ پس اگر جنازہ میں نہ آؤ گے تو مزار پر تو آنا ہی ہوگا۔

یہ خط پڑھتے ہی حافظ صاحبؒ ننگے پاؤں کھڑے ہو گئے اور قاضی صاحبؒ سے جا کر ملے۔

سکھوں سے مقابلہ: جس زمانے میں حافظ صاحبؒ نے ملتان میں ارشاد و تلقین کا کام شروع کیا تھا پنجاب پر سکھوں کا تسلط تھا اور مسلمانوں کو طرح طرح کے آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، حافظ صاحبؒ کے قیام کے زمانے میں

سکھوں نے کئی بار ملتان پر حملہ کیا، لیکن حافظ صاحبؒ کی زندگی میں ملتان پر ان کا قبضہ نہ ہو سکا، حافظ صاحبؒ اگر ایک طرف عبادت اور درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے تو دوسری طرف وہ عملی جہاد سے بھی خوب واقف تھے، ان کی شجاعت، ہمت اور استقلال نے مسلمانوں کے مضمحل اعضاء میں نئی روح پھونک دی تھی، سکھوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ انہوں نے انتہائی مردانگی اور عالی ہمتی سے کیا، جب حالات بہت خراب ہو گئے تو خود میدانِ جنگ میں اُتر آئے، سکھوں کے حملے کی اطلاع ملی تو ''حضرت حافظ صاحبؒ در قلعہ تیر وکمان گرفتہ موجود بودند۔'' حضرت حافظ صاحبؒ قلعہ میں تیر و کمان لیے ہوئے موجود تھے۔

پھر ایک دوسرے موقع پر

''می گویند کہ دراں وقتِ جنگ حافظ صاحب مرحوم در برجِ قلعۂ ملتان تیر وکمان بدستِ خود گرفتہ تیر بر کافراں می انداختند۔''

کہتے ہیں کہ اس جنگ کے وقت حضرت حافظ صاحب مرحوم قلعۂ ملتان کے برج میں بیٹھے ہوئے کافروں پر تیر برسا رہے تھے۔

۱۲۲۶ھ مطابق: ۱۸۱۱ء میں ایک مرتبہ پھر سکھوں نے ملتان پر حملہ کیا، حافظ صاحبؒ اس وقت ملتان میں نہ تھے، مگر جب اطلاع ملی تو فوراً معرکہ میں حصہ لینے کے لیے ملتان پہنچ گئے۔

ایک مرتبہ سکھوں نے بڑے ساز وسامان اور قوت کے ساتھ ملتان پر حملہ کیا، لوگوں میں پریشانی پھیل گئی، بعض لوگوں نے گھبرا کر ہجرت کر جانے کا ارادہ

کیا،آپ ؒ کو معلوم ہواتو فرمایا:

’’آوازِ جنگ بکفار عام است، واکنوں جنگ بایشاں فرضِ عین کرد، پس الحال بیروں نمی رویم، کہ مارادودرجہ است، یکے درجۂ غزا، دوم درجۂ شہادت۔‘‘

ترجمہ: کفار کے ساتھ جنگ کی نفیر عام ہے،اوراس نے اب ان کے ساتھ جنگ کوفرضِ عین کردیا ہے،بس اب ہم یہاں سے نہ جائیں گے،اس لیے کہ ہمارے لیے دودرجے ہیں،ایک درجۂ غازی، دوسرادرجۂ شہادت۔

یہ فرمانے کے بعد آپ ؒ نے مقابلہ میں خودسبقت فرمائی،خوف و ہراس سے وہ بالکل نا آشنا تھے، اللہ تعالیٰ پران کوکامل اعتماد تھا،اوراسی تقویت پر وہ میدانِ جنگ میں کودجاتے تھے،تیراندازی میں کافی مہارت رکھتے تھےاوراس کی تعلیم بھی دیتے تھے،لکھا ہے:

آں حضرت در پیشۂ تیراندازی یگانہ بودند،حتیٰ کہ ایں پیشۂ تیراندازی تعلیم می کردند۔‘‘

ترجمہ: فن تیراندازی میں جناب شیخ بے مثال تھے، یہاں تک کہ اس کی دوسروں کوتعلیم بھی دیتے تھے۔

اصلاحِ رسوم اوراتباعِ شریعت: حافظ صاحب ؒ غیر شرعی رسوم کوناپسند کرتے تھے،ایک مرتبہ زاہدشاہ سے پوچھا کہ ’’تم کہیں شادی کرنا چاہتے ہو؟‘‘ انہوں نے عرض کیا:’’جی ہاں،مگر وہ لوگ سادات سے نہیں ہیں، اور ہماری برادری کے لوگ کہتے ہیں کہ شادی سادات میں کرنی چاہیے۔‘‘فرمایا:

’’نکاحِ سادات باغیر سادات درشرع جائز است،تو گفتۂ جاہلاں راچہ

اعتبار می کنی؟‘‘

ترجمہ: سادات کا نکاح غیر سادات سے شریعت میں جائز ہے، تو جاہلوں کے کہنے کا کیوں اعتبار کرتا ہے؟

وصول الی اللہ کا احسن طریق: شریعت کا خاص احترام کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے:

’’احسنِ طریقِ وصول الی الحق طریقۂ مشائخ است، کہ رسیدہ است باسنادِ صحیح بر رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وآں آراستگیٔ ظاہر شریعت است، و مستقیم بودن برآں و پاک کردنِ باطن است از اوصافِ ذمیمہ۔‘‘

ترجمہ: وصالِ حق کا بہترین طریقہ وہ ہے جو مشائخ کا ہے، جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پہنچا ہے، اور وہ ظاہر کو شریعت سے آراستہ رکھنا ہے اور اس پر قائم رہنا ہے، اور باطن کو خراب عادتوں سے پاک وصاف کرنا ہے۔

ملفوظات: حافظ محمد جمال صاحب ؒ کے ملفوظات بہت کثرت سے مرتب کیے گئے تھے، مندرجۂ ذیل کتب ملفوظات خاص طور سے مشہور ہیں:

(۱)’’فضائل رضیہ‘‘ مرتبہ مولوی عبدالعزیز ساکن: قصبہ بڑھیا ران۔ (۲)’’انوارِ جمالیہ‘‘ مرتبہ منشی غلام حسین شہید ملتانی۔ (۳)’’الاسرار الکمالیہ‘‘ مرتبہ زاہد شاہ مٹھی۔

وصال: حافظ صاحب ؒ نے ۵ / جمادی الاولیٰ / ۱۲۲۶ھ مطابق: ۱۸۱۱ء کو وصال فرمایا۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔

(تاریخ مشائخ چشت، مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی / جلد: ۵ / صفحہ: ۲۷۱)

حضرت مولانا سیدنورالاولیاء بالاپوری ؒ متوفی ۱۲۲۹ھ

نسب: آپ ؒ مولانا سیدنورالعلی صاحب ؒ کے دوسرے صاحب زادے ہیں۔

تعلیم وتربیت: سن شعور کے بعد قرآن شریف اور ابتدائی کتب سے فارغ ہوکر عالم شباب میں زورکشی وورزش کا شوق ہوا، چند مدت اسی شغل میں رہے، نہایت قوی الجسم وزورآور تھے، بعدازاں تحصیل علوم کا خیال ہوا، چند مدت میں کتبِ درسیہ جو باقی رہی تھیں والد ماجد وعلماء سے پڑھ لیں۔

آپ ؒ کی خدمات: پھرنواب منیرالملک بہادر سے تعلقات کے انتظام کی خدمت لی، دنیوی امور کے انتظام میں مصروف ہوئے اور امورِمفوّضہ کا انتظام عمدہ طرح سے کیا،نواب صاحب آپ ؒ کے کام سے بہت خوش ہوئے، پھرآپ ؒ نے حرمین شریفین کی زیارت وحج کا قصد کیا، حیدرآباد سے روانہ ہوئے، حرمین پہنچ کرحج وزیارت سے مشرف ہوئے، وہاں سے مع الخیر والعافیہ حیدرآباد میں مراجعت فرمائی اور مولوی عبدالکریم صاحب شہید کے قصاص کے بابت آپ ؒ نے مکہ مسجد میں ایک جلسہ کیا، تمام علماء، مشائخ اوراُمراء کو بلایا، سب جمع ہوئے، آپ ؒ نے افاغنۂ مہدویہ کے مقابلہ کی ترغیب وتحریض کی، سب نے آپ ؒ کی رائے سے اتفاق کیا، غرۂ محرم بروز پنجشنبہ کل علماء ومشائخ اوراہل اسلام نے افاغنۂ مہدویہ پر بمقام چنچل گوڑہ حملہ کیا، افاغنہ بھی مقابلہ کے لیے مستعد ہوئے، طرفین کے چندآدمی مقتول ہوئے، آخرحسب الحکم حضورمہدویہ شہربدرکر

دیے گئے۔

عنایت الٰہی کے تکملہ کے مؤلف نے لکھا ہے کہ آپؒ لا ولد تھے۔ آپؒ کے مزاج میں دین اسلام کا بڑا پاس تھا، دینی معاملہ میں جان و مال صرف کرنے میں کبھی دریغ نہیں فرماتے تھے، واقعی سیادت و نجابت کی یہی علامت ہے۔

وفات: اس معرکہ کے بعد آپؒ بھی ۱۲۲۹ھ میں وفات پا گئے۔ إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون۔ برادرِ بزرگ کی قبر کے نزدیک باغ میں واقع عیدگاہ کہنہ میں دفن کیے گئے۔ (محبوب التواریخ:۲/ ۱۰۸۵)

حضرت مولانا خواجہ محمد عاقل پنجابیؒ [1] متوفی ۱۲۲۹ھ

نام ونسب: نام خواجہ محمد عاقل، والد کا نام مخدوم محمد شریف، جو وقت کے بڑے محدث تھے، خواجہ صاحبؒ کا لقب ''کوریجہ'' ہے، آپؒ خواجہ نور محمد مہارویؒ کے ممتاز ترین خلفاء میں سے تھے، آپؒ ایک معزز فاروقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

''کوریجہ'' لقب: شاہ محمد عاقلؒ کا خاندانی لقب ''کوریجہ'' تھا، شاہی فرامین میں ان کے بزرگوں کے نام کے ساتھ یہ لقب ملتا ہے، حاجی نجم الدینؒ نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ خواجہ صاحبؒ کے خاندان کے ایک بزرگ ایک دِن مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے گئے اور پوچھا کہ ''کیا کسی نے اذان کہہ دی ہے؟'' لوگوں نے نفی میں جواب دیا تو آپؒ نے مٹی کے ایک برتن کو جو قریب ہی رکھا تھا اٹھایا اور کہا کہ ''اے کوزہ! تو اذان کہہ'' اس وقت سے ان کو ''کوریجہ'' کہنے لگے، کوزہ کو سندھی زبان میں ''کورا'' کہتے ہیں، اور کہنے کے لیے لفظ ''جو'' استعمال ہوتا ہے، چنانچہ یہ لفظ ''کوراجو'' تھا، جس کے فارسی معنیٰ ہوئے ''کوزہ! بگو''، رفتہ رفتہ ''کوراجو'' سے ''کوریجہ'' ہوگیا۔

تعلیم: خواجہ محمد عاقل صاحبؒ نے بہت تھوڑی عمر میں کلامِ پاک حفظ کرلیا تھا،

---

[1] تاریخ مشائخ چشت/ حصہ پنجم مؤلفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی سے آپؒ کے حالات وغیرہ درج کیے جاتے ہیں، اسی سے یہ اقتباس پیش ہے۔ (مرتب)۔

ان کے والد ماجد مخدوم محمد شریف جو محدثِ دوراں تھے خود ان کو تعلیم دیتے تھے، فاضل باپ نے اپنے ہونہار بیٹے میں علم وادب کا وہ ذوق وشوق پیدا کر دیا جو آخری عمر تک ان کا طرۂ امتیاز رہا اور جس سے ہزاروں شائقین علم وادب نے فائدہ اٹھایا۔

خواجہ صاحبؒ نے اپنے والد کے علاوہ شاہ فخر صاحبؒ اور خواجہ مہارویؒ سے بھی علمی استفادہ کیا تھا، شاہ فخر صاحبؒ نے ان کو ''شرحِ عبدالحق'' اور ''سواء السبیل'' کا درس دیا تھا، خواجہ مہارویؒ سے انہوں نے حدیث کی سند حاصل کی تھی۔

خواجہ صاحبؒ کا حافظہ نہایت قوی تھا، جزوی مسائل تک صحت اور حوالوں کے ساتھ یاد رہتے تھے، خواجہ گل محمد احمد پوریؒ کا بیان ہے:

''درعصرِ خود شرقاً وغرباً مماثلِ آں حضرت درعلمِ ظاہری ہم کسے نہ بود۔''

ترجمہ: ان کے زمانہ میں مشرق ومغرب میں ان کے جیسا علمِ ظاہری میں بھی کوئی نہ تھا۔

قیامِ مدارس اور سلسلۂ درس وتدریس: خواجہ محمد عاقل صاحبؒ کو ابتدا ہی سے درس وتدریس کا بڑا شوق تھا، انہوں نے کوٹ مٹھن میں نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ایک مدرسہ قائم کیا، بڑے بڑے عالم اس مدرسہ میں درس وتدریس کے لیے مقرر کیے، وہ خود سو سے زیادہ طلبہ کو درس دیتے تھے، مدرسہ کے ساتھ ہی ایک لنگر خانہ بھی تھا، جب آپؒ کوٹ مٹھن سے شدانی تشریف لے گئے تو وہاں بھی مدارس قائم کیے اور طلبہ واساتذہ کے لیے لنگر کی سہولتیں بہم پہنچائیں، ان کے قائم کیے ہوئے مدارس میں جن کتابوں کی تعلیم کا خصوصی ذکر ملتا ہے وہ یہ ہیں:

مشکوٰۃ شریف، احیاء العلوم، صحیح بخاری، لوائح وشرحِ قصیدہ، سواء لسبیل، فصوص الحکم، شرحِ وقایہ مع حواشی، ہدایہ، شرحِ مواقف، شرحِ ہدایت الحکمت، میر ہاشم، شرحِ عقائد خیالی، مطول......وغیرہ۔

تزکیۂ نفس کے لیے خواجہ مہارویؒ کی خدمت میں: تحصیل علم کے بعد خواجہ محمد عاقل صاحبؒ اوران کے بڑے بھائی میاں نور محمدؒ کو اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس کے لیے مرشدِ کامل کی تلاش اور جستجو پیدا ہوئی، اگرچہ خود ان کے والد ماجد بڑے صاحبِ کمال بزرگ تھے، لیکن بقولِ خواجہ گل محمدؒ ''داعیۂ آں جناب شہبازِ بلند پرواز بود۔''

اسی اثنا میں خواجہ مہارویؒ کی شہرت سنی، اتفاقاً ان کے بڑے بھائی کی موضع یارن والی میں خواجہ مہارویؒ سے ملاقات بھی ہوگئی، پہلی ہی نظر میں یہ عالم ہوگیا کہ ''صولت و ہیبتِ آں بادشاہِ گدا لباس درگرفت'' (یعنی فقیری کے لباس میں بادشاہ کی ہیبت وشوکت نے متاثر کردیا۔)

اسی رات کو ایک قاصد خواجہ محمد عاقل صاحبؒ کو بلانے کے لیے کوٹ مٹھن بھیجا گیا، وہ فوراً آ کر ملے اور اوچ میں خواجہ نور محمدؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوگئے۔

دہلی کا سفر اور شاہ فخر صاحبؒ کی خدمت میں حاضری: خواجہ محمد عاقل صاحبؒ کو کئی مرتبہ شاہ فخر صاحبؒ کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تھی، پہلی بار جب وہ خواجہ مہارویؒ کی ہمراہی میں مہار سے دہلی تشریف لائے تھے تو سارا سفر پا پیادہ کیا تھا، جب مرشدؒ نے اس کا سبب

دریافت کیا تو عرض کیا: ''میں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ حضرت شاہ فخر صاحب کی زیارت کو پاپیادہ جاؤں گا۔'' دوسری مرتبہ وہ دہلی اس طرح آئے کہ پہلے اپنے وطن سے مہار خواجہ مہارویؒ کی خدمت میں گئے، وہاں معلوم ہوا کہ خواجہ صاحبؒ دہلی تشریف لے گئے ہیں، چنانچہ فوراً دہلی کا رُخ کر دیا، دہلی پہنچے تو شاہ فخر صاحبؒ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کچھ پاس نہ تھا، صرف ایک لوٹا تھا اس کو فروخت کر کے مٹھائی خریدی، خواجہ مہارویؒ کو اس کا علم ہوا تو دو اشرفیاں دیں کہ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش کر دو۔

مجاہدات: قاضی محمد عاقلؒ نے نہایت سخت مجاہدات کیے تھے، حافظ محمد جمالؒ کا بیان ہے کہ ''قاضی صاحبؒ نے جتنے مجاہدے کیے ہیں مشکل سے کوئی دوسرا شخص کر سکتا ہے۔'' ذکرِ جہر میں ان کو بڑی دل چسپی تھی، آخری زمانہ میں بھی جب ان کا بدن پیرانہ سالی کے باعث کمزور اور نحیف ہو گیا تھا نہایت پابندی سے ذکرِ جہر کرتے تھے، ان کے ذکر کی آواز میلوں تک جاتی تھی۔ نواب غازی الدین خانؒ نے ''اسماء الابرار'' میں لکھا ہے کہ قاضی صاحبؒ کے ذکر کی آواز مہار سے شہر فرید تک (جو تین چار میل کے فاصلہ پر ہے) جاتی تھی۔

مقبولیت: خلافت ملنے کے بعد کچھ عرصہ تک خواجہ محمد عاقلؒ نے سلسلے کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں کی، شیخ مہارویؒ کو علم ہوا تو نہایت سختی کے ساتھ لکھا کہ ''تم فیض کو عام کیوں نہیں کرتے؟ اور خلق اللہ کو داخل سلسلہ کیوں نہیں کرتے؟ میں اس کی اطلاع شاہ فخر صاحبؒ کو کروں گا۔'' یہ سن کر خواجہ صاحبؒ لرز گئے اور نہایت ادب سے عرض کیا:

''کدام کس پیش من آمدہ است کہ آں ردنمودم، اگر مرضیٔ مبارک باشد خود بہ بخود بگویم۔''

ترجمہ: کون شخص ایسا ہے جو میرے پاس آیا ہو اور میں نے اسے رد کر دیا ہو، اگر آں جناب کی مرضی ہو تو خود بخود اس کی تحریک کر دیا کروں۔ (کہ وہ میرا مرید ہو جائے)

اپنے مرید کا یہ انکسار اور عجز دیکھ کر خواجہ مہارویؒ کو جوش آ گیا، فرمانے لگے:

''اے میاں صاحب! روزے باشد کہ ملائکِ آسماں بنامِ شما منادی دہند، وخلائق از شرق وغرب بر آستانِ شما جبہہ سایند، سبحان اللہ، شما می فرمایند کہ ''پیش من کسے نمی آید۔''

ترجمہ: ہاں صاحب! ایک دِن آئے گا کہ آسمان کے فرشتے تمہارے نام کی منادی کریں گے اور خلقت شرق وغرب سے تمہارے آستانہ پر جبہہ سائی کرے گی، سبحان اللہ! تم کہتے ہو کہ میرے پاس کوئی نہیں آتا۔

تھوڑے ہی دنوں بعد پیر صاحبؒ کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور عقیدت مندوں کے ہجوم ان کے گرد لگ گئے اور آپؒ کی صحبت سے مستفیض ہوئے۔

اتباعِ سنت: خواجہ محمد عاقلؒ اتباعِ سنت کا خاص لحاظ رکھتے تھے، ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ احکامِ شریعت اور سنتِ نبوی پر پورا پورا عمل کیا جائے، وصال سے کچھ پہلے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں: ''تو

مارا بسیار خوش کردی کہ ہم گیں سنتہائے مارا زندہ کردی۔“ (یعنی تم نے ہم کو بہت خوش کر دیا، کہ ہماری مردہ سنتوں کو زندہ کر دیا)۔

خواجہ جلال پوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ ان کو درجہ ”فنافی الرسول“ حاصل تھا۔

تقسیمِ اوقات: خواجہ محمد عاقلؒ اپنے اوقات کے بہت پابند تھے، مغرب کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد شغل و ذکر میں مصروف ہو جاتے تھے، پھر کھانا کھا کر عشا کی نماز باجماعت پڑھتے تھے، اس کے بعد مریدوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو جاتے تھے، آدھی رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا، تہجد کی نماز پڑھ کر ذکرِ جہر کرتے تھے اور قرآنِ پاک کی تلاوت فرماتے تھے، شام کے وقت طلبہ کو درس دیتے تھے، ڈیڑھ پہر دن باقی ہوتا تھا کہ ان کا حلقۂ درس شروع ہو جاتا تھا۔

اخلاق: شاہ صاحبؒ کے اخلاق نہایت اعلیٰ تھے، امیر و غریب، بوڑھے اور جوان سب ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور وہ سب سے یکساں شفقت اور انکساری سے ملتے تھے، ہر ملنے والا یہ سمجھتا تھا کہ جس قدر التفات و اکرام اس پر ہے کسی پر نہیں، اکثر اوقات ایسا دیکھا گیا کہ بعض لوگوں نے بازو پکڑ پکڑ کر اپنی طرف رجوع کیا، لیکن آپؒ نے نہایت خندہ پیشانی اور محبت سے ان کو جواب دیا، لوگ زور زور سے گفتگو کرتے، لیکن آپؒ نہایت آہستگی اور خندہ روئی سے ان کو مطمئن کرتے، بعض مرتبہ خود ہنس کر فرمایا کرتے تھے کہ ”لوگ میرے بازو پکڑ کر اور زور زور سے چیخ کر مخاطب کرتے ہیں، گویا میں بہرا

ہوں۔"

شاہانِ مغلیہ کی عقیدت: اکبر شاہ ثانی نے شاہزادہ جہاں خسرو اور کاؤس شکوہ کو قاضی محمد عاقل صاحبؒ کا مرید کرایا تھا، بہادر شاہ ظفرؔ کو ان سے بہت عقیدت تھی، ایک شعر میں کہتے ہیں:

دل فدا کرتے ہیں نامِ فخرِ دیں پر اے ظفرؔ
ہم ہیں عاقل، ربط عاقل سے دلی رکھتے ہیں ہم

وصال: قاضی صاحبؒ تقریباً چار مہینے تک علیل رہے، ایک دن فرمانے لگے: "امروز در تمامِ ہرج سفر کشیدیم، خوب شد کہ بمنزل رسیدیم۔" (آج سفر میں بہت مشقت برداشت کی، اچھا ہوا کہ منزل تک پہنچ گیا۔)

حاضرین حیران ہوگئے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ خواجہ گل محمد احمد پوریؒ یہ الفاظ سن کر رونے لگے، اسی دن شاہ صاحبؒ نے انتقال فرمایا، شدانی سے کوٹ مٹھن لاکر سپردِ خاک کیا گیا۔ **رحمھم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔**

۸ / رجب/ ۱۲۲۹ھ مطابق: ۱۸۱۴ء کو یہ واقعہ پیش آیا۔ تاریخِ وصال ہے: "**إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔**"

(تاریخِ مشائخ چشت مؤلفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی/صفحہ: ۵/۲۵۳)

حضرت مولانا سید نور المصطفیٰ اورنگ آبادیؒ متوفی ۱۲۳۰ھ

نام ونسب: آپؒ مولانا قمر الدین کے تیسرے صاحب زادے ہیں، آپؒ نے کتبِ تحصیل برادر نور العلیؒ کی خدمت میں ختم کیں اور بھائی کے مرید اور خلیفہ ہوئے۔

فضل وکمال: آپؒ تارک الدنیا وطالب العقبیٰ تھے، دنیا و مافیہا سے تعلق نہیں رکھتے تھے، ترک وتجرید میں زندگی بسر کرتے تھے، والد ماجدؒ کے مزار فائض الانوار کے ملازم تھے، ہمیشہ ذکر وشغل اور تلاوتِ قرآن میں مصروف رہتے تھے، اُمراء و اہل دنیا سے بہت کم ملتے تھے، ارادت مندوں کو بیعت کے دائرہ میں شریک کرتے تھے، ایک مرتبہ علی بہادر کی زوجہ جو مولانا نور الہدیٰ کی مرید تھیں اس کے پاس مقام پونہ گئے تھے، اور کبھی کبھی کرنول وحیدرآباد مریدوں کے تقاضے سے جاتے تھے، اور کبھی بالا پور برادر وہمشیر سے ملنے کے لیے رونق افزا ہوتے تھے، اورنگ آباد میں گوشہ نشین رہتے تھے، کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھتے تھے، بزرگانِ اسلاف کے طریقہ پر ثابت قدم رہتے تھے، متدین، متقی اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔

آپ کی اولاد: آپؒ کی اولاد میں آپؒ کے ایک فرزند مولوی نور المقتدیٰ اور تین بیٹیاں امیر النساء بیگم، فضل النساء بیگم اور فخر النساء بیگم تھے۔

وفات: دسویں تاریخ ماہِ رمضان روزِ پنجشنبہ ۱۲۳۰ھ میں خلدِ بریں کو روانہ ہوئے، والد ماجدؒ کے قریب دفن ہوئے۔ **یُزار و یُتبرک به۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔** (محبوب التواریخ: ۲/ ۱۰۷۸)

حضرت مولانا حافظ شاہ ابواسحاق لُہر اوی مئوی رحمۃ اللہ علیہ[1] متوفی: ۱۲۳۸ھ

نام ونسب: آپ رحمۃ اللہ علیہ کا نام شاہ ابواسحاق، والد کا نام شاہ ابوالغوث گرم دیوان ہے، آپ رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد کے خلیفہ اور جانشین تھے۔

ولادت: آپ رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت بھیرا ضلع مئو (اعظم گڑھ) میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت: حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے قرآنِ کریم حفظ کر کے ان ہی سے ابتدائی کتابیں پڑھیں، ''نزہۃ الخواطر'' میں مذکور ہے:

''وَ حَفِظَ الْقُرْآنَ وَ قَرَأَ الْعِلْمَ عَلىٰ أَبِيْهِ وَ عَلىٰ غَيْرِهٖ مِنَ الْعُلَمَاءِ''

ترجمہ: انہوں نے قرآن اور دیگر علوم اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء سے پڑھا۔

چنانچہ ان کے اساتذہ میں مولانا قاضی عبدالصمد بن ابوالحسن چریا کوٹی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۷۱ھ) بھی ہیں۔ ''تذکرہ علماءِ ہند'' میں قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں ہے: ''یگانۂ آفاق حافظ ابواسحاق از تلامذۂ اوست۔''

قاضی عبدالصمد چریاکوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی میں تعلیم پائی تھی، محمد شاہ بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو چریا کوٹ اوراس کے نواح کا قاضی مقرر کیا تھا۔

ان کے اساتذہ میں مولانا محمد ناصح کو بھی بعض اہل علم نے شمار کیا ہے، جو

---

[1] ماخوذ از: ''دیارِ پورب میں علم اور علماء'' صفحہ: ۴۵۷ مرتبہ قاضی اطہر مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ و ''تذکرۂ علماءِ اعظم گڑھ'' صفحہ: ۷۱ مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی استاد دارالعلوم دیوبند۔

مولانا محمد فاخر الہٰ آبادیؒ کے تلامذہ میں سے تھے۔ (دیارِ پورب میں علم اور علماء: ۴۵۷)

الہٰ آباد کا سفر: انہوں نے اپنے والد ماجدؒ کی طرح آخر میں الہٰ آباد کا سفر کر کے براہِ راست مولانا محمد فاخرؒ (متوفیٰ: ۱۱۶۴ھ) سے تعلیم حاصل کی، اور ان ہی کے طریقہ پر عملی اور علمی زندگی بسر کی، مولانا فاخر الہٰ آبادیؒ اپنے زمانہ کے زبردست محدث و بزرگ تھے، اپنے چچا شیخ محمد افضل اور بھائی شیخ محمد طاہر سے کتب درسیہ کی تکمیل کی، اور اپنے والد مولانا محمد یحییٰؒ سے روحانی فیض حاصل کر کے بائیس سال کی عمر میں ان کے خلیفہ ہوئے، اس کے بعد ۱۱۴۹ھ میں حرمین شریفین کی حاضری کے موقع پر شیخ محمد حیات سندھی مدنی (متوفیٰ: ۱۱۶۳ھ) سے صحیحین وغیرہ پڑھ کر سند و اجازت حاصل کی، مولانا فاخرؒ فقہی مسائل میں مجتہدانہ شان رکھتے تھے، کتاب وسنت اور اجتہاد پر عمل کرتے تھے، ان کے تلمیذ رشید حافظ ابواسحاق رحمۃ اللہ علیہ پر بھی یہی رنگ غالب رہا۔

فضل وکمال: وہ زہد وتقویٰ کے ساتھ کتاب وسنت کا بے حد اہتمام کرتے تھے، ان کی ذات وصفات اور علم وعمل کے بارے میں صاحب ''تذکرۂ علماءِ ہند'' نے لکھا ہے کہ مظہر محاسن اخلاق شاہ ابواسحاق کی ذاتِ شریف نادرۂ روزگار تھی، صحابۂ کبار کی یاد تازہ کرتی تھی، زہد وتقویٰ ان کا شعار اور اسرارِ شریعت ان کا دثار تھے، احادیث کی تصحیح میں وہبی ملکہ رکھتے تھے، علومِ ظاہری و باطنی سے مزین تھے، سنت نبوی کی پابندی میں ذرا بھی غفلت روا نہیں رکھتے تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معاملہ میں چھوٹے بڑے یا امیر وغریب کی تمیز نہیں کرتے تھے، قرآنِ حکیم کے بعد صحیح بخاری کو اصح الکتب قرار دے کر اس

سے بہت زیادہ اعتنا کرتے تھے۔

اجازت وخلافت: مولانا فاخر الہ آبادیؒ سے سند فراغت لے کر لہرا میں آئے اور اپنے والد ماجد سے خرقۂ خلافت حاصل کر کے ان کے خلیفہ وجانشین بنے، اور مدت العمر یہیں رہ کر تعلیم وتلقین میں زندگی بسر کی، کسی روایت سے ان کا باہر جانا معلوم نہیں ہوتا، بلکہ اپنے والدؒ کے مدرسہ اور خانقاہ میں رہ کر درس و تدریس اور ارشاد وتلقین کرتے رہے، بعض اہل حدیث علماء نے ان کی تصنیف میں عربی زبان میں ایک رسالہ ''نور العینین فی اثبات رفع الیدین'' بتایا ہے۔

اور یہ رسالہ بہار کے بعض کتب خانوں میں تھا، شاید یہ رسالہ حافظ صاحبؒ کے استاذ مولانا محمد فاخر الہ آبادیؒ کا ہو، جو حافظ صاحبؒ کے پاس رہا ہو اور اس پر ان کا نام رہا ہو، مولانا محمد فاخرؒ کی تصانیف میں ایک رسالہ ''قرۃ العینین فی رفع الیدین'' (تذکرہ علماءِ ہند:۲۰۶) یا ''قرۃ العینین فی إثبات رفع الیدین'' (نزھۃ الخواطر:۶/ ۳۴۱) بھی ہے۔

آپ کے تلامذہ: حافظ صاحبؒ کے تلامذہ ومریدین میں چند لوگوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں، جن میں مولانا احمد علی عباسی چریا کوٹی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۲۷۲ھ) مشہور عالم ہیں، ''تذکرۂ علماءِ ہند'' میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

''اعمالِ مسلوکہ درویشاں از برگزیدۂ آفاق حضرت حافظ شاہ ابواسحاق ساکن بھیرا گرفتہ۔'' ان کی ولادت ۱۲۰۰ھ میں ہوئی تھی، ابتدائی کتابیں حافظ غلام علی چریا کوٹی سے پڑھ کر فنونِ ریاضیہ مولوی غلام جیلانیؒ سے حاصل کیے اور تجوید وقراءت میں قاری نسیم رامپوریؒ کے شاگرد تھے۔

حافظ صاحبؒ کے مبارک پوری تلامذہ میں تین حضرات کے نام معلوم ہو سکے ہیں، مولانا حکیم امان اللہ (متوفیٰ: ۱۲۹۹ھ) اپنے زمانہ کے طبیب حاذق اور قصبہ مبارک پور کے سردار تھے، ان کے نواسے مولانا عبدالسلام مبارک پوریؒ نے ''سیرۃ البخاری'' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میرے نانا کا نام امان اللہ تھا، وہ قوم کے سربراہ اور طبیب ہونے کی وجہ سے خلائق کے مرجع تھے، ۱۲۹۹ھ میں فوت ہوئے، انہوں نے شہیرِ آفاق شاہ ابواسحاق لہراویؒ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا۔

حافظ عبداللطیف امامِ جامع مسجد مبارک پور کے والدؒ شاہ ابواسحاق صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، چوں کہ وہ رئیس اور مالدار تھے، اس لیے وہ ''دَھنّا سیٹھ'' کے خطاب سے مشہور تھے اور ''مولوی دَھنّا'' کے نام سے پکارے جاتے تھے، نہایت نیک و متقی عالم تھے، ان کے کتب خانہ میں ''نہج البلاغۃ'' کا نہایت عمدہ قلمی نسخہ تھا، نیز ''تحفۂ اثنا عشریہ'' کا قلمی نسخہ بھی تھا۔

مولوی بڑھو شیعی مبارک پوری بھی حافظ صاحبؒ کے شاگردوں میں تھے، استاذ اور شاگرد اگرچہ مسلک کے اعتبار سے مختلف تھے، مگر تعلقات نہایت خوش گوار تھے، استاذ نے ان کو اہل سنت سے اتنا قریب کر دیا تھا کہ وہ بلا تکلف سنیوں کے ساتھ نماز باجماعت پڑھتے تھے، لوگ ان کو مسجد کی طرف آتے دیکھ کر اقامت سے رُک جاتے تھے، تا کہ وہ وضو کر کے جماعت میں شریک ہو سکیں۔

وفات: ۱۲۳۴ھ میں غازی پور میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ (دیارِ پورب میں علم اور علماء، تذکرۂ علماءِ اعظم گڑھ)

حضرت مولانا سید مجاہد الدین بالا پوریؒ متوفی ۱۲۳۵ھ

نام ونسب: آپؒ مولانا سید محمد معصوم نقشبندیؒ کے تیسرے صاحب زادے ہیں، ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے، آپؒ کا مولد ومنشا بالا پور برار ہے۔

ابتدائی تعلیم: سن شعور وتمیز کے بعد مولوی سید شمس الدین آپؒ کو تعلیم کے لیے اورنگ آباد ہمراہ لے گئے، آپؒ نے ابتدائی کتب شرحِ ملا تک مولوی صاحبؒ کی خدمت میں پڑھیں، پھر مولوی صاحبؒ نے عالمِ فانی سے رحلت فرمائی، آپؒ نے مولوی نور الہدیٰ سے درس شروع کیا، ذکی الطبع وذہین تھے، طلبہ کے ساتھ مباحثہ میں سب پر غالب رہتے تھے، حضرت مولانا قمر الدینؒ نے آپؒ کو ملقب بہ ''اسد المعرکہ'' فرمایا تھا، آپؒ نے چند مدت میں تحصیل علوم سے فراغت حاصل کی۔

بیعت وخلافت: تحصیل کے بعد مولانا قمر الدینؒ کی خدمت میں بیعت وخلافت کی درخواست کی، مولاناؒ نے فرمایا کہ آپ کے والد معصوم بھائی افضل زمانہ ہیں، ان سے بیعت کرلو، آپؒ نے اصرار کیا، مولاناؒ نے فرمایا: ''آج شب کو استخارہ کرو'' آپؒ نے استخارہ کیا تو عالمِ رویا میں دیکھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ کے اطراف میں چار قبریں ہیں، اور دل میں ارادہ کیا کہ چوتھی قبر کے پاس جانا چاہیے، آپؒ اسی خیال میں گئے، وہاں کسی سے دریافت کیا کہ یہ چوتھی قبر کس بزرگ کی ہے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ حضرت

محمد معصوم بن شیخ احمد سرہندیؒ کی قبر ہے، آپؒ خواب سے بیدار ہوئے، علی الصباح مولاناؒ کی خدمت میں خواب کا واقعہ بیان کیا، مولاناؒ نے فرمایا: ''معصوم بھائی مسمّٰی بہ عروۃ الوثقیٰ ہیں، آپؒ کو ان کی بیعت کا اشارہ ہوا'' پھر آپؒ اورنگ آباد سے بالا پور میں والد ماجد کی خدمت میں آئے، والد کے مرید وخلیفہ ہوئے، والد سے کمالاتِ باطنی حاصل کیے، درجۂ کمال کو پہنچے، آپؒ جامعِ علوم صوری ومعنوی تھے، طالبین ومریدین کو درس وتدریس اور توجہ وتلقین سے سرفراز فرماتے تھے، بیعت کے بعد دوسرے سال آپؒ نے مسجد میں ماہِ رمضان میں قرآن ختم کیا، سامعین بہت خوش ہوئے، اس روز ماہِ مبارک کی ستائیسویں تاریخ تھی، والد ماجدؒ نے خلافت کا خرقہ عطا کر کے سجادہ نشین فرمایا۔

فضل وکمال: آپؒ حسن سلوک وخلق میں مشہورِ آفاق، عزیز خلائق اور مقبولِ خلاق تھے، آپؒ خانقاہ میں سجادہ نشین ہوئے، خانقاہ کو آپؒ کے وجودِ ذی جود سے دو چند رونق حاصل ہوئی، جو کچھ خانقاہ میں آمدنی ہوتی تھی وہ سب فقراء پر صرف فرماتے تھے، ایک حبّہ بھی جمع نہیں فرماتے تھے۔

تصلب فی الدین: آپؒ کے مزاج میں دین کی حمیت اور اسلام کی حرارت شدت سے تھی، دینی امر میں کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے، شرع کے موافق عمل کرتے تھے، ۱۲۰۱ھ میں بالا پور میں مرہٹوں نے گنیش کی رسمِ جدید ایجاد کی، اہل اسلام مانع ہوئے، وہ اپنے فعل سے باز نہیں آئے، بلکہ گنیش کی سواری اہل اسلام کے متبرک مقامات مساجد وخوانق کے سامنے سے لے جانا چاہتے تھے، اہل اسلام نے آپؒ کی خدمت میں عرض کیا، آپؒ بمقتضائے نامِ خود مجاہد فی سبیل

اللہ ہوئے، جنگ کا سامان فراہم کر کے مودھوجی بھونسلے سے مقابلہ کیا، نواب آصف جاہ ثانیؒ نے تائید کی اور مودھوجی کو تہدیداً ایک مراسلہ بھیجا، اور نواب صلابت خان ناظمِ ایلچپور کے نام احکام بھیجے کہ مولاناؒ کی اعانت کرو، اور سکندر خان کو سرکارِ عالی کی طرف سے امین مقرر کر کے روانہ کیا، احکام وامین کے پہنچنے سے قبل مولاناؒ اور مودھوجی کے درمیان سخت جنگ ہوئی، مرہٹوں نے خانقاہ جلا دی اور خانقاہ کا تمام اسباب غارت کیا، آپؒ کے پاس نہ فوج تھی نہ جنگ کا سامان، مگر آپؒ متوکلا علی اللہ دین اسلام کے لیے متعدد مریدین واہل اسلام کو ہمراہ لے کر خوب لڑے، اور جان نثارانِ محمدی نے بھی بہادری کی داد دی، آخر آپؒ فیروز وکامیاب ہوئے، مخالفین مغلوب و ناکام رہے، تمام اہل اسلام اور مشائخ علاقۂ برار بہت خوش ہوئے، سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

سفرِ حیدرآباد: بعد ازاں آپؒ ۱۲۳۳ھ میں برادر مولوی سید نور العلی کی ملاقات کے لیے حیدرآباد دکن گئے، حیدرآباد کے علماء ومشائخ آپؒ کے مقدم شریف سے بہت ہی خوش ہوئے، ہر ایک آپؒ کی ملاقات سے مشرف ہوتا تھا، آپؒ حضور سکندر جاہ کی ملازمت سے سرفراز ہوئے، حضور نظام آپؒ کی ملاقات سے بہت خوش ہوئے، آپؒ کو دو موضع جاگیر عنایت کیے، جو تا بہ حین حیات بحال رہے، آپؒ کی رحلت کے بعد گاؤں ضبط ہو گئے، آپؒ اور برادر مولوی کلیم اللہ میں نہایت محبت تھی، گویا ایک جان دو قالب تھے، اور آپؒ کی شادی خواجہ میر محمود خان بن عبداللہ خان مخدوم اعظمی احراری دیوانِ اُجین کی لڑکی سے ہوئی تھی، کوئی اولاد نہیں ہوئی، لاولد تھے، بھائیوں کی اولاد کو بجائے فرزندان سمجھتے

تھے۔

وفات: آپ ؒ ۲۰/ رجب/ بروز پنجشنبہ/ ۱۲۳۵ھ میں دارالبقا کو روانہ ہوئے، مولانا سید ظہیر الدین ؒ کی قبر کے قریب دفن ہوئے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ... اور آپ ؒ کی زوجہ آپ ؒ کی حین حیات میں ۱۲۰۰ھ میں وفات پا چکی تھیں۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ (محبوب التواریخ: ۲/ ۹۰۲)

ف: ان حضرات کی خانقاہ (بالاپور) میں مولانا اسماعیل بھوٹا صاحب کے ساتھ حاضر ہوا ہوں، کتب خانہ دیکھا اور قبور کی بھی زیارت کی، سورۂ فاتحہ اور چند سورتیں پڑھ کر ایصالِ ثواب بھی کیا، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین (مرتب)

حضرت مولانا شاہ محمد اجمل الہ آبادیؒ متوفی ۱۲۳۶ھ

نام ونسب: نام محمد اجمل، کنیت ابوالفضل، لقب ناصرالدین، والد کا نام شاہ محمد ناصر افضلی ہے۔

ولادت: ۱۱/شوال ۱۱۶۰ھ مطابق: ۱۷۴۷ء بروز پنجشنبہ الہ آباد میں آپؒ کی ولادت ہوئی۔

تعلیم وتربیت: آپؒ کے والد بزرگ وار نے آپؒ کے حق میں برابر دعا فرمائی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ آپؒ کی دعاؤں کے طفیل اعلیٰ مرتبہ پر پہنچے اور بڑا درجہ حاصل ہوا، آپؒ کی ذات اسم بامسمیٰ تھی، فطرۃً نہایت حسین اور نہایت ذہین تھے اور بہت کم عمری میں ہی قرآنِ پاک حفظ کرلیا، والدہ محترمہ کی تعلیم وتربیت نے چار چاند لگائے اور قدم قدم پر آپؒ کے جوہر نکھارنے اور آپؒ کے کردار سنوارنے کی کوشش کی، بچپن کے بہت سے واقعات اور روزانہ کے معمولات کی طرف اکثر وبیشتر آپؒ نے اپنے قصائد ومثنوی میں اشارے کیے ہیں، بچپن کے ایک واقعہ کا ذکر آپؒ نے اپنی مثنوی میں کیا ہے اور ان کی نصیحتوں کا ذکر کرتے ہوئے انہیں بہت اچھے لفظوں میں یاد کیا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ آپؒ اپنی عمر کے نویں سال میں قدم رکھ چکے ہیں، عید کا دِن ہے، مکتب کے دیگر طالبِ علم نفیس لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں، آپؒ کو بھی شوق دامن گیر ہوا، لوگ عمدہ لباس حاضر کرتے ہیں، مگر والدہ محترمہ جن کے

پیش نظر آپؒ کی آئندہ زندگی ہے منع فرماتی ہیں اور خرقۂ آبائے کرام زیب تن کرنے کے لیے حکم دیتی ہیں، چنانچہ حسب الحکم خرقۂ آبائی پہن کر مریدین ومعتقدین کی جماعت کے ساتھ مسجد تشریف لے جاتے ہیں، مادرِ مہربان فرماتی ہیں کہ شہنشاہوں اور وزراء کے لیے حریر ہے اور فقیر کے فخر کے لیے جامۂ کہنہ، ان کے حکم کی پیروی میں زیب تن فرما کر روانہ ہوتے ہیں، مریدین ومعتقدین کی کثیر تعداد ساتھ ساتھ ہے، بار بار اس جامۂ کہنہ کو چومتے نظر آتے ہیں، صدر مجلس کی طرف لوگ اشارہ کرتے ہیں، آپؒ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ زربفت (ایک ریشمی کپڑا جو زری کے تاروں کی آمیزش سے بنا جاتا ہے) کے لباس میں ملبوس ہیں وہ پیچھے کی صف میں خاموش بیٹھتے چلے جاتے ہیں، اس وقت آپؒ کو اندازہ ہوتا ہے کہ زربفت اور دلق یعنی گدڑی میں کیا فرق ہوتا ہے، دلق پوش صدر مجلس میں نظر آتا ہے اور زربفت کے لباس میں ملبوس کو پیچھے کی صف ملتی ہے۔

آپ کے اساتذہ: آپؒ کے برادرِ بزرگؒ نے شفقتِ بزرگانہ مبذول فرمائی اور آپؒ کی تعلیم اور ارشاد کی طرف ہمہ تن مشغول ہوئے، ان کے علاوہ علامۂ عصر مولانا محمد فصیح جون پوریؒ، مولانا محمد اسلم الٰہ آبادیؒ، مولانا محمد یٰسینؒ، مولانا محمد ناصح ؒ، قاضی القضاۃ محمد سعید خانؒ اور نواب سعید اللہ خانؒ سے علومِ فارسیہ وعربیہ مثلاً منطق وفلسفہ، معانی وبیان، تفسیر، فقہ، حدیث اور فن عروض، غرض جملہ علوم وفنون بدرجۂ اتم حاصل کیے، گیارہ سال ہی کی عمر سے محافل ومجالس میں شرکت فرمانے لگے۔

فضل وکمال: حضرت اجمل افضلیؒ کو ان کے والد بزرگ وار نے مرید فرمایا

تھا، برادرِ بزرگؒ کے ریاضت ومجاہداتِ شاقہ میں مشغول رہے، سلاسل خمسہ میں مجاز وماذون تھے، اورکسبِ کمالاتِ ظاہری وباطنی کے بعد مسندِ رشد وہدایت پر جلوہ افروز ہوئے، یادِ الٰہی میں مستغرق رہتے، ایک کیفیت سی آپؒ کے اوپر طاری رہتی، اللہ تعالیٰ نے شہرت ومقبولیت عطا فرمائی، مرجع خاص وعام تھے، ہر وقت عوام کا جم غفیر گھیرے رہتا، شریعت پر کاربند رہے، صوفیۂ زمانہ کی بدعات سے محترز اور الگ تھے، شرع نے بلند مقام پر پہنچادیا، آپؒ کی طریقت شریعت سے کوئی الگ چیز نہ تھی، قطبیت کے درجہ تک پہنچے اورعرب وعجم میں آپؒ کا نام گونجنے لگا، آپؒ نہایت کریم النفس، سخی، دریا دل اور فیاض تھے، خدمت خلق، ہدایت خلق اللہ، محتاجوں، بے کسوں، مجبوروں اور لاوارثوں کی حاجت روائی آپؒ کا شغل خاص تھا۔

آپؒ کی خانقاہ کا حال: آستانۂ عالیہ پر شب وروز اہل حاجت کا ایک انبوہِ کثیر رہتا جو آپؒ کے خوانِ نعمت سے سرفراز ہوتا، مسافر خانہ اور مدرسہ قائم تھا، جس سے ہزارہا طالب علموں کا روزینہ اور مدرسین کی تنخواہیں ملتیں، طلبہ آپؒ کے دسترخوان پر آٹھ سو کی کثیر تعداد میں دونوں وقت موجود ہوتے، لنگر خانہ جاری رہتا، مشہورِ خواص وعوام تھا کہ آپؒ کا تندور ہر وقت گرم رہتا ہے۔ غرضیکہ ایک بڑا کارخانہ آپؒ کے ذمہ تھا، جس کے آپؒ کفیل تھے، آپؒ کے عہد میں دائرہ، انتہائی کمال کو پہنچا، آپؒ کی شہرت عرب وعجم میں پھیلی، علمائ، فضلاء مشائخ، سیاح اور زائرین آپؒ کے مہمان ہوتے، علم وعمل کی صحبتیں گرم رہتیں۔

آپؒ کے تعلقات: حضرت شاہ اجمل الہ آبادیؒ کے تعلقات ہر طبقہ

سے تھے، بادشاہوں میں شاہ عالم ثانی اور امیروں میں آصف الدولہ سے آپؒ کے گہرے تعلقات تھے، اور وہ جب الہ آباد آتے تو دائرہ میں حاضر ہوتے اور تا دیر قیام کرتے، علماء اور مشائخ میں احمد بن محمد بن علی الانصاری یمنی شروانیؒ، علامہ تفضّل حسین خان کشمیریؒ، مولانا شیخ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، بحرالعلوم مولانا عبدالعلی ارکائیؒ، میر انشاء اللہ خان انشائیؒ، میر ماشاء اللہ خان مصدرؒ، مولانا مدن لکھنویؒ، مرزا محمد علی فروغ، مرزا حاتم بیگ وانی، مولوی نور العین واقفؒ، مرزا حکیم بیگ خان حاکم، مرزا مرتضیٰ علی فراق، مرزا اشرف الدین علی وفا، نواب احمد علی عشرت، مرزا فاخر مکینؒ، شیخ علی حزینؒ، مرزا افضل علی ذاکر جیسی اہم ترین شخصیتوں سے آپؒ کے تعلقات تھے، ان میں بہت سے حضرات حاضر دائرہ بھی ہوتے اور علمی و ادبی مجلسیں و محفلیں دائرہ میں ہوتیں، مولانا مدن لکھنویؒ نے مشائخ کبار کی موجودگی میں شاہ اجمل الہ آبادیؒ سے مسئلہ حدیث میں مصافحہ کیا، یہ بھی ایک طریقہ حدیث میں سند لینے کا تھا، شیخ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے آپؒ کی خط و کتابت تھی اور آپؒ سے وہ عقیدت و مودّت رکھتے تھے اور شیخ الاسلام والمسلمین اور امام المسلمین کے القاب سے یاد کرتے تھے۔

آپؒ کی شادی: آپؒ نے دو شادیاں کیں، پہلی شادی اپنی عم زاد ملکیہ بی بی سے کی، مگر ان کے بطن سے کوئی اولاد نہ ہوئی اور وہ لاولد فوت ہوئیں، دوسری شادی آپؒ نے امۃ الحبیب بی بی بنت حضرت قطب میر فقیر اللہ جنیدی قادری رحمہ اللہ تعالیٰ سے کی۔

تصنیف و تالیف: حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادیؒ نے رشد و ہدایت کی ذمہ

داریوں کو سنبھالتے ہوئے تصنیف وتالیف کا فرض بھی نبھایا، آپؒ کی تصانیف جو آفاتِ زمانہ سے بچی رہیں ان میں ایک قرآن شریف کا ترجمہ فارسی زبان میں ہے، اس کے علاوہ فارسی زبان میں قصیدہ ریاضِ ارم، قصیدہ مظاہر الانوار، قصیدہ راحت القلوب، قصائد در مدحِ اہل بیت کرام، مثنویٔ عاشق ومعشوق، مثنوی بر پندونصائح، مثنویٔ جگر خراش، مثنویٔ نالۂ عشاق، دیوانِ نعت مشہور آفاق ہیں۔

وفات: حضرت شاہ محمد اجمل الٰہ آبادیؒ کا وصال یکم ماہِ ذی الحجہ ۱۲۳۶ھ مطابق: ۱۸۳۰ء بروز جمعہ پچھتّر سال دوماہ کی عمر میں اسی دائرۂ فضل وکمال الٰہ آباد میں ہوا۔ ''**کان الشیخ قطب الأقطاب**'' سے تاریخ وفات نکلتی ہے، الٰہ آباد میں مدفون ہیں، جواب دائرۂ شاہ اجملؒ سے مشہور ہے، بلکہ پورا محلہ اسی نام سے موسوم ہوگیا ہے۔ نوّر اللہ مرقدہ۔ (سراجِ منیر قلمی نسخہ: ۱۲۵)

حضرت شاہ محمد قاسم حیدر آبادیؒ متوفی ۱۲۳۸ھ

ولادت ونام ونسب: آپؒ غلام محمد بن شیخ کبیر انصاریؒ کے صاحب زادے ہیں، نسب کا سلسلہ چند واسطے سے حضرت عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے، آپؒ کے والد درویش سیرت و نیک خصلت تھے، بزرگانِ دین سے نیک اعتقاد رکھتے تھے، آپ کا مولد قصبہ جھونجھنو، ضلع فتح آباد علاقہ سرکار جیپور ہے، آپؒ کی ولادتِ باسعادت ۱۱۷۵ھ میں ہوئی، پرورش قصبہ کی آب وہوا میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم: والد ماجد لختِ جگر کی تربیت و پرورش میں مصروف رہتے تھے، جب آپؒ کی عمر چار برس کی ہوئی تو والد ماجد نے تسمیہ خوانی کی رسم ادا کی اور آپؒ کی تعلیم شروع کی، دس بارہ سال کی عمر میں ختم قرآن ومسائل روزہ ونماز سے فارغ ہوئے، لکھنے پڑھنے میں لیاقت نہیں رکھتے تھے، بعض مؤلفین نے مطلق امّی لکھا ہے، مگر یہ غلط ہے۔

بیعت: چودہ پندرہ برس کی عمر میں والد ماجدؒ آپؒ کو حضرت شاہ محمد عزۃ اللہ قدس سرہٗ کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا کہ حضرت! بندہ زادے کو شرفِ بیعت سے مشرف فرمایئے، حضرتؒ نے آپؒ کو بیعت سے مشرف فرمایا، اولاً سلسلۂ نقشبندیہ، دوم طریقۂ قادریہ میں مرید فرمایا، اور دونوں طریقوں کے اشغال واوراد کی تعلیم دی، آپؒ پیرومرشد کے حکم کی تعمیل کرنے لگے، مدت تک

آبادی سے دور رہے، صحراء وجنگل میں گوشہ نشین رہنے لگے، رات دن ذکر و شغل میں بسر کرتے تھے، ریاضت ومجاہدہ اور ذکر و شغل کی برکت سے درجۂ کمال کو پہنچے، خداشناسی کے دریا میں غرق ہوئے اور اپنی خودی سے بے خود ہو گئے، پیرو مرشد نے آپؒ کو وصال کے قرب میں خلافت کی خلعت سے مشرف فرمایا اور آپؒ کو ارشاد فرمایا کہ آپ دکن تشریف لے جایئے اور اہل دکن کو ہدایت و ارشاد سے سرفراز فرمایئے۔

چنانچہ آپؒ حسبِ حکم وہاں تشریف لے گئے اور لوگ آپ سے فیض یاب ہوئے۔

اخفاءِ حال: آپؒ لوگوں سے اپنا حال پوشیدہ رکھتے تھے، آپؒ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ مجھے مشائخ میں شمار کریں، اس لیے آپؒ مشائخانہ لباس سے اجتناب کرتے تھے، قبائے نیم تن زیب بدن فرماتے، سر پر سادہ دستار اور ایک چادر گزی کاندھے پر رکھتے تھے، گلے میں ایک رومال، پاؤں میں معمولی پاپوش اور ہاتھ میں تلوار، بہر حال آپؒ سپاہانہ لباس میں ولیٔ کامل تھے، لوگ واقف نہیں تھے، اس لیے ظاہر حال کو دیکھ کر تمسخر و مذاق کرتے تھے، مگر آپؒ کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے۔

چنانچہ ایک شب آپؒ سلطان میاں کی دیوڑھی میں ذکر میں مشغول تھے، وہاں ایک جوانِ خوش طبع آپؒ کے قریب بستر پر تھا، اس نے از روئے تمسخر آپؒ کے سر سے چادر یا رومال کھینچ لیا، آپؒ اس کی اس حرکتِ ناشائستہ سے نہایت ہی رنجیدہ وغضب ناک ہوئے اور اس کی طرف غصہ سے دیکھا، مذکور جوان آپؒ کی

توجہِ جلال سے زمین پر گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا، تین روز تک حالتِ غشی میں رہا، ہوش آنے کے بعد آپؒ کی خدمت میں حسن ارادت سے مرید ہوا، اپنے فعل ناشائستہ سے توبہ کی اور معافی کا خواہاں ہوا، اس واقعہ کے ظاہر ہونے سے عام و خاص میں آپؒ کی شہرت ہوگئی، لوگ حلقۂ ارادت میں آنے لگے، آپؒ لوگوں سے گریز کرتے تھے، آپؒ نوکری سے دست بردار ہوئے، چندروز ایلچی بیگ کی کمان کی مسجد میں مراقبہ و اوراد میں مصروف رہے، پھر آپؒ نے گلزار خانؒ کی حویلی میں سکونت اختیار کی۔

ارشادات: آپؒ فرماتے تھے کہ ''قرآن و حدیث کے مطابق عمل کرنا چاہیے، میں جو کچھ نصیحت کرتا ہوں وہ بھی اگر قرآن وحدیث کے مطابق ہے تو اس کی تعمیل کرو، ورنہ تعمیل ضروری نہیں۔'' آپؒ ہمیشہ شریعتِ محمدی کا لحاظ فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ ''شریعت کا ترک گمراہی ہے۔'' اور فرماتے تھے کہ ''نماز دو قسم کی ہوتی ہے: ایک نمازِ ظاہری، دوسری باطنی، نمازِ ظاہری قیام، قعود، رکوع اور سجود ہیں، نمازِ باطنی ترکِ وجود ہے، یعنی اپنی ہستی کو عین نیستی سمجھنا چاہیے، جو دونوں نمازیں ادا کرتا ہے کامل ہوتا ہے، جو ایک ادا کرتا ہے وہ ناقص کہلاتا ہے۔''

فرماتے تھے کہ ''جو سالک بدونِ شریعت وطریقت میدان میں قدم رکھتا ہے گمراہی کے قریب پہنچتا ہے۔'' نیز آپؒ فرماتے تھے کہ ''جو میری نظرِ توجہ سے گزرا وہ صاحبِ دل ہوگیا۔'' فرماتے تھے کہ ''دنیا میں عمارات و مکانات کا تعمیر کرنا فضول ہے، ہمیں عقبیٰ کے گھر کی تیاری کرنی چاہیے۔'' آپؒ فرماتے تھے

کہ ''جس کو فقیری کا مزہ ملا وہ کب امیری کو پسند کرتا ہے؟'' آپؒ فرماتے تھے کہ ''عاقل کے لیے اشارہ کافی ہے، جاہل کو دفتر کے پڑھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

آپؒ کے ملفوظات بے شمار ہیں، جو مریدین کی مزاولت و مداومت کی وجہ سے مشہور ہیں۔

وفات: آپؒ بمصداق {کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ} یکا یک ۲۹/ ربیع الثانی ۱۲۳۸ھ میں بعارضۂ مہلک بیمار ہوئے، بیمار ہوتے ہی آپؒ کی حالت متغیر ہو گئی، جاں کنی کی نوبت آئی، مریدین میں سے ایک نے عرض کیا کہ حضرت! موت کا وقت قریب ہے، کلمۂ شہادت پڑھنا چاہیے، آپؒ نے آہِ سرد کھینچ کر فرمایا: ''میری تمام عمر بے فائدہ گزر گئی، دوتین بار کلمۂ شہادت پڑھا، کلمہ پڑھتے پڑھتے قالبِ خاکی سے روح پرواز کر گئی، معتقدین و مریدین کو بہت رنج والم ہوا، پھر آپؒ کی تجہیز و تکفین عمدہ طرح سے کی گئی، محلہ اردو واقع شہر حیدر آباد میں مدفون ہوئے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔ (محبوب التواریخ: ۲/ ۹۹۶)

حضرت مولانا فضل امام خیرآبادیؒ متوفی ۱۲۴۰ھ

(صاحب مرقات)

نام ونسب: نام فضل امام، والد کا نام شیخ محمد ارشد ہے، آپؒ مشہور مجاہد آزادی مولانا فضل حق خیرآبادیؒ کے والد ہیں، آپؒ کا سلسلۂ نسب خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

پیدائش اور وطن عزیز: ہندوستان کے وہ قصبے جو مردم خیزی میں مشہور رہے ہیں ان میں ضلع سیتاپور کا قصبہ خیرآباد بھی ہے، اب چودہویں صدی کے رُبع آخر میں اس کی حالت کچھ بھی ہو، مگر حلقۂ درس و تدریس سے تعلق رکھنے والے جانتے ہیں کہ گذشتہ صدی کے آخر تک خیرآباد کو خیر البلاد لکھا جاتا تھا، حضرت مولانا فضل امام صاحبؒ اسی خیرآباد کے مشہور فاضل ہیں، لیکن چندوجوہ و اسباب کی بنا پر آپؒ نے شاہ جہاں آباد میں اس طرح توطن اختیار کیا کہ یہیں کے رؤساء میں محسوب ہونے لگے۔

آباءواجداد: آپؒ کے مورثِ اعلیٰ شیر الملک ایک قطعہ مُلک ایران پر قابض وحکمراں تھے، زوالِ ریاست پر دولتِ علم کمائی، ان کے دو صاحب زادے بہاء الدین وشمس الدین ایران سے واردِ ہند ہوئے، شمس الدین نے مسندِ افتاءِ رُہتک سنبھالی، شاہ ولی اللہ صاحبؒ اُن ہی کی اولاد سے تھے، اور بہاء الدین قبۃ الاسلام بدایوں کے مفتی ہوئے، ان کی اولاد میں شیخ ارزانی بدایونیؒ

نامور بزرگ اور اعلیٰ درجہ کے مفتی ہوئے۔

شیخ عمادالدین بن شیخ ارزانی تحصیل علم کی خاطر قاضی ہرگام (ضلع سیتاپور، اَوَدھ، یوپی) کی خدمت بابرکت میں پہنچے، قاضی صاحب نے تحقیق شرافت ونجابت کے بعد اپنا داماد بنالیا، قاضی صاحب کے انتقال کے بعد قاضی ہرگام بن گئے، اور وہیں سکونت اختیار کرلی لیکن آپؒ کے والد شیخ محمد ارشدؒ نے ہرگام کو خیرباد کہہ کر خیرآباد ضلع سیتاپور آباد کیا۔

علمی قابلیت: علمی قابلیت کا اندازہ تو اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک جانب شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر رحمہا اللہ کا ڈنکا منقولات میں بج رہا تھا، اور دوسری طرف اسی دہلی میں مولانا فضل امامؒ کے معقولات کا سکہ چل رہا تھا، طلبہ دونوں دریا سے سیراب ہورہے تھے۔

تحصیل علم: مولانا فضل امام صاحبؒ بڑے طباع وذہین تھے، مولانا، سید عبدالواحد کرمانی خیرآبادیؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، علومِ نقلیہ وعقلیہ، اُن ہی سے حاصل کیے، اس کے بعد دہلی میں صدرالصدور کے عہدہ پر فائز ہوئے، مولانا شاہ صلاح الدین صفوی گوپاموئیؒ (تلمیذِ رشید مولانا محمد اعظم سندیلویؒ ومرید وخلیفہ مولانا شاہ قدرت اللہ صاحب صفی پوریؒ) کے مرید تھے۔

درس وتدریس: فرائض ملازمت کے ساتھ مشغلۂ تدریس وتصنیف ہمیشہ جاری رکھا، مادۂ افہام وتفہیم حق تعالیٰ نے ایسا بخشا تھا کہ ایک بار شریک درس ہونے کے بعد طالب علم دوسری طرف کا رُخ بھی نہ کرتا تھا، آپؒ کے تلامذہ میں سب سے زیادہ نمایاں آپؒ کے صاحب زادے فضل حق اور مفتی صدرالدین

خان آزردہؔ صدر الصدور دہلی ہوئے، مولوی سناء الدین احمد بن محمد شفیع بدایونی اور شاہ غوث علی بھی آپؒ ہی کے شاگرد ہیں۔

تصانیف: مولاناؒ نے بیسیوں مفید و معرکہ آرا کتابیں لکھیں، جن مصنفات کا نام و پتہ معلوم ہوسکا وہ درج کی جاتی ہیں، دو ایک کے سوا سب غیر مطبوعہ ہیں، سب سے زیادہ مشہور تصنیف علم منطق میں مرقات ہے، جو تمام مدارسِ عربیہ میں داخل نصاب ہے، اس کے علاوہ میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال اور الافق المبین پر حواشی لکھے، تلخیص، الشفائ، نخبۃ السر اور آمدنامہ تصنیف کیا، تذکرۂ علماءِ ہند میں ہے: ''آمدنامہ کہ درآں قواعد فارسی بیان کردہ و نیز ترجمہ علماءِ جوار لکھنؤ تحریر فرمودہ۔'' (ظفر المحصلین: ۴۳۹)

وفات: ۵/ ذوالقعدہ/ ۱۲۴۰ھ میں آپؒ نے سفر آخرت کیا اور اِحاطۂ درگاہِ مخدوم سعد الدین خیرآبادی میں بمقام خیرآباد، ضلع سیتاپور، یوپی میں مدفون ہوئے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔ (ظفر المحصلین: ۴۴۲)

حضرت مولانا شاہ غلام علی دہلویؒ متوفی ۱۲۴۰ھ

نام ونسب: آپؒ کے والد نے نام ''علی'' والدہ نے ''عبدالقادر'' اور چچا نے ''عبداللہ'' رکھا۔ آپؒ اپنا نام ''عبداللہ عرف غلام علی'' لکھتے تھے اور اسی سے مشہور ہوئے، والد کا نام ''شاہ عبداللطیف'' ہے جو نہایت مرتاض ومجاہد بزرگ تھے، آپؒ کا سلسلۂ نسب سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۱۵۶ھ کو قصبہ بٹالہ صوبہ پنجاب میں ہوئی۔

(درالمعارف: ۲۴)

تعلیم وتربیت: اپنے علاقہ میں تحصیل علومِ دینیہ کرنے کے بعد دہلی آئے، یہاں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو کر صحیح بخاری کا درس لیا اور سند حدیث حاصل کی۔

بیعت واجازت: بائیس سال کی عمر میں شیخ کبیر حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں شہیدؒ سے بیعت ہو کر طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ کی تکمیل کی اور خلافت واجازت سے سرفراز ہوئے، اپنے شیخ کی خدمت میں ان کی شہادت کے وقت تک رہے، شیخ کے بعد مسند ارشاد پر فائز ہو کر جانشینی کا حق ادا کر دیا، من جانب اللہ آپؒ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، عرب وعجم کے علماء ومشائخ اور عوام جوق در جوق آپؒ کی مجلس ارشاد میں حاضر ہو کر یقین محکم کی دولت حاصل کرتے تھے، خود قرآنِ مجید کے دس پاروں کی روزانہ تلاوت، ذکر نفی واثبات، اسمِ ذات اور

استغفار و درود کی کثرت، نیز پوری طرح پابندیٔ اوقات اور اعمال و اخلاق میں اتباعِ شریعت مطہرہ کا اہتمام کرتے ہوئے اپنے مریدین و مسترشدین کے اعمال و اخلاق اور اَوراد و اذکار کی بھی کڑی نگرانی فرماتے تھے۔

خصوصیات: سر سید احمد خان ''آثار الصنادید'' میں آپؒ کی خصوصیات و معمولات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپؒ زہد و قناعت، تسلیم و رضا، توکل و ایثار اور ترک و تجرید میں یگانۂ دہر تھے، آپؒ نے سادہ زندگی بسر کی، قیمتی لباس اور لذیذ کھانوں سے پرہیز کیا، جو کچھ فتوحات ہوتی تھیں وہ درویشوں اور مستحقین کے صرف میں آتی تھیں، اول وقت نمازِ فجر پڑھ کر اور تلاوتِ قرآن مجید کر کے اپنے اصحاب کو توجہ دیتے تھے، یہ سلسلہ اشراق تک رہتا تھا، نمازِ اشراق پڑھ کر حدیث و تفسیر کا درس دیتے تھے، دوپہر کو تھوڑا سا کھانا تناول فرما کر قیلولہ فرماتے، اول وقت نمازِ ظہر پڑھ کر فقہ، حدیث اور تصوف کا درس دیتے، عصر تک یہ سلسلہ جاری رہتا، پھر بعد نمازِ عصر اپنے اصحاب کو توجہ دیتے، رات کا اکثر حصہ عبادت میں صرف فرماتے، بہت کم سوتے تھے، آپؒ کا سونا مصلّٰی ہی پر ہوتا تھا، آپؒ کی خانقاہ میں سیکڑوں طالبین اور درویش رہتے تھے جن کو آپؒ کے مطبخ سے کھانا ملتا تھا۔

شیخ مراد بن عبداللہ نے ''ذیل الرشحات'' میں آپؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ آپؒ قلیل المنام اور قلیل الطعام تھے، جب کسی مرید کو تہجد کے وقت غفلت کی نیند سوتا دیکھتے تو خود اس کو جگا دیتے تھے، اغنیاء آپؒ کی خدمت میں پر تکلف کھانے پکوا کر بھیجتے، آپؒ نہ خود ان کھانوں کو کھاتے نہ طالبین کو کھلاتے، بلکہ پڑوس کے مستحقین کو تقسیم فرما دیتے تھے، رات کا اکثر حصہ ذکر و مراقبہ میں گزرتا

تھا، رات کو آپؒ کا سونا زیادہ تر بیٹھے بیٹھے ہوتا، آپؒ کی وفات بھی بحالت احتباء بیٹھے بیٹھے ہوئی، کوئی حاجت مند آپؒ کی کوئی چیز بغیر اجازت لیتا تو آپؒ چشم پوشی فرماتے تھے، ایسا بھی اتفاق ہوا کہ کوئی شخص آپؒ سے ایک کتاب لے گیا اور کچھ عرصہ کے بعد اس کو فروخت کرنے کے لیے آپؒ ہی کے پاس خانقاہ میں لایا، آپؒ نے خرید لی، کسی خادم نے کہا بھی کہ حضرت! یہ کتاب آپ ہی کی تھی، اس پر علامت موجود ہے، تو اس کو دخل دینے سے سختی سے منع فرمائے اور یوں فرمائے کہ ''ایک کاتب متعدد کتابیں لکھتا ہے، ہوسکتا ہے کہ اس جیسی کتاب ہو، بعینہٖ وہ نہ ہو۔''

آپؒ موٹا لباس پہنتے تھے، اگر کوئی شخص آپؒ کو نفیس کپڑا یا کوئی قیمتی چیز ہدیہ میں بھیجتا تو اس کو فروخت کر دیتے تھے، اور اس کی قیمت سے اس جنس کی سستی قسم کی بہت سی ضروری اشیاء خرید لیتے تھے اور ان کو صدقہ کر دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''کئی آدمیوں کا نفع اُٹھانا ایک آدمی کے نفع اُٹھانے سے بہتر ہے۔'' (قافلۂ اہل دل:۸۹)

فضل وکمال: آپؒ کی حیاتِ مبارکہ میں اس قدر فیض جاری ہوا کہ شاید ہی کسی شیخ سے اس کی زندگی میں جاری ہوا ہو، ہندوستان کے علاوہ کابل، بلخ و بخارا، عرب وروم ہر ملک میں آپؒ کے خلفاء پہنچ گئے اور طریقۂ عالیہ نقشبندیہ ان سے جاری ہوا، حضرت مولانا خالد کردیؒ آپؒ ہی کے خلیفہ ہیں جن کا سلسلہ فیض اب بھی رواں ہے۔

ابتداءً آپؒ کو معاش کی تنگی پیش آئی، مگر کچھ ہی دنوں کے بعد فتوحات کا سلسلہ جاری ہو گیا اور دو سو کے قریب علماء وصلحاء آپؒ کی خانقاہ میں دور و دراز سے آ کر قیام کرتے اور بقدرِ ضرورت روزی ان کو بطریق احسن پہنچتی۔

مزاج میں بے حد شکستگی اور انکسار تھا اور حد درجہ حیا کا غلبہ تھا، جس کی وجہ سے پاؤں بہت کم پھیلاتے، حتیٰ کہ وفات بھی اسی حالت میں ہوئی، لباس موٹا پہنا کرتے اور اگر کوئی عمدہ لباس بنوا کر بھیجتا تو اس کو فروخت کر کے چند عدد کم قیمت کے کپڑے خریدتے اور اللہ تعالیٰ کے نام پر تقسیم فرما دیتے اور کہتے کہ ''ایک آدمی کے پہننے سے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ چند آدمی پہنیں۔''

آپؒ کا عمل اکثر حدیث پر تھا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے صاحب زادوں نیز اپنے مرشد سے حدیث کی سند حاصل کی تھی، آپؒ حافظِ قرآن تھے، لیکن اس کی کسی کو خبر نہ تھی، برابر تلاوت، مراقبہ اور تفسیر وحدیث کے درس میں مشغول رہتے، اگر کوئی ملاقات کے لیے آتا تو تھوڑی دیر کے بعد رُخصت کر دیتے اور عذر کرتے کہ فقیر اپنی گور وموت کی فکر میں مشغول ہے اور چلتے وقت کچھ بطورِ تبرک شیرینی دیتے۔

دنیا کا ذکر آپؒ کی مجلس میں بالکل نہ ہوتا، آپؒ کی مجلس میں اگر کوئی غیبت کرتا تو منع فرما دیتے اور فرماتے کہ ''غیبت کے لائق تو میں ہوں۔'' (لہٰذا اگر غیبت کرنی ہو تو میری کرو)۔

ف: اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کو اپنے وقت عزیز کی بے حد قدر تھی اور اس کو کارِ آخرت میں ہی صرف فرمانا چاہتے تھے۔ اور یہ حال تو ہر ایک شخص کا ہونا چاہیے کہ اپنی زندگی کے لمحہ لمحہ کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں اور آخرت کی فکر میں گزارے، اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جنت میں کسی بات پر حسرت نہ ہوگی سوا اس وقت کے جس کو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں نہیں لگایا ہے؛ بلکہ غفلت میں گزارا ہے، مگر اس وقت حسرت وندامت سے کیا فائدہ؟ (مرتب)

ارشاداتِ عالیہ : آپؒ نے ارشاد فرمایا کہ ’’طالب کو چاہیے کہ ہر وقت کی عبادت میں علیحدہ علیحدہ کیفیات کا امتیاز کرے اور خیال رکھے کہ تمام سے کیا کیفیت حاصل ہوتی ہے؟ تلاوت سے کس قسم کا ظہور ہوتا ہے؟ درسِ حدیث اور شغل تہلیل (لا الٰہ الا اللہ) سے کیا ذوق پیدا ہوتا ہے؟ اسی طرح خیال رکھے کہ لقمۂ شک سے کیسی ظلمت ہوتی ہے اور گناہوں سے کس قسم کی کدورت پیدا ہوتی ہے؟‘‘

ف: مگر افسوس کہ اب کھانے پینے میں احتیاط تو گویا عنقاء ہی ہوتی جارہی ہے، تو پھر ظلمت و کدورت میں تمیز اور امتیاز کا کیا سوال؟ (مرتب)۔

فرمایا: ’’صوفیہ دنیا و آخرت کو پس پشت ڈال کر متوجہ ہوتے ہیں۔‘‘

للمولوی المعنوی:

ملتِ عاشق ز ملتہا جدا ست　　　عاشقاں را مذہب و ملت خدا ست

یعنی عاشقوں کی ملت جملہ ملتوں سے علیحدہ ہے، یعنی ان کا مذہب و ملت بس اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ پاک ہے۔

ف: کمالِ اخلاص تو یہی ہے کہ اعمالِ صالحہ سے اجر و ثواب کی نیت نہ ہو؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی مقصودِ اصلی ہو، رہا اجر و ثواب کی نیت وطلب، تو یہ بھی اخلاص کے منافی نہیں۔ (مرتب)

فرمایا: ’’طالب کو چاہیے کہ ایک لمحہ یادِ مطلوب سے غافل نہ ہو۔‘‘

ایں شربتِ عاشقی ست خسرو　　　بے خونِ جگر چشیدن نہ تواں

ترجمہ: اے خسرو! یہ عاشقی کا شربت بغیر خونِ جگر کے چکھنا نصیب نہیں ہوسکتا۔ اسی کو کسی نے اُردو میں یوں کہا ہے:

خونِ دِل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو　　یہ غذا ملتی ہے جاناں تیرے دیوانے کو

(مرتب)

فرمایا: ''ایک مرتبہ حضرت مرزا صاحبؒ سے کسی نے میری نسبت بیان کیا کہ وہ طالبِ ذوق وشوق وکشف وکرامت ہے، انہوں نے یہ سن کر فرمایا: ''جو شخص ایسے شعبدوں کا طالب ہو اس سے کہو کہ ہماری خانقاہ سے باہر ہو جائے اور ہمارے پاس نہ آئے۔'' جب یہ خبر مجھ کو پہنچی تو میں نے حاضر ہو کر عرض کیا: ''حضور نے یہ فرمایا ہے؟'' جواب دیا: ''ہاں''، میں نے عرض کیا: '' پھر کیا مرضی ہے؟'' فرمایا: ''یہاں سنگ بے نمک لیسیدن ہے (یعنی پتھر وہ بھی بغیر نمک کے چاٹنا ہے) اگر یہ بے مزگی منظور ہو تو ٹھہرے رہو''، میں نے عرض کیا: ''مجھ کو یہی منظور ہے۔''

ما برائے استقامت آمدیم　　نے برائے کشف وکرامت آمدیم

یعنی میں استقامت کے لیے آیا ہوں، نہ کہ کشف وکرامت کے لیے۔

ف: اسی لیے بزرگوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ **"الاستقامة فوق الکرامة"** یعنی دین پر استقامت کرامت سے بھی بڑھ کر ہے، اس لیے کہ استقامت اللہ تعالیٰ کا مطلوب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو فرمایا: **{فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ}** اور کرامت بندوں کا مطلوب، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مطلوب اعلیٰ وارفع ہوگا بندوں کے مطلوب ومقصود سے۔ **کما أفاده مصلح الأمة علیه الرحمة۔**

اس واقعہ سے یہ بھی مفہوم ہوا کہ طالب کو اپنے مرشد کی تعلیم وتفہیم کو اگرچہ بعنف وسختی ہو بخوشی وبے چون وچرا قبول کرنا چاہیے اور اسی کے مطابق اپنا عمل رکھنا چاہیے، تاکہ درِ فیض وا ہو اور مقاماتِ سلوک طے ہوں، چنانچہ اسی انقیاد واطاعت کی

برکت سے اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ غلام علیؒ کو بے بہا دولت باطنی سے نوازا اور آپؒ کے فیض بے کراں کو دنیا میں عام فرمایا، جس کو حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی زندگی میں دیکھ لیا۔ **ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔** (مرتب)۔

فرمایا: ''پیری کے لائق وہ شخص ہے جو ضروری مسائل کا علم رکھتا ہو، مقاماتِ عشرہ مثل توکل وقناعت وزہد وصبر وغیرہ اسے حاصل ہوں، اربابِ دنیا سے اجتناب رکھتا ہو، مشائخ کرام کی صحبت سے فیض یافتہ ہو، صاحب کشف یا صاحب ادراک ہو، خطرۂ ماسوا سے اس کا دل پاک ہو، ظاہر شریعت سے آراستہ اور باطن طریقت سے پیراستہ ہو۔''

ارشاد فرمایا کہ ''تبدیل اخلاقِ رذیلہ و صفاتِ بشریہ و رفع اَنانیت (خودی) کے واسطے کلمۂ طیبہ کا تکرار اور کثرت سے اس کا ذکر کرنا لازم ہے، جس وقت انوارِ الٰہی غالب ہو جائیں گے سالک کے اخلاق و اوصاف میں شکستگی آجائے گی، اللہ تعالیٰ کا ارشادِ پاک ہے:

{ إِنَّ الْمُلُوْکَ إِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً أَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْآ أَعِزَّةَ أَهْلِهَآ أَذِلَّةً } (النمل: ۳۴)

یعنی یقیناً بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں اور اس کے رہنے والوں میں جو عزت دار ہیں ان کو ذلیل کیا کرتے ہیں۔''

منقول ہے کہ ایک درویش کو توجہ کے واسطے یاد فرمایا، کسی نے عرض کیا: ''وہ جامع مسجد کی طرف سیر کو گئے ہیں''، تو فرمایا کہ ''یہ کیا فقیری ہے؟ فقیری میں صبر لازم ہے اور صبر حبس نفس کو کہتے ہیں۔'' (یعنی نفس کو روکے رکھنا)۔

ف: یہ اس لیے کہ اِدھر اُدھر آنے جانے سے قلب کی جمعیت فوت ہو جاتی ہے، جو مبتدی کے لیے بہت مضر ہے، اسی لیے امام غزالیؒ نے اس راہ کے مبتدیوں کو اسفار سے بتاکید منع فرمایا ہے۔

چنانچہ ''احیاء العلوم'' میں ہے کہ ''أَمَّا السِّيَاحَةُ فِيْ الأَرْضِ عَلىَ الدَّوَامِ فَمِنَ الْمُشَوِّشَاتِ لِلْقَلْبِ، إِلاَّ فِيْ حَقِّ الأَقْوِيَاءِ۔'' یعنی سیر و سیاحت مشوشاتِ قلب میں سے ہے، مگر ہاں، اقویاء کے حق میں موجب تشویش نہیں۔ (احیاء العلوم: ۸ ۲۴) (مرتب)

فرمایا: ''جس وقت ہم مجاہدہ میں مشغول تھے پچیس برس تک خود کو ایک حجرے میں بند کر رکھا تھا کہ نہ جاڑوں میں باہر آتا تھا اور نہ گرمیوں میں۔'' نیز فرمایا کہ ''سترہ سال کی عمر تھی کہ دہلی آیا تھا اور اب مجھے دہلی میں ساٹھ سال گزر چکے ہیں، مگر ایک روز بھی بلا ذکر و فکر اور مراقبہ کے نہیں گزرا، مع ہذا ہر وقت خوفِ خاتمہ دامن گیر ہے، اطمینان تو اس وقت ہوگا جب کہ بہشت میں داخل ہو جاؤں گا اور اپنے کانوں سے نداءِ رب العالمین سن لوں گا کہ اے بندے! میں تجھ سے راضی ہوں۔''

ف: غور فرمایئے کہ پہلے اپنے اعمالِ خیر، ریاضات و مجاہدات کا ذکر فرمایا کہ طالبین و مریدین اس کی اہمیت کو سمجھیں اور اس راہ پر چلیں، یعنی عمل کریں، پھر اس کے معاً بعد اپنے خوفِ آخرت کو بیان فرمایا، تاکہ عاملین و مجاہدین اپنے اعمال و مجاہدات پر ناز نہ کریں؛ بلکہ ڈرتے رہیں کہ معلوم نہیں وہ اعمال قابل قبول ہوئے ہیں یا نہیں، لہٰذا بس اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے اُمیدوار رہیں، اس لیے کہ یہی احتیاط و اعتدال کی راہ ہے، خوب سمجھ لیں۔ واللہ ولی التوفیق۔ (مرتب)

فرمایا: ''جس کسی کو ہماری توجہ سے تصفیۂ قلب وتزکیۂ نفس ہو جائے وہ ہماری طرف سے مجازِ مطلق ہے، اگر چہ ہم نے اس کو زبانی اجازت نہ دی ہو۔''

ف: معلوم ہوا کہ مدارِ اجازت تصفیۂ قلب وتزکیۂ نفس ہے، اس لیے اس کا اہتمام سبھی کو خصوصاً مجازین کو ضرور کرنا چاہیے۔ (مرتب)

فرمایا: ''طالب کیفیت خدا پرست نہیں ہے، ذکر کرنا چاہیے، کیفیت خواہ پیدا ہو یا نہ ہو، اس لیے کہ ذکر فی نفسہٖ عبادت ہے۔''

گر نباشد از شکر جز نام بہر   زاں بسے خوشتر کہ اندرکام زہر

یعنی شکر کے نام کے علاوہ کچھ بھی میسر نہ ہو، تاہم اس سے تو بہتر ہے کہ حلق میں زہر ہو۔

ف: معلوم ہوا کہ ذکر لسانی خواہ کیفیت سے خالی ہی کیوں نہ ہو، مفید ہے اس کو کرتے رہنا چاہیے کہ بیہودہ اور لایعنی باتوں کے کرنے سے تو ہزار درجہ بہتر ہے، اسی کو کہا گیا ہے۔۔ع   ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر۔ (مرتب)

فرمایا: ''فقیری دل سے مراد کے خالی ہونے کو کہتے ہیں، نہ کہ ہاتھ کے خالی ہونے کو۔''

ف: یعنی اگر دل کا تعلق مال و دولت سے نہیں ہے تو خواہ کتنے ہی مال و دولت پاس ہوں، کچھ بھی مضر نہیں، جیسا کہ کتاب وسنت اور اکابر کے کلام سے یہ ثابت ہے۔ (مرتب)

فرمایا: ''حضرت خواجہ ضیاء اللہ خلیفۂ خواجہ محمد زبیرؒ آخرشب میں گریہ وزاری کیا کرتے تھے اور لوگوں کو تنبیہاً بیدار کرتے تھے اور فرماتے تھے: ''افسوس ہے تمہارے حال پر، تم دعوئ محبت کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ

تمہارا محبوبِ حقیقی بیدار ہے، تمہاری طرف متوجہ ہے اور تم ہو کہ غافل پڑے ہو، تم دعویٔ محبت میں جھوٹے ہو۔" عاشقوں کا تو یہ حال ہوتا ہے۔۔۔ع

مجنوں بخیالِ زلفِ لیلیٰ در دشت　　در دشت بجستجوئے لیلیٰ می گشت
می گشت بدشت و برزبانش لیلیٰ　　لیلیٰ می گفت تا زبانش می گشت

فرمایا: "ایمان باللہ فرض ہے، لیکن تین باتیں خاص طور پر ملحوظ رہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر پورا ایمان۔ (۲) یہ یقین کرے کہ جو امر وقوع میں آتا ہے قضاءِ الٰہی سے وقوع میں آتا ہے۔ (۳) ہر فرحت وغم اور ہر مسرت واَلم جو پیش آئے اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے جانے، دردوغم سے شاداں اور صدورِ اَلم سے خنداں رہے۔"

ف: آج کل جو آلام ومصائب رونما ہیں سب کو حق تعالیٰ کی طرف سے یقین کرکے مطمئن ہو جانا چاہیے، یہی علاج ہے اطمینان وسکون کا، ورنہ بے قراری وبے اطمینانی لازمِ حال رہے گی، جیسا کہ آج کل شام، عراق وفلسطین وغیرہ کے احوال وآلام سے ہم سب کو لاحق ہے۔ (مرتب)

فرمایا: "فقروفاقہ کمالِ طریقہ ہے، درویشوں کو طریقۂ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اختیار کرنا چاہیے، حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات یہ تھے کہ انتہائی بھوک کی وجہ سے پتھر پیٹ پر باندھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق قلت طعام کی بہت سی احادیث وارد ہیں، چنانچہ شمائل ترمذی میں آیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کی روٹی سے بھی دو دِن متواتر اپنا پیٹ نہیں بھرا۔ فقراء نے کہا ہے کہ فاقہ کی رات درویشوں کی لیلۃ المعراج ہے۔"

فرمایا: "تبدیلیٔ اخلاقِ رذیلہ اور رفعِ انانیت کے لیے کلمۂ طیبہ کی تکرار

اور ذکر کی کثرت ہونی چاہیے، جس وقت انوارِ الٰہی غالب آئیں گے تو پچھلے اخلاق واَوصاف میں شکستگی آئے گی۔‘‘

فرمایا: ’’حضرت مجدد صاحبؒ اور ان کے تابعین کے احوال ظاہر میں شریعت سے آراستہ اور باطن میں طریقت سے پیراستہ ہیں، ان کا قول ہے کہ جو معارف بال برابر بھی شریعت کے خلاف ہوں وہ ایک جوَ کے عوض بھی نہیں خریدے جاسکتے۔‘‘

فرمایا کہ ’’حدیث کے پڑھنے سے عجیب فیوض وبرکات ظاہر ہوتے ہیں، افسوس کہ لوگوں نے اس برکت کو دیکھنے سے اپنی آنکھوں کو بند کر رکھا ہے، کل چند احادیث مناقب صحابہؓ میں پڑھی گئیں، میں نے مشاہدہ کیا کہ جسم کو غسل سے زیادہ طہارت اور دِل کو تصفیہ سے زیادہ لطافت حاصل ہوئی۔‘‘

ف: دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان فیوض وبرکات سے بہرہ ور فرمائے، آمین۔ (مرتب)

فرمایا کہ ’’جمیع کمالاتِ ظاہری و باطنی بطریق اجمال جناب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حاصل تھے، لیکن جمیع کمالات کی تفصیل کا ظہور زمانۂ خاص اور اشخاص پر موقوف تھا، چنانچہ دیکھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے: ’’**أُعْطِيْتُ مَفَاتِيْحَ كُنُوْزِ الأَرْضِ**۔‘‘ (مجھے تمام خزانوں کی کنجیاں دی گئیں) اس کا ظہور بعد زمانۂ رسالت مآب ہوا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں ممالک فتح نہیں ہوئے، عہدِ خلفاء میں اکثر مقامات فتح ہوئے اور بعد از صحابہؓ سلاطین نامدار نے اکثر مقامات فتح کیے۔‘‘ (اس کے بعد مفصل طریقے پر اس مضمون کو مع امثلہ بیان فرمایا۔ ’’درالمعارف‘‘ سے ہم نے یہ تفصیل نقل کی ہے)۔

ایک طویل مکتوب میں ایک مقام پر یوں فرماتے ہیں: ''با خدا ہونا، ایک طرف دیکھنا، یکساں زندگی بسر کرنا، نعمتہائے الٰہی کو پیش نظر رکھ کر زبان سے شکر ادا کرنا اور حاجت میں رجوع بجنابِ الٰہی بواسطۂ پیرانِ کبار کرنا راہِ طریقت میں ضروری امور ہیں۔ غیبت، سخن چینی، عیب بینی، دروغ گوئی اور تحقیر مردم حرام ہے۔ سب سے اکرام کے ساتھ پیش آنا خود کو خاک و ناچیز دیکھنا، حضرتِ حق سبحانہٗ کو حاضر و ناظر تصور کرنا، عذابِ الٰہی سے ڈرنا، اپنے گناہوں کو اپنے سر پر پہاڑ کی مانند سمجھنا، ترساں ولرزاں رہنا کہ نہ معلوم کل کو کیا پیش آئے، خلق اللہ کے ساتھ تواضع کا معاملہ کرنا، اپنے حقوق معاف کر دینا اور دوسروں کے حقوق ادا کرنا یہ ہے طریق دوستانِ خدا، ایک دم غافل نہ ہونا، انکسار و خاکساری، محبت کے درد وغم کے ساتھ جینا اور توکل و رضا و تسلیم کا شیوہ اختیار کرنا بھی لازم ہے۔'' ع

دلِ مردانِ دِل پُر درد باید　　　ز حسرت رنگِ شاں پر زرد باید

فرمایا: ''حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ نے فرمایا کہ ''بڑی جماعت پر توجہ کا طریقہ جو میں برتتا ہوں یہ ہے کہ تمام جماعت کے دلوں کو خیال میں جمع کر کے جنابِ حق جل وعلیٰ میں تضرع کرتا ہوں کہ اے اللہ! ہر ایک کو اپنے مقام سے فیض پہنچا، پس اپنی ہمت کو تمام قلوب کی جانب متوجہ کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں سے ہر ایک کو عروج واقع ہوتا ہے۔'' پھر اس وقت حضور میں ذوق وشوق کا ذکر آیا، آں حضرتؒ نے فرمایا کہ ''ذوق وشوق اور کشف وکرامات کا طالب اللہ جل شانہٗ کا طالب نہیں، طالب کو چاہیے کہ اس ذات بحت (یعنی محض ذات) کو طلب کرے اور جو کچھ اس راہ میں نظر آئے اس کی نفی کرتا جائے اور یہ کہتا رہے کہ سوائے ذاتِ

پاک کے اور کوئی چیز مقصود نہیں ہے۔'' (درالمعارف:۴۹)

حضرت مرزا صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ ''یہ تمام حضرت خواجہ بہاء الدین رحمہ اللہ کی عنایت ہے کہ سجدہ میں گر کر حضرت کارسازِ حقیقی جلت عظمتہ کی بارگاہ میں یہ دعا والتجا کی تھی کہ اے میرے اللہ! مجھے وہ طریقہ عنایت فرما کہ ضرور موصل ہو، حق تعالیٰ مجیب الدعوات نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ایسا طریقہ عنایت فرمایا کہ جو یقینا (مقصود تک) پہنچانے والا ہے۔''

حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند -قدّسنا اللہ بأسرارہ السامیة- فرماتے ہیں کہ ''ہمارے طریقہ میں محرومی نہیں ہے، نہ ہمارے طریقہ میں مجاہدہ ہے، ہم بامراد ہیں اور ہمارے طریقوں میں اندراج النہایۃ فی البدایۃ ہے۔''

حضرتؒ نے فرمایا کہ ''اندراج النہایہ فی البدایہ'' کا مطلب یہ ہے کہ اس طریقۂ عالیہ میں ابتدا ہی میں توجہ الی اللہ جسے حضور وآگاہی سے تعبیر کرتے ہیں پیدا ہو جاتی ہے اور جمعیت و بے خطرگی ہاتھ آتی ہے، یہاں تک کہ اس مقام تک پہنچتے ہیں کہ ماسوا کا خیال ہی دل میں نہیں آتا، فرض کرو کہ اگر ہزار سال کی بھی عمر ہو جائے تو دِل ماسوا کے خیال سے خالی رہتا ہے اور یہی مقام دوسروں کی انتہا کا ہے۔ یا اس کلامِ مقدس کے یہ معنی ہیں کہ اس طریق میں جذبہ مقدم ہے سلوک پر اور دوسرے طرق میں سلوک مقدم ہوتا ہے جذبہ پر۔'' (درالمعارف:۵۰)

''ہر عمل کے اسرار و فیوض میں تمیز کرنا چاہیے، یہ غلام محفل عالی مقام میں حاضر ہوا، آں حضرتؒ نے فرمایا کہ ''آدمی کو چاہیے کہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ رہے اور اوقات میں سے ہر وقت اور افعال میں سے ہر فعل میں

انوار واسرار اور فیوض و برکات کی تمیز کرتا رہے، مثلاً جب نماز پڑھے تو خیال کرے کہ (نماز کے) انوار و برکات کس طرح کے وارِد ہوتے ہیں؟ اور قرآن پاک پڑھتے وقت اس کے انوار و فیوض کس طور پر صادر ہوتے ہیں؟ اور درود شریف پڑھتے وقت کیسے فیوض کا ورود ہوتا ہے؟ اور زبان سے ''لا الہ الا اللہ'' کہنے پر کون سی برکتیں ہاتھ آتی ہیں؟ اور احادیث مقدسہ کے مطالعہ سے کون سے اسرار منکشف ہوتے ہیں؟ اور اسی طور پر نقصانات کا بھی لحاظ کرے جو مکروہات و منہیات سے ہوتے ہیں، مثلاً مشتبہ کھانے سے کون سی ظلمت آتی ہے؟ اور غیبت سے باطن پر کون سا ضرر پہنچا؟ اور جھوٹ سے کیسی ظلمت دِل پر چھائی؟ اسی طرح تمام مکروہات ومحرمات سے اپنے ظاہری و باطنی نقصانات اور مضرتوں کا اندازہ کرے اور ان سے پرہیز کرے اور احتیاط برتے۔''

ف: راقم (شاہ رؤف احمد) عرض کرتا ہے کہ ''طالب کو چاہیے کہ ہر لمحہ اور ہر گھڑی اپنے آپ میں غور کرتا رہے کہ کون سا فعل مجھ سے سرزد ہوا؟ اگر فعل کتاب وسنت کے مطابق ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے، اور اگر خدانخواستہ وہ قرآن و حدیث کے مخالف ہے تو توبہ واستغفار کرے، چھپے ہوئے گناہوں کی توبہ چھپ کر اور ظاہری گناہوں کی توبہ علانیہ کرے، اور توبہ کرنے میں تاخیر نہ کرے، اس لیے کہ کراماً کاتبین (وہ فرشتے جو گناہ وثواب لکھنے پر مامور ہیں) گناہ کے لکھنے میں توقف کرتے ہیں، اگر بندہ توبہ کر لیتا ہے تو اس گناہ کو نہیں لکھتے، ورنہ لکھ دیتے ہیں۔'' (ماشاء اللہ مفید فائدہ ہے۔ جزاہم اللہ تعالیٰ (مرتب)

ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور تلقین ذکر کی استدعا کی،

آں جنابؒ نے فرمایا کہ ’’اپنی زبان تالو سے چپکا لو اور لفظ ’’اللہ اللہ‘‘ پہلے نام کی ’’ہائے‘‘ کو پیش کے ساتھ اور دوسرے اسم کی ’’ہائے‘‘ کے سکون کے ساتھ خیال ہی میں دل سے جس مقام بائیں پستان کے نیچے دو انگل کے فاصلے پر ہے کہو، اس طرح گویا لفظ مبارک ’’اللہ‘‘ دل سے نکلتا ہے، اور لفظ مبارک ’’اللہ‘‘ کہنے کے بعد بیس یا تیس بار پڑھو ’’الٰہی! مقصودِ من توئی و رضائے تو، محبت و معرفتِ خود بدہ۔‘‘ خداوند! میرا مقصود تو اور تیری رضا ہے، اپنی محبت و معرفت عطا فرما۔ اور اس طریقہ پر مداومت کرتے رہو۔

طریق وقوفِ قلبی کی اہمیت: اس کے بعد دوسرے شخص نے عرض کیا کہ ’’ایک شخص عالم ہیں، جو حضرت سے بیعت کا ارادہ رکھتے ہیں، لیکن کہتے ہیں کہ میں نے چند جگہ بزرگوں کی خدمت میں حاضری دی اور ریاضت کی، اب فی الحال مجھ میں طاقت نہیں ہے (محنت کرنے کی) آں حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ ’’میرے طریق میں مجاہدہ نہیں ہے، صرف وقوفِ قلبی کی ضرورت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ دل ذاتِ الٰہی کی جانب متوجہ رہے اور اس میں گذشتہ اور آئندہ کے خیالات سے حفاظت کی جائے، ہر دم اور ہر لمحہ یہ دو باتیں کی جائیں اور گذشتہ اور آئندہ کے خیالات سے حفاظت اس طرح کی جائے کہ کوئی خطرہ (یعنی خیال) دل میں آئے کہ فلاں کام گذشتہ زمانہ میں کس طرح ہوا تھا؟ تو اسی وقت دل سے دفع کر دیں، تاکہ وہ پورا قصہ دل میں نہ آنے پائے، یا مثلاً دل میں یہ خیال آئے کہ فلاں جگہ جا رہا ہوں، وہاں ایسا کام کروں گا اور اس کام میں یہ فائدہ ہے، اس خیال کو اسی وقت ضائع کرے اور دل میں نہ آنے دے۔

حاصل کلام یہ کہ جب غیر اللہ کا خیال آئے تو اسی وقت اس کو دفع کرے اور دل میں نہ آنے دے۔(درالمعارف: ۵۳)

ف: دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس بلا سے محفوظ رکھے۔آمین۔(مرتب)

دل کے خطرات کا حکم: نیز حضرتؒ نے فرمایا کہ ''خطرات (یعنی دل میں ماسوا کے خیالات) رُتبۂ ولایت میں ضرر رساں ہوتے ہیں اور مرتبۂ کمالاتِ نبوت میں خطرۂ نیک مضر نہیں، چنانچہ حضرت امیر الاولیاء، امام الاصفیاء عمر بن خطاب رضی اللہ عنہٗ عین حالت نماز میں اعداء اللہ کے ساتھ غزوات کا انتظام اور فوج کی صفوں کی درستی فرمایا کرتے تھے اور ان کے دل سے حضوری کی کیفیت ان خیالات سے رفع نہیں ہوتی تھی، جیسے کہ آفتاب کا مشاہدہ دل کے تخیلات کی وجہ سے دور نہیں ہوتا، یہ کمالِ حضور و مشاہدہ ہے، اللہ تعالیٰ میسر فرمائے۔'' ع

دادیم ترا ز گنج مقصود نشاں   گر ما نہ رسیدیم، تو شاید بہ رسی

میں نے تجھ کو منزلِ مقصود کا پتہ دے دیا، گر میں نہیں پہنچا ہوں تو شاید کہ تو پہنچ جائے۔

طریقۂ عالیہ نقشبندیہ کے مقاصد: فرمایا حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ نے: ''خدمت حضورِ پرنور میں حاضر ہوا، حضرتؒ نے فرمایا کہ ''طریقۂ عالیہ نقشبندیہ کا مطلب ان چار چیزوں کا حصول ہے: (۱) بے خطرگی، یعنی ماسوا اللہ تعالیٰ کا خیال دل سے نکلنا۔ (۲) دوامِ حضور، یعنی ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا خیال قائم ہو جانا۔ (۳) جذبات، یعنی فیوضِ الٰہیہ کی کشش۔ (۴) واردات، یعنی فیضانِ الٰہی کا وارد ہونا۔''

نیز فرمایا کہ ''سفر در وطن'' طریقۂ نقشبندیہ کی اصطلاحات میں سے ہے۔ میرے نزدیک وہ یہ ہے کہ بری خصلتوں سے اچھی خصلتوں کی جانب چلے اور

صوفیاء کے مقاماتِ عشرہ (یعنی دس مراتب) حاصل کرے، مطلب یہ کہ بے صبری سے صبر کی طرف چلے اور بے توکلی سے توکل کی جانب، اور بے قناعتی سے قناعت کی طرف سفر کرے، اسی طرح بقیہ سات مقامات حاصل کرے۔''

نیز حضرت ؒ نے فرمایا کہ ''ان دس مقامات کے حصول کا طریقہ اس طور پر ہے کہ کثرت سے ''لا الٰہ الا اللہ'' پڑھے اور اس کلمہ ''لا الٰہ'' سے (مثلاً) بے صبری کی نفی کرے، یعنی میرا مقصود بے صبری نہیں، ''الا اللہ'' بلکہ صرف وہ ذاتِ پاک میرا مقصود ہے، اور کچھ عرصہ اس پر مداومت کرے، ان شاء اللہ تعالیٰ انجام کار مقامِ صبر حاصل ہوگا، پھر اس طرح بے توکلی کی نفی کرے، پھر بے قناعتی کی نفی کرے، وغیرہ۔''

نیز حضرت ؒ نے فرمایا: ''خلوت در انجمن'' کا مطلب حضور، توجہ، آگاہی، یادداشت اور شہود ہے کہ پانچوں الفاظ ایک ہی معنیٰ رکھتے ہیں۔''

فرمایا: ''آں حضرت ؒ -قلبی و روحی فداہ- کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت (مرزا مظہر جانِ جاناں ؒ) نے ارشاد فرمایا کہ ''ہمارے پیغمبر علیہ افضل الصلوات واکمل التحیات تمام کمالاتِ نبوت ورسالت وولایت کے جامع ہیں، لیکن ہر کمال کا ظہور موقت ہے کسی خاص وقت کے ساتھ اور زمانوں میں سے کسی زمانہ کے ساتھ اور اشخاص میں سے کسی شخص کے ساتھ کہ وہ کمال افرادِ امت میں جلوہ گر ہوتا رہا، مثلاً جو کمال کہ آں سرورِ زمین وزماں علیہ وعلیٰ آلہ من الصلوٰت أتمھا و من التحیات أکملھا کے بدن مبارک سے متعلق تھا، مثلاً بھوکا رہنا، جہاد کرنا اور عبادت کرنا حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں جلوہ گر ہوا۔ اور جو کمال کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک سے

تعلق رکھتا تھا، مثلاً ذوق وشوق، استغراق و بے خودی، آہ ونعرہ اور اسرارِ توحید وجودی حضرت جنید بغدادیؒ کے زمانے سے اولیاءِ امت میں ظہور پذیر ہوا۔ اور جو کمال کہ اشرف النفوس آں سرور علیہ صلوٰۃ اللہ الملک الاکبر کے لطیفۂ نفس سے ناشی ہوا، مثلاً استہلاک واضمحلال وہ خواجۂ خواجگان بہاء الملۃ والدین خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کے زمانے سے سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے اکابر میں جلوہ گر ہوا۔ اور جو کمال کہ اسم مقدس محمد علیہ صلوات اللہ الملک الصمد سے متعلق تھا وہ ہزار سال کے بعد حضرت مجدد الف ثانی قدّسنا اللہ تعالیٰ باسرارہ سے جلوہ گر ہوا۔ غرض کہ جو کمالات کاملانِ طریق سے ظہور پذیر ہوئے وہ سب حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات کے عکس اور پرتو تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھا مع جمیع کمالات ہیں۔'' ......ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ترجمہ: وہ حضرات جو خوبیاں رکھتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تنہا ان خوبیوں کے حامل تھے۔

اے ذاتِ تو از صفاتِ ما پاک کنہ ِتو بروں ز حد ِادراک
ہم از تو منیر شمع و انجم ہم از تو بلند قصر افلاک
آدم ز تو شد منور از مہ پیدا است مقامِ ذرۂ خاک

ترجمہ: اے وہ کہ تیری ذات ہماری صفات سے پاک ہے، تیری حقیقت اِدراک کی حد سے باہر ہے، تیری ذات ہی کے پرتو سے شمع وستارے روشن ہیں، تیری قدرت سے ہی قصر افلاک بلند ہیں، تیرے ہی نور سے (حضرت) آدم علیہ السلام چاند سے زیادہ روشن ہوئے، جب کہ ذرۂ خاک سے ان کی پیدائش ہے۔

اسی دوران میں نفس کے اطمینان اور مقامِ رضا کے حصول کا ذکر آیا تو

حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ ”ہمارے طریقہ میں پہلے کثرتِ ذکر و توجہ اور مراقبہ کے ذریعہ قلب کا تصفیہ کرتے ہیں، جس کی کیفیت ما سوا کا خیال نکل جانا اور حضور و آگاہی کی مداومت ہونا ہے، اور اسی کے ذیل میں بقیہ چاروں لطائف (روح وسر وغیرہ) کی تربیت و تہذیب بھی ہو جاتی ہے، اس کے بعد نفس کے تزکیہ (پاک کرنے) میں مشغول ہوتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ استہلاک و اضمحلال اور دعویٔ انا کی شکستگی ہو کہ سالک اپنے حق میں ”انا“ کا لفظ بولنا دشوار سمجھے، اس وقت راضی اور مرضی کی کیفیت اور فناءِ ”انا“ حاصل ہوتی ہے اور نفس امارہ مطمئنہ بن جاتا ہے اور بری خصلتیں زائل ہو جاتی ہیں، یعنی غرور و تکبر، حسد و بغض، کینہ اور عجب وغیرہ اچھائیوں سے بدل جاتی ہیں۔“ (در المعارف:٦٦)

ف: سبحان اللہ! کیا خوب توضیحات ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے فہم اور ان پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ (مرتب)

روزی کمانے کا ذکر: اس کے بعد صوفیہ کے (روزی) کمانے کا ذکر آیا، حضرت والاؒ نے فرمایا کہ ”بعض صوفیہ نے اکل حلال کے لیے تجارت وغیرہ کے ذریعہ کسب معاش کیا ہے، لیکن نمازِ صبح کے بعد سے ظہر تک اس کام میں مصروف رہتے اور باقی اوقات اپنے اصحاب کے ساتھ حلقہ و مراقبہ اور ذکر و توجہ میں مشغول ہوتے ہیں۔“

نیز فرمایا کہ ”صوفیہ جس کمائی میں بھی مشغول ہوتے ہیں اَذان کی آواز سنتے ہی اسے چھوڑ کر نماز کے انتظام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ایک بزرگ حلاجی کرتے تھے، کپڑا اتمام کرنے کے لیے چند ٹانکے باقی تھے کہ اذان کی آواز ان کے کان میں آئی، انہوں نے کچھ توقف کیا، تا آں کہ تمام ٹانکے پورے کر کے اٹھے اور

وضو کے پانی کے لیے کنوئیں میں ڈول ڈالا، ڈول میں پانی کی جگہ درہم (چاندی کے سکے) بھر گئے، جب انہوں نے ڈول کھینچا تو دیکھا کہ بجائے پانی کے درہم نکلے، انہیں زمین پر ڈال کر پھر پانی کے لیے ڈول کنوئیں میں ڈالا، اب اس ڈول میں دینار (سونے کے سکے) بھر گئے، انہیں بھی زمین پر پھینک کر تیسری بار ڈول ڈالا تو جواہرات سے بھرا ہوا اوپر آیا، پھر ان کو بھی زمین پر ڈال کر کہا: ''الٰہی! مجھ سے یہ مذاق، میں ان سب کو کیا کروں گا؟ مجھے تو وضو کے لیے پانی درکار ہے، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھ سے یہ خطا ہوگئی کہ میں نے نماز میں تاخیر کی ہے اور تیری بخشش تو اس گناہ سے کہیں زیادہ ہے، تو میرے حال پر رحم فرما اور میری اس خطا سے درگزر فرما اور وضو کے لیے پانی عنایت فرما، اے الٰہی کارساز!۔''

طالب مخلص کا حال: نیز حضرت والاؒ نے فرمایا کہ ''امام قشیریؒ ایک دِن استنجا کے لیے ڈھیلا ڈھونڈ رہے تھے کہ ایک لعل بے بہا ان کے ہاتھ لگا، انہوں نے اسے زمین پر پھینک دیا اور کہنے لگے کہ ''میں استنجا کے لیے کلوخ (مٹی کا ڈھیلا) چاہتا ہوں اور تو لعل دیتا ہے، آپ کو مبارک ہو، مجھے اس کی ضرورت نہیں۔'' مطلب یہ ہے کہ عارفین کی نگاہ میں دنیا رائی کے دانے سے بھی کمتر اہمیت رکھتی ہے۔ (اور ہے بھی یہی کہ) جو طالب ِیار ہے وہ اِن سب سے بے زار ہے۔''

راقم عفی عنہٗ (شاہ رؤف احمد) کہتا ہے کہ ''جو ان (مال و متاع) میں گرفتار ہے وہ کب عاشق کردگار ہے، طالب یزداں وارستۂ دو جہاں ہے (چھوڑنے والا ہے)۔'' سبحان اللہ! ایک شخص نے خوب کہا ہے اور خوب معنیٰ کے موتی پروئے ہیں۔......ع

گیرم کہ سریرت از بلور و پشم ست سنگش داند ہر آنکہ او را چشم ست
ایں مسند قاقم و سمور و سنجاب در دیدۂ بوریا نشیناں پشم ست

ترجمہ: میں نے مانا کہ تیرا تخت ہیرے جواہرات کا ہے، لیکن جو چشم (بصیرت) رکھتا ہے وہ اس کو پتھر جانتا ہے، قاقم وسمور وسنجاب کی بنی ہوئی مسند بوریا نشینوں کی نگاہ میں کملی کی طرح ہے۔

دعا کے انوار و برکات: حضرت مرزا صاحبؒ نے فرمایا کہ ''دعا کے وقت انوار و برکات کا ظہور ہوتا ہے، لیکن یہ فرق کرنا کہ یہ دعا کے انوار ہیں یا قبولیت کے، بہت دشوار ہے، بعض اکابر نے لکھا ہے کہ اگر دونوں ہاتھوں میں بھاری پن ہوتو یہ قبولیت کی نشانی ہے۔ اور میں اس طرح امتیاز کرتا ہوں کہ اگر دعا کرتے وقت قلب میں انبساط و انشراح کی کیفیت پیدا ہوتو یہ قبولیت کی علامت ہے، ورنہ دعا کے انوار ہیں۔''

حضرت والا نے فرمایا کہ ''حضرت امیر خسرو دہلویؒ حضرت شاہ بوعلی قلندر قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوکر شرفِ قدم بوسی سے فائز ہوئے، حضرت بوعلی قلندرؒ نے فرمایا: ''تو وہی خسرو ہے جو ہاہا ہی ہی کرتا ہے؟'' حضرت امیر خسروؒ نے عرض کیا: ''جی ہاں'' پھر حضرت بوعلی قلندرؒ نے فرمایا کہ ''تو اشعار نظم کرتا ہے اور میں نے بھی ایک غزل کہی ہے''، پس اپنی غزل پڑھی، حضرت امیر خسروؒ سن کر اس قدر روئے کہ آنکھوں سے چشمے کی طرح آنسو بہہ نکلے، حضرت بوعلی قلندرؒ نے فرمایا کہ ''میرے کلام سے کیا بات سمجھی کہ تو اس قدر رویا؟'' حضرت امیر خسروؒ بولے کہ ''مجھے اپنی نافہمی پر رونا آیا کہ حضرت کا کلام نہیں سمجھ پایا، اپنی طبیعت کی

نارسائی پر روتا ہوں''، حضرت بوعلی قلندرؒ بہت خوش ہوئے اور ان کے حق میں دعا فرمائی کہ خسرو اچھی زندگی گزارے، عمدہ موت آئے اور بہترین حشر ہو۔''

ف: سبحان اللہ! کیسی جامع دعا فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کے حق میں بھی قبول فرمائے۔ آمین۔ (مرتب)

طالبین کے آنے پر اپنی کمی کا استحضار: خدمت اقدس میں حاضر ہوا، چند طالبین سمرقند سے حضرت والاؒ کی آستانہ بوسی کا شرف حاصل کرنے آئے تھے، حضرت والاؒ نے جنابِ الٰہی میں تضرع وزاری فرمائی، اس کے بعد مزارِ پر انوار، حضرت قبلۂ دین وایمان، مظہرانوارِ رحمان مرزا جانِ جاناںؒ کی جانب اشارہ کر کے فرمایا:

''اے میرے قبلہ حضرت مرزا صاحب! میں اس لائق نہیں ہوں کہ اتنے بڑے بڑے لوگ اتنا دور دراز کا مرحلہ طے کر کے اور ایسی کڑی منزلیں برداشت کرتے ہوئے میرے پاس آئیں، یہ سب آپ کی عنایات ہیں اور حضور ہی کی خدمت میں آئے ہیں، ورنہ میں تو وہی نالائق پنجابی مرد ہوں جو تھا، یہ آپ کی نظر عنایت کا کرشمہ ہے کہ لوگ یہاں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سُرمہ بناتے ہیں، حضور کی نگاہِ کیمیا کے اثر نے میرے وجود کے مس کو سونے کا رُتبہ دے دیا۔''.......ع

نیا وردم از خانہ چیزے نخست   تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست

ترجمہ: میں اپنے گھر سے کچھ نہیں لایا تھا، آپ ہی نے تو سب کچھ دیا ہے اور میں بھی آپ ہی کی چیز ہوں۔

میری حیثیت تو بس اتنی ہے کہ خاک پر بیٹھا ہوں، پھر یہ شعر پڑھا:

خاک نشینی ست سلیمانیم   عار بود افسر سلطانیم

فرمایا: ''حضور فیض گنجور میں حاضر ہوا، میری حاضری سے قبل حضرت والا نے ہدایت کے باب میں چند باتیں ارشاد فرمائی تھیں اور بھائی صاحب (حضرت شاہ ابوسعیدؒ) اس مجلس میں موجود تھے، ان کی زبانی تحریر کرتا ہوں، حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص بزرگوں کی ملاقات کو جائے اس کو چاہیے کہ پہلے دو رکعات نمازِ نفل پڑھے، اس کے بعد اپنے دِل کو اس بزرگ کی جانب متوجہ کر کے راہ طے کرتا ہوا حضورِ والا میں حاضری دے، تاکہ ان کے فیض سے بہرہ ور ہو اور اس بزرگ کی صحبت میں چپ بیٹھ جائے۔'' کہ

ع......خموشی معنئ دارد کہ در گفتن نمی آید۔

خاموشی میں وہ معنیٰ ہیں جو کہنے میں نہیں آسکتے۔

نیز فرمایا کہ ''حدیث شریف میں وارد ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: '' إِيَّاكُمْ وَهَيْشَاتِ الأَسْوَاقِ۔'' (صحیح لمسلم/ کتاب الصلوٰۃ/ باب تسویۃ الصفوف و إقامتھا و فضل الأول فالأول منھا)

ترجمہ: بچاؤ اپنے آپ کو بازاروں کی فتنہ انگیزیوں سے۔

حضرت والا (شاہ غلام علیؒ) نے یہ بھی فرمایا کہ ''حضرت امیر المومنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ اپنے دہن مبارک میں کنکریاں رکھتے تھے، تاکہ منہ سے بلند آواز نہ نکل سکے۔ نیز قبلۂ عالم خواجہ محمد زبیر قدّسنا اللہ بسرہ الاقدس دہن مبارک میں گھاس رکھتے تھے اور بات کم کرتے تھے، اس لیے کہ انسان پر بہت سی آفتیں زبان ہی کے ذریعہ آتی ہیں اور خاموشی اکثر بلاؤں کو ٹال دیتی ہے۔'' اس کے بعد ''مثنوئ مولانا رومؒ'' کا یہ شعر پڑھا:

اے زباں! ہم رنجِ بے درماں توئی　　　　اے زباں! ہم گنجِ بے پایاں توئی

ترجمہ: اے زبان! بے علاج رنج (پہنچانے والی) تو ہے، اے زبان! تجھ میں بے حد خزانہ ہے۔

نیز حضرت والاؒ اس مجلس فیض نشان میں یہ شعر اکثر زبان مبارک پر لاتے تھے:

بعشقت گر جنوں پیدا نمی کردم چہ می کردم
چو مجنوں سر سوئے صحرا نمی کردم چہ می کردم

تیرے عشق میں اگر میں پاگل نہ بنتا تو کیا کرتا، مجنوں کی طرح صحرا نوردی نہ کرتا تو کیا کرتا۔

بیعت کے اقسام: اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ ''مولوی نور محمد صاحب بیعت کا ارادہ رکھتے ہیں'' حضرت والاؒ نے فرمایا کہ ''بیعت کی تین قسمیں ہیں: ایک بیعت توسّل ہے، کہ ایک شخص طریقۂ نقشبندیہ یا قادریہ وغیرہ کے پیرانِ کبار کا وسیلہ چاہنے کے لیے بیعت کرتا ہے۔ دوسری بیعت گناہوں کے رفعیہ کے لیے ہے، لیکن گناہ کر لینے سے یہ بیعت ٹوٹ جاتی ہے، پس اس کی تجدید کرنا چاہیے؛ بلکہ گناہ کے واقع ہونے کے بعد (تجدید) لازم ہے۔ تیسری بیعت باطن کے کسبِ سلوک کے لیے ہے۔''

حضرت والاؒ نے فرمایا کہ ''میرے نزدیک ایک جڑنا ٹوٹنے سے مقدم ہے کہ جب تک محبت الٰہی نہ پیدا ہو دنیا کی محبت نہیں چھوٹتی۔ اور بعض عارفین دونوں کے ایک ساتھ ہونے کے قائل ہیں، یعنی جب حق سے اتصال ہوتا ہے تو خلق سے انفصال ہو جاتا ہے اور جب دنیا کے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں تبھی

اللہ تعالیٰ سے معاملات درست ہوتے ہیں۔"

رُباعی از شاہ رؤف احمدؒ مؤلف درالمعارف

چوں رِشتۂ اخلاصِ دو عالم بشکست　　در راہِ محبت الٰہی بنشست
رافت نہ تقدم و تاخر اینجا ست　　آں دم کہ گست در ہماں دم پیوست

ترجمہ: جب دونوں عالم سے رِشتہ توڑا تو محبت الٰہی کی راہ میں بیٹھ گیا، اس مقام پر تقدم وتأخر نہیں ہے، جس دم وہ ٹوٹا اسی دم وہ جڑ گیا۔

فرمایا کہ "میں محفل فیض منزل میں حاضر ہوا، حضرت والاؒ کو ضعف قلب کی شدت سے اس وقت بیٹھنے کی ہمت نہ تھی، ایک شخص نے عرض کیا کہ "حضرت کو ضعف بہت ہے، دواؤں کے ذریعہ اس کے دور کرنے کی تدبیر ہونی چاہیے۔"
حضرت والاؒ میں محبت الٰہی کی حرارت نے جوش مارا اور بے اختیار شعر پڑھا:

ہر چند پیر خستہ دل و ناتواں شدم　　ہرگہ کہ یادِ روئے تو کردم جواں شدم

اگر چہ میں خستہ دِل بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہوں؛ مگر جب بھی تیرے چہرہ کو یاد کرتا ہوں تو جوان ہو جاتا ہوں۔

پھر اُٹھ کر بیٹھ گئے اور متوسلین کے حلقہ پر توجہ فرمائی۔ (درالمعارف:۱۰۹)

وفات: آپؒ کی وفات ۲۲ /صفر/ ۱۲۴۰ھ مطابق: ۱۸۲۴ء کو شہر دہلی آپؒ کی خانقاہ میں ہوئی، إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔

آپؒ اپنے پیر و مرشد حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کے پہلو میں جانب غرب بمقام دہلی سپر دِ خاک ہوئے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔ (درالمعارف: ۲۴)

حضرت مولانا خالد شہر زوری کردیؒ متوفی ۱۲۴۲ھ

تعارف و ولادت: علامہ ابن عابدین مشہور بہ علامہ شامیؒ مصنف ''ردّالمحتار'' شرح ''الدرّ المختار'' مولانا خالد رومیؒ کے شاگرد و دست گرفتہ تھے، انہوں نے ان کے مناقب میں پورا رسالہ ''**سلّ الحسام الھندی لنصرۃ مولانا خالد النقشبندی**'' کے نام سے تصنیف کیا ہے، جو اصلاً ایک رسالہ کی تردید میں ہے، جو بعض حاسدین نے مولانا خالدؒ کی مخالفت و تضلیل میں لکھا تھا، رِسالہ کے آخر میں مختصر حالات لکھے گئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلیمانیہ کے قریب قصبہ قرہ داغ کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۹۰ھ میں ولادت ہوئی، اساتذۂ وقت سے علومِ مروّجہ کی تعلیم حاصل کی اور معقولات، ریاضیات اور ہیئت وغیرہ میں بھی کمال پیدا کیا، پھر سلیمانیہ واپس آکر حکمت، علم کلام وبلاغت کی انتہائی کتابیں پڑھائیں۔ ۱۲۲۰ھ میں حج بیت اللہ وزیارت سے مشرّف ہوئے، مکہ معظّمہ میں دہلی جانے کا اشارۂ غیبی پایا۔

دہلی آمد: مکہ سے پہلے شام واپس آئے، وہاں ایک ہندوستانی سے حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کا ذکر سنا، اس کی بنا پر ۱۲۲۴ھ میں ایران اور افغانستان ہوتے ہوئے اور ہر جگہ اپنے علم کا لوہا منواتے ہوئے لاہور کے راستہ سے پورے ایک سال کی مدت میں دہلی پہنچے، دہلی پہنچ کر عربی میں قصیدۂ شوقیہ کہا، جس کا مطلع ہے:

كَمُلَتْ مَسَافَةُ كَعْبَةِ الآمَالِ حَمْدًا لِمَنْ قَدْ مَنَّ بِالإِكْمَالِ

ایک سال نہیں گزرا تھا کہ طرقِ خمسہ میں اِجازت وخلافت سے مشرف ہوئے، پھر اپنے مرشد کے حکم مؤکد سے وطن کی طرف واپس ہوئے، بغداد پہنچ کر تربیت وارشاد کا سلسلہ شروع کیا، پانچ مہینے وہاں قیام کر کے وطن واپس ہوئے، ۱۲۲۸ھ میں پھر بغداد واپس ہوئے، وہاں ان کی قبولیت اور رجوعِ عام دیکھ کر لوگوں کو حسد ہوا اور ان کے خلاف ایک فتنہ کھڑا کیا گیا، والیٔ بغداد سعید پاشا کی طرف سے بعض علماء کو اس کی تردید کا ایما ہوا، علماءِ بغداد نے اپنی مہروں سے مزین کر کے آپؒ کی براءت اور آپؒ کے عالی مرتبہ ہونے کا فتویٰ دیا، کردوں، اہل کرکوک، اربل، موصل، عمادیہ، عینتاب، حلب، شام، مدینہ منورہ، مکہ معظّمہ اور بغداد کے ہزاروں آدمیوں نے آپؒ سے نفع اُٹھایا۔ (تاریخ دعوت وعزیمت: ۴/ ۴۸۳)

فضل وکمال: حضرت مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے آپؒ کی مقبولیت اور خدمات کا تذکرہ یوں کیا ہے:

’’عراق، شام اور ترکی میں حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے سلسلہ کی اشاعت کا کام اللہ تعالیٰ نے ایک کردی فاضل اجل مولانا خالد رومیؒ سے لیا، جو اپنے ملک میں حضرتؒ کے فیض وارشاد کا آوازہ سن کر ہمہ تن شوق وبے قراری بن کر منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے ایک سال میں دہلی پہنچے اور آستانہ پر آکر ایسے پڑے کہ تکمیل سلوک کی منزلیں طے کر کے اِجازت وخلافت خاصہ سے مشرف ہوئے، اِس عرصہ میں ان کی یکسوئی کا عالم یہ تھا کہ دہلی کے علماء ومشائخ جو ان کے فضل وکمال کی شہرت برسوں سے سنتے تھے ملنے آتے تو فرمادیتے کہ فقیر جس مقصد کے لیے آیا ہے اس کے حصول کے بغیر کسی طرف

متوجہ نہیں ہوسکتا، مسند ہند، سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ آئے کہ ''القَادِمُ یُزارُ''(باہر سے آنے والے سے خود ملنے جاتے ہیں) اور حضرت شاہ ابوسعید صاحبؒ نے جوان کے شاگردِ رشید تھے عرض کیا کہ استاذ الہند آپ کی ملاقات کے لیے آئے ہیں، فرمایا کہ ''سلام کہو اور کہو کہ مقصد براری کے بعد میں خود حاضر ہوں گا۔''

آپؒ کی مقبولیت: وطن واپس گئے تو طالبین خدا پروانہ وار ٹوٹ پڑے اور ایسا رجوع ہوا کہ باید و شاید، مولانا شاہ رؤوف احمد صاحب مجددیؒ اپنی کتاب ''درالمعارف'' میں جمعہ ۲۴/رجب ۱۲۳۱ھ کی روداد میں لکھتے ہیں کہ ''ایک مغربی بزرگ حضرتؒ کا نامِ مبارک سن کر منزلوں پر منزلیں قطع کر کے بغداد میں مولانا خالد رومیؒ سے ملتے ہوئے حاضر ہوئے، انہوں نے مولاناؒ کی مقبولیت و مرجعیت کا حال بیان کیا کہ تقریباً ایک لاکھ آدمی حلقہ بگوشِ ارادت اور بیعت سے مشرف ہو چکے ہیں، ایک ہزار عالم متبحر داخل طریقہ ہو کر مولاناؒ کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں، خود مولانا خالدؒ نے حضرت شاہ ابوسعیدؒ کے نام جو خط لکھا ہے اس میں تحدیث بالنعمۃ کے طور پر تحریر فرماتے ہیں:

''تمام مملکت روم و عرب اور حجاز و عراق اور بعض ممالک عجم اور سارا کردستان طریقۂ عالیہ نقشبندیہ کی تاثیرات و جذبات سے سرشار ہے اور شب و روز تمام محافل و مجالس، مساجد و مدارس میں امامِ ربّانی مجدّد و منوّرِ الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے محاسن و محامد کا ذکر اس طرح ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ہے کہ اس کا گمان نہیں ہوسکتا کہ کبھی کسی ملک میں اور کسی وقت میں گوشِ زمانہ نے ایسا زمزمہ

سنا ہو، یا چشم فلک نے ایسی رغبت اور ایسا اجتماع دیکھا ہو، اگرچہ اس قسم کی باتوں کا تذکرہ ایک طرح کی گستاخی اور خود بینی ہے، یہ فقیر اس پر شرمندہ ہے، محض دوستوں کے حق کو مقدم جان کر اس نے بے ادبی کی جرأت کی۔‘‘

ف: حضرت مولاناؒ کے اپنی مقبولیت و مرجعیت کے اظہار سے یہ ثابت ہوا کہ دوسروں کو بھی اپنی مقبولیت و شہرت کی بطورِ تشکر و تمنن مخلص احباب کے سامنے توضیح و تلقین کر سکتے ہیں، خواہ بعض حضرات کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو، بلکہ بعض تو ایسے بھی ہیں کہ اس کو عجب و خود بینی پر محمول کر کے ناشائستہ کلمات بھی کہتے ہیں، مگر علامہ کشافؒ کا یہ شعر تسلی کے لیے کافی ہوتا ہے:

تَعَجَّبْ مِنْ هٰذَا الزَّمَانِ وَ أَهْلِهٖ　　فَمَا أَحَدٌ يَسْلَمُ مِنْ أَلْسُنِ النَّاسِ

(کشاف)

یعنی کوئی بھی لوگوں کی زبان درازی سے اس عالم میں محفوظ نہیں ہے، اس لیے اس سے قطع نظر کر کے کام سے کام رکھنا چاہیے، اس لیے کہ کسی نے خوب کہا ہے:

کار کن، کار بگذر از گفتار　　اندریں رہ کار باید کار

مگر افسوس کہ اپنی اصلاح کی کوئی فکر نہیں، مگر دوسروں کے قول و عمل پر اعتراض کو آسان سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کسی بزرگ نے فرمایا ہے کہ سب سے آسان کام اعتراض ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔ (مرتب)۔

حضرت مفکر اسلامؒ نے کتاب کے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے کہ ’’آپؒ کا سلسلہ ترکی و شام میں اب تک موجود ہے، میں نے دمشق، حلب اور ترکی میں اس سلسلے کے متعدد مشائخ کبار کی زیارت کی ہے۔‘‘ (تاریخ دعوت وعزیمت: ۴/ ۳۸۵)

الحمدللہ! اس حقیر کو بھی حرمِ پاک مکہ معظّمہ میں عزیزم مولانا اسماعیل صاحب بھوٹا کے ساتھ شیخ محمود آفندی حفظہ اللہ سے شرفِ زیارت نصیب ہوا، معلوم ہوا کہ اس وقت کے صدر اسی سلسلہ سے منسلک ہیں، جو ماشاء اللہ صرف صوم وصلوٰۃ کے پابند ہی نہیں؛ بلکہ نقشبندی اَوراد و وظائف کے پابند اور تہجد گزار ہیں۔ (محمد قمرالزمان)

مکاتبت: آپؒ کی خط و کتابت اپنے شیخ و مرشد حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلویؒ سے تھی، نصیحت کے لیے ایک خط نقل کرتا ہوں جو آپؒ کے شیخ حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلویؒ نے آپؒ کے نام ارسال فرمایا ہے، مولانا خالد رومیؒ کو ایک مکتوبِ گرامی میں بطورِ نصیحت تحریر فرماتے ہیں:

”کسی سے انتقام لینا ہمارے اور آپ کے لیے مناسب نہیں ہے، صبر وعفو صوفیہ کی ایک ادنیٰ عادت وخصلت ہے، اللہ تعالیٰ اس آیت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے: {اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ} (برائی کی مدافعت عمدہ خصلت اور اچھائی کے ذریعہ کر)۔ ہر بات کا انجام خوب سوچ لیا کریں، تاکہ طائفۂ درویشاں بدنام نہ ہوں، اپنی نظر ارادۂ الٰہی پر یا تقدیر الٰہی پر یا فعل حق تعالیٰ پر رکھنا، ملکۂ راسخہ بن جانا چاہیے۔ (یعنی یہ بات دِل میں بیٹھ جانی چاہیے کہ جو کچھ پیش آتا ہے وہ مشیت الٰہی کے تحت ہے)۔“ والسلام۔ (قافلۂ اہل دل: ۱۲۷)

وفات: ۱۴/ ذوالقعدہ/ ۱۲۴۲ھ میں طاعون کے مرض میں آپؒ نے شہادت حاصل کی اور قاسیون (دارالحکومت دمشق) کے دامن میں مدفون ہوئے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔ (تاریخ دعوت وعزیمت: ۴/ ۳۸۶)

حضرت مولانا شاہ کمال الدین کاندھلویؒ متوفی ۱۲۴۳ھ

نام ونسب: نام شاہ کمال الدین، والد کا نام مولانا محمد عرف شیخ الاسلام ہے، آپؒ مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ خاتمِ مثنوی کے حقیقی چھوٹے بھائی ہیں۔

تعلیم وتربیت: ابتدائی درسیات، متوسطات حضرت مفتی الٰہی بخشؒ سے پڑھیں اور اعلیٰ کتابیں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور شاہ رفیع الدین دہلویؒ سے پڑھیں۔

بیعت واجازت: سلوک ومعرفت کے لیے اس عہد کے نامور مرشد حضرت شاہ ابوالعدل خلیفہ حضرت خواجہ محمد زبیر نقشبندی مجددی سے بیعت کی اور اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے، آپؒ نہایت درجہ متبع سنت، بے ریا اور بے نفس انسان تھے، زہد وتقویٰ میں ممتاز تھے، مجاہدہ کا خاص ذوق تھا، آپؒ کے فضل وکمال کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپؒ کے بڑے بھائی حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ سلوک ومعرفت میں آپؒ سے بیعت ہوگئے، جب کہ اکثر درسی کتابوں کے اُستاذ تھے۔(تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ:۳۹)

موجب نصیحت واقعہ: حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپؒ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے:

’’سردی کی راتوں میں آدھی رات کو اُٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کرکے نمازِ تہجد میں مشغول ہوجاتے، ایک دِن میں نے ان سے کہا کہ’’اس سخت سردی میں اُٹھنا اور ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا بہت دشوار ہے، یہ روزانہ کس طرح

کرتے ہو؟'' وہ بولے: ''روزانہ جب میں وضو سے فارغ ہوتا ہوں تو وسوسۂ شیطانی ونفسانی دل میں آتے ہیں کہ کل کو سردی میں نہ اٹھوں گا، نوافل کے لیے اِتنی سخت اذیت اٹھانا دشوار ہوتا ہے، جب اگلی رات آتی ہے اور چکی پیسنے والیوں کی آواز کان میں آتی ہے تو میں بے قرار ہوکر اُٹھ جاتا ہوں کہ سبحان اللہ! اس سخت سردی میں اپنے دِن کی روزی کے خاطر آدھی رات سے اُٹھ کر صبح تک بھاری پتھر چکی کے پاٹ کو کس محنت ومشقت کے ساتھ گھماتی ہیں، میرے لیے جس کی روزی کی کفالت بے محنت ومشقت حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ رکھی ہے، مروّت سے بعید تر ہے کہ خوابِ غفلت میں سوتا رہوں اور اپنے رازق کا شکر ادا نہ کروں'' میں نے جب سنا تو سمجھ گیا کہ بیدار دل ہیں۔'' (مشائخ کاندھلہ)

اس کے علاوہ جود وکرم، ایثار ومروّت، عفت، خدمت خلق اور مسافر کی خبر گیری میں بڑے مستعد تھے، عمر بھر سماع، مزامیر اور مجالس لہوولعب سے پرہیز رکھا۔ (سوانح مولانا محمد یوسف صاحبؒ: ۴۲)

ف: یہ واقعہ ہم سب کے لیے موجب عبرت ونصیحت ہے، خصوصاً ان لوگوں کے لیے جن کو اللہ تعالیٰ نے صحت وفراغت اور رزق کے حصول میں سہولت دے رکھی ہے، اس لیے کہ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے غفلت اعلیٰ درجہ کی ناشکری ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔ (مرتب)

وفات: آپؒ کی وفات ۱۲/ربیع الاول/ ۱۲۴۳ھ مطابق : ۴/اکتوبر ۱۸۲۷ء بروز پنجشنبہ کاندھلہ میں ہوئی، خاندانی قبرستان کاندھلہ، یوپی میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (تذکرۂ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ: ۳۹)

حضرت مولانا شاہ عبدالحی بڈھانویؒ متوفی ۱۲۴۳ھ

نام ونسب: نام مولانا عبدالحی، والد کا نام ھبۃ اللہ بن نور اللہ صدیقی ہے، آپؒ مشہور علماء اور اللہ تعالیٰ کے خاص نیک بندوں میں تھے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت بڈھانہ میں ہوئی۔

فضل وکمال: آپؒ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے داماد تھے اور شاہ صاحبؒ آپ کے پھوپھا بھی تھے، شاہ صاحبؒ آپؒ کے والد کے شاگرد تھے، اس لیے مولانا عبدالحی صاحبؒ سے بہت محبت وخصوصیت کا تعلق رکھتے تھے، آپؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بابرکت خاندان میں داخل وشامل تھے۔

علم وفضیلت میں آپؒ کا شمار ہندوستان کے ممتاز علماء میں تھا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور پورا خاندانِ ولی اللّٰہی بلکہ پورا دہلی آپؒ کی فضیلت علمی وتبحر کا قائل تھا، شاہ صاحبؒ تفسیر میں مولاناؒ کو اپنے تمام تلامذہ پر فضیلت دیتے تھے اور اپنا نمونہ فرماتے تھے، ''شیخ الاسلام'' کا لقب جو اسلام میں خاص خاص علماء کو دیا گیا ہے شاہ صاحبؒ نے خود مولاناؒ کو ایک خط میں دیا ہے، آپؒ کو اور شاہ محمد اسماعیل صاحبؒ کو ''تاج المفسرین، فخر المحدثین، سرآمد علماءِ محققین'' لکھا ہے اور فرمایا ہے کہ ''دونوں حضرات تفسیر وحدیث، فقہ، اصول اور منطق وغیرہ میں اس فقیر سے کم نہیں ہیں، جنابِ باری کی جو عنایت ان دونوں بزرگوں کے شامل حال ہے اس کا شکر مجھ سے ادا نہیں ہوسکتا، ان دونوں کو علماءِ ربانی میں شمار

کرواور جواشکال حل نہ ہوان کے سامنے پیش کرو۔‘‘

ف: سبحان اللہ! کس قدر شرف کی بات ہے کہ استاذ اپنے شاگردوں کے کمالاتِ علمیہ وعملیہ کا اس طرح برملا اعتراف کر کے ان کو اعزاز بخشتے ہیں۔ **ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔** (مرتب)

شاہ محمد اسماعیل شہید صاحبؒ نے بھی آپؒ سے پڑھا تھا، اہل علم کے نزدیک علومِ رسمیہ میں مولانا عبدالحی صاحبؒ کا پایہ سید صاحبؒ کی جماعت میں سب سے بلند تھا، سید صاحبؒ بھی آپؒ کا بہت احترام کرتے تھے۔

آپؒ کی بیعت کا ذکر کتاب میں آچکا ہے، آپؒ ہی کی ترغیب سے حضرت شاہ اسماعیل صاحبؒ حضرت سید صاحبؒ کی طرف رجوع ہوئے، بیعت ہوتے ہی شاہ صاحبؒ کے ساتھ آپؒ سید صاحبؒ کے رنگ میں رنگ گئے اور اپنے سارے علم وفضل کا آپؒ پر تصدق کر دیا، ادنیٰ خادم بن گئے، آپؒ کی جوتیاں اٹھاتے، آپؒ کی رِکاب تھام کر چلتے، یہ آپؒ کا سب سے بڑا ایثار وکارنامہ تھا، آپؒ کا علم، قلم اور زبان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر قوت وقابلیت اسلام کی خدمت اور حق کی اشاعت ونصرت کے لیے وقف تھی۔

اخلاقِ فاضلہ: آپؒ پر شانِ صدیقیت اور شاہ محمد اسماعیل صاحبؒ پر شانِ فاروقیت غالب تھی، نہایت حلیم اور رقیق القلب تھے، چہرہ پر خشیت الٰہی وتواضع کے انوار ظاہر تھے، کوئی تعریف کرتا تو دِل سے ناخوش ہوتے اور بری لگتی، نصیحت کرتا تو دِل سے خوش ہوتے اور سر جھکا دیتے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نہایت چست ومستعد رہتے اور اس میں اپنے شیخ کا بھی -جن سے زیادہ محترم

ہستی آپؒ کی نظر میں کوئی نہ تھی- لحاظ نہ کرتے۔

ایک مرتبہ شادی کے بعد سید صاحبؒ کو خلافِ معمول جماعت میں کچھ تاخیر ہوگئی، دوسرے دِن پھر اتنی تاخیر ہوئی کہ تکبیر اولیٰ فوت ہوگئی، مولاناؒ نے سلام پھیرنے کے بعد کہا: ''عبادتِ الٰہی ہوگی یا شادی کی عشرت'' سید صاحبؒ خاموش ہوگئے اوراپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

دیوبند میں ایک مرتبہ کسی وجہ سے صبح کی نماز میں سید صاحبؒ کی تکبیر اولیٰ فوت ہوگئی، اس دِن مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اسی کا وعظ فرمایا۔ ایک مرتبہ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ ''اگر مجھ سے کوئی بات خلافِ سنت دیکھیں تو متنبہ کردیجیے گا'' مولاناؒ نے فرمایا کہ ''حضرت! جب کوئی خلافِ سنت فعل آپ سے عبدالحی دیکھے گا تو وہ آپ کے ساتھ ہوگا ہی کہاں؟''

آپؒ کے وعظ کا حال: آپؒ کے علم سے جس قدر اسلام کو نفع اور آپؒ کے وعظ سے جس قدر اصلاح ہوئی کم خوش نصیب علماء کے علم وتقریر سے ہوئی ہوگی، لکھنؤ کے قیام میں برابر آپؒ کا وعظ ہوتا تھا، جس میں ہزارہا آدمی شریک ہوتے اور ہدایت پاتے، ایک مرتبہ آپؒ نے {وَ ذَاالنُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا . . . الخ} پر وعظ کہا اور ایسا وعظ کہا کہ سامعین پر سکتہ طاری ہوگیا، ہر ایک کے منہ سے واہ واہ، سبحان اللہ کی صدا نکلتی تھی، سارا مجمع اور علماء آپؒ کی قوتِ بیانی اور نکتہ دانی کے قائل ہوگئے، علماء نے کہا کہ حق تو یہ ہے کہ ہماری ساری عمر جہل و نادانی میں گزری اور اس وادیٔ معرفت کا آج تک پتہ نہ چلا، تین جمعہ تک اسی آیت کا وعظ ہوتا رہا۔

ایک دوسرا وعظ آپؒ کا ان قوموں کے حالات، صفات اور اخلاق پر ہوا جن پر عذابِ الٰہی نازل ہوا تھا، آپؒ نے تفصیل سے ان کے اعمال واخلاق، وضع ومعاشرت، رسم و رِواج، صورت وسیرت بتائی اور موجودہ مسلمانوں واہل شہر کے حالات واخلاق سے مطابق کیا، ان خطبات ومواعظ کا نہایت نفع ہوا اور ہزاروں کو ہدایت ہوئی۔

لکھنؤ کے ایک محدث اور مشہور عالم نے ایک مرتبہ کہا کہ میں بھی قرآن و حدیث کا وعظ کہتا ہوں اور یہ دونوں عالم (مولاناؒ اور شاہ محمد اسماعیل صاحبؒ) بھی قرآن وحدیث کا وعظ کہتے ہیں، مگر میرے وعظ میں دس پانچ آدمیوں سے زیادہ جمع نہیں ہوتے اور ان کے وعظ میں سارا شہر ٹوٹا پڑتا ہے، مسجدوں میں سامعین کو بیٹھنے کی جگہ تک نہیں ملتی، مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اس محدثِ خشک کی زبان سے یہ بات سن کر فرمایا کہ ''پہلے ہمارا بھی یہی حال تھا، یہ سید صاحبؒ کی برکت ہے۔''

سفر بیت اللہ: حج میں آپؒ مع اہل خانہ سید صاحبؒ کے ساتھ تھے اور آپؒ نے اپنی زوجۂ محترمہ سے فرمایا تھا کہ اس سفر میں تم کو چکی بھی پیسنی پڑے گی، روٹی بھی پکانی پڑے گی، پیدل بھی چلنا ہوگا، جو ضروری کام ہیں سب کرنے ہوں گے، راستہ میں آپؒ کے وعظ سے ایک بازاری عورت تائب ہوئی اور شریکِ قافلہ ہوئی، سید صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کو عورتوں میں بٹھا دو، عورتیں کسی طرح اس پر راضی نہیں ہوتی تھیں، آخر مولانا عبدالحی صاحبؒ نے آکر فرمایا کہ تم اس نیک بخت کو اپنی ناؤ پر کیوں نہیں بٹھاتیں؟ آج اس نے برے کاموں سے

توبہ کی ہے، اِس وقت یہ تم سب سے افضل ہے، اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شرعی حکم تم پر ہے وہی اس پر ہے، عورتوں نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اس کو پردہ کرا کر چھت پر الگ بٹھا دو، مولاناؒ نے کہا کہ کیا چھت پر تم میں سے کوئی نہیں بیٹھ سکتیں؟ وہی کیوں جا کر چھت پر بیٹھے؟ آخر آپؒ نے اپنی بیوی کو حکم دیا کہ چادر اوڑھ کر اُتر آئیں، وہ اُتر آئیں تو آپؒ نے ان کو گھر کا اقرار یاد دلایا، سید صاحبؒ نے یہ دیکھا تو مولاناؒ کو آواز دی کہ یہاں تشریف لایئے، آپؒ نے فرمایا کہ حاضر ہوتا ہوں، اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ دیکھو عبدالحی کی بی بی کھڑی ہے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق شرعی پردہ اس کو کہتے ہیں، یہ تین بار فرمایا، تا کہ وہ غرور ٹوٹ جائے۔

سفر میں اکثر لوگ اور بالخصوص عورتیں نماز کم پڑھتی ہیں اور بہلی گاڑی وغیرہ میں دشوار بھی ہے، ایک مقام پر آپؒ نے پردہ کا انتظام کر کے اپنی بیوی کو اُتارا اور اُن سے نماز پڑھوائی اور ساتھیوں سے فرمایا کہ صاحبو! ''دیکھ لو! عبدالحی کی بیوی نماز پڑھ رہی ہے'' اس پر لوگوں نے بھی اپنی اپنی بیویوں سے نماز پڑھوائی۔

آپؒ نے سفرِ حج میں یمن کے مشہور محدث محمد بن علی الشوکانی رحمۃ اللہ علیہ (صاحب نیل الاوطار) سے خط و کتابت کی اور امام موصوفؒ نے اپنی تصنیفات بھیجیں۔

حجاز میں اہل عرب کے نفع کے لیے آپؒ نے ''صراطِ مستقیم'' (فارسی) کا عربی میں ترجمہ کیا۔

ف: اس ترجمہ کا حجازی نسخہ صاحب زادہ عبدالرحیم خان صاحب مرحوم کے کتب

خانہ ٹونک میں موجود تھا اور میری نظر سے گزرا ہے۔ (یعنی مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

آپؒ کا مقام سید صاحبؒ کی نظر میں: حضرت سید صاحبؒ نے مولانا عبدالحی صاحبؒ، حاجی احمد صاحبؒ اور مولانا عبدالقدوس صاحب جونپوریؒ کو ٹونک میں ہدایت وارشاد اور بعض ضرورتوں کی تکمیل کے لیے چھوڑ دیا تھا، وہ محض تعمیل ارشاد میں ٹھہرے رہے، اُن کا جسم ٹونک میں تھا؛ لیکن دل حضرتؒ کے ساتھ تھا، پانچ مہینے کے بعد حضرتؒ نے طلب فرمایا، تو یہ حضرات اس طرح بے تابانہ گئے جس طرح مرغِ اسیر قفس سے نکل کر اپنے آشیانہ کی طرف جاتا ہے، راستہ میں ان حضرات پر عجب کیف وسرور طاری تھا، راستہ میں حضرتؒ کا نامۂ گرامی ہاتھ میں لیے ہوئے پڑھتے ہوئے بڑے جذب وشوق سے پیدل چلے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، جو راستہ میں ملتا اس سے کہتے کہ ہم کو سید صاحبؒ نے بلایا ہے، جسم کی ناتوانی، پیری اور نقاہت کے باوجود منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے جارہے تھے، جب حضرتؒ سے ملاقات ہوئی تو راستہ کی ساری کلفت جاتی رہی، اپنے احباب کو جو آپؒ نے خط لکھا ہے نواب وزیر الدولہ مرحوم فرماتے ہیں کہ میں نے وہ خط دیکھا ہے، اس میں لکھا تھا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ مومن کو جب جنت کی نہر میں غوطہ دیا جائے گا تو اس کا سارا تکان جاتا رہے گا، قیامت کے مصائب کافور ہوجائیں گے اور وہ بالکل تر وتازہ ہوجائے گا، یہی کیفیت ہم خستہ جانوں کی تھی کہ حضرتؒ کی مجلس میں پہنچتے ہی سفر کا تکان اور راستہ کی تکلیف خواب وخیال ہوگئی۔

سید صاحبؒ کو آپؒ کی آمد کا ایسا انتظار تھا جیسے عید کے چاند کا ہوتا ہے،

آپؒ کی آمد کی خبر سن کر نہایت مسرور تھے، دریا تک آپؒ کو لانے کے لیے پالکی بھیجی اور خاص اپنے ساتھ اپنے خیمہ میں اُتارا اور اپنا مہمان رکھا، اُس وقت مجاہدین پر بڑی تنگی تھی، کبھی کبھی پتے کھانے کی نوبت آتی تھی، آپؒ اپنے ساتھ ہندوستان سے روپئے بھی لائے تھے جن سے مجاہدین کو فراغت ہوگئی۔

سید صاحبؒ نے آپؒ کو لشکر کا قاضی مقرر فرمایا، مقدمات کا فیصلہ کرنا اور عاملوں کو مقرر کرنا آپؒ کے متعلق تھا۔

وفات: آپؒ کی وفات ۱۲۴۳ھ کو مقامِ خار میں ہوئی۔ إنا للّٰہ وإنا إلیه راجعون۔

انتقال کے وقت سید صاحبؒ سے فرمایا کہ ''حضرت! شہادت تو میری قسمت میں نہ ہوئی، اب اتنی تمنا ہے کہ آپؒ اپنا قدم مبارک میرے سینے پر رکھ دیجیے، کہ اسی حالت میں میری جان نکل جائے'' سید صاحبؒ نے فرمایا کہ ''میرا پاؤں اس قابل کہاں ہے کہ اُس سینہ پر رکھوں جو قرآن وحدیث کے علم کا خزینہ ہے، آپؒ نے تسلی کے لیے اپنا ہاتھ آپؒ کے سینے پر رکھا اور اسی حالت میں آپؒ کا انتقال ہوگیا۔

آپؒ کی زبان سے آخری کلمہ ''اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الأَعْلیٰ'' نکلا اور روح پرواز کرگئی۔

{وَ مَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ} (اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی طرف ہجرت کے لیے نکلے پھر اس کو موت پالے تو اس کا اجر مقرر ہو چکا اللہ کے یہاں)۔ (تاریخ دعوت وعزیمت از: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

حضرت شیخ احمد رومیؒ [1] متوفی ۱۰۴۳ھ

تعارف: آپؒ کے تعارف کے سلسلے میں بعینہ وہی عبارت نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس کو حضرت مفتیٔ اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب دہلویؒ نے ’’تذکرہ مصنف مجالس الابرار‘‘ کے عنوان سے نقل فرمایا ہے:

’’مجالس الابرار‘‘ کے مصنف نے غایت اخلاص وتواضع کی وجہ سے اپنا نام ظاہر نہیں فرمایا، میں نے ہر چند کوشش کی کہ مصنفؒ کے کچھ حالات معلوم ہو جائیں، مگر افسوس کہ کامیابی نہیں ہوئی، صرف وہی معلوم ہو سکا جو خود اسی کتاب ’’مجالس الابرار‘‘ کے طبع سابق میں اس کے آخری صفحے پر مرقوم ہے، جس کا حاصل یہ ہے:

’’حضرت خاتم المحدثین، حجۃ اللہ فی الارضین، آیۃ من آیات اللہ فی العالمین، امام ہمام، ثقۃ الاسلام، منتہائے روایت حدیث فی الہند حضرت شیخ شاہ عبدالعزیز العمری الدہلویؒ (متوفی: ۱۲۳۹ھ) نے اس کتاب کی تعریف وتوصیف

---

[1] الحمد للہ! یہ کتاب بدست محب مکرم الحاج عبدالمنان صاحب مدظلہٗ سابق انجینئر مکہ مکرّمہ موصول ہوئی، جو نہایت اہم ومفید کتاب ہے، جس کی ہمارے اکابرؒ نے بہت ہی تعریف فرمائی ہے، اگر چہ یہ گیارہویں صدی کے بزرگوں میں ہیں، مگر لاعلمی کی بنا پر اس صدی میں تذکرہ نہ ہو سکا، مگر اس کتاب کی افادیت کی وجہ سے تیرہویں صدی کے بزرگوں کے ساتھ تذکرہ ہو رہا ہے، دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شیخ احمد رومیؒ کے فیوض وبرکات اور کتاب کے مواعظ ونصائح سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے......آمین۔ (مرتب)

فرمائی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ کی عبارت یہ ہے: ''کتاب ''مجالس الابرار'' علم ووعظ ونصیحت میں اسرارِ شریعت و ابوابِ فقہ و ابوابِ سلوک و ردِ بدعات وعاداتِ شنیعہ کے فوائدِ کثیرہ پر شامل ہے، ہمیں اس کے مصنف کا اس سے زیادہ حال معلوم نہیں، جتنا کہ اس تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کا مصنف ایک عالم، متدین، متورع اور علومِ شرعیہ کے فنونِ مختلفہ پر حاوی تھا، اور کیا اچھی بات کسی نے کہی ہے کہ کہنے والے کو نہ دیکھو، بلکہ اس کے کلام کو دیکھو، کیوں کہ آدمیوں کی پہچان حق بات سے ہوتی ہے، نہ حق بات کی پہچان آدمیوں سے۔'' واللہ اعلم بالصواب۔

اور ''کشف الظنون'' میں ہے کہ کتاب ''مجالس الابرار'' کی سو (۱۰۰) مجلسیں ہیں، ہر ہر مجلس کے موضوع میں مصابیح کی حدیث کو بنیاد بنا کر اس کی شرح کی گئی ہے اور مصنف اس کے شیخ احمد رومیؒ ہیں۔''

اس سے زیادہ مصنف کا کوئی حال معلوم نہیں ہوسکا، نواب سید محمد صدیق حسن خان صاحب مرحوم نے بھی اپنی کتاب **"اتحاف النبلاء بإحياء مآثر الفقهاء المحدثين"** میں ''مجالس الابرار'' کے بیان میں صرف اپنی دو نقلوں پر اکتفا کیا ہے جو حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ اور ''کشف الظنون'' سے اوپر نقل کی گئیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(کتبہ خاکسار محمد کفایت اللہ غفرلہ، مقدمہ مجالس الابرار)

تذکرۂ مجالس الابرار: آپؒ کی گراں قدر تصنیف بزبانِ عربی ''نفائس الازہار'' ہے، اسی کا ترجمہ بزبانِ اردو مولانا حکیم محمد ابراہیم صاحب راندیری

سورتیؒ نے ''مجالس الابرار'' کے نام سے کیا ہے، اسی کو مولانا حسین احمد نجیب صاحب رفیق دارالتصنیف کراچی نے کافی محنت کر کے اردو کے بہترین قالب میں پیش کر کے کتاب کا تعارف یوں کرایا:

''شیخ احمد رومیؒ کی کتاب ''مجالس الابرار'' احیاء وحفاظت سنت کے اسی کارِ خیر کا ایک حصہ ہے، مصنفؒ نے اس میں نہایت محتاط اور محققانہ انداز سے احادیث مصابیح کی شرح کی ہے کہ رطب و یابس روایات جمع نہیں کیں اور سنت نبویہ کی محبت اور بدعت سے نفرت اس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتی ہے، عقائد، فقہ اور تصوف و طریقت کے ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے، کتاب کو سو مجلسوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ہر مجلس کی بنا حدیث شریف پر رکھی گئی ہے، تشریح میں قرآنِ کریم، احادیث شریفہ، فقہ، سلوک اور تصوف کے مسائل اور بزرگوں کے تجربات کو اس پیرایہ میں جمع فرمایا ہے کہ ہر بات دل میں اُترتی چلی جاتی ہے، اصل کتاب عربی زبان میں لکھی گئی تھی، امام الہند، خاتم المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ العزیز اس کتاب کی نہایت بلیغ انداز میں توصیف فرماتے تھے۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب راندیری سورتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کے اردو ترجمہ کو سلیس اور بامحاورہ کر کے عام اُردوداں حضرات کے لیے صحیح دینی معلومات کا ایک بہترین ذخیرہ فراہم کر دیا، مفتیٔ اعظم ہند حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی اشاعت میں خصوصی دل چسپی فرمائی، وعظ وتبلیغ کرنے والوں اور خطباء حضرات کے لیے بلاشبہ ایک نادر تحفہ ہے۔

کتاب ''مجالس الابرار'' کی خصوصیات: اتباعِ سنت کی ترغیب و فضائل اور اجتنابِ بدعات کی تاکید اور بدعت کے قبائح کے بیان میں بہت سی کتابیں علماءِ ربانی نے تصنیف کیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا، مگر کتاب ''مجالس الابرار'' اس بارے میں نہایت مفید اور بے انتہا خوبیوں سے لبریز تھی، اس کے مصنف کا اِخلاص اس سے ظاہر ہے کہ اس نے اپنا نام تک ظاہر نہیں فرمایا کہ رِیا کا وہم ہوسکتا تھا، اور سنت نبویہ کی محبت اور بدعت سے نفرت کتاب کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتی ہے، احادیث پر وسعت نظری اور رفقہ فی الدین مضامین کتاب سے عیاں ہے، غرض ہر مضمون سفینۂ فلاح اور ہر مضمون حرزِ جاں ہے۔

ف: سبحان اللہ! کیسی جامع تعریف فرمائی ہے۔

ایک محب سنت کے لیے یہ کتاب مونس انیس اور رفیق نفیس ہے، اسی لیے علماءِ محققین نے اس کی مدح و ثنا فرمائی ہے اور واعظین محتاطین (احتیاط کرنے والے) نے اس کے مضامین سے استفادہ کیا، کیوں کہ اور کتب وعظ کی طرح اس میں رطب و یابس روایتیں جمع نہیں کی گئی ہیں، بلکہ نہایت محققانہ طرز پر احادیث مصابیح کی شرح کی گئی ہے اور عمدہ عمدہ بحثیں درج فرمائی ہیں، اللہ تعالیٰ مصنفؒ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کی قبر پر رحمت کی بارش برسائے۔ آمین یارب العالمین۔

اب ہم عبرت ونصیحت کے لیے ''مجالس الابرار'' سے کچھ اہم مضامین نقل کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں۔

ذکر کی فضیلت: اس کی پہلی ہی مجلس جو ذکر کی فضیلت و معرفت میں ہے اس کی ابتدائی عربی عبارت مع اس کے اردو ترجمہ کے نقل کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین۔

قال رسول اللهﷺ: "مثل الذی یذکر ربه والذی لا یذکر ربه مثل الحي و الميت۔" (البخاری/الرقم:٦٤٠٧، والترمذی /الرقم:٣٣٨٣)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے وہ مثل زندہ کے ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا وہ مثل مردہ کے ہے۔

هٰذا الحديث من صحاح المصابيح، رواه أبو موسىٰ الأشعري رضي الله عنه، فإنه ﷺ جعل فيه الذاكر مثل الحي مع كونه حيا، لأن المراد بالحي من له حياة حقيقية أبدية و هي إنما تحصل بذكر الله تعالىٰ لأن الذكر يحيي قلوب الذاكرين، و يوجب لهم الاستعداد لمعرفة رب العالمين و الوصول الى

یہ حدیث مصابیح کی صحیح حدیثوں میں سے ہے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے اسے روایت کیا ہے، حضور ﷺ نے اس میں ذکر کرنے والے کو مثل زندہ کے فرمایا، حالاں کہ وہ زندہ ہے، اس لیے کہ زندہ سے مراد وہ ہے جس کو حقیقی اور دائمی زندگی حاصل ہو، اور ایسی زندگی بغیر یادِ الٰہی کے حاصل نہیں ہوتی، کیوں کہ ذکر الٰہی ذاکرین کے دلوں کو زندہ رکھتا ہے اور ان کے لیے رب العالمین کی پہچان کا سامان تیار کر دیتا ہے اور بہشت کی ہمیشہ کی زندگی

الحياة الأبدية في دار النعيم، و من كان خاليا عن الذكر فهو بمنزلة الميت، لكونه خاليا عما يحيي قلبه و عما يوجب له المعرفة والحياة الأبدية، لأن شرف الإنسان و فضيلته التي بها فاق جميع أصناف الخلق ليس إلا بالاستعداد لمعرفة الله تعالىٰ، و إنما يستعدّ لمعرفة الله تعالىٰ بقلبه، لا بجارحة من جوارحه، بل الجوارح له أتباع و خدم يستخدمها استخدام الملك للرعايا، و يستعملها استعمال السيد للعبيد، و هو إنما يطمئن بذكر الله، كما قال الله تعالىٰ:{ أَلاَ بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ} و أفضل الذكر

کے لائق بنا دیتا ہے، اور جو شخص یادِ الٰہی نہیں کرتا وہ مردے کے مانند ہے، کیوں کہ وہ اس چیز سے خالی ہے جس سے اس کا قلب زندہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور دائمی زندگی حاصل ہو، کیوں کہ انسان کی وہ شرافت جس سے وہ تمام اقسامِ مخلوقات پر فضیلت رکھتا ہے صرف اسی وجہ سے ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کی لیاقت اور استعداد ہے، اور اس معرفت کی استعداد کا تعلق صرف دل کے ساتھ ہے، ہاتھ، پاؤں وغیرہ اعضاء سے اسے کچھ علاقہ نہیں، بلکہ تمام اعضائ، دل کے تابع اور خدمت گزار ہیں، دل ان اعضاء سے اس طرح کام لیتا ہے جس طرح بادشاہ رعیت سے اور اس طرح خدمت لیتا ہے جس طرح آقا اپنے غلاموں سے۔ اور دل کو اطمینان صرف یادِ الٰہی سے حاصل ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ’’خبردار ہو کہ صرف اللہ کی یاد سے دل اطمینان پاتے ہیں۔‘‘

علیٰ ما ورد فی الحدیث: "لا إلٰه إلا الله" ۔ فلا بد للعبد المكلف أن يشتغل بهذا الذكر حتّٰی يطمئن قلبه، و يستعد لمعرفة الله تعالىٰ، لٰكن قبل اشتغاله به يجب عليه أن يحصّل من علم الكلام ما يصحّ به اعتقاده على مذهب أهل السنة و الجماعة، و ما يحترز به عن شبه المبتدعة، لأن القلب ما دام مكدّرا بظلمة البدعة الاعتقادية لا ينوره أنوار الطاعات۔" (مجالس الأبرار:١٥)	اور سب سے بہتر ذکر جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: "لا الٰہ الا اللہ" ہے، تو ہر عاقل بالغ شخص پر ضروری ہے کہ اس ذکر میں مشغول رہے، تاکہ اس کا دل مطمئن ہو جائے اور معرفت الٰہی کی استعداد حاصل کرے، لیکن اس میں مشغول ہونے سے پہلے اس پر واجب ہے کہ عقائد کا اتنا علم حاصل کرے جس سے اس کا اعتقاد موافق مذہب اہل سنت والجماعت کے ٹھیک ہو جائے اور اہل بدعت کے شبہات سے بچ سکے، کیوں کہ جب تک دل میں اعتقادی بدعت کی تاریکی رہتی ہے اس وقت تک اس میں عبادت کی روشنی نہیں چمکتی۔

ف: اس کے بعد نہایت ضروری نصیحت فرما رہے ہیں جو نقش قلوب کیے جانے کے لائق ہے۔(مرتب)۔

مسائل کا علم بھی ضروری ہے: اور یہ بھی واجب ہے کہ اتنا علمِ فقہ سیکھ لے جس سے اس کے اعمال شریعت کے موافق صحیح و درست ہو جائیں، اور نہیں تو بغیر جڑ مضبوط کیے ہوئے اور ٹھیک راستہ درست کیے ہوئے بڑا کام کر بیٹھنا

شیطانی جلدی اور نفسانی خواہش ہے، جو دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل کرتی ہے، کیوں کہ ایسا جاہل کبھی دھوکے میں پڑ کر نادانی سے خیالاتِ نفسانی اور شبہاتِ شیطانی کو کرامت سمجھ لیتا ہے، حالاں کہ اصل میں وہ استدراج ہوتا ہے اور اس کے حق میں طرح طرح کی گمراہی بڑھ جاتی ہے۔ (مجالس الابرار)

فوائد طاعت ونحوست معصیت: منحوس اور مبارک حقیقت میں معصیت اور طاعت ہی ہے، جیسا کہ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ آدمی کی برکت اور نحوست اس کے دونوں جبڑوں کے درمیان ہے، یعنی اس کی زبان۔ اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر کسی چیز میں نحوست ہے تو اس میں ہے جو دونوں کلّوں کے درمیان ہے، یعنی زبان، اور کوئی چیز زبان سے زیادہ قید کی حاجت مند نہیں۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ نحوست بدخلقی ہے۔

پس اب حقیقت میں نحوست، معاصی اور گناہوں کے سوا کچھ نہیں ہے، کیوں کہ گناہ اللہ تعالیٰ کو بیزار کر دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے ناراض ہوتا ہے تو وہ دنیا اور آخرت میں بدبخت ہوتا ہے، اور جب کسی بندے سے راضی ہوتا ہے تو وہ بندہ دنیا اور آخرت میں نیک بخت ہوتا ہے۔ کسی بزرگ سے ایک مصیبت کی جس میں تمام خلق گرفتار تھی شکایت کی گئی، تو انہوں نے جواب دیا کہ جس بلا میں تم گرفتار ہو، گناہوں کی نحوست کے سوا اس کی اور کوئی وجہ نہیں جانتا۔

اس شخص اور مقام سے دور رہنے کا حکم جس پر اللہ کا عذاب نازل ہوا ہو: اور اب اس بنا پر نافرمان خود اپنی جان کے لیے اور نیز دوسروں کے لیے منحوس

ہوتا ہے، کیوں کہ اس سے امن نہیں ہوسکتا کہ اس پر عذاب نازل ہو کر سب پر عام ہو جائے، خصوصاً اس پر جس نے اس کے عمل پر انکار نہیں کیا، لہٰذا ایسے شخص سے دور رہنا ہی لازم ہے، اسی طرح ان مقامات سے جہاں معاصی کیے جاتے ہیں ان سے بھی اس خوف سے کہ جو اس مقام میں ہیں اُن پر عذاب نازل نہ ہو، دور رہنا اور بھاگنا لازم ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اصحابؓ سے جب کہ مقامِ حجر میں دیارِ قومِ ثمود پر گزرے تھے فرمایا تھا کہ ان حد سے بڑھے ہوئے لوگوں کے مکانوں میں داخل نہ ہوں مگر اس خوف سے روتے ہوئے کہ کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آجائے جو ان پر آیا تھا۔

اللہ تعالیٰ سے حسن ظن اور اُمید کی تاکید: بندہ کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن رکھے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ رحم کرے گا اور میرے گناہ معاف کردے گا، اور اپنے دل میں یہ خیال کرے کہ میں اس کی مخلوقات میں سب سے ادنیٰ ہوں اور اللہ تعالیٰ کو میرے عذاب اور طاعت کی کچھ حاجت نہیں ہے، اور مناسب ہے کہ قرآن مجید کی ان آیتوں کے پڑھنے میں مشغول رہے جن کا مفہوم اُمیدواری ہے، یا اس کے پاس اور لوگ پڑھیں اور وہ سنتا رہے، اور ایسے ہی اُمیدواری کے مضمون کی حدیثیں اور نیک لوگوں کی حکایتیں اور ان کے مرتے دم کے حالات پڑھے یا اور لوگ اس کے پاس پڑھیں اور یہ سنتا رہے۔

اور مناسب ہے کہ پنجگانہ نماز اور وہ وظیفے جو شرعاً ثابت ہیں اپنی طاقت کے موافق ہمیشہ پڑھتا رہے، پس جب کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے عاجز ہو جائے تو بیٹھ کر رکوع اور سجود کے ساتھ پڑھے، اور اگر رکوع اور سجود کی قدرت نہ ہو

تو بیٹھ کر اشارے سے پڑھے، اور سجدہ کو رکوع سے ذرا پست کرے کہ دونوں میں فرق ہو جائے، اور اگر بیٹھنے کی قدرت نہ ہو تو اشارے سے کروٹ پر یا چت لیٹ کر پڑھے۔

دِل کی سختی اور نفس کی سرکشی کے علاج کا طریقہ: علماء نے کہا ہے کہ جب دل سخت ہو جائیں تو ایسے دل والوں کو چاہیے کہ چار چیزوں کو لازم پکڑ لیں۔

چنانچہ اوّل یہ کہ ایسی مجلسوں میں حاضر ہوں جن میں دنیا سے آخرت کی طرف اور گناہ سے طاعت کی طرف رہنمائی ہوتی ہو، کیوں کہ ایسی مجلسوں میں شرکت دلوں کو نرم کرتی ہے اور ان میں درد پیدا کرتی ہے۔

دوم یہ کہ موت کو یاد رکھنا چاہیے، جو کہ لذتوں کو توڑنے والی اور بیٹے بیٹیوں کو چھڑانے والی ہے۔

سوم ان لوگوں کا دیکھنا جو نزع کی حالت میں ہوں، اس لیے کہ سکرات کا حال دیکھنا اور مرنے کے بعد اس کی حالت پر غور کرنا طبیعتوں کو لذتوں سے اور دلوں کو خوشیوں سے الگ کر دیتا ہے، اور آنکھوں کو نیند سے اور بدنوں کو آرام سے باز رکھتا ہے اور طاعت پر ابھارتا ہے۔

چہارم یہ کہ اگر دل کے امراض راسخ ہو گئے ہوں تو پھر اس میں قبروں کی زیارت اس قدر اثر کرتی ہے جتنا سابقہ طریقے بھی اثر نہیں کرتے، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ قبروں کی زیارت کیا کرو، کیوں کہ یہ موت اور آخرت کو یاد دلاتی ہے اور دنیا سے بے رغبت کرتی ہے۔ (مجالس الابرار/صفحہ: ۴۱۷)

موت کو بکثرت یاد کرنے کا حکم اور اس کا فائدہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

نے فرمایا کہ لذتوں کو توڑنے والی یعنی موت کو بکثرت یاد کیا کرو۔ یہ حدیث مصابیح کی حدیثوں میں سے ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے، اوراس کے معنیٰ یہ ہیں کہ موت چوں کہ ہر لذت کو توڑ دیتی ہے لہٰذا اس کو کثرت سے یادرکھو، تاکہ اس کے لیے تیاری کرسکو۔

بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول ''لذات کو توڑنے والی کا ذکر زیادہ کیا کرو'' نہایت مختصر کلام ہے، لیکن اس میں تمام نصیحتیں بھر دی ہیں، کیوں کہ جو شخص موت کو یادرکھے گا اس پر موجودہ لذت کم ہوجائے گی اوراس کو آئندہ کی اُمیدوں سے منع کرے گی اور جو اُمیدیں پکاتا ہے اُن سب سے بے رغبت کردے گی۔

اس لیے کہ علماء کہتے ہیں کہ موت محض عدم اور صرف فنا ہی نہیں ہے، بلکہ موت صرف روح کا بدن سے تعلق چھوٹ جانا ہے اوراس کا بدن سے جدا ہونا اور ایک حال سے دوسرے کی طرف بدل جانا اور ایک گھر سے دوسرے گھر میں چلا جانا ہے۔

موت کا وقت متعین نہ ہونے کا سبب: علامہ قرطبیؒ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ تمام امت کا اس پر اتفاق ہے کہ موت کا نہ کوئی سال متعین ہے اور نہ کوئی زمانہ معلوم ہے، اور نہ کوئی مرض مقرر ہے، اور یہ اس لیے ہے تاکہ آدمی اس سے ہر دم ڈرتا رہے اوراس کے لیے تیار رہے۔ (مجالس الابرار/صفحہ:۴۱۵)

نیک اعمال میں سستی نہ کرنے کی ہدایت: پس بندہ پر واجب ہے کہ نیک اعمال میں جس حال میں ہو موت سے پہلے اور فوت ہونے سے قبل جلدی کرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

{ وَ سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ }

''دوڑو اپنے رب کی بخشش اور ایسی جنت کی طرف جس کا پھیلاؤ آسمان اور زمین ہے، تیار ہوئی ہے پرہیز گاروں کے واسطے۔''

دنیا کی محبت کا نتیجہ: کیوں کہ جس کا دل دُنیا میں اٹک گیا اور دُنیا میں اس نے حاجت سے زیادہ کھایا، پیا اور لباس حاصل کیا تو یہ بات اس کے حق میں مضر ہوتی ہے، مگر اُس صورت میں کہ طاعت الٰہی میں اس سے مدد لے، کیوں کہ ہر وہ چیز جس کو آدمی پسند کرتا ہے اور اُس پر کامیاب ہو جاتا ہے اُس سے جدا ہونا ضروری ہے، پس اگر اُس سے غیر اللہ کے لیے محبت رکھتا تھا تو اس کا فوت ہونا بھی اس پر عذاب ہوگا، اس لیے کہ جس قدر اس کے دل کو اس سے تعلق ہوگا اسی قدر رنج ہوگا، پس جس کے پاس سرمایہ اسی قدر موجود ہو جو اس کو کافی ہو وہ تو فارغ دل ہے، پھر اگر سو اشرفیاں پا جائے تو اس کے دل میں دس خواہشیں اُٹھ کھڑی ہوں گی، جن میں سے ہر ایک خواہش کے لیے سو سو اشرفیوں کی حاجت ہو، پس جو ہاتھ آیا ہے کافی نہ ہوگا، بلکہ اور نو سو کی حاجت پڑے گی، حالاں کہ ان سو کے پانے سے پہلے اُن سے مستغنی تھا، پس انہیں پایا اور گمان کیا کہ غنی ہو گیا، حالاں کہ اس کو یہ خبر نہیں کہ وہ اور نو سو کا محتاج ہو گیا، تاکہ مکان خریدے یا اس کو بنوائے، اور لونڈی مول لے اور اس کے لیے اور اپنے لیے قیمتی پوشاک خریدے اور ہر ایک کے لیے اُن لوازم کی ضرورت ہے جو اس کے مناسب اور لائق ہوں، جن کی کہیں انتہا نہیں، پس ایسے گڑھے میں پڑ جائے گا جس کا انجام

دوزخ کا گھراؤ ہے اور سوا اس کے کوئی اس کی انتہا نہیں۔

ایک حکایت: ایک حکایت ہے کہ کسی بادشاہ کے پاس ایک فیروزہ کا پیالہ کوئی لایا اور وہ پیالہ جواہرات سے جڑا ہوا تھا اور اس جیسا دیکھنے میں نہیں آیا تھا، پس بادشاہ اس سے بہت خوش ہوا، بادشاہ کے پاس ایک حکیم تھا، بادشاہ نے اس سے کہا: ''تم اس کو کیسا جانتے ہو؟'' اس نے عرض کیا: ''مجھ کو یہ تمہارے لیے مصیبت اور فقر معلوم ہوتا ہے'' بادشاہ نے کہا: ''کیوں کر؟'' اس نے عرض کیا: ''اس لیے کہ جس چیز کا بھی انسان دنیا میں مالک ہوتا ہے وہ ہمیشہ نہیں رہتی، پس یہ پیالہ اگر جاتا رہا یا ٹوٹ گیا تو تم کو اس کی حاجت ہوگی، اور ایسا ملے گا نہیں، اور تمہارے لیے ایسی مصیبت ہوگی جس کا کچھ علاج نہیں، حالاں کہ اس سے پہلے کہ یہ پیالہ تمہارے پاس لایا جائے تم مصیبت اور احتیاج سے امن میں تھے۔'' پھر ایک روز اتفاق سے وہ پیالہ ٹوٹ گیا تو بادشاہ کو بہت زیادہ رنج ہوا اور اس نے کہا کہ حکیم نے جو کہا تھا ٹھیک تھا، کاش وہ میرے پاس نہ لایا جاتا۔

(مجالس الابرار/صفحہ:٦٧٢)

وفات: ''نفائس الازہار'' عربی کتاب کے ٹائٹل پر آپؒ کی سن وفات ۱۰۴۳ھ درج ہے، اور آپؒ کے بعض احوال لکھنے والوں نے سن وفات ۱۰۴۱ھ بتائی ہے، اور یہ راجح اس وجہ سے بھی ہے کہ آپؒ کے بعض مخطوطات کے سرورق پر بھی یہی تاریخ درج ہے، جب کہ ''مجالس الابرار'' میں کوئی تاریخ وغیرہ درج نہیں ہے۔ آپؒ کوترکی کے علاقہ آق حصار کے مقبرۂ اوزون طاش میں دفن کیا گیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ متوفی ۱۲۴۵ھ

نام ونسب: نام مفتی الٰہی بخش، والد کا نام مولانا محمد عرف شیخ الاسلام ہے، آپؒ کا سلسلۂ نسب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، آپؒ کے مورثِ اعلیٰ عوض بن ابی جعفر محمدؒ بغداد سے آکر ہندوستان میں شاہی ملازمت سے وابستہ ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے بلند ترین عہدوں تک پہنچے۔

ولادت وطفولیت: حضرت مفتی الٰہی بخشؒ ۱۱۶۲ھ مطابق: ۴۹-۱۷۴۸ء میں پیدا ہوئے، بچپن وطن میں گزرا، والدین کے سایہ میں پرورش وتربیت پائی، قرآنِ پاک حفظ کیا اور فارسی وعربی کی ابتدائی کتابیں متوسطات تک والد ماجد سے اخذ کیں، تذکرۂ مفتی الٰہی بخش میں ہے:

''تا سن تمیز بہ کنارِ والدین ماجدین و پدرِ مادرِ خود جناب مولوی محمد مدرس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بہ ہزاراں ناز ونعم پرورش یافتند۔''

ترجمہ: زمانۂ شعور تک والدین ماجدین اور اپنے نانا مولوی محمد مدرّس (ان سب پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں) کے آغوش میں ہزار ناز ونعمت سے پرورش پائی۔ (حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ: صفحہ: ۳۳)

تعلیم: مفتی صاحبؒ نے اپنے والد مکرم مولانا محمد عرفِ شیخ الاسلام سے کیا کیا

۱؎ حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی نے اپنی تالیف ''حضرت مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلویؒ'' میں آپؒ کے حالات وتعلیمات تفصیل سے تحریر کیے ہیں، اسی سے یہ اقتباسات نقل کیے جارہے ہیں۔ (مرتب)

کتابیں پڑھیں اس کی تفصیل دستیاب نہیں ہوئی، لیکن مفتی صاحبؒ کی تحریرات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ کاندھلہ سے دہلی کے سفر کے وقت تک متوسطات کی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔

تعلیم کے لیے دہلی کا سفر: متوسطات کی تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے لیے معمول کے مطابق کئی بڑے اساتذہ اور ممتاز علماء پر نظر گئی ہوگی، اس وقت علم وتدریس کی کثرت اور بلند پایہ علماء کی موجودگی کی وجہ سے دہلی رشکِ بغداد و بخارا بنا ہوا تھا، خصوصاً آخری دور کے امام حضرت شاہ ولی اللہؒ کے وجود سے علم کی ایسی شمع روشن تھی جس کی کرنوں سے آفتاب و ماہتاب شرمندہ تھے، بہر حال اس مجمع علماء و مرکز علم وفضل سے استفادہ کے لیے دہلی کا سفر ہوا، اس سفر کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، مولانا محمد سلیمان نے لکھا ہے کہ اس وقت مفتی صاحبؒ کی عمر چودہ سال تھی، اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو یہ سفر ۱۱۷۶ھ مطابق: ۱۷۶۲ء میں ہوا ہوگا، اور قرین قیاس ہے کہ اس وقت حضرت شاہ ولی اللہؒ باحیات ہوں، کیوں کہ اس وقت تک شاہ عبدالعزیزؒ کے نامِ نامی سے شاہ ولی اللہؒ کے شاگردوں اور متعلقین کے علاوہ کوئی اور واقف بھی نہ تھا، بہرصورت یہ شاہ ولی اللہؒ کی زندگی کے آخری ایام تھے، اس لیے حضرت شاہ صاحبؒ سے تعلیم وتلمذ کا موقع نہیں ملا، ممکن ہے تبرکاً کچھ پڑھا ہو۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں: حضرت شاہ ولی اللہؒ کی وفات (۲۹/ محرم/ ۱۱۷۶ھ) کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ نے مسندِ درس وافادہ کو زینت بخشی، اور سب سے پہلے جو چار پانچ طالب علم شاہ عبدالعزیزؒ کے حلقۂ درس سے

فیضیاب ہوئے ان میں مفتی الٰہی بخش شامل تھے۔

حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے ہم سبق تھے:

مفتی صاحبؒ اکثر درسیات میں شاہ رفیع الدینؒ کے رفیق و ہم سبق تھے، اس وقت شاہ عبدالقادرؒ نسبتاً ابتدائی کتابیں پڑھ رہے تھے، شاہ رفیع الدینؒ کے ساتھ آخر تک تمام کتابوں میں سماعت وقراءت کے ساتھ رفاقت رہی، مصابیح السنہ کے اسباق میں شاہ عبدالقادرؒ بھی مفتی صاحبؒ کے ہم سبق ہو گئے تھے، غالباً کسی وجہ سے درس کے معمول کی ترتیب میں شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں سنن ابی داود پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا، اس لیے سنن ابی داود اپنے رفیق درس شاہ عبدالقادرؒ سے پڑھی، شاہ عبدالعزیزؒ تحریر فرماتے ہیں:

”وَ سَمِعَ الْمَصَابِيْحَ بِقِرَاءَةِ الأَخِ الأَرْشَدِ العَالِمِ الصَّالِحِ الشَّيْخِ عَبْدِالْقَادِرِ، وَقَرَأَ عَلَيْهِ سُنَنَ أَبِيْ دَاوُدَ۔“

ترجمہ: مصابیح میرے نیک بھائی، عالم و صالح شیخ عبدالقادر کی قرأت سے سنی، اوران (ہی) سے سنن ابی داود پڑھی۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی عطا فرمائی ہوئی سند: تعلیم سے فراغت پر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے دست مبارک سے مفصل سند لکھ کر مفتی صاحبؒ کو عطا فرمائی، اس میں زیر درس کتب کی تفصیل کے علاوہ مفتی صاحبؒ کی اعلیٰ درجہ کی لیاقت وصلاحیت، معقولات ومنقولات کے فہم واستحضار کی تصدیق کے علاوہ یہ بھی تحریر فرمایا ہے:

” فَعَرَفَ مَعَانِيَ الْمُتُوْنِ پس متون کے مفہوم، ان کی باریکیوں

وَ دَقَائِقِهَا، و اصطِلاَحَاتِ	اور اصطلاحاتِ حدیث واسانید کو پہچانا،
الحَدِيْثِ وَ أَحْوَالَ أَسَانِيْدِهٖ،	یہاں تک کہ ان میں شروح وحواشی سے
حَتّٰى تَيَسَّرَ لَهٗ مَلَكَةُ الْتِقَاطِ	مطالب اخذ کرنے کی ایسی صلاحیت
المَطَالِبِ مِنَ الشُّرُوْحِ وَ	پیدا ہوگئی ہے کہ ان کی سمجھ (اور
الحَوَاشِي، بِحَيْثُ يُعْتَمَدُ	صلاحیت) پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور ان
عَلٰى فَهْمِهٖ، وَ يُقْبَلُ مَا صَدَرَ	کی رائے قبول کی جاسکتی ہے۔ بہ فضلہ
مِنْ رَأْيِهٖ۔ وَ صَارَ بِحَمْدِاللّٰهِ	تعالیٰ نہایت جید فاضل اور ممتاز عالم ہو
فَاضِلاً جَيِّدًا وَ عَالِمًا بَارِعًا،	گئے ہیں، نیکی و پرہیزگاری والے، اللہ
ذَا تَقْوٰى وَ صَلاَحٍ وَ خَشْيَةٍ	تعالیٰ سے ڈرنے والے، اس سے محبت
مِنَ اللّٰهِ وَ مَحَبَّتِهٖ وَ الاسْتِقَامَةِ	کرنے والے، اس کی شریعت پر جمے
فِيْ شَرِيْعَتِهٖ، وَ أَهْلاً لِأَنْ	ہوئے اور اس بات کے اہل کہ ان کے
يُعْتَمَدَ عَلٰى فَتَاوَاهُ وَ أَجْوِبَتِهٖ	فتاویٰ اور جوابات پر اعتماد کیا جائے، مع
مَعَ فَضَائِلَ أُخْرٰى۔"	مزید فضائل وکمالات کے۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں سفرِ سلوک اور اجازت وخلافت:

مفتی صاحبؒ نے درسیات کے علاوہ سلوک وتصوّف کی متعدد اہم تصنیفات اور دیگر فنون کی اہم کتابیں سبقاً سبقاً شاہ صاحبؒ سے پڑھیں اور مراتبِ عرفان وسلوک کی علمی واقفیت کے علاوہ اصلاحِ باطن اور سلوک وتصوّف کی عملی تربیت بھی حاصل کی، مفتی صاحبؒ جن کے حسن اخلاق، پاکیزہ عادات وکردار کا شاہ صاحبؒ ان الفاظ میں تذکرہ فرما چکے تھے:

”وَهَبَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی مِنْ حُسْنِ الْأَخْلَاقِ وَطَيِّبِ الشِّيَمِ۔“

ترجمہ: ان کو اللہ تعالیٰ نے پسندیدہ اخلاق اور عمدہ خصلتیں عطا فرمائی ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے حلقۂ اصلاح وتربیت سے وابستہ ہوئے اور مراحلِ سلوک مکمل کرنے کے بعد اجازت وخلافت سے مشرف کیے گئے۔

مولانا شاہ کمال الدین کاندھلوی سے بیعت واجازت: حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے دریائے کمال سے استفادہ کے بعد مفتی صاحبؒ نے مسند درس وافادہ کو زینت بخشی، مفتی الٰہی بخشؒ کی ذاتِ گرامی شاہ صاحبؒ کے محاسن وکمالات کا پرتو اور شاہ ولی اللہؒ کے طریقۂ تعلیم وتربیت اور علوم وکمالات کی جامع اور مکمل نمونہ تھی، اس لیے مفتی صاحبؒ کے حلقۂ درس وارشاد میں طلبہ اور طالبانِ راہِ حق کا کثرت سے رجوع ہوا، طلبہ کی کثیر تعداد اور ارشاد ومعرفت کے طالبین گروہ در گروہ مفتی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی اپنی صلاحیت وظرف کے مطابق حسبِ توفیق استفادہ کرتے۔

اسی دوران سلسلۂ نقشبندیہ کے طریقہ پر سیر سلوک کا اور اس سلسلہ کے کمالات حاصل کرنے کا خیال آیا، اس قصد سے متعدد بزرگوں اور اہلِ طریقت سے رجوع کیا، مگر جس چیز کی تلاش تھی وہ کہیں نہیں ملی، اسی کشمکش کے زمانے میں بھوپال کے اطراف کے ایک سفر میں ایک درویش کامل سے ملاقات ہوئی، اس نے کہا: ”جب تک اپنے بھائی شاہ کمال الدینؒ سے بیعت ہو کر استفادہ نہ کرو گے تمہارا مقصد حاصل نہ ہوگا۔“

جس چھوٹے بھائی کی بچپن میں تربیت کی ہو اور سبقاً سبقاً تمام کتابیں

پڑھائی ہوں اس سے بیعت ہونے کا فیصلہ آسان نہیں تھا، مگر مفتی صاحبؒ فنائیت اور اخلاص کے ایسے مقام پر فائز تھے کہ اس مشورہ کو ماننے قبول کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا، مفتی صاحبؒ نے اپنے چھوٹے بھائی شاہ کمال الدینؒ سے عام متوسل ومسترشد کی حیثیت سے رجوع ہونے کا فیصلہ فرمالیا، چھوٹے بھائی شاہ کمال الدینؒ سے عقیدت اور خوش دلی کے ساتھ بیعت کی اور اجازت وخلافت پائی۔

ف: کس قدر طلبِ صادق تھی کہ اپنے برادرِ خورد اور باکمال تلمیذ کی طرف استفادہ کے لیے رجوع فرمایا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے علمی، عملی اور مالی ہر حیثیت سے باکمال بنادیا۔ مرتب

حضرت سید احمد شہیدؒ سے استفادہ: شاہ کمال الدینؒ سے بیعت واستفادہ کے بعد خانوادۂ ولی اللہی اور نقشبندیہ مجددیہ سلسلوں کا فیضان مفتی صاحبؒ میں جمع ہوگیا تھا، گویا مفتی صاحبؒ کی ذات مجمع البحرین ہوگئی تھی، مگر ابھی مفتی صاحبؒ کو اور دور تک جانا تھا، اس لیے سفر کا آغاز حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے اشارہ وایما پر حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ سے ارادت ووابستگی سے ہوا، جو اس دور میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے روشن مستقبل کی نوید تھے۔

سید صاحبؒ ۱۲۳۴ھ میں اطرافِ دہلی کے تبلیغی سفر پر نکلے تھے، اسی سفر کے دوران کاندھلہ بھی تشریف لائے اور مفتی صاحبؒ کے مکان پر فروکش ہوئے، مفتی صاحبؒ نے سید صاحبؒ کے کمالاتِ باطنی کا اندازہ فرمالیا تھا، اس

لیے بلا تامل سید صاحبؒ سے بیعت ہو کر ان کے علوم و کمالات سے مستفید ہوئے، نیز مفتی صاحبؒ نے اپنے قریبی رشتہ داروں، خلفاء اور مریدین کو بھی سید صاحبؒ کے دامن تربیت میں دے دیا تھا، سید صاحبؒ نے بھی مفتی صاحبؒ کو اجازت وخلافت سے نوازا اور اپنے طریقۂ سلوک وتربیت کی تفصیلی تعلیم فرمائی۔

جب سید صاحبؒ کاندھلہ سے اگلی منزل کے لیے روانہ ہوئے اس وقت مفتی صاحبؒ بھی سید صاحبؒ کے ہمراہ تھے، اس دوران مفتی صاحبؒ نے سید صاحبؒ کے ملفوظات اور طریقۂ تعلیم کو مرتب و منضبط فرمایا تھا، مجموعۂ افادات ''ملہماتِ احمدیہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

درس وافادہ: مفتی صاحبؒ کے حلقۂ درس وتعلیم کا آغاز زمانۂ تعلیم میں ہوگیا تھا، اس کا اہتمام خود حضرت الاستاذ شاہ عبدالعزیزؒ نے فرمایا تھا، شاہ صاحبؒ نے ہدایت فرمائی کہ ان کی موجودگی میں درسی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھائیں، چنانچہ مفتی صاحبؒ شاہ صاحبؒ کی موجودگی میں طلبہ کو درس دیتے تھے، شاہ صاحبؒ بنفس نفیس تشریف رکھتے اور توجہ کے ساتھ مفتی صاحبؒ کے طرزِ تعلیم اور فن سے مناسبت ومہارت کا مشاہدہ اور نگرانی فرماتے تھے، جب حضرت شاہ صاحبؒ کی نگرانی وتربیت نے مفتی صاحبؒ کی ایک ایک خوبی کو خوب جانچ پرکھ لیا اور ہر امتحان میں کامیاب پایا تو مفتی صاحبؒ کو اجازت مرحمت فرمائی کہ اب وہ اپنا حلقۂ درس قائم کریں، دینی رہنمائی وفقہ وسنت کے ذریعہ مخلوق کی خدمت فرمائیں۔ مولانا محمد سلیمان لکھتے ہیں:

''(شاہ عبدالعزیزؒ) نقد فضل وکمالِ ایشاں را بر محکِ امتحاں می سودند،

چوں کامل المعیار یافتند وزرِخالص دانستند پس حضرت ایشاں را رخصت فرمودند کہ بطورِ خود سلسلۂ درس و افتاء جاری دارند و فیض تدریس و افتاء بہ خلق اللہ رسانند۔‘‘

ترجمہ: شاہ عبدالعزیزؒ نے ان کے فضل وکمال کی پونجی کو امتحان کی کسوٹی پر پرکھ لیا، جب اعلیٰ معیار کا پایا اور اس کا خالص سونا ہونا واضح ہو گیا تو حضرتؒ نے ان کو رخصت کر دیا کہ اپنے طور سے درس اور فتاویٰ لکھنے کا کام کریں اور اپنے درس وفتاویٰ (کے ذریعہ) سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو فائدہ پہنچائیں۔

ذوقِ سلوک ومعرفت: مفتی صاحبؒ کا جس خانوادہ سے تعلق تھا اس میں عرفان وسلوک اور سفرِ معرفت کی روایت نہایت گہری اور قدیم تھی، کئی نسلوں سے اکابر علماء اور ممتاز مرشدین سے وابستگی و استفادہ کا سلسلہ چلا آرہا تھا، مفتی صاحبؒ اپنی ذاتی خصوصیات، کردار کی پاکیزگی، بے نفسی اور اخلاص وانکسار کی وجہ سے اپنے اُستاذ اور بعد کے دور میں استاذ الکل حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی نگاہوں میں محبوب بنے، مفتی صاحبؒ نے اس عنایت کو اپنے حق میں اکسیر جانا اور شاہ صاحبؒ کی خدمت میں دل وجان سے لگ گئے، شاہ صاحبؒ سے تصوّف کی اعلیٰ ترین کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں، سلوک کے سب مرحلے ایک کے بعد ایک طے کیے، اور جب کئی برس شبانہ روز استاذِ والا شان کی خدمت میں رہ کر رخصت ہوئے تو استاذِ محترم سے علم وتدریس کی اجازت کے علاوہ ارشاد وتربیت کی سند سے بھی مشرف تھے، مفتی صاحبؒ نے اگرچہ پیرومرشد کی ہدایت واجازت کے مطابق ارشاد وتربیت اور بیعت کا سلسلہ جاری کیا، مگر ہمیشہ خود کو

ناچیز اور مزید تربیت ونگرانی کا محتاج خیال کرتے رہے، یہی جذب و بے چینی ملک کے دوسرے خطوں میں لے گئی تھی، چنانچہ ارشاد وسلوک کے مختلف خانوادوں اور متعدد مشائخ سلوک سے ملاقاتیں اور استفادہ بھی ہوا، مگر دل میں جو آگ لگی ہوئی تھی اور قلب جس سکون کا متلاشی تھا وہ متاع کسی دوکان پر دستیاب نہ ہوئی، بالآخر جذبِ دروں نے چھوٹے بھائی کی خدمت میں پہنچا دیا، یہاں سے قادریہ ونقشبندیہ کے طریقۂ تعلیم اورنسبت الی اللہ کی راہ کھلی، مگر ابھی سفر باقی تھا، تڑپ برقرار تھی، جس نے سید احمد شہیدؒ کے دامن سے وابستہ کیا، یہاں سے طریقۂ سنت کے شبنمی قطرے دل پر برسے، اس سے خاص طراوت پیدا ہوئی اور:

''عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا۔''

مفتی صاحبؒ اصلاح وتربیت میں یکتا اور فلسفۂ تصوف، اس کے فنی اسرار ورموز، علمی مباحث کی استاذانہ واقفیت، اس کی تفہیم وتشریح، اس کے مراحل ونکات کی درجہ بندی اور اس کی تعلیم وتلقین میں بھی فردِ فرید تھے، اس میدان میں مفتی صاحبؒ کی راسخ قدمی کا اختتامِ مثنویٔ مولانا رومی سے خوب اندازہ کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ تصوّف اور اس کے مختلف گوشوں پر مفتی صاحبؒ کی متعدد تالیفات یادگار رہیں۔

طب ومعالجات میں خاص دسترس اور غیر معمولی کمال: منقولات ومعقولات میں غیر معمولی مہارت وکمال کے ساتھ ساتھ مفتی صاحبؒ کو طب یونانی پر بھی غیر معمولی دسترس حاصل تھی، مفتی صاحبؒ نے طب کی اکثر کتابیں

اپنے والد ماجد مولانا محمد عرف حکیم شیخ الاسلامؒ سے پڑھی تھیں، چند کتابیں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے روبرو عرض کیں، نیز چند اور کتابیں اور غالباً علمِ طب کا تجربہ دہلی میں حاصل کیا تھا، مفتی صاحبؒ کی بعض تحریروں سے ایسا تأثر ملتا ہے کہ حکیم محمد شریف خان (وفات: ۱۲۱۶ھ) سے تلمیذانہ استفادہ کا تعلق رہا ہے۔

تصانیف: آپؒ کی تصانیف عربی، اردو اور فارسی میں تمام علوم وفنون پر مشتمل ہیں، مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی نے ایک سو پانچ کتابوں کے نام مع تعارف شمار کروائے ہیں، مثلاً تلخیص وحواشی تفسیر مدارک التنزیل، رسالہ اصولِ حدیث، احوالِ علماءِ حنفیہ وغیرہ۔

مگران میں سب سے اہم ''اختتامِ مثنوی'' ہے، جو مثنویٔ مولانا رومیؒ کا تکملہ وتتمہ ہے، جس کا تعارف حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے یوں کروایا ہے: ''مفتی صاحبؒ نے مولانا رومیؒ کی لے میں لے اس طرح ملائی ہے کہ اصل اور تتمہ کا فرق ہی اٹھ گیا۔''

وفات: ۱۴ / جمادی الاخریٰ/ ۱۲۴۵ھ مطابق: ۱۲ / دسمبر/ ۱۸۲۹ء کا دن گزار کر شب میں ایک دوا استعمال کی، جس کے کھاتے ہی بے ہوشی طاری ہوگئی، ایک شب وروز اسی حالت میں گزرے، اِفاقہ کی کوئی صورت نہیں بنی، اسی حال میں اتوار کی شام ۱۵ / جمادی الاخریٰ/ ۱۲۴۵ھ مطابق: ۱۳ / دسمبر/ ۱۸۲۹ء کو مغرب کے وقت جان جاں آفریں کے سپرد فرمائی۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

(حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی/ صفحہ: ۸۳)

حضرت مجاہدِ اسلام سید احمد شہید رائے بریلویؒ متوفی ۱۲۴۶ھ

نام ونسب: نام سید احمد، والد کا نام سید محمد عرفان بن سید عبد النور ہے، آپؒ کا سلسلۂ نسب سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۲۰۱ھ مطابق: ۱۷۸۶ء میں بمقام دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ ضلع رائے بریلی، یوپی میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت: آپؒ چار سال کے ہوئے تو مکتب میں بٹھائے گئے؛ مگر باوجود کوشش کے آپؒ کی طبیعت علم کی طرف راغب نہیں ہوئی اور کتابی علم میں کچھ ترقی نہ کی، آپؒ کو بچپن ہی سے مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں کا بہت شوق تھا۔

سن بلوغ کو پہنچے تو خدمت خلق کا ایسا ذوق پیدا ہوا کہ اچھے اچھے بزرگ انگشت بدنداں رہ گئے، ضعیفوں، اپاہجوں اور بیواؤں کی خدمت کرنے کا جذبہ، اس کے ساتھ ذکر الٰہی کا ذوق بہت بڑھا ہوا تھا۔

شاہ عبدالعزیزؒ سے بیعت واجازت: چار ماہ تلاشِ معاش میں لکھنؤ میں مقیم رہے اور اسی دوران اپنے ساتھیوں کو دہلی چلنے اور شاہ عبدالعزیزؒ سے استفادہ کی ترغیب دِلاتے رہے، پھر خودتن تنہا دہلی کی طرف روانہ ہوگئے، پورا سفر پیادہ پا مسافروں کی خدمت کرتے ہوئے انجام دیا اور کئی روز کے بعد دہلی پہنچے اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت شاہ صاحبؒ کے سید صاحبؒ کے بزرگوں سے قدیم روحانی تعلقات تھے، مصافحہ

ومعانقہ اور تعارف کے بعد بڑی خوشی کا اظہار کیا اور اپنے بھائی شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے پاس ٹھہرایا، کچھ عرصہ ان کی خدمت اور صحبت میں رہ کر مقاماتِ سلوک طے کیے اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے خلافت واجازت لے کر وطن رائے بریلی واپس ہوئے، پھر تقریباً چھ سال کے بعد دوبارہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

علماء و مشائخ کا آپؒ کی طرف رجوع: اس مرتبہ آپؒ کی طرف غیر معمولی رجوع ہوا، اس قیام کے دوران خاندانِ ولی اللہی کے دو ممتاز افراد اور جید عالم مولانا عبدالحیؒ ومولانا شاہ محمد اسماعیلؒ آپؒ سے بیعت ہوئے، ان دونوں کے بیعت ہونے کے بعد عوام وخواص، علماء اور مشائخ کا ایسا رجوع ہوا کہ شاید و باید، ان دونوں حضرات کے بیعت ہونے کا مقصد اس طرح پیش آیا کہ آپؒ کے مرشد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنے خاندان کے عظیم المرتبت علماء وفضلاء کو آپؒ سے بیعت ہونے اور سلوک وارشاد کی تعلیم حاصل کرنے کی تاکید کی، شاہ محمد اسماعیلؒ اور مولانا عبدالحیؒ علم وعمل کی بلندیوں پر فائز تھے اور عمر میں بھی سید صاحبؒ سے بڑے تھے، اس لیے ان دونوں علماء کو آپؒ سے بیعت ہونے میں تامل ہوا، مگر اپنے خاندان کی سب سے بزرگ ہستی کا کہا بھی نہ ٹالا جاسکتا تھا، فیصلہ کیا کہ سید صاحبؒ کی آزمائش کی جائے۔

چنانچہ ایک رات مولانا عبدالحی صاحبؒ نے سید صاحبؒ سے کہا: ''میاں صاحب! مجھے کچھ عنایت کیجیے'' سید صاحبؒ نے کہا: ''کہیے! کیا مانگتے ہیں؟'' مولاناؒ نے کہا: ''جیسی نماز صحابۂ کرامؓ پڑھا کرتے تھے ویسی نماز ہم سے ادا ہو''

سید صاحبؒ یہ سن کر چپ ہو گئے، تو مولاناؒ نے دل میں سمجھا کہ شاید بزرگی کا دعویٰ خام تھا، مولاناؒ خود لکھتے ہیں: ''اُسی رات سید صاحبؒ نے آواز دی: ''مولانا!'' مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی اور حضرتؒ نے فرمایا: ''جایئے اور اللہ کے لیے وضو کیجیے'' یہ الفاظ کچھ اس طرح ادا کیے کہ ایک بار پھر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، چند قدم چلا تھا کہ پھر آواز دی: ''مولانا! سن لیں'' میں واپس آیا، فرمایا: ''آپ نے اچھی طرح جان لیا نا؟'' میں نے کہا: ''کیا؟'' کہا: ''اللہ کے لیے وضو کریں'' میں نے عرض کیا: ''بہت خوب'' تیسری بار پھر یہی واقعہ گزرا، الغرض میں نے حق تعالیٰ سبحانہ کے خوف سے اس روز ایسا وضو کیا جیسا کبھی نہیں کیا تھا، واپس آیا تو فرمایا: ''اب جایئے اور اللہ کے واسطے دو رکعات نماز پڑھیے'' اسی طرح مکرّر تین بار تاکید کی، اس کے بعد ایک گوشہ میں نماز شروع کی، تکبیر تحریمہ کے ساتھ ہی ایسا مشاہدۂ جلال میں غرق ہوا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا، نہایت خوف ولذّت سے نماز ادا کی، دو رکعات پڑھ چکا تو خیال آیا کہ کوئی واجب چھوٹ گیا، دوبارہ دو رکعات ادا کیں، سو رکعات تک پڑھنے پر بھی اطمینان نہ ہوا تو خود کو ملامت کرنے لگا کہ تم سے دو رکعات نماز ادا تو ہوتی نہیں اور آزمائش کرتے ہو ایسے کامل شخص کی، اسی طرح شرم میں ڈوبا ہوا تھا اور ''استغفر اللہ، استغفر اللہ'' کہہ رہا تھا کہ اذان ہوگئی، تو اس سے دل کو یقین ہو گیا کہ جو نعمت مدتِ دراز کی محنت سے نصیب نہ ہوئی تھی وہ مرشد کامل کی توجہ سے حاصل ہوگئی، پھر میں مسجد کے اندر گیا اور فجر کی نماز سے پہلے پہلے حضرت میاں صاحب سے بیعت ہو گیا۔''

اصلاحی وتبلیغی دورے: اس کے بعد آپؒ نے مولانا عبدالحیؒ اور شاہ محمد اسماعیلؒ

کے ہمراہ مختلف علاقوں کے اصلاحی و تبلیغی دورے کیے، جن میں لاتعداد بندگانِ خدا نے آپؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی، مولانا کرامت علی صاحبؒ نے اپنے رسالہ ''مکاشفاتِ رحمت'' میں ان لوگوں کی کیفیت بیان کی ہے جو آپؒ سے بیعت ہوتے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ جو شخص ان سے بیعت ہونے کا ارادہ کرتا ہے وہ پہلے ہی بت پرستی، شرک و بدعت، ڈھول باجے اور ناچ تماشے چھوڑنے پر مضبوط ہو لیتا ہے، پس حقیقت میں حضرت سید صاحبؒ کے طریقے میں داخل ہونا اس ملک ہند میں اسلام کی نشانی ہے۔

آپؒ کی رفعت و منقبت پر شہادتیں: غرض ان افادات اور دینی خدمات کو دیکھ کر علماءِ اعلام نے آپؒ کے کمال اور علوِ شان بلکہ منصب تجدید کا اعتراف کیا ہے اور آپؒ کو ''آیۃ من آیات اللّٰہ'' تحریر فرمایا ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا کرامت علی صاحب جونپوریؒ لکھتے ہیں: ''اس امت مرحومہ کے واسطے حضرت قطب الاقطاب امیر المومنین سید احمد شہیدؒ کو اس تیرہویں صدی کا مجدد پیدا کیا اور اس جنابؒ نے دین کو تازہ اور نیا کر دیا، غافلوں کو ہوشیار کر دیا اور دین کے علم کو خوب پھیلایا۔''

مولانا حیدر علی رامپوریؒ ''صیانۃ الناس'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''ان کی ہدایت کا نور آفتاب کی مثل کمالِ زور و شور کے ساتھ بلاد اور قلوبِ عباد میں منوّر ہوا۔

مولوی عبدالاحد صاحبؒ لکھتے ہیں: ''حضرت سید صاحبؒ کے ہاتھ پر چالیس ہزار سے زیادہ ہندو وغیرہ کفار مسلمان ہوئے اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور یہ سلسلۂ بیعت آپؒ کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء کے ذریعہ تمام روئے زمین پر جاری ہے۔

حضرت نواب صدیق حسن خان صاحبؒ ''تقصار جیود الاحرار'' میں سید صاحبؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''خلق اللہ کی رہنمائی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے میں وہ اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی تھے، ایک بڑی خلقت اور ایک دنیا آپؒ کی قلبی وروحانی توجہ سے ولایت کو پہنچی، خلاصہ یہ کہ اس زمانہ میں دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا صاحب کمال سنا نہیں گیا، اور جو فیوض اس گروہِ حق سے خلق خدا کو پہنچے ان کا عشر عشیر بھی اس زمانہ کے علماء ومشائخ سے نہیں پہنچے۔

(سیرتِ سید احمد شہیدؒ: ۲/۵۳۱)

ارشادات: ''اداءِ طاعات کا مقصد نفس کا سنورنا ہے۔'' چنانچہ ''صراطِ مستقیم'' میں اداءِ طاعات کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

''تہذیب اخلاق اور اداءِ طاعت سے اصلی مقصود تو نفس کا سنوارنا اور اصلاح کرنا ہے، تاکہ وہ مطمئن ہو جائے اور بدعات سے پاک ہو جائے۔ اور بری عادتوں سے نفس کا پاک ہونا ہی نیک عادتوں کے ساتھ اس کا موصوف ہونا ہے، عام اہل سلوک جو اس کو نفس کشی سے تعبیر کرتے ہیں محض خطا ہے، کیوں کہ نہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نفس کو مار ڈالنے کا حکم ہے اور نہ زندگی کے باوجود اس کا کرنا ممکن ہے، اور جو ممکن ہے اس کی بجا آوری کا حکم ہے، یعنی نفس کی اصلاح کر کے اسے احکامِ شرعیہ کا مطیع کیا جائے، جیسے جاہل آدمی کو عالم بنا دیا جائے، پس اس کو مار ڈالنے کی تعبیر کرنا غلط ہے۔''

''اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور پیار کا دعویٰ ہر شخص کرتا ہے، لیکن اس کی حقیقت کم یاب بلکہ نایاب ہے، محبت واُلفت کی حقیقت تو یہ ہے کہ محب کے

ایمان، اعمال، علم اور عقائد کے ہر باب میں کمال اور گناہوں سے پرہیز ہونے کے باوجود اگر اس کو ایسی مصیبتیں اور بلائیں پہنچیں کہ اس کی جان و مال، اولاد، عزت و آبرو کو گھیر لیں اور وہ نہایت ہی سخت آزار میں گرفتار ہو جائے، تو شکایت کی بات ذرا بھی اس کے دل میں نہ گھسے، ہاں، ان مصیبتوں کے عدمِ برداشت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کے نہایت اعتقاد کے باعث اس کی بارگاہ میں جس قدر کہ التجا وزاری، عاجزی و بے قراری کرے تو بجا ہوگا۔''

ف: ما شاء اللہ! حضرت سید صاحبؒ نے صدقِ محبت کی بالکل صحیح علامت بیان فرمائی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی صحیح محبت و معرفت سے نوازے۔ (مرتب)

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''بخل، حسد، تکبر، غیبت، حرام، کینہ، ریا، کذب، طمع اور حرص جیسی بری عادتوں کے ساتھ سالکانِ راہِ حق کے نفوس کا آلودہ ہو جانا ان پر رحمانی فیوض کے اُترنے اور اللہ تعالیٰ کی عنایات کے وارد ہونے کا قوی مانع ہے، سلف صالحین ان رذائل کا تزکیہ نہایت ہی ضروری جانتے تھے اور ان کو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے واسطے اپنے دل سے دور کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہتا اور ان کا دل صاف ہو جاتا، اس لیے بے نہایت مہربانیوں کے مورِد ہوا کرتے اور اسی تصفیہ کی وجہ سے جو محض اللہ تعالیٰ کے خوش کرنے کے واسطے فرماتے عند اللہ مقبول ہو جاتے۔ اور جو شخص کہ سلوک کے مراتب طے کرنے کے باوجود آثارِ عنایات کا مورِد نہ بنے تو بے شک ان تمام رذائل یا بعض کے آثار اس میں موجود ہوں گے، پس ان رذائل کا وجود عنایاتِ الٰہی کے ورود کے لیے مانع ہے۔''

ف: پس فیض رحمانی کے نزول کا سبب قلب کا رذائل سے پاک وصاف ہونا ہے، پس جب یہ نہ ہوگا تو وہ قلب باوجود ذکر وشغل کے عنایت الٰہی کا موردِ نہیں ہو سکتا، جیسا کہ جسمانی مریض دوا سے بغیر پرہیز کے صحت مند نہیں ہوتا۔ (مرتب)

ایک مرتبہ اپنے مریدوں کو راہِ جہاد میں نکالنے سے پہلے فرمایا: ''علمِ سلوک جہاد کا تابع ہے، اگر کوئی تمام دِن روزہ رکھے، تمام رات زہد وریاضت میں بسر کرے، یہاں تک کہ نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں پر ورم آجائے، اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے دن یا رات کی ایک گھڑی نیند میں کاٹ دے، تا کہ کفار کے مقابلہ میں بندوق اُٹھاتے وقت آنکھ نہ جھپکے، تو وہ عابد اس مجاہد کے مرتبہ کو کسی طور پر نہیں پہنچ سکتا۔''

سفر جہاد کے دوران ایک مرتبہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے پچھلے دور کے سلوک وطریقت کی ریاضتوں اور خوش گوار یادوں کو تازہ کرنا چاہا تو سید صاحبؒ نے فرمایا: ''وہ منزل پیچھے رہ گئی، اب ہمیں کفار کے ساتھ جہاد کا حکم دیا گیا ہے، جو سب سے بلند پایہ ہے، یہ انبیاءِ اولوالعزم کا طریقہ اور اُسوہ ہے۔'' **والحمدللہ علی ذٰلک۔**

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ''سیرتِ سید احمد شہیدؒ'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''بیعت کے وقت آپؒ کی سب سے بڑی تاکید اور آپؒ کے طریق کی سب سے مقدم اور سب سے اہم دفعہ یہی تھی کہ شرک وبدعت سے پوری طرح احتراز کیا جائے گا اور توحید وسنت پر استقامت کی جائے گی، آپؒ کے نزدیک یہی طریقت کا مقصود اور یہی شریعت کی بنیاد تھی۔'' ایک اجازت نامہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

''معلوم ہونا چاہیے کہ بیعت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک بیعت طریقت،

دوسری بیعت امامت، بیعت طریقت کا مقصود تو صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رضامندی کا راستہ ہاتھ آجائے۔ اور حق تعالیٰ کی رضامندی منحصر ہے شریعت کی پیروی میں، جو شخص شریعت محمدی کے سوا کسی اور راستے کو حصولِ رضاءِ خداوندی کا ذریعہ سمجھتا ہے وہ شخص جھوٹا اور گمراہ ہے، اس کا دعویٰ باطل اور نامسموع۔

شریعت کی بنیاد دو باتوں پر ہے: ایک ترکِ اشراک، دوسرے ترکِ بدعات۔

ترکِ اشراک کی تفصیل یہ ہے کہ فرشتوں، جنات، پیر و مرید، استاذ وشاگرد، نبی وولی میں سے کسی کو مشکل کشا، دافع بلا اور منافع کے حاصل کرانے پر قادر نہ سمجھے، سب کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور علم کے سامنے اپنی طرح عاجز و نادان سمجھے اور اپنی ضرورتوں کی طلب میں انبیاء، اولیاء، صلحاء اور ملائکہ میں سے ہرگز کسی کی نذر و نیاز نہ کرے، ہاں، یہ ضرور عقیدہ رکھے کہ وہ مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہیں، ان کی مقبولیت کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کی پیروی کی جائے اور ان کو اپنا پیشوا سمجھا جائے، نہ یہ کہ ان کو اس عالم میں متصرف اور ظاہر و باطن کا عالم سمجھا جائے، یہ محض کفر و شرک ہے، مومن کا اس سے آلودہ ہونا کسی طرح درست نہیں۔

ترکِ بدعات کی تفصیل یہ ہے کہ تمام عبادات، معاملات اور امورِ معاش ومعاد میں خاتم الانبیاء جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طریقے کو پوری قوت اور بلند ہمتی سے پکڑنا چاہیے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد لوگوں نے جو بہت سی رسمیں ایجاد کر لی ہیں مثلاً رسومِ شادی و ماتم، قبروں کی زینت و آرائش، ان پر عمارتیں بنوانا، شادی کی تقریبات کی فضول خرچی و اسراف، تعزیہ سازی وغیرہ، ہرگز ان کو اختیار

نہ کیا جائے اور حتی الامکان ان کے اِزالہ کی کوشش کی جائے، اولاً خود ان کو ترک کیا جائے، پھر ہر مسلمان کو ان سے اجتناب کی دعوت دی جائے، جس طرح اتباعِ شریعت فرض ہے اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی فرض ہے۔"

(سیرتِ سید احمد شہیدؒ: ۲/ ۵۳۳)

ف: سبحان اللہ! بیعتِ طریقت کی کیسی عمدہ تشریح فرمائی جو مستحضر رکھنے کے قابل ہے، خصوصاً مریدین و مشائخ کے لیے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے مطابق بیعت ہونے اور بیعت کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین۔ (مرتب)

شہادت: ہندوستان پر غیروں کے تسلط، مسلمانوں کی آپسی خانہ جنگی اور زبوں حالی نے آپؒ کو بے چین کر دیا تھا، آپؒ کے نزدیک اعلاءِ کلمۃ اللہ کی ضرورت ہر غیور اور فرض شناس انسان سے جہاد کا مطالبہ کر رہی تھی اور آپؒ شروع ہی سے اپنی جماعت کو اس کارِ عظیم کے لیے تیار کر رہے تھے، آخر کار ۷/ جمادی الاولیٰ/ ۱۲۴۱ھ میں آپؒ نے وطن کو خدا حافظ کہا اور مختلف علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے نوشہرہ میں قیام کیا اور وہیں سکھوں سے پہلا معرکہ پیش آیا، پھر آپؒ پیشاور فتح کرنے کے بعد وہاں کے بے وفا لوگوں سے دل برداشتہ ہو کر ۱۷/ اپریل/ ۱۸۳۱ء مطابق: ۱۲۴۶ء کو کوچ کر کے بالاکوٹ پہنچے اور اسی میدان میں وہ آخری معرکہ پیش آیا جس میں تین سو سے زائد مجاہدین شہید ہوئے، بالاکوٹ کی سرزمین پر ان مبارک انسانوں کا وہ مبارک سفر تمام ہوا جس کی ابتدا سید صاحبؒ نے جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ کی صبح کو اپنے غازیوں کے ساتھ اپنے وطن رائے بریلی سے کی تھی، وہ ۲۴/ ذوالقعدہ/ ۱۲۴۶ھ کو مقصود کو پہنچا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃً۔ (سیرتِ سید احمد شہیدؒ)

حضرت شاہ حاجی عبدالرحیم ولایتی شہید رحمہ اللہ متوفی ۱۲۴۶ھ

فضل وکمال: یہ سلسلۂ چشتیہ کے مشہور شیخ ہیں، آپ رحمہ اللہ سادات افغانستان سے ہیں، فطری استعداد وصلاحیت اور محبوبِ حقیقی کی طلب وارادت میں اپنے وطن سے ہندوستان آئے، اولاً ہندوستان کے درویش کامل شاہ رحم علی صاحب رحمہ اللہ سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے اور نسبت مع اللہ حاصل کی، ان کی وفات کے بعد نسبت عشقیہ چشتیہ کی تحصیل کے لیے شاہ عبدالباری امروہوی کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے سلسلۂ بیعت قائم فرمایا، تاہم سیری نہ ہوئی، اس لیے کہ طالب صادق کا تو یہ حال ہوتا ہے:

دل آرام در بر دل آرام جو　　لب از تشنگی خشک بر طرف جو

ترجمہ: معشوق کے بغل میں رہتے ہوئے بھی عاشق معشوق کے لیے بے قرار رہتا ہے، جیسے کہ مستسقی کا ہونٹ دریا کے کنارے بھی پیاس کی وجہ سے خشک رہتا ہے۔

بیعت واجازت: غرض آپ رحمہ اللہ غایت شوق وتڑپ میں مجدد الملۃ حضرت سید احمد شہید بریلوی، نقشبندی رحمہ اللہ سے بیعت جہاد مع بیعت طریقت کئے ہوئے تھے، جیسا کہ ''انوار العارفین'' مؤلفہ محمد حسین مرادآبادی میں ہے: ''بیعت جہاد با طریقت باجنابِ سید احمد صاحب رحمہ اللہ کردہ اند۔''

ف: یعنی بیعت جہاد مع بیعت طریقت حضرت سید احمد بریلوی رحمہ اللہ سے فرمائی۔ (مرتب)

ادھر حضرت سید صاحب رحمہ اللہ نے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کی بے حد قدردانی

فرمائی اور اجازت وخلافت سے مشرف فرمایا۔ ''امیر الروایات'' میں ہے کہ سید احمد صاحب بریلویؒ جب سہارن پور تشریف لائے تو حضرت حاجی صاحبؒ بھی حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ مجھے اجازت مرحمت فرمائیں، میں ذکر، شغل حضراتِ قادریہ کے کر چکا ہوں، سید صاحبؒ نے فرمایا: ''جب تک ہم سے بیعت نہ ہوں گے ہم تمہیں اجازت نہ دیں گے۔'' بموجبِ ارشادِ سید صاحبؒ آخر بیعت ہوئے اور حضرت سید صاحبؒ نے آپؒ کو خلیفہ ومجاز فرمایا۔''

''تذکرۃ الرشید'' مصنفہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب ولایتی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے دونوں شیخ مولانا شاہ رحم علی صاحب قادریؒ اور شاہ عبدالباری امروہوی چشتیؒ سے خلافت نہ ملی تھی، اخیر میں جب حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی، نقشبندیؒ سے بیعت ہوئے تو انہوں نے خلافت سے نوازا، تاہم ان سے خاص طور سے سلسلۂ چشتیہ ہی جاری ہوا اور سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے شجرۂ طیبہ میں آپؒ کا اسمِ گرامی حضرت میاں جی نور محمدؒ کے شیخ ہونے کی وجہ سے ان کے بعد آتا ہے۔ (تذکرۃ الرشید)

حضرت حاجی صاحب شہیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''سید صاحبؒ میں انوارِ شریعت بہت زیادہ ہیں۔'' جب دونوں حضرات مراقب ہوتے تھے تو حضرت حاجی صاحب شہیدؒ ہنستے تھے اور حضرت سید صاحبؒ خاموش رہتے تھے۔

نیز ''امیر الروایات'' ہی میں ہے کہ ''خان صاحبؒ نے فرمایا کہ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ فرماتے تھے کہ ''شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی رحمۃ اللہ علیہ سے جو لوگ ان کے سید صاحبؒ سے بیعت ہونے کے بعد بیعت ہوئے ان کی

حالت نہایت اچھی تھی اور ان پر اتباعِ سنت نہایت غالب تھا۔ اور جو لوگ سید صاحبؒ کی بیعت سے پہلے بیعت ہوئے تھے ان کی حالت اس درجہ کی نہ تھی۔‘‘

ف: سبحان اللہ، شیخ کے متبع سنت ہونے کا کس قدر اثر و کیف مریدین پر پڑتا ہے، جو عیاں ہے، لہٰذا ہر شیخ کو سنت کا اہتمام کرنا چاہیے، تاکہ مریدین کے اندر اتباعِ سنت کا جذبہ پیدا ہو، اس طرح متبعین سنت کی ایک جماعت تیار ہو جائے، عالم سنت کے نور سے منوّر ہو۔ واللہ الموفق والمعین۔ (مرتب)۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ’’سیرتِ سید احمد شہیدؒ ‘‘ میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب ولایتی رحمہ اللہ بایں جلالت قدر و کمالِ روحانی فرماتے ہیں:

’’جب مجھ کو حضرتؒ سے بیعت نہ تھی اور اپنے مشائخ کے طور وطریق پر تھا، چلہ کشی کرتا تھا، جو کی روٹی کھاتا تھا، موٹے کپڑے پہنتا تھا، میرے صدہا مرید تھے، اور جو درویشی کا طالب میرے پاس آتا اس کو تعلیم کرتا تھا اور کسی سے کچھ غرض نہیں رکھتا تھا، جو کوئی اپنے مطلب کے لیے دو چار کوس یا دو ایک منزل لے جانے کی درخواست کرتا للہ فی اللہ چلا جاتا تھا اور میری نسبت کا یہ طور تھا کہ اگر آدھ کوس یا کوس بھر سے کسی پر توجہ کی نظر ڈالتا تھا تو اسی جگہ اس کو حال آجاتا اور بعض بعض باتیں مجھ میں اس سے بڑھ کر تھیں اور میں اپنے اس حال میں بہت خوش تھا اور میرے مریدوں میں بعض بعض صاحب تاثیر تھے، باوجود ان سب باتوں کے جب اللہ تعالیٰ نے سید صاحبؒ کو سہارن پور پہنچایا اور مجھ سے ملایا اور مجھ کو توفیق دی کہ میں نے آپؒ کے دست مبارک پر بیعت کی اور ان کا طریقہ

دیکھا، اس وقت اپنے نزدیک مجھ کو یہ خیال ہوا کہ اگر میں اس حالت میں مرجاتا تو میری موت بری ہوتی، پھر میں نے اپنے سب مریدوں سے کہا کہ اگر تم اپنی عاقبت بخیر چاہتے ہو تو اب دوسری مرتبہ ان سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کرو اور جو نہ کرے گا وہ جانے، میں نے آگاہ کر دیا ہے، اس کا مواخذہ قیامت کے روز مجھ سے نہیں ہوگا، پھر دوبارہ سب نے بیعت کی، سو میں نے عیش و آرام اور ناموس و نام کو ترک کر کے سید صاحبؒ کے یہاں محنت، مشقت، تنگی اور کلفت اختیار کی، اینٹیں بھی بناتا ہوں، دیوار بھی اُٹھاتا ہوں، گھاس بھی چھیلتا ہوں، لکڑی بھی چیرتا ہوں اور ہر طرح کے کام کرتا ہوں، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کاروبار کی بدولت جو نعمت دی اور خیر و برکت عطا کی اس کے دسویں حصے کے برابر ان معاملات (سابقہ) کی تمام خیر و برکت کو نہیں پاتا ہوں، اگر ایسا نہ ہوتا تو اس راحت کو چھوڑ کر یہ محنت کیوں اختیار کی۔'' (سیرتِ سید احمد شہیدؒ: ۲/ ۵۵۲)

نیز حضرت حاجی صاحبؒ سے کسی نے کہا کہ ''آپ تو بڑے باکمال آدمی ہیں اور کمالِ باطن میں سید صاحبؒ سے گھٹے ہوئے نہیں؛ بلکہ بڑھے ہوئے ہیں، پھر آپ سید صاحبؒ پر اس درجہ کیوں مٹ گئے؟ کہ آپ بھی مرید ہو گئے اور اپنے مریدوں کو بھی ان کا مرید کرایا؟'' اس کے جواب میں حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ ''یہ سب کچھ ہے، مگر ہم کو نماز پڑھنی اور روزہ رکھنا نہ آتا تھا، سید صاحبؒ کی برکت سے نماز پڑھنی بھی آگئی اور روزہ رکھنا بھی آگیا۔''

ف: سبحان اللہ! حضرت حاجی صاحبؒ کے اندر کیسی للّٰہیت اور کس قدر فنائیت تھی کہ اپنے کمالات کی بالکل نفی فرمادی اور حضرت سید صاحبؒ کے اوصاف

وکمالات کا اپنے مریدین تک کے سامنے اعتراف فرمایا؛ بلکہ علی رؤوس الاشہاد اس کا اظہار واعلان فرمایا اوراس میں ذرا بھی تکلف وتوقف نہ فرمایا، گویا آپؒ پر عارفِ رومیؒ کے اس شعر کی حقیقت بالکل عیاں تھی: ؎

آئینہ ہستی، چہ باشد نیستی نیستی بگزیں، گر ابلہ نیستی

یعنی فنا ونیستی اختیار کرنے کے بعد ہی کمال حاصل ہوتا ہے، اس لیے عقلمند آدمی کو اسے اختیار کرنا چاہیے، آدمی کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ باوجود صاحب کمالات ہونے کے ان کمالات پر از راہِ فخر وعجب نظر نہ کرے، اللہ تعالیٰ کو یہ صفت وخصلت بے حد پسندیدہ ہے، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَهُ اللّٰہُ۔“ جو اللہ کے لیے تواضع وانکسار اختیار کرتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ عظمت و رفعت سے نوازتے ہیں، اسی کے حصول کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہِ رب العزت میں یہ مناجات فرمائی: ”اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا، وَ فِیْ أَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا۔“ یعنی اے اللہ! مجھے اپنی آنکھوں میں چھوٹا کر کے دِکھائیں مگر اوروں کی نظر میں عظیم اور بڑا رکھئے۔ اس کے برعکس یہ حالت تو نہایت ہی بری ہے کہ اپنے اندر تو ذرا بھی فضل وکمال نہ رکھتا ہو؛ مگر اپنے متعلق فضل وکمال کا گمان واعتقاد رکھتا ہو۔

اسی کو حضرت مصلح الدین شیرازیؒ یوں فرماتے ہیں:

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے خواجہ را حاصل بجز پندار نیست

یعنی شیخ تو اپنے متعلق یہ گمان کیے بیٹھا ہے کہ مجھے سب کچھ حاصل ہے، مگر افسوس کہ اس کو سوائے غرور وپندار کے کچھ بھی حاصل نہیں۔

اور اس سے بھی بری خصلت تو یہ ہے کہ اس لاحاصلی کے باوجود دوسروں

پر تفوق و ترفع کا اظہار کرے اور ان سے حمد و ستائش کی بھی توقع رکھے، حالاں کہ یہ منافقین یہود کی خصلت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: {وَ يُحِبُّوْنَ أَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا} یعنی جو نیک کام نہیں کیا اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو۔ (سورۂ آل عمران: ۴/ رکوع: ۱۰)

غرض حاجی عبد الرحیم صاحبؒ کی غایت طلبگاری اور نہایت انکساری کا کرشمہ تھا کہ آپؒ اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے وطن مالوف افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لائے اور متعدد مشائخ سے یکے بعد دیگرے بیعت ہوئے اور اس سلسلہ میں اپنے سابق سلسلۂ بیعت و ارادت اور خانوادۂ سلوک وطریقت کی بھی پروا نہ کی، بلکہ اس دولت کی بو جس کوچہ سے بھی آئی وہاں سیر کی اور اس دولت گراں مایہ کو حاصل کیا، اس لیے کہ ان کا مقصودِ اصلی نسبت احسان کی تکمیل اور رضاءِ رحمن کی تحصیل تھی، نہ کہ کچھ اور، جس کی نصیحت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ سالکین کو یوں فرما رہے ہیں:

’’ہر کہ ہوسِ ایں راہ دارد و تخم	جو شخص طریق میں داخل ہونے کی ہوس
ایں اندیشہ در دل می کارد، باید	رکھے اور طلب خدا کے خیال کا بیج اپنے دِل
کہ ہمہ چیز را گذاشتہ صحبت ایں	میں بونا چاہے تو اس کو لازم ہے کہ تمام
اکابر اختیار نماید و جاں نثارِ	چیزوں کو ترک کر کے مشائخ طریق کی صحبت
لوازمِ طلبگاری کند و از ہر جا	اختیار کرے اور لوازمِ طلب کے آگے اپنی
بوئے ازیں دولت بمشام جاں	جان نثار کر دے اور جس جگہ سے بھی اس
برسد از پئے آں شود۔‘‘	دولت کی خوش بو اس کے مشامِ جان میں

پہنچے اس کی تحصیل کے درپے ہوجائے۔

خوش گفت: کسی نے خوب کہا ہے:

''بعد ازیں مصلحتِ کار دراں	''اس کے بعد مصلحتِ کار اسی میں سمجھتا
می بینم کہ رَوم بر درِ میخانہ وخوش	ہوں کہ مے خانہ کے دروازے پر جا
بنشینم۔''	پڑوں اور خوشی خوشی وہیں ایام گزاروں۔''

آپؒ کا فیضِ روحانی: چنانچہ حاجی عبدالرحیم صاحب شہیدؒ نے ایسی ہی طلب کا مظاہرہ فرمایا اور نسبت قویہ حاصل کی، جس کا ثمرہ وکرشمہ یہ ہوا کہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ جیسے باکمال بزرگ آپؒ کے مجاز وخلیفہ ہوئے اوران سے حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ نے نور وفیض اس قدر اخذ فرمایا کہ شیخ العرب والعجم کے لقب سے ملقب ومشہور ہوئے اور آپؒ کے حلقۂ ارادت میں اس دور کے علماء وفضلاء کی ایک جماعت داخل ہوئی، مثلاً حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا محمد حسین الہ آبادیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کا اِرشاد: حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کے متعلق مرشدی حضرت مولانا محمد احمد صاحب قدس سرہٗ نہایت پرلطف پیرایہ میں گاہے گاہے فرماتے تھے کہ دیکھئے! نمک کا مزہ کچھ اور ہے اور مرچ کا مزہ کچھ اور، مگران دونوں کو باہم ملا دیجیے تو اس کا مزہ کچھ اور ہی ہوجاتا ہے، اسی طرح حضرت حاجی عبدالرحیم صاحبؒ حضرت

سید احمد رائے بریلویؒ سے بیعت ہوئے تو پھر نسبت چشتیہ اور نسبت نقشبندیہ کی آمیزش سے ایک عجیب نسبت نمودار ہوئی، جس کا رنگ و مزہ کچھ اور ہی ہے، الحمدللہ! کہ اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

اِجازت نامہ: حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب شہیدؒ نے اِجازت نامہ جو بزبانِ فارسی حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کو لکھا ہے اس کا ترجمہ اردو ''سیرتِ سید احمد شہیدؒ '' سے نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، بغور مطالعہ فرمائیں، ان شاءاللہ مفید پائیں گے، وہ اجازت نامہ یہ ہے:

''مہربانِ مخلصان میاں جی نور محمد صاحب! بعد سلامِ مسنون کے معلوم ہو کہ ضروری مدّعا یہ ہے کہ آپ کو (بیعت لینے کی) اجازت ہے، جو آپ سے بیعت کا ارادہ کرے آپ پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ طالبین کو بیعت وتلقین فرمائیں، اس معاملہ میں ہرگز تکلف سے کام نہ لیں اور کسی مخالف وسوسے اور خطرے کو دل میں جگہ نہ دیں۔

اہم مقصود و مطلوب یہ ہے کہ انسان خود بذاتہٖ شریعت پر ثابت قدم ظاہراً و باطناً ہر وقت رہے اور ہر طرح کے شرک و بدعت سے پاک رہے، اسی طرح سے دوسرے مومنین مخلصین کی ہدایت اس کے پیشِ نظر رہے۔ زیادہ خیریت، والسلام۔

یاد رہے کہ شرک فقط یہی نہیں ہے کہ غیر اللہ کو خدا کہے، شرک کی کئی قسمیں ہیں: (۱) شرک فی العبادۃ، وہ یہ ہے کہ جو افعال اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لیے مقرر کیے گئے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے بجا لاوے، جیسے: سجدہ۔ (۲) شرک فی العلم، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو عالم الغیب سمجھے، جیسے

کہ اس زمانہ کے جہلاء سمجھتے ہیں، مثلاً ہم جو کچھ کہتے ہیں ہمارا پیر سنتا ہے۔
(۳) شرک فی القدرۃ، وہ یہ ہے کہ دوسرے کے لیے اللہ تعالیٰ کی سی قدرت ثابت کرے، مثلاً یوں کہے کہ میرا یہ لڑکا فلاں پیر کا عطا کیا ہوا ہے، یا میری روزی فلاں پیر دیتا ہے۔

اور بدعت یہ ہے کہ اس شریعت میں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے اس میں کچھ کمی زیادتی کرے، چنانچہ رکعت میں ایک رکوع اور سجدے دو مشروع ہیں، کوئی تین کر دے اور سمجھے کہ زیادتی عبادت ہے، یا کمی کرے، چنانچہ ایک رکوع اور ایک سجدہ کرے اور کہے کہ میں نے عبادت کی ہے، یہ دونوں شرع کے نزدیک مردود ہیں، فقط۔"

ف: سبحان اللہ کس قدر جامع اجازت نامہ ہے کہ پہلے اتباعِ شریعت کی کامل متابعت اور شرک و بدعت سے غایت درجہ اجتناب کی تاکید فرمائی، پھر دوسروں کو اس کی تعلیم کی تلقین فرمائی، نیز شرک کی قسموں کی بھی عمدہ توضیح فرمائی، جو پیش نظر رکھنے کے لائق ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ (مرتب)

وفات: ۲۷/ ذوالقعدہ/ ۱۲۴۶ھ کو اپنے مرشد حضرت سید احمد صاحب نقشبندیؒ کے ساتھ سکھوں سے جہاد فرماتے ہوئے آپؒ نے جامِ شہادت نوش فرمایا اور حیاتِ جاودانی سے شادکام ہوئے۔

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوٰتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا

تَشْعُرُوْنَ}(البقرة:۱۵۴-۱۴۴)

اور جولوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولی مُردوں کی طرح) مُردے ہیں؛ بلکہ وہ تو زندہ ہیں، لیکن تم (ان) حواس سے (اس حیات کا) ادراک نہیں کرسکتے۔ ع

کشتگانِ خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

یعنی عشاقِ الٰہی کو ہر آن مسلسل جان ملتی رہتی ہے، جس سے وہ سرمست رہتے ہیں اور دنیا ومتاعِ دنیا کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ **فهنيأ لهم**۔ (مرتب)۔

حضرت مولانا سید قطب علی نقوی بستویؒ متوفی ۱۲۴۷ھ

مکرم جناب قطب علی صاحبؒ کا نسبی تعلق حسینی سادات کی اس شاخ وخانوادے سے ہے جو ''نقوی'' نسبت سے معروف ہے، اور جو حضرت جعفر صادقؒ کے پرپوتے جناب محمد نقی کی طرف منسوب ہے، جن کو شیعہ حضرات دسواں امام قرار دیتے ہیں، آپؒ ان کی اولاد سے ہیں۔

ہندوستان میں آپؒ کے مورثِ اعلیٰ کی آمد: ہندوستان میں اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ یعنی اولین بزرگ جو کہ کرمان سے ہندوستان تشریف لائے وہ شاہ جلال الدین کرمانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ شاہ صاحب موصوفؒ کی تشریف آوری آٹھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں ہوئی، تشریف آوری کے سن کی تعیین نہیں مل سکی، البتہ ایک اندازہ چھٹی دہائی کے آغاز یعنی ۷۵۰ھ کے بعد متصلاً کا ہے۔

عہدِ فیروز شاہی کے مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں جلال الدین کرمانی کا بڑے اہتمام کے ساتھ اور وقیع الفاظ میں تذکرہ کیا ہے، فیروز شاہی عہد کے حالات کے تذکرہ میں بالکل ابتدا میں برنی نے فیروزی عہد کے عمائد وشاہزادگان وغیرہ خواص کی ایک فہرست دی ہے، ان میں سرفہرست جلال الدین کرمانی کا ذکر کیا ہے۔

جائے قیام: شاہ جلال الدین کرمانی نے اپنے قیام کے لیے دہلی اور اس

کے نواح کے ایک مقام ''نارنول'' کا انتخاب کیا، ان کے بعد ان کی اولاد نے بھی عرصہ تک یا تقسیم ملک تک اس کو اپنا وطن بنائے رکھا، گیارہویں صدی ہجری میں پورا خاندان یا ایک حصہ اجودھیا منتقل ہو گیا، اور جو لوگ نارنول رہ گئے تھے اگر واقعی کچھ لوگ تھے تو وہ ۱۹۴۷ء کے حالات کا شکار ہو گئے، یا یہ کہ پاکستان کے کسی حصہ میں چلے گئے، کچھ نہیں کہا جا سکتا، بالخصوص اس لیے کہ اجودھیا کی سکونت اختیار کرنے کے بعد نارنول سے کسی ربط و تعلق کا پتہ نہیں چلتا، جیسے کہ بستی آنے پر چند پشتوں کے بعد اجودھیا سے ربط و تعلق نہیں رہ گیا۔

جائے قیام کی حیثیت سے نارنول ہی کا نام و تذکرہ معروف ہے، اور خاندانی روایات اور تحریروں کی رو سے تواتر کو پہنچا ہوا ہے۔

نارنول اور سہنہ: یہ دونوں بستیاں دہلی سے ہریانہ کی جانب واقع ہیں، اور اب ہریانہ میں شامل ہیں، شہر سے انٹرنیشنل ائیرپورٹ کو جانے والی سڑک سہنہ ہوتی ہوئی گڑگاؤں ہو کر نارنول جاتی ہے، سہنہ ائیرپورٹ سے قریب ہے۔

منصبِ قضا و عہدۂ صدر الصدور: برنی کی تحریر کے مطابق جلال الدین کرمانیؒ کے علوِ نسب اور اس کے ساتھ ان کے علم و فضل کی وجہ سے فیروز شاہ نے ان کو ملک کا شعبۂ قضا سپرد کیا، اور ان کو صدر الصدور کا عہدہ دے کر پورے ملک میں شرعی احکام کے اجراء و تنفیذ کی مکمل ذمہ داری و آزادی سے سرفراز کیا، اور انہوں نے بحسن و خوبی اپنی اس ملکی و شرعی ذمہ داری کو نبھایا، لیکن کب تک یہ سلسلہ جاری رہا اس کی صراحت نہ برنی نے کی ہے اور نہ دوسری تاریخوں میں ہے۔

جلال کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کا آخری ایام میں نارنول ہی میں قیام رہا، جسے

انہوں نے اپنی باقی ماندہ زندگی کے گزارنے کے لیے پسند کیا تھا، اور اپنی علمی ودینی خدمات کا مرکز بنایا تھا، حتیٰ کہ وہیں ۸۵۰ھ میں وفات پائی اور وہیں ان کا مزار بنا، منظوم نسب نامہ میں ایک مصرع میں ان کے مزار کو ''زیارت گاہِ خاصانِ جنابِ کبریائی'' کہا گیا ہے۔ (حیاتِ جعفر/صفحہ:۴۵)

اب ہم مولانا قطب علیؒ کے حالات واخلاقِ کریمہ نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں:

آپؒ کے والد محترم کا نام دوست علی تھا، موصوفؒ کے والد بزرگوارؒ مجھوا میر میں آباد ہو گئے تھے، اس لیے موصوف گاؤں کے اولین ان لوگوں میں سے تھے جن کی ولادت گاؤں میں ہوئی، مجھوا کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تینوں بھائیوں میں سب سے زیادہ صاحب علم یہی تھے۔

زہد وتقویٰ: علمِ دین میں ان کی اس حیثیت کو جس چیز نے مزید زینت بخش رکھی تھی، بلکہ جس کی بدولت شیخ اسحاق کی شہادت کے مطابق کم از کم طالبین حق وتشنگانِ علم ومعرفت کے لیے ایک طرح کی مقبولیت ومرجعیت حاصل تھی وہ ان کی عملی زندگی اور زہد وتقویٰ کا اہتمام تھا، کس شان کا زہد وتقویٰ تھا؟ انور صاحبؒ نے نقل کیا ہے:

''میر قطب علی صاحبؒ کا زہد وتقویٰ ایسا بڑھا ہوا تھا کہ فی عمرہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔'' مولانا جعفر علی صاحبؒ ایک موقع پر ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ ''شب و روز در وِرد وتلاوتِ قرآن بسر می بودند۔'' (یعنی شب وروز اوراد اور قرآنِ پاک کی تلاوت ہی میں بسر فرماتے تھے)۔

تبلیغ، دعوت اور ردِ منکر کا اہتمام: مولاناؒ نے منظورہ میں جو تھوڑے بہت حالات ضبط کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوفؒ کا دینی کمال خود اپنی ذات تک محدود نہ تھا، اور ان کو صرف اپنے ہی عمل کا فکر و اہتمام نہ تھا، بلکہ عامۃ المسلمین اور اطراف کے مسلمانوں کے لیے بھی انتہائی فکر مند رہتے تھے، اور اپنی بساط بھر ان کی اصلاح کے لیے سعی اور دعوت و تبلیغ میں لگے رہتے، اور ردِ منکر کے لیے زبانی فہمائش کے ساتھ مشہور حدیث نبوی "مَنْ رَأیٰ مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ" (برائی دیکھنے پر اگر قدرت ہو تو آدمی کو اپنے ہاتھوں سے اس کو روکنا چاہیے) کے مطابق ایسے عملی اقدام سے بھی پیچھے نہیں رہتے تھے، انور صاحبؒ نے ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے گھر کی کسی خادمہ سے زنا کا صدور ہو گیا تو انہوں نے اس کو سنگسار کیا۔

بہرحال اطراف میں انہوں نے دعوت و تبلیغ کے کام کی بنیاد رکھی تھی، اگرچہ نتیجہ کچھ زیادہ اُمید افزا سامنے نہیں آرہا تھا، مولاناؒ نے اس کا تذکرہ اس ضمن میں کیا ہے کہ مولانا مظہر علی صاحب عظیم آبادیؒ کا جب چند دنوں کے لیے مجھوا میر میں موصوفؒ کے پاس قیام ہوا وہ خود بھی دعوت اور ردِ منکرات کے کام میں بڑے متحرک تھے، مولاناؒ کے والد نے بھی ان سے کام لیا، ان کی زبان اور سید صاحبؒ کا فیض صحبت تھا کہ ان کی سعی سے کچھ نتیجۂ خیر نقد بھی سامنے آیا، اور وہ لوگ جن منکرات میں عرصہ سے مبتلا تھے ان سے باز آگئے، اور جو اس سے پہلے مولاناؒ کے والد محترم کے نصائح کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے وہ مسائل میں مولانا جعفر صاحبؒ سے رجوع کرنے لگے۔

حضرت سید صاحبؒ سے تعارف اور خدمت عالیہ میں اوّل حاضری:

اب تک حضرت سید صاحبؒ سے ملاقات نہ تھی، مگر شیخ محمد اسحاق صاحب گورکھپوری سید صاحبؒ سے واقفیت کا بنیادی ذریعہ بنے، اور ان کو سید صاحبؒ کی خدمت میں پہنچانے کا ذریعہ بھی بنے، جس کی تفصیل اصل کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

چنانچہ تکیہ کے قریب قطب علی صاحبؒ اچانک شدید بیمار ہوگئے، اگلے دِن پورا قافلہ بجز جناب قطب علی صاحبؒ کے تکیہ پر حاضر ہوا، اور شیخ اسحاق صاحبؒ، حسین علی صاحبؒ، (برادرِ خورد مولانا جعفر علی صاحبؒ) کو لے کر سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مصافحہ سے مشرف ہوئے، پھر عرض کیا کہ سید قطب علی گورکھپوری آگئے ہیں اور کافی بیمار اور پیچھے رہ گئے ہیں، سید صاحبؒ نے شیخ صاحبؒ سے فرمایا: ’’آپ جایئے اور ان سے کہہ دیجیے کہ وہ خود تکلیف نہ کریں، میں خود آرہا ہوں۔‘‘ چنانچہ سید صاحبؒ بہ نفس نفیس قطب علی صاحبؒ کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو ملاقات وزیارت کا شرف بخش کر ایک طالب کو مطلوب بنادیا، اور قطب علی صاحبؒ تو مطلوب تھے ہی کہ دعوت دے کر بلائے گئے تھے۔

تکیہ کا قیام اور خلافت سے سرفرازی: اس کے بعد حضرت سید صاحبؒ انتظام کرکے حضرت قطب علی صاحبؒ کو تکیہ لائے، اور تکیہ میں مسجد کے متصل ایک جگہ ان کے قافلے کے قیام کے لیے تجویز فرمائی، اور اپنے برادرزادہ سید یعقوبؒ کو قطب علی صاحبؒ نیز ان کے قافلے کی مہمان نوازی وخبر گیری کے لیے متعین و مامور فرمایا۔ (قیام وغیرہ کے نظم سے فارغ و مطمئن ہوکر) حضرت

قطب علی صاحبؒ مع رفقاء سید صاحبؒ سے بیعت ہوئے اور تقریباً ایک ماہ سید صاحبؒ کی خدمت بابرکت میں قیام فرمایا، اور بقول مولانا جعفر علی صاحبؒ ''تحصیل نعمہائے باطنہ نمودند۔'' (والد ماجد نے اس عرصہ میں خوب خوب روحانی و باطنی دولتیں حاصل کیں) اس کے بعد سید صاحبؒ نے مولانا عبدالحي صاحبؒ سے خلافت نامہ تحریر کراکر قطب علی صاحبؒ کو خلافت سے سرفراز فرمایا، اس کے بعد آپ کو رُخصت فرمایا۔ **فللّٰہ الحمد۔**

خاص بات یہ ہے کہ مکرم قطب علی صاحبؒ نے حضرت سید صاحبؒ سے جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کی، مگر سید صاحبؒ نے اجازت مرحمت نہ فرمائی، بلکہ ایک خاص موقع پر فرمایا: ''بودنِ شاں دراں جوار بسیار بہتر است، از ترغیب مردم و ہدایت شاں بسیار ثواب خواہند یافت۔''

یعنی ان کا اس علاقہ میں رہنا بہتر ہے، وہ علاقہ کے لوگوں کو دین کی ترغیب دے کر اور ان کو ہدایت کی راہ دکھا کر بہت ثواب حاصل کریں گے۔

ف: حضرت سید صاحبؒ کی اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ امت کی تعلیم وتربیت خاص جہاد اور چلہ میں نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی شخص اپنے احوال واعذار کی رعایت کرتے ہوئے جو بھی کارِ دین خلوص کے ساتھ سنت کا لحاظ رکھتے ہوئے کرے گا وہ اجر وثواب کا مستحق ہوگا۔

اس لیے کسی کے لیے روا نہیں ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وسیع شاہ راہ کو تنگ کر دے، بلکہ جس کو جس طریق سے مناسبت ہو دین کی خدمت کرے، دوسروں پر ہرگز ہرگز طعن وتشنیع نہ کرے، ورنہ وہ **''لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا''** کا

مصداق ہوگا۔ و اللہ الموفق للرشد و السداد۔ (مرتب)۔

زندگی کے آخری ایام: مولانا جعفر علی صاحبؒ نے منظورہ میں جہاد سے واپسی کے حالات میں والد بزرگوار کے آخری حالات تفصیل سے رقم فرمائے ہیں، فرماتے ہیں: ''میری واپسی کے چند ماہ بعد والد ماجد علیل ہو گئے، اور یہی بیماری مرض الموت ثابت ہوئی، بہت دوا کی گئی، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔''

سفر آخرت کی تیاری: انتقال سے کچھ دن پیشتر تمام متعلقین کے حقوق کا لین دین کیا، اور دور دور کے اپنے دوستوں و متعلقین کو بلا کر ان سے ملاقات کی اور ہر ایک سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگی۔

وصایا: انتقال سے تین دن قبل تمام اعزہ کو جمع کر کے وصیت فرمائی، ابتدا والدہ ماجدہؒ سے فرمائی، اس پر خاندان کی عورتوں نے رونا چیخنا شروع کر دیا اور کہا کہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے، ایسی بات نہ کیجیے، اس پر والدہؒ نے ان سب عورتوں کو ٹوکا اور کہا کہ ان کو وصیت کرنے دو اور سنو، اس کے بعد والد صاحبؒ یوں گویا ہوئے:

بیوی کو وصیت: (۱) توحید و اتباعِ سنت کو مضبوطی سے تھامنا۔ (۲) میرے بعد ہرگز کسی بدعت کی مرتکب مت ہونا، ورنہ قیامت کے دن میں تمہارا فریق و دشمن ثابت ہوں گا، اس کے بعد نوحہ و سیوم وغیرہ کی ایک ایک رسم کے متعلق وصیت فرمائی کہ ایسا کچھ نہ کیا جائے۔

وفات: ۱۲۴۷ھ کا کوئی دن تھا، جب آپؒ نے ایک مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہا اور تین مرتبہ اللہ اللہ کہا، اور حق تعالیٰ کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔ (حیات جعفر، مؤلفہ حضرت مولانا محمد عبید اللہ اسعدی صاحب باندہ)

حضرت شاہ محمد مدنی حیدر آبادیؒ متوفیٰ ۱۲۴۰ھ یا ۱۲۵۰ھ

نام ونسب: آپؒ کا اسم گرامی شاہ محمد، عرف شاہ مدنی وسیدِ مدینہ ہے، آپؒ حضرت شاہ پیران صاحب بن شاہ درویش محي الدین قادریؒ کے صاحب زادے ہیں۔

علم وفضل: انوارالاخیار کے مؤلف نے لکھا ہے کہ آپؒ اٹھارہ برس کی عمر میں علومِ ظاہری وباطنی سے فارغ التحصیل ہوئے، والد ماجد کے مرید وخلیفہ وجانشین ہوئے، جامع حقائق ومعارف وواقفِ دقائق وعوارف تھے، فصیح البیان وبلیغ اللسان تھے، تحریر وتقریر میں بے نظیر تھے، مشکوٰۃ النبوۃ کے مؤلف نے لکھا ہے کہ آپؒ حسن وخوبی میں ایسے تھے کہ لوگ آپؒ کو سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام سے تشبیہ دیتے تھے، خاص وعام آپؒ کے جمالِ باکمال کے مشتاق ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ ''وہ یوسفِ کنعان تھے، یہ یوسفِ کاروان ہیں۔'' حیدر آباد کے کاروان میں آپؒ کا دولت خانہ تھا، زمانۂ شعور وتمیز سے ریاضت وعبادت میں مشغول رہتے تھے، نہایت ہی پرہیزگار ومتقی تھے، حقائق تصوف اور دقائق تعرف سے خوب واقف تھے، وحدت کے نکات ورموز نہایت شرح کے ساتھ بیان فرماتے، آپؒ کی تقریر سے طالبین سالکین کو یقین کامل حاصل ہوجاتا تھا، آپؒ نے ایک رسالہ حقائق وکشف دقائق میں لکھا ہے، اس میں فرماتے ہیں کہ ''حضرات صوفیہ نے اپنی اصطلاح میں ممتنع الوجود شریکِ باری تعالیٰ باعتبارِ نیستیٔ

محض کہ مقابلِ ہستیٔ محض جو درمیانِ ممکن و واجب ہے، قرار دیے ہیں، اور وہ مرتبۂ وحدت ہے، مقامِ عروجِ روح میں فی حد ذاتہ وجودِ غیر سے مانع ہے، واجب میں اس لیے کہ توحید کا مرتبہ یہیں سے شروع ہوتا ہے، اور اسی مقام سے منافاتِ سقوط بھی واقع ہوتا ہے، وہ مقامِ تاریک ہے، پس ممکن جب تعین وتقید سے رہا ہوتا ہے اور اپنے اسم و رسم سے گذر جاتا ہے تب باعتبارِ ''تخلقوا بأخلاق اللہ'' یعنی باوصافِ باری تعالیٰ موصوف ہوتا ہے، باوجودِ ایں ممتنع الوجود سے موسوم ہوتا ہے۔'' پھر فرماتے ہیں کہ ''ممکن مثل باد (ہوا) و ممتنع مثل سراب (ریت) اور واجب مثل نورِ آفتاب ہے۔''

نیز فرماتے ہیں کہ ''صوفیۂ کرام نے ممکن کی دو قسمیں فرمائی ہیں: ایک لازم الوجود، کہ اصطلاح میں واجب الوجود ہے، دوم ممکن الوجود، واجب الوجود میں دو مرتبے قرار دیے ہیں: ایک عارف الوجود، دوم واحد الوجود، ہر دو بمعنیٰ نور علی نور منوّر و مشہور ہے، پس اس تقسیم سے قسمت لازم نہیں ہوتی ہے، تقدّم و تاخّر بالرتبہ ہوتا ہے، جیسا کہ آب و صفائی آب، و آئینہ و جلاءِ آئینہ، و شمشیر و جوہر شمشیر، پس اس حالت میں پانچ وجود باعتبارِ اصطلاح قرار پائے۔''

نیز فرماتے ہیں کہ ''صوفیۂ کرام کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وجودِ ششم ''شاہد الوجود'' مثل منازلِ ستہ و ایامِ ستہ ہے۔'' الغرض آپ کا رسالہ جامع رموز ونکاتِ تصوف ہے، گویا صوفیۂ کرام کے لیے فتاویٰ ہے، رسالہ کامل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ کس قدر اسرارِ الٰہیہ کو پردۂ عدم سے وجود میں لائے ہیں۔

اخلاقِ فاضلہ: انوار الاخیار کے مؤلف نے لکھا ہے کہ آپ حسن اخلاق میں

مجسم اخلاق تھے، امیر وفقیر ہر ایک سے حسن اخلاق سے ملتے تھے، نہایت تواضع وانکساری سے پیش آتے تھے، غربا ومساکین کی مساعدت فرماتے تھے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپؒ فصیح وبلیغ تھے، طبع موزون رکھتے تھے، آپؒ کی طبیعت میں شعر گوئی کی لیاقت خداداد تھی، کبھی کبھی جوش و وجد اور ولولۂ شوق میں کلام موزون فرماتے تھے۔

''مشکوٰۃ النبوۃ'' کی تالیف کے زمانے میں یعنی ۱۲۱۹ھ میں آپؒ زندہ تھے، مؤلف کتابِ مذکور حضرت میر غلام علی صاحب قادریؒ کے عم بزرگوار تھے، چنانچہ مؤلفِ مذکور متعدد مقام میں آپؒ کو ''عمو'' کے لقب سے یاد فرماتے ہیں۔

وفات: تقریباً آپؒ کی وفات (سنہ ۱۲۴۰ھ یا سنہ ۱۲۵۰ھ) میں واقع ہوئی، فقیر مؤلف کو تحقیقاً سن وفات معلوم نہ ہوسکا، جس قدر معلوم ہوا ذکر کردیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(محبوب التواریخ: ۱/ ۴۴۶)

حضرت مولانا شاہ ابوسعید مجددی رامپوری ثم مدنیؒ متوفی ۱۲۵۰ھ

نام ونسب: نام شاہ ابوسعید مجددی، والد کا نام حضرت صفی القدر ہے۔

آپؒ کا سلسلۂ نسب حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ تک بایں طور پہنچتا ہے: شاہ ابوسعید بن حضرت صفی القدر بن حضرت عزیز القدر بن حضرت محمد عیسیٰ بن حضرت سیف الدین بن حضرت خواجہ محمد معصوم بن حضرت مجددِ الفِ ثانی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ولادت: آپؒ کی ولادتِ باسعادت ۲ / ذوالقعدہ/ ۱۱۹۶ھ کو مصطفیٰ آباد عرف رامپور میں ہوئی، بچپن ہی سے آثارِ صلاح آپؒ پر ظاہر تھے۔

تعلیم وتربیت: دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا، بعدہٗ قاری نسیم رامپوریؒ سے علم تجوید حاصل کیا اور اس میں مہارت حاصل کی، بالآخر آپؒ ترتیل کے ساتھ قرآن خوانی کے اندر رونق دہِ مجالسِ قراء ہوگئے، جو شخص آپؒ سے قرآن شریف سنتا تھا محو ہوجاتا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ ’’مجھ کو اپنی خوش خوانی پر چنداں اعتماد نہیں تھا، یہاں تک کہ بعض عربوں نے میرا قرآن حرمِ محترم میں سنا اور تحسین کی، اس سے پہلے تحسین عجم کا میرے نزدیک کوئی اعتبار نہ تھا۔‘‘

پھر بعدِ حفظِ قرآن مجید علومِ عقلیہ ونقلیہ میں بہرۂ کامل حاصل کیا، اکثر کتب درسیہ مفتی شرف الدین رامپوریؒ سے اور کچھ حضرت مولانا رفیع الدین محدث ابن حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے پڑھیں، فرمایا کرتے تھے کہ ’’میں نے قاضی مبارک کی شرح سلم العلوم حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ سے

پڑھی ہے، نیز سند صحیح مسلم شاہ صاحب موصوفؒ سے حاصل کی، اپنے مرشد یعنی حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ اور اپنے ماموں حضرت مولانا سراج احمد محدث رامپوریؒ بن محمد مرشد مجددیؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے سند حدیث حاصل کی۔

بیعت: تحصیل علم کے دوران ہی ارادۂ خداطلبی کا غلبہ ہوا، اولاً اپنے والد ماجد کی خدمت میں ارادت کا تعلق پیدا کیا، وہ اپنے آباءِ کرام کے طریقہ پر مستقیم تھے، ترکِ دنیا وانقطاع اُن پر غالب تھا، نواب نصراللہ خان نے ان سے آرزو کی تھی کہ عہدۂ بخشی گیری قبول فرمالیں، مگر انہوں نے یہ عہدہ قبول نہیں فرمایا، وہ اشغال و اوراد میں مشغول رہتے تھے، علمِ حدیث کا ذوق بھی رکھتے تھے، اہل فسق وفجور سے کنارہ کش رہتے تھے۔

حضرت شاہ صفی القدرؒ نے ۲۵ / شعبان / ۱۲۳۶ھ کو بروزِ پنجشنبہ لکھنؤ میں وفات پائی، حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ، حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید دہلویؒ اور دیگر اکابر واعزہ نے آپؒ کی تجہیز وتکفین کی۔

اجازت وخلافت: چوں کہ آتش شوق مشتعل تھی، اس لیے اپنے والد کی صحبت کے بعد ان کی زندگی ہی میں ان کی اجازت سے حضرت شاہ درگاہی رامپوری کے پاس پہنچے تھے، وہ دو واسطوں سے حضرت خواجہ محمد زبیر مجددیؒ سے ملحق ہوتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ آپؒ کے حال پر بہت عنایت فرماتے تھے، چند روز میں اجازت وخلافت عطا فرمائی، آپؒ کے اندر شورش بہت زیادہ پیدا ہوگئی

اور کثیر التعداد مرید بھی جمع ہو گئے، اس وقت آپؒ کے حلقہ میں بے ہوشی و وجد کا ظہور بہت ہوتا تھا، چیخ و پکار اور نعرے برپا ہوتے تھے، چوں کہ نسبت مجددیہ میں یہ امور قابل انتفا ہیں اس لیے آپؒ نے حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے متوسلین کے حالات سن کر ان کی طرف توجہ کی۔

شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں: آپؒ نے رامپور میں حضرت شاہ غلام علی کو دیکھا تھا، ان کے تشریف لانے کا سبب یہ ہوا کہ دہلی کی صوبے داری ایک ایسے حاکم کے سپرد تھی جس سے آپؒ کو تکدر تھا، اس لیے رامپور تشریف لے گئے تھے، الغرض حضرت شاہ ابوسعیدؒ نے اپنے آپ کو دہلی پہنچایا، اس وقت دہلی اربابِ علم وصلاح سے بھری ہوئی تھی، ہر سہ فرزندانِ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی اس وقت زندہ تھے، نیز حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ بھی زندہ تھے، آپؒ نے ایک مکتوب حضرت قاضی صاحبؒ کو خدا طلبی کے بارے میں بھیجا، انہوں نے کمالِ تعظیم کے ساتھ جواب لکھا اور مشورہ دیا کہ آپ کے لیے حضرت شاہ غلام علیؒ سے بہتر کوئی نہیں ہے، پس آپؒ حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے اور مقبولِ درگاہ ہوئے، اس وقت حضرت شاہ درگاہیؒ زندہ تھے، حضرت شاہ ابوسعیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر حضرت شاہ غلام علیؒ کے مانند مرشد نہ ہوتا تو مرشد سابق کی طرف سے بہت خوف تھا، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے ایسی حمایت فرمائی کہ کوئی روحانی تکلیف مجھے نہیں پہنچی، حضرت مجدد الفِ ثانیؒ نے ایک مکتوب میں ارقام فرمایا ہے کہ اگر کوئی طالب اپنی ہدایت کسی دوسرے کے پاس دیکھے تو پیر اوّل کے انکار کے بغیر اس کی خدمت میں حاضر ہو جائے تو رخصت ہے۔

ف: عین صواب وصحیح فیصلہ ہے، اپنے پیرِ اوّل کے ادب کو ملحوظ رکھنا لازم ہے، تاکہ اس کو تکدّر نہ ہو، جو مضر ہوسکتا ہے۔ (مرتب)۔

آپ اپنے پیرِ اوّل کی محبت میں کمال رکھتے تھے، چنانچہ ایک شخص نے حضرت شاہ درگاہیؒ کی غیبت آپؒ کی موجودگی میں حضرت شاہ غلام علیؒ کی مجلس کے اندر کی، اس شخص کا خیال تھا کہ آپ پیرِ اوّل کے منکر ہوکر حضرت شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، آپؒ کو اس شخص پر انتہائی غصہ آیا، حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ بھی اس شخص پر خفا ہوکر فرمانے لگے: ''تو میرے سلسلے کے بزرگوں کی غیبت کرتا ہے۔'' شاہ ابوسعیدؒ فرماتے تھے کہ اوّل اوّل پیرِ سابق کو مجھ سے کچھ کدورت رہی، لیکن آخر بار جب میں رامپور جاکر خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی وہ کدورت زائل ہوگئی۔ **فللّٰہ الحمد علیٰ ذلک۔**

بعض دوستوں کی استدعا پر آپؒ نے سلوک میں ایک رسالہ لکھا اور حضرت شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں وہ رسالہ لے کر حاضر ہوئے، حضرت ایشاں نے اس کی بہت تعریف فرمائی، جو رسالہ کے آخر میں منقول ہے، حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ وہ رسالہ فی الحال طریقۂ مظہریہ مجددیہ کا دستورالعمل ہے، ہر اس ملک میں جہاں اس طریقہ کے فیض یاب موجود ہیں وہ اپنے پاس یہ رسالہ ضرور رکھتے ہیں، بعض بزرگوں نے مکہ معظّمہ میں اس رسالے کا عربی میں ترجمہ کیا ہے، عرب میں وہ عربی کا رسالہ مروّج ہے، غالباً بلادِ روم میں ترکی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہوگیا ہے۔

کرامات: آپؒ کی بہت سی کرامات آپؒ کے صاحب زادے حضرت شاہ

عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ نے ضمیمۂ مقامات میں درج کی ہیں، ان میں سے تین کرامات ذیل میں لکھی جاتی ہیں:

(۱) میاں محمد اصغر صاحب نقل کرتے تھے کہ میری نمازِ تہجد کبھی فوت ہو جاتی تھی، ایک بار خدمت اقدس میں عرض کیا، ارشاد فرمایا: ''ہمارے خادم سے کہو کہ تہجد کے وقت ہم کو یہ بات یاد دلا دے، میرے ذمہ اتنی بات ہے کہ تم کو اٹھا کر بٹھا دوں، آگے کو تمہارا اختیار ہے'' کہتے تھے کہ اس کے بعد ایسا ہوتا تھا کہ گویا کوئی مجھے اٹھا کر بٹھا رہا ہے۔

(۲) آپؒ جب سفر حجاز میں شہر سورت پہنچے، وہاں ایک مسجد تھی، اس مسجد میں ایک مالدار شخص یوسف علی خان نام کا آتا تھا، جو خود کو زمرۂ فقراء میں داخل کیے ہوئے تھا، جب اس نے حضرتؒ کی خبر سنی تو مسجد میں آنا موقوف کر دیا، ایک مدت اسی حال میں گزر گئی، ایک بار غایت نیاز مندی سے حاضر خدمت اقدس ہوا اور سو روپے نذر کیے، حضرتؒ کو اور راقم (شاہ عبدالغنیؒ) کو اپنے محل میں لے گیا اور اپنی زوجہ کو بیعت کرایا، لوگ اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ اس شخص نے تو کمالِ انحراف کی بنا پر مسجد میں آنا ترک کر دیا تھا، چہ جائے کہ نذر کرے اور عقیدت مندوں میں سے ہو جائے۔

(۳) شاہ عبدالغنی جو سفر حج میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ تھے لکھتے ہیں کہ ہم جب شہر بمبئی پہنچے تو ایک جہاز کرایہ پر لیا، حضرتؒ کی صحبتِ مبارکہ غنیمت شمار کر کے بعض دوسرے لوگ اس جہاز میں شریک ہو گئے، حضرتؒ نے فرمایا کہ جہاز میں بیٹھنا ٹھیک معلوم نہیں ہوتا، کرایہ واپس لے لیا، ناخدا سے تخلف وعدہ

بھی کئی مرتبہ ہو گیا تھا، آخر کار دوسرے جہاز میں بیٹھے، یہ پہلا جہاز حج کے بعد پہنچا اور بعد والے جہاز نے حج کو پالیا، پہلے جہاز کے حاجی ایک سال تک حجاز میں رُکے رہے۔

شاہ غلام علیؒ کی جانشینی: جب حضرت شاہ غلام علیؒ کو مرضِ وفات لاحق ہوا تو حضرت شاہ ابوسعیدؒ لکھنؤ میں تھے، حضرت شاہ صاحبؒ نے مکرر خطوط ان کی طلب میں بھیجے، مقصود یہ تھا کہ اپنی جگہ ان کو بٹھائیں، الغرض حضرت پیر و مرشد کے حکم سے حضرت شاہ ابوسعیدؒ نے لکھنؤ سے آکر ۹ سال تک بہ حیثیت جانشین، ہدایت طالبین فرمائی، تلخی و سختی اور فقر و فاقہ کو بہت کچھ برداشت کیا، ۱۲۴۹ھ میں عزمِ حرمین شریفین کیا، اہل دہلی کو آپؒ کی جدائی کا بہت غم ہوا، اپنے صاحب زادے حضرت شاہ احمد سعیدؒ کو اپنی جگہ چھوڑ کر عازمِ سفر ہوئے، راستے میں ہر شہر کے باشندے دوڑ دوڑ کر ملاقات کے لیے آتے تھے، رمضان شریف میں بمبئ میں داخل ہوئے، تراویح میں ایک قرآن شہر بمبئ میں پڑھا اور شوال میں جہاز پر سوار ہوئے، ابتداءِ ذی الحجہ میں جدّہ پہنچے، مولانا محمد جانؒ اپنے وقت میں گویا کہ شیخ الحرم تھے، وہ برائے استقبال جدّہ آئے، آپؒ ۲ یا ۳ ذی الحجہ کو مکہ معظّمہ میں داخل ہوئے، حرمین کے قاضی، مفتی اور علماء و امراء نہایت تعظیم سے پیش آئے، شیخ عبداللہ السراج اور شیخ عمر مفتی شافعیہ اور مفتی سید عبداللہ میر غنی حنفی اور ان کے چچا شیخ یٰسین حنفی اور شیخ محمد عابد سندھی اور دیگر اکابر برائے ملاقات حاضر ہوئے۔

آپؒ کو مرضِ اسہال و بخار محرم کے مہینے میں مکہ معظّمہ میں لاحق ہوا، عین

مرض و بے ہوشی میں اشتیاقِ مدینہ منوّرہ آپؒ پر غالب آیا، جوں ہی کچھ اِفاقہ ہوا مدینہ منوّرہ کا عزم کیا، ربیع الاول کے مہینے میں وہیں موجود تھے، حلقے میں لوگ اس قدر جمع ہوتے تھے کہ قیام گاہ پُر ہوجاتی تھی، شیخ حرم مدینہ نے آپؒ کو دعوت بھیجی اور کہا کہ یہ دعوت آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے ہے، مدینہ منوّرہ میں مرض کو اس قدر تخفیف ہوگئی تھی کہ قریب قریب آدھا کوس پیدل چل سکتے تھے، زیارتِ حرمین سے فراغت کے بعد وطن کی جانب رجوع فرمایا، مرض روز بروز ترقی پر تھا، پہلی رمضان کا ایک روزہ رکھا کہ اگر ضرر نہ ہو تو باقی تمام روزے رکھوں گا، اس پہلے ہی روزے میں مرض میں شدت ہوگئی، فدیہ کا حکم کیا اور فرمایا کہ اگرچہ مریض و مسافر پر فدیہ کا حکم نہیں ہے؛ لیکن طبیعت چاہتی ہے کہ (تطوعاً) فدیہ ادا کیا جائے۔

آپؒ کی وصیت : ۲۲/ رمضان کو شہر ٹونک کے اندر داخل ہوئے، نواب وزیرالدولہ نے بہت تعظیم و تکریم کی، بروزِ عیدالفطر سکراتِ موت کا عالم شروع ہوا، شاہ عبدالغنیؒ ہمراہ تھے، ان کو اتباعِ سنت اور اہل دنیا کی صحبت سے اجتناب کی وصیت فرمائی اور فرمایا کہ اگر تم اہل دنیا کے دروازے پر جاؤ گے تو ذلیل ہو جاؤ گے، ورنہ خود اہل دنیا ''مثل سگاں'' تمہارے دروازے پر آکر لوٹیں گے، اور فرمایا: ''جو کچھ ہم کو اشغال و اوراد سے پہنچا ہے اس کی تم کو بلکہ عبدالمغنی کو بھی میں نے اجازت دی'' بعدہٗ فرمایا کہ کس نماز کا وقت ہے؟ مولوی حبیب اللہ صاحب نے عرض کیا کہ جو نماز بھی چاہیں حضرت ادا فرمالیں، فرمایا کہ میری آج تمام رات نماز میں گزری ہے، بعد نمازِ ظہر حافظ کو سورۂ بقرہ اور سورۂ یٰسین پڑھنے

کا حکم دیا، تین مرتبہ یہ دونوں سورتیں سنیں، تیسری مرتبہ کے بعد فرمایا: ''بس اب کم دیر رہ گئی ہے'' پھر فرمایا کہ آج نواب ہماری قیام گاہ پر نہ آئیں، اس سے پہلے ایک دنیادار شخص پہنچا تھا تو آپؒ نے فرمایا تھا کہ امراء کے آنے سے ظلمت آتی ہے۔ (قافلۂ اہل دل: ۲۳۱)

وفات: ظہر و عصر کے درمیان بروزِ عید الفطر شنبہ ۱۲۴۹ھ کو انتقال فرمایا، نواب اور باشندگانِ ٹونک حاضر ہوئے، مولوی حبیب اللہ صاحب اور دیگر اہل قافلہ متکفل غسل ہوئے، مولوی خلیل الرحمن قاضیٔ شہر نے نمازِ جنازہ پڑھائی، تابوت شریف کو دہلی منتقل کیا گیا، جب نعش مبارک صندوق سے نکال کر لحد میں رکھی گئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسی وقت غسل دیا گیا ہے، چالیس روز کے بعد بھی اس میں کوئی تغیر نہیں آیا تھا، حضرت شاہ غلام علیؒ کی قبر مبارک کے قریب دفن ہوئے، لوگوں نے وفات کی تاریخیں بہت سی کہیں، ایک عربی اور دوسری فارسی کی تاریخ یہاں نقل کی جاتی ہے: ''یُنَوِّرُ اللّٰہُ مَضْجَعَہٗ۔''

۱۲۵۰ھ

فارسی کی تاریخ مولوی خلیل احمدؒ نے یوں کہی:

امام و مرشد ما شاہ بو سعید | بروزِ عید چو شد واصل جنابِ خدا
دل شکستہ و مغموم گفت تاریخش | ستونِ محکم دین نبی فتادہ زپا

۱۲۵۰ھ

اولاد: آپؒ کے تین صاحب زادے تھے: (۱) شاہ احمد سعیدؒ (۲) شاہ عبد الغنیؒ (۳) حافظ عبد المغنیؒ۔ اللہ تعالیٰ سب کو جنت الفردوس میں مقام عطا کرے۔ (مرتب)۔ (ضمیمہ مقاماتِ مظہری: ۵۴۹، مؤلفہ شاہ عبد الغنی مجددیؒ)

حضرت مولانا سید عبدالحي مجددی دہلوی ثم امروہویؒ متوفی ۱۲۵۱ھ

نام ونسب: آپؒ حضرت شاہ حفیظ اللہؒ کے صاحب زادے ہیں، دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔

تربیت: حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ کی خدمت میں سلوک طے کیا، بالآخر خلافت واجازت سے ممتاز ہوئے، پیر ومرشد کے حکم سے امروہہ تشریف لائے اور یہیں سکونت اختیار کر لی، محلہ مُلّانہ کی ایک مسجد کے حجرے میں ذکر وفکر میں مشغول رہ کر اپنی پوری عمر گزاری اور معمولات کے پابند رہے، انوارالعارفین کے مصنف صوفی محمد حسین چشتی مرادآبادیؒ اپنے والد کے ہمراہ بچپن میں آپؒ سے ملے، انہوں نے اپنی کتاب میں آپؒ کا تذکرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ بچپن میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ فرمانے لگے کہ میاں! ذرا یہ دعا مانگو اور کہو کہ ''اے اللہ! عبدالحي کو بخش دے'' میں نے دعا مانگی اور کہا: ''اے اللہ! مولوی صاحب کو بخش دے'' فرمانے لگے: ''نہیں، یوں کہو کہ ''اے اللہ! عبدالحي کو بخش دے'' پھر میں نے وہی کہا، انہوں نے پھر اصرار کیا، بالآخر میں نے دل میں سوچا کہ جب تک ان کے کہنے کے مطابق نہ کہوں گا چھٹکارا نہ ہوگا، مجبوراً میں نے وہ الفاظ ادا کیے، اس پر بہت خوش ہوئے اور صحن مسجد میں امرود کا درخت تھا، دو تین امرود اس میں سے توڑ کر مجھ کو دیے۔

فضل و کمال: آپؒ کمالاتِ ظاہری و باطنی سے آراستہ، عالم وفاضل اور مقتدائے وقت تھے، متوکلانہ زندگی بسر کی، اہل دنیا سے اجتناب رہتا تھا، کثرت سے تلاوتِ قرآن مجید فرماتے تھے اور مراقبہ ومجاہدہ کا شغل بھی رہتا تھا، اگر کوئی ملنے آتا تو حجرے کے اندر سے صحن مسجد میں آتے اور ایک دو باتوں کے بعد سلام کر کے واپس ہو جاتے تھے، غیر ضروری بات کسی سے نہ کرتے تھے۔

سندِ خلافت: حضرت مولانا شاہ غلام علیؒ نے آپؒ کو جو سندِ خلافت عربی میں عطا فرمائی اس کا ترجمہ تبرکاً درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

''بعد حمد وصلوٰۃ ...... چوں کہ برادرِ طریقت میاں عبدالحي نے (اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مرضیات کی توفیق دے) پیرانِ کبار کی توجہات سے نسبتِ حضور وآ گاہی سے حصہ وافر حاصل کیا ہے، نیز ان کے دل کو فنائیت نے صبغۃ اللہ کے رنگ میں رنگ لیا ہے، نیز انہوں نے لطائفِ عالمِ امر اور لطائفِ عالمِ خلق کی نسبت سے حصہ پا لیا ہے، لہٰذا ان کو تعلیم طریقہ کی اجازت دے دی گئی، وہ نسبتِ نقشبندیہ احمدیہ کا سلوک طے کرائیں اور طالبین کو طریقۂ قادریہ و چشتیہ میں بھی داخل کر سکتے ہیں، لیکن حضراتِ نقشبندیہ کے اذکار ومراقبات کی تلقین کریں۔ میں اللہ تعالیٰ سے اُن کے لیے استقامت علی الطریقت اور استقامت علی السنۃ المطہرۃ کی دعا کرتا ہوں، اپنے اوقات کو وظائفِ اعمال سے معمور رکھیں اور توجہ بقلب اور توجہ بہ دیگر لطائف وبذاتِ الٰہی سبحانہ ہر سانس میں لازم سمجھیں، اہل دنیا، اہل غفلت اور بے کار لوگوں سے بچنا ضروری سمجھیں، اپنے کاموں کو حضرت حق سبحانہ کے فضل وکرم پر چھوڑنا اور ارواحِ مشائخ کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے التجا کرنا

ضروری سمجھیں، منہاج العابدین امام غزالیؒ، رشحاتِ فخرالدین علیؒ، تلمیحاتِ ملا جامیؒ اور مکتوباتِ حضرت مجددالفِ ثانیؒ کے مطالعہ کا التزام رکھیں، فقروقناعت اور دوامِ ذکر میں اپنی عمر بسر کریں۔ حسبنا اللہ و نعم الو کیل۔" (اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔) فقیر عبداللہ معروف غلام علی عفي عنه

وفات: آپؒ کا وصال ۱۲۵۱ھ میں ہوا، آپؒ کی تدفین شہر امروہہ کی جس مسجد کے حجرے میں آپؒ رہا کرتے تھے اس کے صحن میں ہوئی۔ نوراللہ مرقدہٗ۔

(قافلۂ اہل دل/صفحہ:۲۶۷، مؤلفہ مولانا نسیم احمد امروہوی)

حضرت مولانا شاہ محمد آفاق دہلویؒ متوفی ۱۲۵۱ھ

نام ونسب: نام شاہ محمد آفاق، والد کا نام احسان اللہ بن محمد عمری دہلوی، آپؒ مجدد الف ثانی شیخ احمد بن عبد الاحد سرہندیؒ کے نسب ونسل کے تھے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۱۶۰ھ میں ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر: ۷/۶۱۱)

سلوک وتصوف: سلوک کی تکمیل اپنے طریقۂ آبائی سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت خواجہ ضیاء اللہؒ سے کی اور ان کے خلفاء میں ممتاز ہوئے۔ حضرت خواجہ ضیاء اللہؒ کے انتقال کے بعد مدتِ دراز تک حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کی صحبت میں رہے، جو اپنے والد خواجہ محمد ناصر عندلیبؒ کے خلیفہ تھے۔ اور خواجہ محمد ناصر عندلیبؒ حضرت خواجہ محمد زبیرؒ کے خلفاء میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ محمد آفاق رحمۃ اللہ علیہ کو قبولِ عام عطا فرمایا اور شہرۂ آفاق بنا دیا، دہلی سے کابل تک لوگوں نے آپؒ سے فیض اُٹھایا، خود آپؒ کابل تشریف لے گئے اور زمان شاہ (شاہِ افغانستان) نے بیعت کا شرف حاصل کیا، سلوک میں اپنے شیوخِ کرام اور آبائے عظام کی طرح عالی ہمت، بلند حوصلہ اور سرگرم تھے۔

معمولات: مولانا شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادیؒ فرماتے تھے کہ "ہمارے حضرت شیخ شاہ محمد آفاق صاحبؒ دس ہزار مرتبہ درود شریف اور پچاس ہزار مرتبہ کلمہ پڑھتے تھے اور دس پارے قرآن مجید کے تہجد میں پڑھنے کا معمول تھا اور کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا، دس پارے اتنی دیر میں ہو جاتے تھے کہ اَن جان سمجھے

ایک پارہ ہوا ہوگا، پانچوں وقت صلوٰۃ التسبیح پڑھتے تھے، مزاج میں نہایت تواضع ومسکنت تھی، مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ (حضرت مولانا شاہ محمد آفاق صاحبؒ) سب باتیں موافق سنت کرتے تھے، لیکن کسر نفسی سے ایسا فرماتے تھے کہ ''ہم سے جوکوئی بات موافق سنت ہوجاتی ہے تو عرش سے ایسا فیض آتا ہے کہ ہم تر بتر ہوجاتے ہیں۔''

ف: سنت کی اتباع کی کیسی اہمیت ثابت ہوئی کہ اس سے عرش سے باطنی فیض نصیب ہوتا ہے، اسی لیے ہمارے مشائخ اتباعِ سنت کا غایت اہتمام کرتے ہیں، جن کی اقتدا ہم منسلکین پر لازمی ہے۔ (مرتب)

حضرت شاہ غلام علیؒ اکثر اپنے مریدوں کو بعد تعلیم کے حضرت شاہ محمد آفاق رحمہ اللہ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے، جو امر وہ صادر فرماتے اس کو تسلیم کرتے تھے۔

وفات: ۷/محرم/ بروز چہار شنبہ ۱۲۵۱ھ میں انتقال فرمایا اور پنج شنبہ کو مغل پورہ دہلی میں عقب مسجد شریف مدفون ہوئے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔

(تذکرۂ حضرت مولانا شاہ فضل رحمنؒ)

حضرت علامہ سید ابن عابدین شامیؒ متوفی ۱۲۵۲ھ

(صاحبِ فتاویٰ شامی)

نام ونسب: نام محمد، عرف ابن عابدین شامی ہے، والد کا نام امین بن عمر ہے، آپؒ کے چھٹی پشت کے مورث کا نام ابن عابدین محمد صلاح الدین ہے، اسی نسبت سے ابن عابدین سے مشہور ہیں، آپؒ کا نسب نامہ تینتیسویں پشت میں فخر موجودات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملتا ہے، اور آپؒ ''علامہ شامیؒ'' اس لیے کہلاتے ہیں کہ آپ کا وطن ملک شام ہے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۱۹۸ھ میں دمشق میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت: بہت کم عمری میں آپؒ نے قرآنِ کریم حفظ کرلیا، اس کے بعد آپؒ اپنے والد ماجد کی تجارت میں ہاتھ بٹانے لگے، ایک مرتبہ دوکان پر بیٹھے ہوئے آپؒ قرآنِ کریم پڑھ رہے تھے کہ ایک نامعلوم شخص کا وہاں سے گذر ہوا، اس نے جب آپؒ کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو بہت ڈانٹا اور کہا کہ اولاً تو یہ بازار قرآن پڑھنے کی جگہ نہیں ہے، کیوں کہ تم پڑھتے رہوگے اور لوگ اسے نہیں سنیں گے، جس کی وجہ سے وہ گناہ کے مرتکب ہوں گے، دوسرے یہ کہ تمہارے پڑھنے میں فحش غلطیاں پائی جاتی ہیں، یہ کہہ کر وہ شخص تو چلا گیا، مگر علامہ شامیؒ فوراً وہاں سے اٹھے اور اپنے زمانہ کے مشہور قاری شیخ سعید الحمویؒ کی خدمت میں حاضری دے کر اولاً فن قراءت میں مہارت حاصل کی اور اس کے

بعد نحو وصرف اور فقہِ شافعی کی کتابیں ان ہی سے پڑھیں، بعد ازاں آپ ؒ نے علامۃ الدہر، امام العصر سید محمد شاکر سالمی الحنفیؒ کی شاگردی اختیار کی اور ان سے تمام علومِ عقلیہ ونقلیہ، حدیث، تفسیر اور فقہِ حنفی کو حاصل کیا، یہاں تک کہ اپنے استاذ کی زندگی ہی میں آپ ؒ کی علمی استعداد کی شہرت ہوگئی، دورانِ طالب علمی آپ ؒ نے بعض کتابوں کی شرحیں بھی لکھیں، شرحِ منار اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

ابھی آپ ؒ کی عمر کل چوبیس سال کی تھی اور آپ ؒ کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا کہ آپ ؒ کے استاذ شیخ محمد شاکرؒ کا وصال ہوگیا، اس وقت آپ ؒ اپنے اُستاذِ محترم سے البحر الرائق، ہدایہ اور اس کی شرحیں پڑھ رہے تھے، شیخ محمد شاکرؒ کی وفات کے بعد شیخ کے سب سے جلیل القدر شاگرد شیخ محمد سعید الحلبیؒ کے سامنے آپ ؒ نے زانوئے تلمذ تہہ کیا، تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ ؒ نے درِ مختار کا بے نظیر حاشیہ ردالمحتار کے نام سے لکھنا شروع کیا، اس دوران بہت سے رسائل اور حواشی الگ سے تحریر کیے، جن میں بعض رسائل ''مجموعۂ رسائل ابن عابدین'' میں شائع ہو چکے ہیں۔

علمی انہماک: علامہ شامیؒ پوری زندگی مکمل یکسوئی کے ساتھ علمی مشاغل میں مشغول رہے، آپ ؒ کی رات کا اکثر حصہ تالیف وتحریر میں گزرتا اور پورا دِن درس وتدریس، افادہ وافتا میں گزرتا تھا، کتابوں کو جمع کرنے کا آپ ؒ کو بہت شوق تھا اور اس بارے میں آپ ؒ کے والد ماجد آپ ؒ کا ہر ممکن تعاون فرماتے تھے، انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ جو کتاب بھی تمہیں چاہیے خرید لو، قیمت میں ادا کروں گا، چنانچہ آپ ؒ کا ذاتی کتب خانہ بے مثال اور عدیم النظیر تھا، پھر آپ ؒ کتابوں کو بہت غور وفکر سے پڑھتے تھے اور مطالعہ کے دوران جو بھی اشکال وجواب یا تنبیہ کی

باتیں سامنے آتیں تو فوراً آپؒ حاشیہ میں اس پر نوٹ لگا دیتے تھے، اور کوئی گنجلک عبارت ہوتی تو اس کی وضاحت بھی لکھ دیتے اور کوئی غلط عبارت سامنے آتی تو اس کی اصلاح فرما کر مناسب افادہ بھی نوٹ فرماتے تھے۔

علمی گیرائی: اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپؒ کو فقاہت کے بلند مرتبہ پر فائز کیا تھا، جس مسئلہ پر بھی آپؒ بحث فرماتے دلیل سے اسے مضبوط فرما دیتے، علامہ شامیؒ کے ایک شاگرد علامہ محمد آفندی جابی زادہ (جو خلافتِ عثمانیہ میں مدینہ منوّرہ کے قاضی تھے) کا بیان ہے کہ خلافتِ عثمانیہ کے مفتیٔ اعظم شیخ الاسلام عارف عصمت بیگ نے ان سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میری یہ تمنا ہے کہ علامہ شامیؒ مجھے بطورِ برکت کے اجازت مرحمت فرمائیں۔ آپؒ کے ایک شاگرد مفتیٔ بیروت شیخ محمد آفندی الحلوانی کا بیان ہے کہ میں نے علامہ شامیؒ جیسا درس کسی کا نہیں سنا، میں آپؒ کے درس میں جانے سے پہلے تمام شروح وحواشی وغیرہ کا مطالعہ کر کے جاتا تھا اور اپنی دانست میں یہ سمجھ لیتا تھا کہ شاید ہر اشکال وجواب پر مجھے قابو ہو گیا ہے، لیکن جب علامہ شامیؒ کے درس میں جاتا تو آپؒ ایسے عجیب وغریب فوائد و اِفادات سے مستفید فرماتے کہ ہمارے قلب و دماغ وہاں تک رسائی حاصل نہ کر سکے تھے، یہی وجہ تھی کہ اطراف واکناف سے بڑے بڑے علماء آپؒ سے شرفِ اجازت حاصل کرنے کی غرض سے آپؒ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور آپؒ کے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

اخلاق وعادات: آپؒ نہایت باوقار، بردبار اور خوش اخلاق تھے، آپؒ کے ایک شاگرد جو سفر حج میں آپؒ کے رفیق تھے کہتے ہیں کہ میں نے پورے سفر میں

آپؒ سے کوئی ایسی نازیبا بات نہیں سنی جس سے آپؒ کے کسی رفیق سفر کو ناگواری ہوئی ہو، اِلّا یہ کہ کوئی منکر شرعی آپؒ کے سامنے آتا تو آپؒ کے تیور بدل جاتے، آپؒ کے چہرے سے ایمانی نور چمکتا نظر آتا تھا اور بشاشت پھوٹی پڑتی تھی، جو بھی آپؒ سے ایک مرتبہ مل لیتا وہ آپؒ کی تواضع اور خوش کلامی کو ہمیشہ یاد رکھتا، آپؒ کی مجلس پُر اِفادہ ہوتی تھی، جس میں ہر وارد و صادر کا حد درجہ اکرام کیا جاتا اور فحش کلامی اور غیبت وغیرہ سے کلی اجتناب ہوتا تھا، آپؒ کی مبارک مجلس میں حاضر ہونے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا کہ علامہ کی نظر میں وہ ان کی حقیقی اولاد سے زیادہ باعزت ہے، دین کے معاملے میں آپؒ نہایت جری واقع ہوئے تھے، جو بات مسئلہ کے اعتبار سے غلط دیکھتے اس پر کھل کر نکیر فرماتے اور اس بارے میں کسی کے طعن و تشنیع کا خیال نہ فرماتے اور نہ ہی کسی حاکم سے مرعوب ہوتے۔

ف: سبحان اللہ! آپؒ کے کس قدر بلند اخلاق وصفات تھے، مگر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے میں کسی کی رِعایت نہ فرماتے تھے، یہ اُن کا بڑا کمال تھا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان صفات سے اتصاف کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ (فتاویٰ نویسی کے رہنما اصول: ۴۰)

روحانی و باطنی فضل وکمال: آپ صرف بلند پایہ محقق ومصنف ہی نہیں، عظیم المرتبت روحانی شخصیت بھی تھے، انہوں نے روحانی تربیت اور اسباقِ تصوف کی تکمیل اپنے مربی واستاذ شیخ الوقت السید محمد شاکر السالمی، المعمری، الشہیر بابن مقدم سعد کے پاس کی، یہ بلادِ شام میں سلسلۂ قادریہ کے شیخ وقت تھے، علامہ شامیؒ نے جملہ علوم وفنون کی تعلیم ان ہی سے پائی تھی، ان کی مدح میں

علامہ شامیؒ نے مقاماتِ حریری کی طرح مقامات لکھے ہیں، علامہ شامیؒ نے اپنا تمام وقت ذکر وعبادت، درس وتدریس، افتا وتصنیف کے لیے وقف کر رکھا تھا، اپنا کاروبار بھی خود نہیں کرتے تھے، ایک شریک کو سونپ رکھا تھا، عادت تھی کہ رمضان کی ہر رات ایک قرآنِ کریم ختم کرتے تھے، عام دنوں میں اکثر ساری ساری رات گریہ وزاری اور تلاوت میں گزر جاتی تھی، تصوّف سے ان کو خاص شغف تھا، ان کے تصوّف سے متعلق دو رسالے ہیں: ایک کا نام ہے: "إجابة الغوث ببيان حال النقباء و النجباء و الأبدال و الأوتاد و الغوث" یہ رسالہ ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا، جس میں قطب، غوث اور ابدال وغیرہم کے بارے میں استفسار کیا گیا تھا، اس میں اس سوال کے جواب کے علاوہ تصوف سے متعلق مزید تفصیلات بھی مذکور ہیں۔

دوسرا رسالہ: "سلّ الحسام الهندی لنصرة مولانا خالد النقشبندی" ہے۔ اس کے لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ شام کے ایک ممتاز عالم ضیاء الدین خالد نقشبندی ہندوستان آئے اور مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کے خلیفہ شاہ غلام علیؒ (۱۱۵۶ھ-۱۲۴۰ھ) کے پاس رہ کر مقاماتِ سلوک کی تکمیل کی اور خلعت خلافت سے سرفراز ہو کر واپس گئے، وہاں ان کو کچھ معاندین کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، انہوں نے ان پر مختلف اعتراضات اٹھائے، ان کے جواب میں علامہ شامیؒ نے یہ رسالہ لکھا، اس میں صوفیہ کے نزدیک مروّج امور کے استناد اور ان کے حال وقال پر مکمل کلام کیا ہے، یہ دونوں رسائل "مجموعہ رسائل ابن عابدین" جزوِ دوم میں موجود ہیں۔

ف: اگر دست یاب ہو تو اس اہم اور مفید کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ واللہ الموفق۔ (مرتب)۔

علمی آثار: آپؒ نے اپنے بعد لائق شاگردوں کے علاوہ مفید تالیفات بھی چھوڑی ہیں، ان میں افتاء کے کام میں سب سے زیادہ اہمیت "ردالمحتار" یعنی مسمیٰ بہ "شامی" کی ہے۔ مختلف اسباب کی بناء پر علماء نے اس کتاب کو قبول فرمایا۔

فتاویٰ شامی کی اہمیت کی وجوہ: (۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ دوسرے مصنفین سے متأخر ہیں، انہوں نے پچھلے تمام فقہاء کی کتب کو سامنے رکھ کر اس کتاب کی تصنیف کی ہے، لہٰذا اس کتاب میں فقہاءِ امت کی بارہ صدیوں کی محنت اور تحقیقات کا نچوڑ آ گیا ہے۔

(۲) دوسری وجہ اس کتاب کا مستند ہونا ہے، مصنفؒ نے کوئی بات نقل کرتے وقت صرف نقل پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ التزام کے ساتھ اہتمام کیا ہے کہ اس بات کی تحقیق کی جائے کہ قائل اوّل کون تھے اور ان کی اپنی اصل عبارت کیا ہے؟ کیوں کہ کبھی ناقل اوّل سے غلطی ہو جاتی ہے، بعد والے حضرات کو اس کا علم نہیں ہو پاتا، وہ ناقل اوّل پر اعتماد کرتے چلے جاتے ہیں۔

(۳) تیسری وجہ اس کتاب کا جامع ہونا ہے، مصنف محقق کی عادت ہے کہ سابقہ تمام اقوال و مباحث کو سامنے رکھ کر تطبیق یا ترجیح کی صورت بیان فرماتے ہیں، علماءِ متقدمین کی کتب رسوخ فی العلم میں بہت بڑھ کر ہیں، لیکن مفتی کے لیے "ردالمحتار" سے استغنا نہیں، دوسری کتب سے فتویٰ دینا چاہیں تو بہت سی کتب کا مطالعہ کرنا ضروری ہوگا، کیوں کہ ترجیح میں اختلاف ہوتا ہے، یا

قول مطلقاً ذکر ہوتا ہے جب کہ وہ مقید ہوتا ہے، اس لیے مفتی کے لیے کافی محنت کے بعد بھی ترجیح یا معرفت قیود میں غلطی کا احتمال رہتا ہے، ”ردالمحتار“ دیکھنے والا اتنی محنت سے بھی بے نیاز ہوجاتا ہے اور غلطی کا امکان بھی کم ہوجاتا ہے، اسی وجہ سے یہ کتاب اپنے وقت تحریر سے آج تک مرجع اہل افتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ارشادِ گرامی ہے کہ ”علامہ ابن عابدین شامیؒ انتہائی وسیع المطالعہ ہونے کے باوجود اس قدر تقویٰ شعار اور محتاط بزرگ ہیں کہ عام طور سے اپنی ذمہ داری پر کوئی مسئلہ بیان نہیں کرتے، بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے اپنے سے پہلے کی کتابوں میں سے کسی نہ کسی کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں، اگر ان اقوال میں بظاہر تعارض ہو تو اس کو رفع کرنے کے لیے بھی حتی الامکان کسی دوسرے فقیہ کے قول کا سہارا لیتے ہیں اور جب تک بالکل مجبوری نہ ہوجائے خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرماتے۔ اور جہاں ظاہر فرماتے ہیں وہاں بالعموم آخر میں ”تأمّل“ یا ”تدبّر“ کہہ کر خود بری ہو جاتے ہیں اور ذمہ داری پڑھنے والے پر ڈال دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات اُلجھے ہوئے مسائل میں ہم جیسے لوگوں کو ان کی کتاب سے مکمل شفا نہیں ہوتی۔“ (آدابِ فتویٰ نویسی/صفحہ: ۱۰۲، مؤلفہ: مفتی ابولبابہ شاہ منصور)

اقتباس از ردالمحتار ملقب بہ ”شامی“: علامہ شامیؒ نے اپنے مقدمہ میں اخلاق کی تحصیل کو فرض قرار دیا ہے، جس کو مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ نے ”مضمونِ تصوف“ میں نقل فرمایا ہے، بغرضِ اِفادہ اس کو مع ترجمہ نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں:

إن علم الإخلاص والعجب والحسد والرياء فرض عين، و مثلها غيرها من آفات النفوس، كالكبر والشحّ والحقد والغشّ والغضب والعداوة والبغضاء والطمع والبخل والبطر والخيلاء والخيانة والمداهنة و الاستكبار عن الحق والمكر والمخادعة والقسوة وطول الأمل، ونحوها مما هو بين فى ربع المهلكات من الإحياءِ، قال فيه: " ولا ينفک عنها بشر، فيلزمه أن يتعلم منها ما يرىٰ نفسه محتاجا إليها، و إزالتها فرض عين، و لا يمكن إلا بمعرفة حدودها و أسبابها و علاماتها و علاجها، فإن من لا يعرف الشر يقع فيه۔"

یقینا اخلاص، عجب، حسد اور ریا کا علم فرضِ عین ہے، اسی طرح اس کے علاوہ جو اور آفاتِ نفوس ہیں ان کا علم بھی، جیسے کبر، بخل، کینہ، خیانت، غصہ، عداوت، بغض، طمع، بخل، بطر، خیلائی، مداہنت، استکبار عن الحق، مکر، خداع، قسوت، طولِ امل اور اس کے مثل دوسرے امراض جن کو احیاء العلوم کی ربع مہلکات میں بیان کیا گیا ہے، احیاء العلوم میں یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ ان امراض سے کوئی بشر خالی نہیں ہے، تو لازم ہے کہ ان میں سے جن کا خود کو محتاج سمجھے ان کو سیکھے اور ان کا ازالہ فرضِ عین ہے، اور یہ ممکن نہیں ہے جب تک کہ حدود و اسباب و علامات اور اس کے علاج کو نہ جانے، اس وجہ سے کہ جس کو شر کی معرفت نہیں ہوتی وہ اس میں واقع ہوجاتا ہے۔

(مقدمۂ شامی/صفحہ:۳۰)

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد یوں تحریر فرماتے ہیں:

دیکھئے! علامہ شامیؒ جو فقہاءِ متاخرین میں سے ہیں، ان ہی کی کتاب سے عام طور پر فتویٰ دیا جاتا ہے اور ہم سب لوگ اس کو تسلیم کرتے ہیں وہ یہ فرمارہے ہیں کہ علم اخلاق کی تحصیل فرضِ عین ہے، اس لیے کہ ہر آدمی (الا ماشاء اللہ) ان مذکورہ امراض میں سے ایک یا اکثر یا کل میں ضرور ہی مبتلا رہتا ہے، جن کا اِزالہ فرض ہے، تو بغیر علم کے ان کی اصلاح و اِزالہ کیسے متصور ہو سکتا ہے؟ نیز بہت سے اخلاق ایسے ہوتے ہیں جن کی تحصیل لازم ہے، جیسے اخلاص و تواضع وغیرہ، تو ان کا حاصل کرنا بھی بغیر علم ممکن نہیں، اس لیے اخلاقِ حمیدہ اور اخلاقِ سیئہ کا علم ضروری ٹھہرا۔ (تالیفاتِ مصلح الامتؒ: ۴/ ۱۰۰)

وفات: ۲۱/ ربیع الثانی/ ۱۲۵۲ھ کو صرف ۵۴ سال کی عمر میں علم و عمل اور فقہ و افتاء کا یہ آفتاب دمشق میں غروب ہو گیا، وفات سے ۲۰ دن قبل علامہ موصوفؒ نے اپنی قبر خود ہی صاحب درِ مختار شیخ علاء الدین الحصکفیؒ اور شیخ صالح الجنینیؒ کے پہلو میں تیار کرادی تھی، جس میں آپؒ کو دفن کیا گیا، شیخ سعید الحلبیؒ نے آپؒ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

(فتویٰ نویسی کے رہنما اصول/ صفحہ: ۴۳، مؤلفہ مفتی محمد سلمان منصور پوری)

حضرت مولانا عبداللہ دہلویؒ نزیل امراوتی متوفی: ۱۲۵۲ھ

نام ونسب: نام مولوی محمد عبداللہ، آپؒ کا اصلی وطن دہلی ہے۔

تعلیم وتربیت: آپؒ نے سن شعور کے بعد کتب درسیہ علماء وفضلاء سے تحصیل کیں، تحصیل کے بعد گوالیار میں آئے، مہاراجہ سیندھیا کی سرکار میں معزز عہدہ پر مقرر ہوئے، مدت تک مہاراجہ کی سرکار میں رہے، امورِ مفوضہ کو امانت ودیانت سے انجام دیتے تھے، آخر دل میں محبت الٰہی کا شوق پیدا ہوا، دنیا ومافیہا سے دل برداشتہ ہوئے، ملازمت سے مستعفی ہوئے اور دلّی میں آئے۔

بیعت واجازت: دہلی پہنچ کر مولانا فخر الدین دہلویؒ کے مرید ہوئے، چوں کہ آپؒ کے چہرے سے مشیخت و بزرگی کے آثار نمایاں تھے حضرت مولاناؒ نے اجازت عطا فرمادی، آپؒ حضرتؒ کی خدمت سے رخصت ہوکر ہدایت وارشاد کا کام کرتے ہوئے پاتور علاقہ برار میں پہنچے، دوتین سال وہاں رہے، شیخ بابو قدس سرہٗ وغیرہ مشائخ کرام کی زیارت سے مشرف ہوتے رہے، پھر پاتور سے امراوتی میں رونق افزا ہوئے، جامع مسجد میں فروکش ہوئے اور وہیں وفات ہوئی۔

غرباء پروری: آپؒ غرباء نواز اور فقراء پرور تھے، موسمِ سرما میں مساکین وغرباء کو لحاف اور کمبل وغیرہ تقسیم فرماتے تھے، اور روزانہ کھانا بھی عطا فرماتے تھے، حاجت مندوں کی حاجت روائی میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے، ہمدردی ومساعدت میں کوشش و جاں فشانی فرماتے تھے، اہل برار بھی آپؒ سے نیک

گمان رکھتے تھے کہ آپؒ کو غیب سے فتوحات ہوتی ہیں، اور بعض کا یہ خیال تھا کہ آپؒ کیمیا گر ہیں، واقع میں آپؒ عارف باللہ اور فنافی الرسول تھے، علامۂ دہر وفہامۂ عصر تھے، قانع ومتوکل، صابر وصاحب دل تھے، جو کچھ اطراف وجوانب سے معتقدین نذر وتحائف بھیجتے تھے آپؒ فقراء وغرباء پر تقسیم فرماتے تھے۔

اخلاق وعادات: آپؒ کی وضع درویشانہ تھی، لباس میں ایک تہہ بند اور ایک رومال سر پر رہتا اور چادر جسم پر رکھتے تھے، ہمیشہ اسی لباس میں بسر کرتے تھے، جاڑا ہو یا گرما یا بارش، جاڑے میں بعض معتقدین نے آپؒ کو لحاف کی پیش کش کی، آپؒ نے لیا، رات کو جاڑے کے وقت کسی مسافر غریب کو دے دیا، آپؒ صرف اسی رومال میں مصلّی پر وظائف میں مشغول رہے، مدت تک برار میں ہدایت وارشاد فرماتے رہے، آخر آپؒ مرض الموت میں مبتلا ہوئے، حاضرین غمگین ہو گئے اور مسجد کی ویرانی پر افسوس کرنے لگے، آپؒ نے سب سے کہا کہ غم مت کرو، ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب مجھ سے بہتر ایک بزرگ وارد ہوں گے، ان کی ذات سے مسجد کو رونق نصیب ہوگی۔

وفات: حاضرین نے آپؒ سے مدفن کے متعلق سوال کیا، آپؒ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: ''یہ گنہگار اس لائق ہے کہ پیر میں رسّی باندھ کر کھینچتے ہوئے کسی مجہول مقام میں دفن کر دیں۔'' حاضرین آپؒ کے کلام سے بے تاب ہو کر گریہ وزاری کرنے لگے، آپؒ نے سب کو تسلی دی، اس کے بعد داعیٔ اجل (ملک الموت) کو لبیک کہا اور واصل حق ہوئے، مسجد کے صحن میں مولسری کے درخت کے پاس مدفون ہوئے۔

ف: یہ تھی ہمارے بزرگوں کی عبدیت اور بندگی۔ چنانچہ ہمارے شیخ حضرت مصلح الامتؒ یہ شعر برابر پڑھتے:

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا؟
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی یہ حالِ فنا وشوقِ عبدیت نصیب فرمائے۔ آمین۔

(مرتب)

یہ سانحہ ۱۲۵۲ھ میں ہوا، فاضل اجل مولوی امجد حسین مرحوم خطیب ایلچپورؒ نے آپؒ کی رحلت کی تاریخ کہی ہے ؎

مولوی عبداللہ صاحب قدوۂ علماءِ دین　　　عارف ومتوکل وسرِ حلقۂ اہلِ یقین

(محبوب التواریخ:۱/ ۵۲۵)

حضرت مولانا سید نور الاصفیاء حیدر آبادیؒ متوفی ۱۲۵۵ھ

ابتدائی تعلیم وتربیت: آپؒ مولانا نور العلی صاحبؒ کے تیسرے صاحب زادے ہیں، ابتدائی شعور میں آپؒ کے چہرے سے سعادت ورشادت کے آثار نمایاں تھے، ہر ایک صاحب نظر آپؒ کی نسبت کہتا تھا کہ یہ ہونہار ہے، آپؒ ذکی الطبع وسریع الفہم تھے، بیس برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے، تحصیل کے بعد والد ماجدؒ سے خلافت کا خرقہ لیا۔

تدریس وتلقین: والد ماجدؒ کے فوت ہونے کے بعد درس وتدریس اور ہدایت وتلقین کا بازار گرم کیا، طالبین ومریدین کو نہایت محبت وحسن اخلاق سے تدریس وتلقین فرماتے تھے، آپؒ کی ذاتِ بابرکات سے درسگاہ کو زینت اور سجادۂ ہدایت کو رونق حاصل ہوئی، آپؒ آبائی موروثی خدمت کو عمدہ طرح سے ادا کرتے تھے، طلبہ کو متعدد سبق پڑھاتے تھے، آپؒ کا صبح سے شام تک یہی شغل تھا، متوکل تھے، جو کچھ معاش حضور سے مقرر تھی اس پر صابر وشاکر تھے، نواب امجد الملک بہادر نے براہِ قدردانی ولحاظِ خاندانی ماہانہ وظیفۂ معقول مقرر کر دیا تھا۔

ف: سبحان اللہ، کیسے مبارک والد محترم ہیں کہ ان کی اولاد عالم، فاضل، متقی اور دین دار ہے۔ **ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔** (مرتب)۔

کرنول میں قیام: چند مدت کے بعد آپؒ کرنول میں رونق افزا ہوئے، نواب الف خان بہادر نے آپؒ کی نہایت تعظیم وتکریم کی، عظمت وشان سے

مہمانی کی، آپؒ خان صاحب کی قدردانی کی وجہ سے چندسال کرنول میں رہے، نواب حسنِ ارادت سے ہرروز خدمت کرتا رہا۔

حیدرآباد میں قیام: پھرآپؒ کرنول سے حیدرآباد آئے، امیر کبیر نواب شمس الامراء بہادر نے باصرارِتمام آپؒ کواپنے اورمہاراجہ چندولال بہادر کے فیما بین وکالت کی خدمت پر مامور کیا، رسالۂ سواران، جوانانِ پیادہ، جاگیراور تعلق داری سے بھی ممتاز کیا، اورمہاراجہ کی طرف سے بھی تیس ہزارروپیہ سالانہ محاصل کی جاگیر مقرر ہوئی، آپؒ اوقاتِ عزیز کونہایت فراغت سے بسر کرتے تھے، چار پانچ ہاتھی اور دس بارہ عربی گھوڑے ہمرکاب رہتے تھے، اور پچاس سوارِ بارگیر ملازمِ خاص تھے،آپؒ کی سواری تجمل سے برآمد ہوتی تھی، باوجود جاہ وحشمت اورعیش وعشرت کے آپؒ اس موروثی خدمت یعنی درس وتدریس کی موقوفی پرافسوس وحسرت کرتے تھےاورفرماتے تھے کہ ”مجھے اُس وقت جولطف ومزہ حاصل ہوتا تھااب وہ خواب وخیال ہے۔“

وفات: آخرصاحب ترجمہ حضرت نورالاصفیاء اوّلؒ نے بیسویں تاریخ ماہِ ذی قعدہ ۱۲۵۵ھ میں اس دارِفانی سے بہشت بریں کی جانب رحلت فرمائی۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

باغ میں واقعہ عیدگاہِ کہنہ حیدرآباددکن میں مدفون ہوئے، قبرپرگنبدِ عالی بنایا گیاہے۔یزارویتبرک۔۔۔آپؒ کی اولادمیں صرف مولوی نورالحسین قادر جنگ ہیں۔ (محبوب التواریخ:۲/۱۰۸۷)

حضرت قاضی محمد بن علی بن محمد الشوکانیؒ متوفی ۱۲۵۵ھ

نام وولادت: آپؒ کا نام محمد، والد کا نام علی بن محمد بن عبداللہ الشوکانی ہے، آپؒ کی ولادت بروز دوشنبہ ۲۸ / ذوالقعدہ/ ۱۱۷۲ھ کو شوکان میں ہوئی، جو صنعاء کی ایک بستی ہے، اس بستی میں اہل فضل وکمال بکثرت پیدا ہوئے، آپؒ خود ''بحرالعلوم، امام الائمہ، شیخ الاسلام'' اور ''سندالمجتہدین'' وغیرہ القاب سے یاد کئے جاتے ہیں، آپؒ صنعاء میں قاضی القضاۃ کے منصب پر تھے۔

تعلیم: آپؒ کی نشوونما صنعاء میں ہوئی، اپنے والد محترم کی آغوش میں پروان چڑھے، تعلیم کی طرف توجہ شروع ہی سے تھی، آپؒ نے فقیہ حسن بن عبداللہ سے قرآن پاک مکمل کیا اور اس وقت کے علماءِ اعلام سے تمام علوم وفنون کی کتابوں کا درس لیا، آپؒ اکثر تاریخ اور ادب کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے، اپنے وقت کے علماء سے مراجعت کی، حتیٰ کہ خود منصب امامت پر فائز ہو گئے اور مرجع علماء ہو گئے، آپؒ کی تصانیف میں ''**نیل الأوطار فی شرح منتقی الأخبار من أحادیث سید الأخیار**'' کافی مشہور ومعروف ہے۔ (مقدمۂ نیل الاوطار: ۱/ ۲۰)

حضرت مولانا نواب صدیق حسن خان نے ''**تقصار جیود الأحرار من تذکار جنود الأبرار**'' میں نقل کیا ہے کہ ''آپؒ نے اپنی سوانح ''بدر طالع'' میں ارقام فرمایا ہے جس کے اخیر میں ایسی باتیں تحریر فرمائی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ آپؒ ذوقِ صحیح، وجد صریح اور معارف وحقائق سے حظ وافر رکھتے تھے،

ارشادفرماتے ہیں:

و هو الآن يسأل الله الذى لا إله إلا هو الحكيم الكريم، رب العرش العظيم أن يحسن ختامه و يُنيله من خيري الدارين مرامه و يسدّده فى أقواله و أفعاله، ينزع حب الدنيا من قلبه، حتّى ينظر إلى الحقيقة، فيفوز بنيل دقائق الطريقة، اللّٰهم اجذبه إلى جنابك العلي جذبة يصحى عندها من سكر غروره، و افتح له خوخة يتخلص بها عن حجابه المظلم إلى المعارف الحقيقية، و لا تخرجه من هٰذه الدار إلا بعد أن يسبح فى بحار حبك، و يغسل أدران قلبه بمياه

اب یہ بندہ اس اللہ سے سوال کرتا ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ حکیم اور کریم ہے، عرشِ عظیم کا رب ہے، اس کا خاتمہ بالخیر فرمائے اور دارین کے مقاصد حسنہ سے بہرہ ورفرمائے اور اس کے اقوال وافعال میں صحت ودرستگی عطا فرمائے اور اس کے قلب سے حب دنیا کو نکال دے، تاکہ حقیقت اور دقائق طریقت سے بہرہ ور ہو جائے، اے اللہ! اس بندہ کو اپنی جنابِ عالی تک اس طرح جذب فرمالیجیے کہ وہ اپنے دھوکہ کے نشے سے ہوش میں آجائے اور اس کے لیے اپنی طرف ایسا روشن دان کھول دیجیے کہ تاریک حجاب سے نکل کر معارفِ حقیقیہ (کے نور) تک پہنچ جائے اور اے اللہ! اس بندے کو دارِ دنیا سے اس وقت تک جدا نہ فرمایئے جب تک کہ یہ آپ کے بحرِ محبت میں تیر

قربک، فأنت إذا شئت جعلت المرید مرادا۔

نہ لے اور آپ کے آبِ قرب سے اپنے قلب کے میل کچیل کو دھو کر پاک و صاف نہ ہو جائے، اے اللہ! آپ کی ذات تو ایسی قدرت والی ہے کہ جب چاہے مرید کو مراد بنالے۔

ف: ماشاء اللہ! کیسی مؤثر مناجات ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسی دعا کرنے کی توفیق دے اور اللہ تعالیٰ ہمارے حق میں اسے قبول فرمائے، آمین۔ (مرتب)

إِذَا كَانَ هٰذَا الدَّمْعُ يَجْرِیْ صَبَابَةً عَلیٰ غَيْرِ لَيْلیٰ فَهُوَ دَمْعٌ مُضَيَّعُ

اگر یہ آنسو لیلیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے عشق میں بہہ رہے ہیں تو بالکل رائگاں اور ضائع ہیں۔

اور میں وہ نہیں کہتا جو کسی کہنے والے نے کہا ہے:

وَ كَيْفَ تَرىٰ لَيْلیٰ بِعَيْنٍ تَرىٰ بِهَا سِوَاهَا، وَ مَا طَهَّرْتَهَا بِالْمَدَامِعِ

یعنی تم لیلیٰ کو اس نظر سے کیسے دیکھ سکتے ہو جس سے اس کے غیر کو دیکھتے ہو، حالاں کہ ابھی تم نے اپنے آنسوؤں سے اس کو پاک نہیں کیا ہے۔

وَ تَلْتَذُّ مِنْهَا بِالْحَدِيْثِ وَ قَدْ جَرىٰ حَدِيْثُ سِوَاهَا فِیْ خُرُوْقِ الْمَسَامِعِ

اور تم اس کی باتوں سے لذت اندوز ہوتے ہو، حالاں کہ اس کے غیر کی باتیں بھی کانوں میں آتی رہتی ہیں۔

بلکہ میں وہ کہتا ہوں جو کسی دوسرے کہنے والے نے کہا ہے:

أَلَاَ، إِنَّ وَادِيَ الْجَزْعِ أَضْحیٰ تُرَابُهٗ مِنَ الْمِسْکِ كَافُوْرًا وَ أَعْوَادُهٗ رَنْدًا

سنو! وادی الجزع کی مٹی مشک سے کافور ہوگئی اور اس کی لکڑیاں آس یعنی (خوشبودار) لکڑی ہوگئیں۔

وَ مَا ذَاکَ إِلاَّ أَنَّ هِنْدًا عَشِيَّةً   تَمَشَّتْ وَ جَرَّتْ فِيْ جَوَانِبِهٖ بُرْدًا

اور یہ اس لئے ہوا کہ ہندہ ایک رات اس کے اطراف میں اپنی چادر لپیٹے ہوئے چلی پھری ہے۔

اور میں کہتا ہوں:

أَنَا رَاضٍ بِمَا قَضىٰ، وَاقِفٌ تَحْتَ حُكْمِهٖ   سَائِلٌ أَنْ أَفُوْزَ بِالْخَيْرِ مِنْ حُسْنِ خَتْمِهٖ

یعنی میں اس کے فیصلہ پر راضی ہوں اور اس کے فیصلہ کے تحت کھڑا ہوں، میں اِس کا طلب گار ہوں کہ حسن خاتمہ سے فائز المرام ہوجاؤں۔

اور کیا ہی خوب کسی نے کہا ہے:

العَفْوُ يُرْجىٰ مِنْ بَنِىْ آدَمَ   فَكَيْفَ لاَ يُرْجىٰ مِنَ الرَّبِّ

عفو ودرگذر کی اُمید تو آدمیوں تک سے کی جاتی ہے، تو پھر ربِ کریم سے کیوں نہ کی جائے؟

اور اس شعر پر میں بطورِ تضمین کہتا ہوں:

فَإِنَّهٗ أَرْأَفُ بِىْ مِنْهُمْ   حَسْبِى بِهٖ، حَسْبِىْ بِهٖ، حَسْبِىْ

وہ تو مجھ پر سب سے زیادہ رحمت ومہربانی کرنے والا ہے، لہٰذا وہ میرے لیے کافی ہے، وہ مجھے کافی ہے، وہ مجھے کافی ہے۔

اس کے بعد حضرت نواب صاحبؒ یوں تحریر فرماتے ہیں:

’’وایں عبارت صریح است در حصولِ مقامِ تسلیم و رضا و بلوغِ درجاتِ فنا

وبقا ووصول بمنازلِ حقائق علیٰ‘‘۔

ترجمہ: یہ عبارت اس امر میں صریح ہے کہ حضرت العلامہ کو تسلیم و رضا کا مقام حاصل تھا اور فنا و بقا کے درجاتِ عالیہ پر فائز تھے اور حقائق رفیعہ سے بہرہ ور تھے۔

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ مِنْھَا مَا رَزَقْتَہٗ، وَ اجْعَلْہُ مَتَاعًا وَّ بَلاَغًا إِلیٰ حِیْنٍ، وَ أَلْحِقْنِیْ بِالصَّالِحِیْنَ، وَ اجْعَلْ لِیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِیْ الآخِرِیْنَ۔

(تقصار جیود الأحرار: ۸۲)

اے اللہ! جن حقائق سے آپ نے ان کو نوازا ہے مجھے بھی عطا فرمائیے اور اس کو میرے واسطے وقت موعود تک کے لیے سامان اور وسیلۂ رسائی کر دیجیے اور مجھے صالحین میں شامل فرما دیجیے اور میرا ذکر خیر آئندہ آنے والوں میں جاری رکھیے۔

ف: بصد ادب عرض ہے کہ اگر قاضی شوکانی رحمہ اللہ کے مذکورہ تذکرہ پر نظرِ ثانی فرمائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں ذوق و وجد، صحو و سکر، تسلیم و رضا اور فنا و بقا کے کلمات استعمال ہوئے ہیں، جو اکثر تصوّف و سلوک کی کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ اور خوشی کی بات ہے کہ حضرت نواب صاحبؒ نے حضرت قاضی شوکانی صاحبؒ کے لیے ان صفات سے اتصاف کو بھی ارقام فرمایا ہے جو بہت بڑی نعمت اور باطنی دولت ہے۔

یقیناً یہی وہ صفات و احوال ہیں جن سے صوفیۂ عظام متصف ہوتے ہیں اور اپنے مریدین و منتسبین کو ان سے اتصاف کی ترغیب دیتے ہیں؛ بلکہ اسی کی

تحصیل کے لیے ذکر و شغل کی تلقین فرماتے ہیں، تاکہ ظاہری اعمال کی اصلاح کے ساتھ باطنی اخلاق و ملکات کی بھی اصلاح ہو جائے، جس کی ضرورت بلکہ فرضیت پر قرآن وحدیث دال وشاہد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان صفاتِ عالیہ اور اخلاقِ حسنہ سے متصف فرمائے۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز۔**

وفات: آپؒ کی وفات شبِ چہارشنبہ ۲۷/ جمادیٰ الاولیٰ/ ۱۲۵۵ھ میں ہوئی۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ (تقصار جیود الأحرار من تذکار جنود الأبرار)

حضرت مولانا قاری امام الدین بخشی امروہویؒ متوفی ۱۲۵۶ھ

نام ونسب: آپؒ ۱۱۹۳ھ میں پیدا ہوئے، آپؒ کے والد خاندانِ بخشی میں پہلے شخص تھے جنہوں نے شیعہ مذہب اختیار کرلیا تھا، چنانچہ آپؒ بھی ابتداءِ عمر میں اپنے باپ کے مسلک پر رہے۔

تحصیل علم: حضرت مولانا شاہ ضیف اللہ نقشبندی خلیفہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ سے تحصیل علم کی، اسی کا یہ نیک نتیجہ برآمد ہوا کہ آپؒ نے اپنے آبائی مذہب اہل سنت والجماعت کو اختیار کرلیا، تبدیل مذہب کی بنا پر باپ کی سختیوں سے عاجز آکر بمشورۂ حضرت شاہ ضیف اللہؒ آپؒ دہلی گئے، وہاں حضرت شاہ عبدالقادر محدثِ دہلویؒ کے درس میں شامل ہوگئے اور تکمیل کی، حضرت مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادیؒ بھی آپؒ کے ہم درس تھے، طالب علمی کے زمانے میں وہ بھی اپنے رفیق درس کے ہمراہ امروہہ آتے رہتے تھے اور قاری صاحبؒ کی مسجد میں ٹھہرتے تھے۔

بیعت وخلافت: اسی اثناء میں سلوکِ باطنی طے کرنے کا جذبہ آپؒ کے قلب میں پیدا ہوا، اس موقع پر بھی آپؒ اپنے استاذ ومربی حضرت سید شاہ ضیف اللہؒ کے ارشاد کے مطابق حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ کی خدمت میں پہنچے، ان کی خدمت میں رہ کر حقائق ومعارف کے باطنی درس سے مستفیض ہوئے، مجاہدہ وریاضات سے مقاماتِ عالیہ طے کیے اور خلعت خلافت سے سرفراز ہوئے، پیر

و مرشد کے حکم کے مطابق قاری صاحبؒ اپنے وطن امروہہ واپس آئے۔

اخلاقِ فاضلہ: آپؒ وہاں درس و اِفادہ میں مصروف ہوئے اور یادِ الٰہی میں اپنے اوقات کو صرف کیا، عزلت گزینی آپؒ کو زیادہ پسند تھی، متوکل اور قناعت پسند تھے، تواضع اور کسر نفسی آپؒ کا شیوہ تھا، مرید بہت کم کرتے تھے، نورانی، خندہ پیشانی، عابد و زاہد بزرگ تھے، کوئی سنت بلکہ مستحب بھی نہ چھوڑتے تھے۔

معمولات: آپؒ کے معمولات یہ تھے کہ بعد نمازِ فجر مراقبہ و اشراق سے فارغ ہو کر حدیث، تفسیر اور فقہ کا درس دیتے تھے، دور دور سے تشنگانِ علوم آتے اور ان کے دریائے فیض سے سیراب ہوتے تھے، ظہر کے بعد پھر طلبہ کو درس دیتے تھے، بعد نمازِ عصر طالبانِ حق کی تعلیم باطنی میں مشغول ہو جاتے تھے، جمعہ کے دِن وعظ کہتے تھے۔

قاری عبدالرحمن محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے امروہہ آ کر آپؒ سے علم تجوید پڑھ کر سند حاصل کی، تذکرۂ رحمانیہ میں وہ سند درج ہے، بخاری کے بھی چند پارے آپؒ نے امروہہ میں ہی پڑھے، باقی حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ سے دہلی جا کر پڑھے تھے۔ قاری عبدالرحمن محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ ''تبیین الضاد'' آپؒ کے صاحب زادے مولانا کریم بخش بخشیؒ کی فرمائش پر لکھا تھا، جیسا کہ اس رسالہ کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ امروہہ کے مشہور مؤرخ مولانا آل حسن بخشیؒ مؤلف نخبۃ التواریخ آپؒ کے باکمال پوتے تھے۔ حضرت مولانا قاری امام الدینؒ کے ذریعہ علمِ تجوید و قراءت کی بھی بڑی اشاعت ہوئی، ''کشف الغطائ، رد الربا، السماع والغنائ'' اور چند

تجویدی رسائل آپؒ نے تالیف فرمائے تھے۔

اپنے محلہ کی (یعنی محلہ بخشی نزد چاہ شور کی) مسجد میں جس کو آپؒ نے دو بارہ تعمیر کرایا تھا زیادہ وقت گزارتے تھے اور وہیں درس و اِفادہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

وفات: آپؒ نے ۶/ ذوالقعدہ/ ۱۲۵۶ھ میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(قافلۂ اہل دل/صفحہ: ۲۶۴، مؤلفہ مولانا نسیم احمد امروہی)

حضرت شیخ حسام الدین چشتی گجراتیؒ متوفی ۱۲۵۷ھ

نام ونسب اور ولادت: آپؒ کا نام شیخ حسام الدین ہے، ''خوب میاں'' آپؒ کا عرف ہے، آپؒ شیخ رشید الدین مودود لالہ چشتیؒ کے لائق صاحب زادے ہیں، آپؒ کی ولادت ۱۲۰۳ھ میں شہر احمد آباد گجرات میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت: آپؒ نے سن شعور وتمیز کے بعد والد ماجدؒ کی خدمت میں کتب درسیہ علمیہ ختم کی اور تصوف وسلوک کی تکمیل بھی والد ماجدؒ سے کی، ریاضت وعبادت میں مصروف ہوئے، چند مدت کے بعد صاحب کمال اور صاحب وجد وحال ہوئے۔

فضل وکمال: ماشاء اللہ! آپؒ عالم فاضل وصوفیٔ کامل اور واصل باللہ تھے، متقی، مرتاض، متدین اور متشرع تھے، صاحب مکاشفہ ومجاہدہ اور مراقبہ ومشاہدہ کے اوصاف سے مشرف تھے، آبائے کرام وبزرگانِ ذی احترام کے طریقہ پر قائم تھے، سیر وخصائل میں سلف صالحین کے ہم قدم تھے، خلائق کی تعلیم وتربیت آپؒ کا کام تھا، آپؒ کی ہدایت وتلقین کا فیض عام تھا، آپؒ نے تعلیم وتربیت کا دروازہ کشادہ کیا، بلاد وامصار سے جوق در جوق طلبہ آتے تھے اور آپؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوتے تھے، آپؒ فقراء کے دوست اور طلبہ پر شفیق تھے، مہمان نواز وغرباء پرور تھے، طالبین ووار دین (آمد ورفت رکھنے والوں) کی خبر گیری خاص اپنی ذاتی ملکیت سے فرماتے تھے، ہر ایک کی دست گیری خوراک

و پوشاک سے کرتے تھے، الحمدللہ، اکثر طلبہ آپؒ کے فیضانِ نعمت سے فائز المرام ہوئے، آپؒ حسن اخلاق و کسرِ نفسی میں بے نظیر اور آسمانِ عرفان کے بدرِ منیر (چودہویں کے چاند) تھے، صاحب خوارقِ عادات و مظہر کشف و کرامات تھے۔

کرامات: رسالہ معتبرہ کے مؤلف نے آپؒ کی خوارقِ عادات کی حکایتیں اکثر لکھی ہیں، ان ہی میں سے ایک یہ ہے کہ جب حضرتؒ جہاز میں سوار ہو کے عازمِ حرمین شریفین ہوئے، آپؒ کا جہاز دریائے سقوطرہ میں پہنچا، وہاں مخالف ہوا کی وجہ سے طوفان میں گرفتار ہوا، اہل جہاز مضطرب الحال ہوئے اور آپؒ کی خدمت میں عرض کی کہ آپ مقبول الدعاء ہیں، جنابِ باری تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ ہم کو طوفان سے نجات ملے، جہاز میں اس قسم کے لوگ بھی تھے کہ وہ اولیاءِ کرام کے خوارق و دعاؤں کے منکر تھے، اس لیے ان سب نے کہا کہ حضرت سے التجا کرنا فضول ہے، یہ بات حضرتؒ کو معلوم ہوئی، آپؒ نے فرمایا کہ اولیاء اللہ کی کرامات حق ہیں اور ان کی دعا مقبول ہے، اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہیں، پھر آپؒ نے دعا کی، دعا کرتے ہی طوفان دفع ہوا اور جہاز چلا، چند ہی روز میں مع الخیر والعافیہ جدہ پہنچ گئے، اہل جہاز معتقد ہوئے، آپؒ مکہ معظّمہ حرمِ محترم میں داخل ہوئے، زیارت و طواف سے فراغت پائی، اس وقت ایک بزرگ آپؒ کی خدمت میں آئے اور ملاقات سے مشرف ہوئے، اور ملاقات کر کے روانہ ہو گئے، سید عبداللہ قدس سرہٗ جو حرم کے قطب تھے ان سے معلوم ہوا کہ وہ بزرگ بیت المقدس کے قطب و شیخ تھے، پھر آپؒ مدینہ منورہ گئے، وہاں سید گل محمدؒ جو قطب الاقطاب و اکمل الاولیاء تھے آپؒ کے استقبال کے لیے آئے اور نہایت

حسن اخلاق سے ملے، اور فرمایا کہ مجھ کو حضرتؒ سے بشارت ملی کہ میری طرف سے ولدی (میرے لڑکے) خوب میاں کو کہو **"مرحبا بک و خیر مقدم"** (آپ کو خوش آمدید ہو) آپؒ نے تعظیماً وشکراً سر تسلیم کو جھکایا اور روضۂ منورہ میں زیارت کے لیے گئے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے، جب تک مدینہ میں رہے ہر روز زیارت وسلام سے مشرف ہوتے تھے، بے شمار فوائد حاصل کیے، پھر جد امجد حضرت قطب المدینہ شیخ یحیٰ معشوق اللہؒ کی زیارت سے بھی معزز ہوئے۔ اہل گجرات آپؒ کی تشریف آوری سے خوش ہوئے۔

ف: اس سے بڑھ کر خوشی کی بات ہی کیا ہوسکتی ہے کہ کوئی ولیٔ کامل کسی کی بستی میں تشریف لائے۔ **فهنيئًا لهم**۔ (مرتب)

وفات: آخر آپؒ نے ۹/ ذوالقعدہ/ ۱۲۵۷ھ میں اس عالم فانی سے فردوسِ بریں کو رحلت فرمائی، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً، شاہ پور، احمد آباد، گجرات میں خانقاہ میں مدفون ہوئے، مزار کی زیارت کی جاتی ہے۔

(محبوب التواریخ:۱/ ۲۸۷، مؤلفہ سید یوسف محمد الحسینی)

حضرت اقدس میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ [1] متوفی ۱۲۵۹ھ

نام ونسب: نام نور محمد، والد کا نام شاہ جمال محمد بن سید پیر محمد ہے، آپؒ کا سلسلۂ نسب سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ تک پہنچتا ہے، حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب جھنجھانویؒ آپؒ کے نویں پشت کے جد امجد ہیں، جن کی تصنیف لطیف ''صحائف معرفت'' ہے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۲۰۱ھ کو جھنجھانہ میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم: حفظ کلام پاک آپؒ نے جھنجھانہ ہی کے کسی مکتب میں کیا، ابتدائی فارسی کی تعلیم بھی یقینا دستورِ زمانہ کے مطابق اپنے خاندان کے کسی بزرگ یا کسی دوسرے صاحب علم شخص سے حاصل کی ہوگی، کیوں کہ اس وقت قصبات میں عام طور پر سلسلۂ تدریس وحصولِ تعلیم کے لیے باقاعدہ مدارس بہت کم ہوتے تھے، اس لیے ایسے اہل علم وفضل حضرات ہی سے شائقین علم وفن اور طالبانِ فضل وکمال کسب علم وفیض کرتے تھے جن کی ہستی خود ایک اِدارہ ہوتی تھی، یہ حضرات اتالیقی ومعلمی کو ایک فریضۂ مقدس سمجھ کر اپنے متعلقین ومتوسلین کی ذہنی اور اخلاقی تربیت پر خصوصی توجہ دیتے تھے، حضرتؒ کو بھی اس زمانہ میں یقینا کوئی ایسا شفیق وباکمال استاذ ملا ہوگا، کیوں کہ اس وقت جھنجھانہ کو علماء وفضلاء کے وجود سے ایک

---

[1] آپؒ کے حالات قاری عزیز الرحمن صاحب ناظم مدرسہ دینیہ لوہاری کی تصنیف ''حیاتِ قطبِ عالم حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ'' سے ماخوذ ہیں۔ (مرتب)۔

امتیازی حیثیت حاصل تھا اور خود آپ ؒ کے خاندان میں علم و فضل کی فراوانی اور ارزانی تھی، اب سے کچھ دِنوں پیشتر تک ان کے خاندان کے افراد کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ ماں کے پیٹ سے ہی پڑھے لکھے یا عالم پیدا ہوتے ہیں۔

سفر دہلی: آپ ؒ نے ایک طفل معصوم اور علم کی طلب صادق رکھنے والے ایک نو عمر و نوجوان طالب علم کی حیثیت سے اپنی عمر عزیز کے کتنے سال اپنے وطن مالوف میں گزارے اور کس سن میں پہلی بار حصولِ تعلیم کی غرض سے شاہجہاں آباد (دہلی) کا سفر اختیار کیا اس کی نسبت کوئی زبانی روایت بھی معلوم نہ ہوسکی، گمانِ غالب ہے کہ اٹھارہ اور بیس سال کے سن کے درمیان ایسا ہوا ہوگا۔

درس و تدریس: دہلی سے سلسلۂ تعلیم ترک کرنے کے بعد آپ ؒ جھنجھانہ واپس آگئے، کچھ زمانہ تک یہیں قیام رہا، اس کے بعد آپ ؒ نے قصبہ لوہاری میں جو تھانہ بھون کے قریب ہے بچوں کو قرآنِ پاک اور فارسی کی تعلیم دینے کے لیے ملازمت کر لی، اس وقت کے اعتبار سے آپ ؒ کی تنخواہ دو روپے ماہوار تھی۔ قدوۃ العلماء حضرت مولانا صادق صاحب ؒ کی فرمائش وطلب پر آپ ؒ یہاں (قصبہ حسن پور، لوہاری) آئے اور درس و تدریس کی ۳۶ سال تک وہ گراں قدر محنت کی کہ جس کی نظیر نہیں ملتی، جس مسجد میں آپ ؒ کا قیام تھا وہ مسجد مولانا صادق صاحب ؒ کی کہلاتی تھی، اسی مسجد سے حضرت مولانا صادق صاحب ؒ نے درس و افادہ کا سلسلہ جاری کیا تھا، میاں جی صاحب ؒ کا قیام بھی اسی مسجد کے ایک حجرے میں تھا، حجرے کے سامنے خانقاہِ نوریہ تھی، جہاں شب و روز ذکر الٰہی ہوتا تھا۔

لوہاری میں درس و تدریس: لوہاری میں ملازمت کب شروع ہوئی؟ اس

کی بھی تاریخ اور سن حتمی طور پر معلوم نہیں، لیکن مولانا شیخ محمد تھانویؒ کی ایک تحریر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تقریباً بائیس یا تیئیس سال کی عمر میں ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء میں لوہاری آگئے تھے۔ مولانا شیخ محمد تھانویؒ نے لکھا ہے: ’’درآنجا (یعنی در لوہاری) حضرت سی وشش سال بلکہ زائد ازاں تشریف داشتند۔‘‘

حضرت میاں جی صاحبؒ کی وفات رمضان المبارک یا شوال المکرم ۱۲۵۹ھ مطابق: ۱۱/اکتوبر، نومبر/۱۸۴۲ء میں ہوئی، اگر اس میں سے ۳۶ سال کم کردیے جائیں تو بارہ سو تیئیس ۱۲۲۳ھ باقی رہتے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ ان ہی سنین میں لوہاری تشریف آوری ہوئی تھی، اس وقت سے آخر زمانۂ حیات تک (ایک درمیانی وقفہ کے علاوہ) مسلسل لوہای میں قیام فرمارہے، درمیان میں کسی وجہ سے اہل لوہاری سے کبیدہ خاطر ہوکر جھنجھانہ آگئے تھے، مگر جلد ہی اہل لوہاری کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا، وہ لوگ میاں جیؒ کو واپس لوہاری لے آئے تھے، میاں جی صاحبؒ کا قیام ایک ملازم اور معلم کی حیثیت سے تھا، جس کی طرف حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ نے بھی ایک مکتوب میں اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ (حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کو) تحریر فرماتے ہیں:

’’نوکریٔ مطبع خوب نمی پندارم کہ از صبح تا شام ہمہ تن مصروفیت بوے باشد، اگر نوکریٔ معلمی بود چہ خوش است، اوّل سنت سیدی وشیخی قدس سرہٗ است۔‘‘

ترجمہ: میں پریس کی ملازمت کو اچھا نہیں سمجھتا، کیوں کہ اس میں صبح سے شام تک اسی کی مصروفیت رہتی ہے، اگر پڑھانے کی ملازمت ہوتی تو کیا ہی اچھا ہوتا، پہلے تو وہ میرے شیخ اور سردار (حضرت میاں جی نور محمد صاحبؒ) کا

طریقہ ہے۔

قصبہ لوہاری کے قیام سے حضرت میاں جی نور محمد صاحبؒ کو بہت زیادہ منافع وفوائد حاصل ہوئے ہیں، اوّل تو معرفت کی چاشنی پیدا ہوئی، یہیں سب سے پہلے پیرو مرشد حضرت شاہ احسان علی صاحب پٹنیؒ کی زیارت ہوئی، یہیں ان سے بیعت ہوئے اور روحانی تربیت واستفادہ کا موقع ملا، یہیں کے قیام میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی رحمہ اللہ سے وابستگی نصیب ہوئی اور یہیں حضرت سید احمد شہیدؒ کا دامن تھاما اور اجازت وخلافت حاصل کی، اس سلسلہ کی ابتدا حضرت شاہ احسان علی پٹنیؒ سے ملاقات، تأثر، عقیدت اور بعد میں بیعت واستفادہ کا ذریعہ ہوئی۔

حضرت شاہ احسان علی صاحبؒ کے تعلیم فرمودہ معمولات کا تاحیات اہتمام

حضرت شاہ احسان علی صاحبؒ سے میاں جی نور محمد صاحبؒ کو اجازت وخلافت حاصل نہیں ہوئی تھی، ان کی وفات کے بعد دوسرے مرشدین سے رجوع ہو گئے تھے، مگر آخری زمانۂ حیات تک شاہ احسان علیؒ کے تعلیم کیے ہوئے معمولات پر اہتمام سے کاربند رہے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں جب تک شاہ احسان علیؒ کے بتائے ہوئے معمولات پورے نہیں کر لیتا میری طبیعت خوش نہیں ہوتی۔

''تا وقتیکہ اشغال فرمودۂ حضرت شاہ احسان علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ را نمی کنم طبع درست وخوش نمی شود۔'' (بیاضِ دل کشا: ۱۵۲)

ترجمہ: جب تک میں حضرت شاہ احسان علی صاحبؒ کے تعلیم فرمائے ہوئے اَورادو معمولات پورے نہیں کر لیتا میری طبیعت بحال اور خوش نہیں ہوتی۔

شاہ عبدالرحیم ولایتی رحمہ اللہ سے رجوع: شاہ احسان علیؒ کی وفات کے بعد حضرت میاں جی نور محمد صاحبؒ شاہ عبدالرحیم ولایتی رحمہ اللہ کے دامن تربیت سے منسلک ہو گئے، شاہ عبدالرحیمؒ سے حضرت میاں جی صاحبؒ کی واقفیت غالباً خاصی پرانی تھی، شاہ عبدالرحیمؒ اور شاہ عبدالعلیم لوہارویؒ کے علاوہ اخوند جان محمدؒ ہندوستان کے سفر اور ذوقِ معرفت میں ان کے رفیق تھے، اس نسبت سے نیز شاہ احسان علیؒ وغیرہ کی وجہ سے شاہ عبدالرحیمؒ کا بھی جلال آباد لوہاری سے ایک رِشتہ جڑا ہوا تھا، وہ بھی کبھی کبھی ان مواضعات میں آتے رہتے تھے، شاہ عبدالرحیمؒ سے رجوع کیے غالباً زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ شروع ۱۲۳۴ھ میں حضرت سید احمد شہیدؒ اس (نواحِ دیوبند، سہارن پور، لوہاری، کاندھلہ) کے سفر پر تشریف لائے، اس وقت جب حضرت سید صاحبؒ سہارن پور میں تھے، تو حضرت میاں جی نور محمد صاحبؒ کو حضرت سید صاحبؒ سے استفادہ کی سعادت میسر آئی اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحبؒ نے پیر و مرید (شاہ عبدالرحیمؒ و میاں جی نور محمدؒ) دونوں کو غالباً بیک وقت اجازت عطا فرمائی۔

حضرت سید صاحبؒ اور شاہ عبدالرحیمؒ سے اجازت کی کچھ تفصیل

حضرت سید صاحبؒ سہارن پور وغیرہ سے راستے کی بستیوں اور قصبات سے گزرتے قیام فرماتے ہوئے ۱۲۳۴ھ میں لوہاری تشریف لائے، اس سفر میں میاں جی صاحبؒ سید صاحبؒ کے ہم رکاب تھے، لوہاری آنے کے بعد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے حضرت میاں جی صاحبؒ کو سلسلۂ چشتیہ کی اجازت سے نوازا، اس کے علاوہ حضرت میاں جی صاحبؒ کو کس سلسلہ میں کس

سے اجازت ہے اس میں الگ الگ اطلاعات ہیں۔ حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ نے ''ارشادِ محمدی'' میں صاف لکھا ہے: ''حضرت میاں جی صاحبؒ نے تمام سلاسل کی تکمیل حضرت سید احمد شہیدؒ سے کی تھی، صرف چشتیہ صابریہ کی شاہ عبدالرحیم ولایتی رحمہ اللہ سے کی۔'' (ارشادِ محمدی: ۳)

اور ''انوارِ محمدی'' میں سب سلسلوں کے شجرے بھی درج کیے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں جی صاحبؒ کو حضرت سید صاحبؒ سے سلسلۂ نقشبندیہ میں، سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں اور چشتیہ صابریہ میں بھی اجازت حاصل تھی۔ اور شاہ عبدالرحیمؒ سے علاوہ چشتیہ صابریہ کے ایک سلسلۂ اجازت نسبت سہروردیہ کا بھی ہے۔

حضرت حاجی امداداللہ تھانوی مہاجر مکیؒ کا ارشاد ہے کہ ''شاہ عبدالرحیمؒ کو بواسطہ سید رحیم علی شاہؒ سلسلۂ قادریہ قمیصیہ میں اجازت حاصل ہے اور سلسلۂ نقشبندیہ قدوسیہ میں حضرت سید احمد شہیدؒ سے اجازت ہے۔''

مکتوب: حاجی عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے مہربان ومخلصان میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلام مسنون......

''سلام کے بعد مدعائے ضروری مکتوبِ ضمیر ہو کہ جو آں جناب سے ارادۂ بیعت رکھے پوری طمانینت قلب کے ساتھ اسے بیعت فرمالیں اور تلقین طالبین کرتے رہیں اور اس امر میں ہرگز واگذاری ودریغ نہ فرمائیں اور اس معنیٰ کے مخالف کسی وسوسہ وخطرہ کو زنہار دل میں راہ نہ دیں، نیز مراداتِ عظیمہ میں اہم

ترین مقصد یہ ہے کہ خود (حضرت میاں جی نور محمد صاحبؒ) ظاہری و باطنی اعتبار سے شریعت حقہ پر مستقیم رہیں اور بدعت وشرک سے بہرنوع پاک رہیں اور ایسی ہدایت دیگر مؤمنین ومخلصین کو فرماتے رہیں۔بس، زیادہ خیریت۔''

والسلام

(منقول از: ''انوارِ محمدی'')

ف: سبحان اللہ، کیسی اہم نصیحت ہے کہ ظاہری و باطنی اعتبار سے شریعت حقہ پر قائم رہنے کی تاکید بلیغ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آج کل امراء و مشائخ کو خود اولاً اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے اور مریدین، متعلقین اور اپنے اہل خانہ کو اس کی ہدایت کرتے رہنا چاہیے، اور اعمال واخلاق کی نگرانی کرتے رہیں، تاکہ راہِ راست پر قائم رہیں۔ اور حضراتِ چشتیہ کو خاص طور پر حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کی تصنیف ''السنۃ الجلیۃ فی الچشتیۃ العلیۃ'' کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، تاکہ ان حضرات کے کمالات وخصوصیات عیاں ہوں اور ان کے طریقہ پر چلنے کی سعادت نصیب ہو۔ (مرتب)۔

پاکیزہ زندگی: میاں جی نور محمد صاحبؒ قصبہ حسن پور، لوہاری میں بحیثیت ایک معلم کام کرتے رہے اور مستور الاحوال رہے، آخر شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب فاروقی، تھانوی، مہاجر مکی و مدنی ایک عجیب طریقہ سے آپؒ کے مرید ہوئے اور آپؒ کے جلوؤں کو عام کرنے کا سبب بنے، آپ اس واقعہ کو مصنفِ ''شمائمِ امدادیہ'' کی زبان سے سنیے:

''حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے مطالعہ ''''مثنوی مولانا روم''

کو بطورِ ورد کے معمول بنالیا تھا، خاطر اقدس کو ایک حرکت بلیغ پیدا ہوتی تھی اور جوش وخروش باطنی آئینۂ چہرۂ انور سے ظاہر ہوتا تھا اور داعیۂ سلوکِ صامت سینہ صفت گنجینہ میں جلوۂ اضطرار ڈالتا تھا کہ ایک دِن آپؒ نے خواب دیکھا کہ مجلس اعلیٰ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم مرشد اتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوں، غایت رُعب سے قدم آگے نہیں پڑتا ہے، ناگاہ میرے جد امجد حضرت شاہ بلاقی صاحبؒ تشریف لائے اور میرا ہاتھ پکڑ کر حضورِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پہنچا دیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرا ہاتھ لے کر حضرت میاں جی صاحب علوی جھنجھانوی چشتی صابریؒ کے حوالے کر دیا، اس وقت بعالم ظاہری حضرت میاں جی نور محمد صاحبؒ سے کسی طرح کا تعارف نہ تھا، بیان فرماتے ہیں کہ جب بیدار ہوا تو عجب انتشار وحیرت میں مبتلا ہوا کہ یارب! یہ کون بزرگوار ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر ان کے ہاتھوں میں دے دیا؟ مجھ کو خود ان کے سپرد فرما دیا، اسی طرح کئی سال گزر گئے کہ ایک دِن استاذی مولانا قلندر شاہ صاحب محدث جلال آبادی شاگردِ رشید وخلیفہ مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلویؒ نے میرے اضطرار کو دیکھ کر بکمالِ شفقت فرمایا: ''تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ موضع لوہاری یہاں سے قریب ہے، وہاں چلے جاؤ اور حضرت میاں جی صاحبؒ سے ملاقات کرو، شاید مقصودِ اصلی کو پہنچو اور حیص بیص (تردّد) سے نجات پاؤ، میں گرمی وسفر سے حیران وپریشان چلا جاتا تھا، یہاں تک کہ پیروں میں آبلے پڑ گئے، بارے بہ کشش وکوشش آستانہ شریف پر حاضر ہوا اور جیسے ہی دور سے جمالِ باکمال جنابِ والا کو ملاحظہ کیا چہرۂ انور کو خواب میں دیکھا تھا بخوبی پہچانا اور محوِ خود رفتگی ہو گیا اور آپے سے گزر گیا، اُفتاں وخیزاں ان کے حضور میں پہنچ کر قدموں پر گر پڑا، حضرت میاں

جی صاحبؒ نے میرے سر کو اُٹھایا، اپنے سینۂ نور گنجینہ سے لگایا اور بکمالِ رحمت وعنایت فرمایا کہ ”تم کو اپنے خواب پر کامل وثوق ہے“، یہ پہلی کرامت منجملہ کراماتِ حضرت میاں جی صاحبؒ سے ظاہر ہوئی اور اس کو بکمالِ استحکام مائل بخود کیا۔

الحاصل ایک مدّت تک خدمت بابرکت حضرت میاں جی صاحبؒ میں حلقہ نشین رہا، سلوکِ طرقِ اربعہ عموماً اور طریقۂ چشتیہ صابریہ میں خصوصاً کیا اور حضرتؒ سے خلافت تامہ اور اجازتِ خاصہ و عامہ سے مشرف ہوا، بعد عطاءِ خلافت حضرت میاں جی صاحبؒ نے فرمایا: ”کیا چاہتے ہو؟ تسخیر یا کیمیا؟ جس کی رغبت ہو تم کو بخشوں“، میں یہ سن کر رونے لگا اور عرض کیا کہ ”دنیا کے واسطے آپ کا دامن نہیں پکڑا ہے، اللہ کو چاہتا ہوں، وہی مجھ کو بس ہے“، حضرت میاں جی صاحبؒ یہ جوابِ باتمکین سن کر بہت مسرور وخوش مزہ ہوئے اور مجھ کو بغل گیر فرما کر علوِ ہمت پر آفرین کی اور دعاہائے جزیلہ وجمیلہ دیں۔

جس طرح دربارِ نبوی سے آپؒ کو حضرت میاں جی صاحبؒ کی مریدی کا شرف بخشا گیا اسی طرح درگاہِ نبوی سے آپؒ کو حضرت کے خلیفۂ خصوصی کا رُتبۂ عالیہ اور اخذ بیعت کے لیے عمامۂ امامت امت عطا ہوا، چنانچہ حاجی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ”میں نے درمیان روضۂ شریف ومنبر کریمہ کہ ”روضة من رياض الجنة“ اس کی شان ہے- مراقبہ کیا، معلوم ہوا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبر مقدس سے خود بصورتِ میاں جی صاحبؒ نکلے اور ایک لپٹا اور بھیگا ہوا عمامہ اپنے دست مبارک میں لیے ہوئے تھے، جو میرے سر پر غایت شفقت سے رکھ دیا اور واپس تشریف لے گئے۔“

مصنف ''شمائمِ امدادیہ'' کہتے ہیں کہ یہ عبارت ہے اجازتِ مطلقہ آں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور بھیگا ہوا عمامہ اشارہ ہے طرف سلوک کے بعد جذب و تمکین بعد تکوین و بقا بعد فنا کے، نیز یہ مجموعہ اشارہ واپسیٔ وطن کا ہے۔

(شمائمِ امدادیہ:۱۵)

آپؒ کا زہد و ورعِ کامل: ایک طرف تو اہل باطن کی دنیا میں آپؒ کے مراتب و مدارج یہ تھے، دوسری طرف اہل ظاہر کی نگاہوں میں آپؒ کے زہد و ورع اور پابندِ شرع ہونے کی کیفیت یہ تھی کہ تیس سال تک کبھی حضرتؒ کی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی، چنانچہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ فرماتے ہیں کہ ''مولوی محمد صادق صاحبؒ بیان کرتے تھے کہ میری تیس سال سے حضرت میاں جی صاحبؒ سے ملاقات ہے، ان تیس سالوں میں کبھی آپؒ کی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی۔''

معاملات و مسائل مذہبی میں بڑی احتیاط برتتے تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ یا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ وغیرہ فرماتے تھے کہ ''لوہاری میں کوئی شخص خوش گلو آیا ہوا تھا، کسی نے حضرت میاں جیؒ سے عرض کیا کہ وہ شخص خوش گلو ہے اور نعت پڑھتا ہے، آپ بھی سن لیں، آپؒ نے فرمایا: ''لوگ مجھے کبھی کبھی امام بنا دیتے ہیں۔''

کرامات: (۱) کہا جاتا ہے کہ حضرت میاں جی صاحبؒ کسی بات پر لوہاری کے پٹھانوں سے ناراض ہو کر جھنجھانہ تشریف لے گئے، حضرتؒ کے لوہاری سے چلے جانے کے بعد لوہاری کے اکثر محلوں میں آگ لگ جاتی تھی، جس سے وہاں

کی خواتین کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ آگ کا لگنا حضرت میاں جی نور محمدؒ کی خفگی کے باعث ہے، چنانچہ وہ لوگ جھنجھانہ پہنچے، خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور حضرتؒ کی خوشامد کرکے لوہاری واپس لے آئے، حضرتؒ کی مراجعت کے بعد پھر لوہاری میں آگ نہیں لگی، خواتین نے حضرتؒ کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا کہ ''حضرت! جب آپ لوہاری والوں سے خفا ہوکر جھنجھانہ تشریف لے گئے تھے تو یہاں مختلف محلوں میں آگ لگ جاتی تھی اور کچھ دیر کے بعد خود بجھ جاتی تھی، اس کا کیا سبب ہے؟'' حضرتؒ نے جواب دیا: ''مجھے اور تو کچھ معلوم نہیں، صرف لوہاری سے محبت کے باعث مجھے اس کا ماحول اور محلے یاد آتے تھے۔''

(۲) آگ لگنے کا واقعہ تو آپ نے سن لیا، اب آگ بجھنے کا بھی سن لیجیے، حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے یہاں ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب علویؒ کی بعض کرامتیں بھی عجیب وغریب ہیں، فرمایا کہ ''جی ہاں، ایک مرتبہ کسی کے کھیت میں آگ لگ گئی، کھیت والے نے حضرتؒ سے آکر شکایت کی، آپؒ نے اپنے ٹوپی اُتار کر دے دی کہ جلد سے جاکر آگ میں ڈال دو، اس شخص نے ایسا ہی کیا، آگ فوراً بجھ گئی۔''

(۳) آگ لگنے اور بجھنے کے ساتھ بارانِ رحمت کے نزول کی حکایت بھی سن لیجیے، یہ حکایت نسیم احمد علویؒ نے اپنے پھوپھا مولوی محمد میاں صاحب مرحوم سے - جو حضرت میاں جی نور محمدؒ کے حقیقی بھتیجے یعنی غلام حیدر صاحب علویؒ کے لڑکے تھے- سنی تھی، حضرت میاں جیؒ کے زمانے میں ایک مرتبہ بارش کی سخت قلت ہوئی، چند حضرات میاں جیؒ کی خدمت میں بغرضِ دعا حاضر ہوئے، حضرتؒ

اس وقت گناّ چوس رہے تھے، جب حضرتؒ سے بارش نہ ہونے کی شکایت اور دعا کی درخواست کی، آنے والوں میں سے جو صاحب حضرتؒ سے انتہائی بے تکلف تھے آپؒ نے ان سے فرمایا کہ ''اگر تم میرے گنےّ کے چھلکے چوس لو تو ان شاء اللہ بارش ہو جائے گی، ان صاحب کو پہلے تو گنےّ کے چھلکے چوسنے میں کچھ تکلف ہوا، مگر آنے والوں کے اِصرار پر ان صاحب نے حضرتؒ کے چوسے ہوئے چھلکوں کو چوس لیا، جس پر ابر رحمت اُٹھا اور خوب زور سے بارش ہوئی۔

(۴) قبولِ دعا اور استمداد ہمت کا ایک اور دلچسپ واقعہ سنیے، حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے جس وقت تھانہ بھون کی مسجد پیر محمد والی میں قیام فرمایا -جواب ''خانقاہِ امدادیہ اشرفیہ'' کے نام سے موسوم ہے- اس وقت یہاں سہ دری نہ تھی، کچھ قبریں تھیں، کچھ درخت تھے اور اس جگہ ایک بزرگ بیٹھا کرتے تھے، جن کا نام حسن علی شاہ تھا، صاحب سماع تھے، مگر دنیا دار نہ تھے، جب حضرت حاجی صاحبؒ یہاں تشریف لائے تو انہوں نے اتنا ادب کیا کہ خود اٹھ کر شاہ ولایت میں چلے گئے، حالاں کہ اس وقت حضرت حاجی صاحبؒ جوان تھے اور یہ بوڑھے، ان کے جانے کے بعد حاجی صاحبؒ کا قیام ونشست گاہ یہی جگہ تھی، حضرت میاں جیؒ بھی یہاں تشریف لایا کرتے تھے، تھانہ بھون میں ایک خاندان تھا، ان کی زمین ضبط ہو گئی تھی اور وہ کوشش کر رہے تھے، حضرت میاں جی صاحبؒ کے پاس بھی وہ لوگ دعا کے واسطے حاضر ہوئے، حضرتؒ نے فرمایا: ''میرے حاجی صاحب کو بیٹھنے کی تکلیف ہے، یہاں ان کے لیے ایک سہ دری بنوا دو، میں دعا کروں گا''، انہوں نے سہ دری بنوانے کا وعدہ کر لیا، حضرتؒ

نے دعا کی، وہ مقدمہ الٰہ آباد جا کر موافق ہو گیا، جس کی اطلاع ایک خاص خط سے ہوئی، حضرت میاں جیؒ سے تذکرہ کیا گیا، تو حضرتؒ نے فرمایا کہ ''وعدہ بھی یاد ہے؟'' کہا: حضرت! پوری سہ دری بنوانے کی طاقت نہیں، آدھی بنا دیں گے'' حضرتؒ نے فرمایا: ''بہت اچھا، آدھی ہی سہی'' پھر الٰہ آباد سے حکم آیا کہ تا حیات تو معاف، تمہارے بعد پھر ضبط، انہوں نے آ کر حضرت میاں جی نور محمد صاحبؒ سے عرض کیا، حضرتؒ نے فرمایا: ''تم نے آدھا ہی کیا ہے، میں کیا کروں؟''

(۵) جب اس سرچشمۂ فیوض و برکات سے دوسرے اس طرح مستفیض و مستنیر ہو رہے تھے تو اپنے کیوں محروم رہتے؟ حضرتؒ کی اہلیہ محترمہ آنکھوں سے بالکل معذور تھیں، ایک بار جب حضرت میاں جی صاحبؒ کے کسی قریبی عزیز کے یہاں کوئی تقریب تھی، مہمان بچوں اور عورتوں کا ہجوم زیادہ تھا، حضرتؒ کی اہلیہ محترمہ مہمانوں کی خاطر و مدارات میں مشغول تھیں، مگر بینائی نہ ہونے کی وجہ سے سخت پریشانی اور مشکل میں تھیں، حضرتؒ سے بطورِ ناز کہنے لگیں: ''لوگ کہتے ہیں کہ آپ ولی ہیں! ہم کیا جانیں؟ ہماری آنکھیں درست ہو جائیں تب ہم جانیں۔'' ......غالبؔ کی زبان میں یہ شعر سنئے!

ابن مریم ہوا کرے کوئی　　　میرے دل کی دوا کرے کوئی

حضرت میاں جی صاحبؒ باہر تشریف لے گئے اور دعا فرمائی، اتفاقاً حضرتؒ کی پیرانی صاحبہؒ کسی طرف جا رہی تھیں، راستہ میں دیوار سے ٹکرا گئیں، غشی طاری ہو گئی اور گر پڑیں، تمام جسم پسینہ پسینہ ہو گیا، آنکھوں سے بہت پسینہ یا پانی نکلا، ہوش آیا تو قدرتِ خداوندی کا تماشا دیکھا کہ دونوں آنکھیں کھل گئیں

اور نظر آنے لگا، بیوی نے جو کچھ ان سے مانگا وہ ان کو مل گیا۔

ف: کرامات کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ حق ہیں، جیسا کہ شرحِ عقائد میں ”کرامات الأولیاء حق“ لکھا ہوا ہے۔(مرتب)۔

وفات: حضرت میاں جی صاحبؒ لوہاری میں قیام فرماتے تھے اور تعلیم وافادہ میں مشغول تھے کہ اچانک تپ ولرزہ کی وبا آئی اور حضرت میاں جی صاحبؒ بھی اس میں مبتلا ہو کر چند روز میں واصل بحق ہو گئے، وفات سے دو تین دِن پہلے لوہاری سے جھنجھانہ تشریف لے گئے تھے اور وہیں ۴/شوال المکرم/۱۲۵۹ھ بروز دوشنبہ مطابق: ۲۹/اکتوبر/۱۸۴۳ء کو وفات ہوئی۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ آپؒ کا مدفن جھنجھانہ ہے۔ ”نورِ محمد در بہشت“ کے عدد سے سن وفات نکالا جاتا ہے۔

۱۲۵۹

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے آپؒ کے مولد و مدفن کے سلسلہ میں کیا ہی خوب کہا ہے:

شہر جھنجھانہ ہے ایک جائے ہدیٰ — مسکن و ماٰویٰ ہے اس جا آپؒ کا
مولد پاک آپؒ کا ہے اور مزار — اس جگہ تو جان لے اے ہوشیار

خلفاء: آپؒ کے خلفاء میں چند کے نام یہ ہیں: حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، حضرت حافظ ضامن شہید تھانویؒ، حضرت شیخ محمد محدث تھانویؒ۔

(حیاتِ قطبِ عالم حضرت نور محمد میاں جی جھنجھانویؒ)

ف: اللہ تعالیٰ ان حضرات کے فیوض و برکات ان کی وفات کے بعد بھی تا قیامت جاری وساری رکھے، آمین۔ مرتب۔

حضرت مولانا میر شجاع الدین حیدر آبادیؒ متوفی ۱۲۶۵ھ

نام ونسب: آپؒ کا اسم گرامی شجاع الدین ہے، ''تاریخ برہان پور'' اور بزرگانِ سلف کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ آپؒ ساداتِ علویہ میں سے ہیں، اور بعض کا قول ہے کہ آپؒ کے نسب کا سلسلہ محمد بن حنفیہ فرزندِ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، آپؒ حافظ کریم اللہ صاحبؒ کے فرزند ارجمند ہیں، آپؒ کے جد امجد مولوی محمد دائم صاحبؒ محمد شاہی عہد میں شادی آباد عرف مانڈو صوبہ مالوہ میں عہدۂ قضا پر مامور رہے، خدمت مفوّضہ کا کام نہایت دیانت داری سے ادا فرماتے تھے، آپؒ کے جد موصوف محمد شاہی عہد میں مالوہ سے دہلی گئے تھے، عالم وفاضل تھے، تحریر وتقریر میں استعدادِ کامل رکھتے تھے، شعر وشاعری کے میدان میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی فرماتے تھے، مرزا عبدالقادر بیدلؔ سے کلام کی اصلاح فرماتے تھے، تلمذ کے زمانہ میں غفران مآب نواب نظام الملک فتح جنگ آصف جاہ بہادر اوّل اور ناصر جنگ شہید سے ملازمت حاصل ہوئی تھی، پدر وفرزند آپؒ کے علمی تجربہ سے خوب واقف تھے، جب آصف جاہ اوّل دار الخلافت سے دکن میں آئے اور مختارانہ حکومت کرنے لگے اس وقت صاحب ترجمہ کے جد کو بہ تعارفِ سابقہ شہر برہان پور کی قضا پر مقرر فرمایا، تا بہ زندگی آصف جاہ اوّل خدمت قضا پر مامور رہے، جب ناصر جنگ شہید مسندِ ریاست پر جلوہ افروز ہوئے تو آپؒ کو بلوایا اور ارکانِ دولت میں شریک فرمایا، تا بہ زمانۂ شہادت ناصر جنگ اورنگ آباد میں مصاحبت ودیگر خدمات پر کام کرتے

رہے، آپؒ کے والد میر کریم اللہؒ بھی آپؒ کے جدِ بزرگوار کے ہمراہ تھے، وہ بھی نواب شہید کی عنایت سے خانی و بہادری کے خطاب سے سرفراز اور خدمت انتظام پائے گاہ صرف خاص سے ممتاز تھے، نواب کی شہادت کے بعد آپؒ کے جدِ بزرگوار برہان پور میں آئے اور سکونت پذیر ہوئے، آپؒ کے والد بھی نوکری سے دست بردار ہو کے برہان پور چلے آئے، متوکلانہ زندگی بسر کرتے رہے، ایک رات صاحب ترجمہ کے والدؒ نے خواب دیکھا کہ برہان پور میں ہوائے تند و بادِ صرصر سے شہر کے تمام چراغ گل ہو گئے، مگر جامع مسجد کا چراغ روشن ہے، خواب سے بیدار ہوئے، بزرگانِ وقت سے خواب کی تعبیر کا استفسار کیا تو تمام نے ولادتِ فرزند کی بشارت دی، آپؒ کے والد تعبیر سے حیران ہوئے، کہ اس وقت میری عمر ساٹھ سال کے قریب ہے، کیوں کر یہ تعبیر مطابق واقعہ ہوگی؟ بزرگانِ سلف نے فرمایا کہ آپ حضرت زکریا علیہ السلام کا قصہ بھول گئے؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے آخر عمر میں جب کہ وہ مایوس ہو چکے تھے فرزند حضرت یحیٰ علیہ السلام عطا فرمایا، آپؒ عقد فرمائیے۔

ولادت: پھر صاحب تذکرہؒ کے والدؒ نے برہان پور میں جامع مسجد کے متولی مسمّٰی خواجہ صدیق عرف میر غلام محی الدین خان نبیرۂ خواجہ ہاشم کی لڑکی سے عقد کیا، دو سال بعد اسی منکوحہ سے مولوی شجاع الدین صاحبِ ترجمہ ۱۱۹۱ھ میں پیدا ہوئے، آپؒ کی ولادت کے بعد والد ماجد بہشت بریں روانہ ہوئے۔

تعلیم و تربیت: آپؒ کی تعلیم و تربیت نانا صاحب کی آغوشِ محبت میں ہوئی، پرورش برہان پور کی آب و ہوا میں ہوئی، ابتدائی شعور میں نانا کی توجہِ پدرانہ سے حفظِ قرآن و مختصراتِ نحو و صرف اور مسائل دینیات سے فارغ ہو کر علماءِ برہان پور

کی خدمت میں تحصیل علوم کرنے لگے، ۱۲۰۶ھ میں آپؒ کے نانا صاحب جو آپؒ کے مربی تھے فوت ہوگئے، نانا کے انتقال کے وقت آپؒ عالمِ شباب میں تھے۔

سفرِ حج: آپؒ کے دل میں حج وزیارتِ حرمین شریفین کا شوق پیدا ہوا، اسی شوق میں بندرگاہ سورت روانہ ہوئے، چند روز سورت میں رہے، ایامِ حج کے قریب حرمین شریفین روانہ ہوئے، زیارت و حج سے فارغ ہوکر وہاں کے علماء سے استفادہ فرمایا، آپؒ متقی و پرہیزگار تھے، شب و روز ذکر و شغل اور درس و تدریس میں بسر فرماتے تھے، حرمین شریفین سے مع الخیر والعافیہ وطن مالوف برہان پور پہنچے، جامع مسجد میں طلبہ کو مستفید فرماتے تھے، ۱۲۱۶ھ تک وطن میں رہے۔

صحاحِ ستہ کی سند: پھر حسب الطلب نواب فتح الدولہ بہادر بلدہ حیدرآباد میں آئے، مولانا مولوی عزت یار خان محي الدولہ صدر الصدور سے صحاح ستہ کی سند حاصل کی۔

بیعت وخلافت: مولوی شاہ رفیع الدین قدس سرہٗ قندھاریؒ کی خدمت میں بیعت وخرقۂ خلافت سے مشرف ہوئے، طریقۂ قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ اور رفاعیہ میں مرید کرنے کی اجازت بھی حاصل کی، حیدرآباد میں مدت العمر عبادتِ الٰہی وہدایتِ خاص و عام اور اشاعتِ اسلام میں مصروف رہے، فرائض وسنن کے ادا کرنے میں سرِ مو تجاوز نہیں فرماتے تھے، تہجد ونوافل پر بھی مواظبت فرماتے تھے، آپؒ علمِ تجوید میں بھی بے نظیر تھے، ہفت قراءات کے اصول وفروع سے واقف تھے، قرآن شریف عمدہ لہجہ میں تلاوت فرماتے تھے، آپؒ کی توجہ سے بہت سے لوگ حافظِ قرآن ہوئے۔

اشاعتِ دین: آپؒ کی ہدایت واشاعتِ اسلام سے بے شمار ہنود دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، آپؒ کے کلام ونصائح میں وہ اثر تھا کہ ہنودِ سنگ دل موم کی طرح نرم ہوجاتے تھے، چنانچہ راجہ سنبھو پرشاد آپؒ کی نصیحت کی برکت سے اولاً پوشیدہ طور پر اسلام سے مشرف ہوا اور راجہ کی زوجہ افضل بیگم مرید ہوئی، جب راجہ اسلام سے مشرف ہوا اس مجلس میں مولوی سید جلال الدین برہان پوری عرف اللہ والے صاحبؒ، مولوی عبداللہ صاحبؒ اور مولوی عبدالکریم صاحبؒ وغیرہم موجود تھے، راجہ کا نام غلام رسول رکھا گیا، آخر عمر میں راجہ علانیہ طور پر اسلام ظاہر کر کے جاں بحق ہوا، اسی طرح تتیا کہ دو ہزار فوج کا افسر تھا صدق دل سے آپؒ کا مرید ہوا اور شرفِ اسلام سے مشرف ہوا، اس کے تمام قرابت دار تقریباً تین سو آدمی مرد وزن تمام مسلمان ہوئے، حضرت نے اس کا نام مرتضیٰ رکھا۔ اس کے بعد صاحبو نامی کمانڈر جو ایک ہزار کی فوج کا کمانڈر تھا مع چند اعزہ وملازمین خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا، اس کا نام صاحب حسین رکھا گیا۔

آپؒ نہایت نیک طینت اور فرشتہ سیرت تھے، خاص و عام کی بھلائی چاہتے تھے، ہر ایک کو نیک ہدایت فرماتے تھے، جو کوئی آپؒ سے دینی و دنیوی عبادات و معاملات میں استفسار و استشارہ کرتا تھا آپؒ راست راست بے کم و کاست صاف صاف جواب دیتے تھے، ایسی رائے اور تدبیر بتاتے تھے کہ سائل کے لیے اس کا نتیجہ مفید ہو، چنانچہ نواب الف خان بہادر والیٔ کرنول آپؒ سے حسن ارادت رکھتا تھا، ایک وقت آپؒ کو بلایا، آپؒ حسب الطلب مع صاحب زادہ حاجی عبداللہ کرنول رونق افزا ہوئے، نواب نے آپؒ کی بہت تعظیم

وتکریم کی اور مہمانی کے لوازمات حسن عقیدت سے ادا کیے، آپؒ چند روز مہمان رہے، جب تک رہے پند ونصیحت سے سرفراز فرماتے رہے، امر ونہی کی تعمیل کی تاکید فرماتے رہے، اور بمصداق : { إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ... الخ } فرماتے کہ مظلوم ومساکین کے ساتھ عدل واحسان سے مساعدت کرتے رہو۔ پھر آپؒ حیدرآباد میں واپس آئے، بعد ازاں نوابِ موصوف فوت ہوا، نواب کا فرزند غلام رسول خان مسند نشین ہوا، ملکی انتظام میں زیادہ دور اندیش وعاقبت بیں نہیں تھا، مگر فیاضی ومہمان نوازی اور پیر پرستی میں فردِ فرید تھا، غلط فہمی سے صیغۂ راز میں انگریزی سرکار سے مخالفت وبغاوت پر آمادہ ہوا اور چند افاغنۂ قوم کو اس فتنۂ بے جا میں اپنا شریک بنالیا، نواب مبارز الدولہ بہادر برادرِ غفران منزل ناصر الدولہ بہادر ونظام الملک چہارم کو بھی شریک کیا، اور حضرتؒ یعنی صاحب تذکرہ کو اپنے ارادہ سے مطلع کر کے بلایا، آپؒ نے عاقلانہ عنایت نامہ ہدایت آموز تحریر فرمایا، عنایت نامہ کیا ہے، گویا حکمت ودانائی کا خزانہ ہے، اگر نواب آپؒ کی حکمت آمیز باتوں پر کاربند رہتا تو کبھی جان ومال سے تباہ وبرباد نہ ہوتا، بدستور رئیس رہتا، بلکہ اس کی ریاست نسلاً بعد نسل باقی رہتی، نواب نے آپؒ کی نصیحت پر عمل نہیں کیا، برباد وتباہ ہوا۔

میر شجاع الدینؒ کا مکتوب بہ نام نواب حیدرآباد: اب میں حضرتؒ کے عنایت نامہ کا خلاصہ نقل کرتا ہوں:

”خان صاحب! قومِ نصاریٰ سے اسلام اور اہل اسلام پر کسی قسم کی مداخلت وممانعت نہیں ہے، نہ وہ ہمارے مذہبی امور میں دست اندازی کرتے

ہیں، بلکہ وہ ہمارے ملک وملت کے مددگار ومحافظ ہیں، ہمارے جان ومال کے نگہبان ہیں، ان ہی کی حمایت واعانت کی برکت ہے کہ ہم پر اہل اصنام حملہ آور نہیں ہوتے ہیں، نہ ہمارے ملک میں دست اندازی کر سکتے ہیں، زمانۂ سابق میں ہزار ہا قطاع الطریق پنڈہارے اور بھیل وغیرہ ملک برار، خاندیس اور دکن میں فتنہ وفساد برپا کرتے تھے، رعایا پر ظلم ہوتا تھا، نصاریٰ کی حسن تدبیر سے ان کا نام ونشان باقی نہ رہا، ہم ان کے سایۂ رحمت میں امن وامان سے زندگی بسر کرتے ہیں، واقع میں ہمارے لیے نصاریٰ رحمت ہیں، فی زماننا کون ہے جو ان سے مقابلہ کر سکے؟ کون ہے جو ان کو نکالے؟ پس جب وہ ہمارے مذہبی امور میں مداخلت نہیں کرتے اور ہماری جان ومال کی حفاظت کرتے ہیں، تو ایسی حالت میں ان سے مخالفت وبغاوت کرنا مذہباً اہانتِ اسلام وقتل عظیمِ اہل اسلام ہے، جیسا کہ ہند میں بعض اہل اسلام نے سکھ قوم سے جہاد کیا، ہزار ہا علماء وصلحاء ناحق وناروا مقتول ہوئے، مناسب یہ ہے کہ آپ فی زماننا نماز وروزہ کے مسائل اور احکامِ دین جاری کرنے میں اور رعایا پروری وعدل گستری میں سعی بلیغ فرمائیں، اور علماء وصلحاء کی خدمت کرتے رہیں، میری رائے میں آپ جس جہاد کا قصد فرما رہے ہیں وہ جہادِ شرعی کے موافق نہیں ہے، واقع میں یہ جنگِ نفسانی ہے، آپ جنگ وجدال کا خیال ہرگز نہ فرمایئے، میں نے یہ مضمون بنظرِ خیر خواہی لکھا ہے، اگرچہ بظاہر خلافِ مزاجِ عالی ہے، مگر واقع میں ''صبر تلخ است، ولیکن برِ شیریں دارد'' کا مصداق ہے۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔''

نواب غلام رسول خان نے آپؒ کی نصائح پر عمل نہیں کیا، بغاوت پر آمادہ

رہا، پس عاقبۃ الامر جنرل فیرزر صاحب ریزیڈنٹ حیدرآباد مع جمعیت روانہ ہوا، شہر کرنول کا محاصرہ کیا، تمام ملکِ کرنول سرکارِ انگریزی کے قبضہ میں آ گیا، اور راجہ چندولال نے بلحاظِ مصلحتِ وقت حسب الحکم حضور نواب مبارز الدولہ کو قلعہ گولکونڈہ میں راونہ کیا، اس ہنگامہ کے فرو ہونے کے بعد ریزیڈنٹ صاحب نے غلام رسول خان کے قلمدان وغیرہ دفتر میں اس بات کی تلاش کی کہ نواب سے اس فساد میں مراسلت وکتابت کہاں کہاں اور کس کس سے تھی؟ صاحبِ تذکرہؒ کا ایک عنایت نامہ مسمیٰ نواب ملا، مضمون دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا، حیدرآباد پہنچتے ہی راجہ چندولال سے آپؒ کی ملاقات کی درخواست کی، راجہ صاحب نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ ریزیڈنٹ صاحب آپ کی ملاقات کے مشتاق ہیں، آپؒ میانہ میں سوار ہو کر ریزیڈنٹ صاحب کی کوٹھی میں پہنچے، ریزیڈنٹ صاحب نے آپؒ سے ملاقات کی، آپؒ کی تعظیم وتکریم میں کوتاہی نہیں کی، مزاج پرسی کے بعد وہی آپؒ کا عنایت نامہ جو نواب غلام رسول خان کے نام سے بھیجا گیا تھا پیش کر کے پوچھا کہ یہ آپ کا خط ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں، میں نے نواب کو لکھا تھا۔'' ریزیڈنٹ صاحب نے کہا کہ اگر نواب آپ کی نصیحت پر عمل کرتا تو اس کا ملک اس کے قبضہ سے نہ جاتا، آپ کی عدول حکمی سے ریاست قبضہ سے جاتی رہی، یہ آپ کی نصیحت کیا واقع میں کرامت تھی، آپ کا کلام نہایت ہی پرتاثیر تھا، خلائق کے دلوں پر مؤثر ہوتا تھا۔

کرامات: آپؒ صاحبِ خرقِ عادات تھے، بہت سے خارقِ عادات آپؒ کے ہاتھوں ظاہر ہوئے، دکن میں مشہور ہیں، ''مناقبِ شجاعیہ'' کے مؤلف نے اپنی

تالیف میں فراہم کیے ہیں، آپؒ کی ذاتِ مبارک قناعت اور صبر و استقلال میں بزرگانِ سلف کی ہم قدم تھی، چنانچہ آپؒ کے صاحب زادے حاجی عبداللہ صاحبؒ بارادۂ زیارتِ بزرگان آپؒ سے اجازت لے کر وطن قدیم شہر برہان پور روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر بزرگانِ سلف کی زیارت سے مشرف ہوئے، چند روز وہاں مقیم رہے، پھر وہاں سے حیدرآباد واپس ہوئے، قصبۂ دیونی، ضلع اودگیر (اس وقت صوبہ مہاراشٹر کے ضلع لاتور کی تحصیل ہے) میں مع الخیر پہنچے، رات کو وہاں تہجد کی نماز ادا کرنے کے لیے بستر سے اٹھے، باولی پر وضو کے لیے گئے، اندھیرے اور نابلدی کی وجہ سے باولی میں گر گئے، ایسا صدمہ پہنچا کہ آپؒ کی روح جسم خاکی سے عالمِ بالا کی طرف روانہ ہوگئی، ہمراہیوں نے باولی سے نکال کر وہاں دفن کیے، شہر میں حضرت کو فرزند کی رحلت کی خبر معلوم ہوئی، نہایت رنج والم میں بھی صبر کو اختیار فرمایا، کسی طرح رنج وغم کا اظہار نہیں فرمایا، استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہے، آپؒ کے مریدین میں سے خاص کر غلام رسول نے نعش لانے کے لیے عرض کیا، حضرتؒ نے اس امر کی اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ دفن کے بعد قبر کھودنا منع ہے، بالآخر مریدین کے اصرار سے راضی ہوئے اور نعش کو حیدرآباد میں لائے، نعش صحیح سالم تھی، حضرتؒ نے نہایت استقلال کے ساتھ بجماعتِ کثیر جنازہ کی نماز ادا کی اور صاحب زادے کو مقبرہ میں دفن فرمایا۔ نوراللہ مرقدہٗ۔

وفات: آخر حضرتؒ بمصداق: {كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ} بتاریخ چار محرم بروز جمعہ ۱۲۶۵ھ میں دنیائے فانی سے عالم بقا روانہ ہوئے۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔ اور حیدرآباد میں مدفون ہوئے۔ نوراللہ مرقدہ۔ (محبوب التواریخ: ۲/ ۱۰۰۲)

حضرت حافظ محمد علی خیرآبادیؒ[۱] متوفی ۱۲۶۶ھ

نام ونسب: نام محمد علی، والد کا نام مولوی شمس الدین ہے، آپ کے اجداد میں ایک بزرگ حضرت شیخ سعد خیر آبادیؒ خلیفہ حضرت شاہ مینا لکھنویؒ بھی گذرے ہیں، علم وفضل میں اس گھرانے کو ایک خاص امتیازی شان حاصل تھی۔

ولادت: آپ کی ولادت ۱۱۹۲ھ مطابق ۱۷۷۸ء کو ہوئی تھی۔

فضل وکمال: حافظ سید محمد علی خیر آبادیؒ خواجہ تونسویؒ کے اوّلین خلفاء میں سے تھے، خیر آباد میں ان کی خانقاہ علم وفضل کا مرکز اور فیوض وبرکات کا منبع تھی، اودھ اور دکن میں چشتیہ سلسلے کی اشاعت کا کام اسی خانقاہ میں بیٹھ کر کیا گیا تھا، ان میں بے پناہ عزم اور غیر معمولی استقلال تھا، انتہائی نامساعد حالات میں انہوں نے اپنے اصلاحی اور تربیتی کام کو جاری رکھا اور ایک ایسے سماج کی نگہبانی کی جو اخلاقی قدروں سے بیگانہ ہوتا جارہا تھا، اودھ کے گرتے ہوئے اخلاقی نظام اور زوال پذیر سیاسی طاقتوں کے خلاف انہوں نے آواز اٹھائی اور عوام کو ان کی اخلاقی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔

ایامِ طفلی (بچپن کے احوال): بچپن ہی سے حافظ صاحبؒ کی طبیعت عبادت کی طرف راغب تھی، رات کے آخری حصہ میں اٹھ کر یادِ حق میں مشغول

---

۱ مکرم پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم نے اپنی معرکہ آرا تصنیف ''تاریخ مشائخ چشت'' حصہ پنجم میں آپ کا تذکرہ کیا ہے، یہ تذکرہ اسی سے ماخوذ ہے۔(مرتب)

ہوجاتے تھے۔ شریعت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ ایک دِن وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی جگہ جارہے تھے، راستے میں بیر کے درخت نظر آئے، سب لڑکوں نے اُن درختوں سے پھل توڑ کر کھائے، حافظ صاحبؒ سے کھانے کے لیے کہا گیا تو فرمایا: ''یہ درخت غیر کی ملک ہیں، مالک کی اجازت کے بغیر کیوں کر کھاؤں؟''۔

تعلیم: سب سے پہلے سیّد محمد علی صاحبؒ نے قرآن پاک حفظ کیا، اس کے بعد خیرآباد میں مولانا عبدالوالی صاحبؒ سے جو اس زمانے کے مشہور عالم تھے شرحِ وقایہ پڑھی۔ پھر شاہجہاں پور تشریف لے گئے اور وہاں کچھ عرصہ تک تحصیل علوم میں مشغول رہے، یہاں شہر کے باہر ایک مسجد میں قیام رہا، شاہجہاں پور کی علمی دنیا جب ان کی تشنگیٔ علم کو نہ بجھا سکی تو دہلی کا رُخ کیا، کہ وہی ہندوستان میں علم وادب، احسان وسلوک کا آخری مرکز سمجھا جاتا تھا، اس وقت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے گھرانے نے علم کی وہ شمع روشن کر رکھی تھی جس کے گرد دور دور سے علمی پروانے جمع ہورہے تھے، دہلی میں مشکوٰۃ کا سبق انہوں نے شاہ عبدالقادرؒ سے لیا، پھر حرمین شریفین میں صحیح بخاری کی سماعت فرمائی، جب شاہ سلیمان تونسویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو صحیح مسلم کی سماعت کی، دہلی میں شاہ عبدالقادرؒ کی خدمت میں فصوص الحکم کا بھی کچھ حصہ پڑھا۔

مجاہدات: حافظ صاحبؒ نے ابتدائی زمانہ میں سخت مجاہدات کیے تھے، سب سے پہلے وہ حضرت سیّد محمد مشتاق عرف چھیدا میاںؒ کے مزار پر چلہ کش ہوئے، پھر حضرت شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ متبرکہ پر ریاضاتِ شاقہ میں مشغول ہوگئے، نمازیوں کے لیے پانی بھر بھر کر لاتے تھے، باقی وقت میں عبادت کرتے تھے، اسی طرح کافی عرصہ گذر گیا، پھر حضرت دہلی چلے گئے اور وہاں حضرت قطب صاحبؒ کے مزار پر

مجاہدوں میں مشغول ہو گئے، چند مکانوں میں اُجرت پر پانی بھر کر اپنی گذر اوقات کرتے تھے اور اکثر روزہ رکھتے تھے، تمام رات قرآن پاک کی تلاوت میں گذرتی تھی، دہلی سے اجمیر شریف کا رُخ کیا اور وہاں بارہ سال تک ایک مسجد میں بکمالِ اخفا مقیم رہے، یہاں سے پاک پٹن پہنچے، پاک پٹن میں خواجہ محمد سلیمان ؒ کی عظمت و بزرگی کا شہرہ سن کر دل اس طرف متوجہ ہو گیا، یہاں ان کو عقیدت وارادت کا ایسا مرکز مل گیا جس نے ان کے مجاہدوں اور ریاضتوں کو صحیح راستے پر لگا دیا، شاہ محمد سلیمان ؒ کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، فطرت کی ودیعت کی ہوئی صلاحیتیں اُبھر آئیں اور مرشدِ کامل نے ان کو اعلیٰ روحانی اور مذہبی اقدار کی خدمت میں لگا دیا۔

بیعت: حافظ صاحب ؒ انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ پاک پٹن سے تونسہ روانہ ہوئے، شاہ محمد سلیمان ؒ کی خدمت میں پہنچ گئے اور درخواست کے بعد شاہ محمد سلیمان صاحب ؒ نے انہیں اپنے سلسلہ میں داخل کرلیا اور خلافت سے سرفراز فرمایا۔

بری رسموں کو دور کرنے کی کوشش: حافظ صاحب ؒ کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کی سوسائٹی کا نشو ونما اسلامی اصول پر ہو، وہ ہمیشہ اسلامی رسم ورواج اور طرزِ زندگی پر زور دیتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ بری رسموں کو دور کرنے کی جدوجہد کرنا سب سے زیادہ اہم کام ہے، خود ان کے متعلق مناقب کے مصنف کا بیان ہے: ”ہمیشہ سنتِ نبویہ کے زندہ رکھنے اور اہل ہند کی باطل رسوم کو مٹانے کے واسطے مستعد اور آمادہ رہتے تھے۔“

حافظ صاحب ؒ کی اصلاحی کوششوں کی ابتدا خود ان کے گھر سے ہوئی، انہوں نے اپنے گھر میں ان تمام رسوم اور توہمات کو ختم کیا جن کو وہ غیر شرعی سمجھتے

تھے، پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ان کو قصبہ موہان کا سفر پیش آیا، متعلقین نے کہا: ''کیا حضرت! بی بی صاحبہ کی رسوم نہیں کریں گے؟'' فرمایا: ''جہاں ہوں گا وہاں فاتحہ کر دوں گا، کیوں کہ اس سے غرض ایصالِ ثواب ہے، اور وہ ہر جگہ ممکن ہے، یہ کیا ضرور ہے کہ اسی جگہ رسوم (تیجا) کی فاتحہ کروں۔''

شادی کے معاملہ میں وہ غیر ضروری رسوم کو ناپسند کرتے تھے، ایک دِن اچانک صاحب زادے حافظ جمال الدین کو دلہن کے مکان پر لے گئے اور نکاح کے لیے کہا، دلہن کے گھر والوں نے بے سروسامانی کا عذر کیا تو فرمایا: ''جو کچھ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔'' چنانچہ قواعدِ شرعیہ کے مطابق نکاح ہو گیا اور کوئی غیر شرعی رسم ادا نہیں کی گئی۔

ف: اس زمانہ میں خاص طور سے علماء و مشائخ کے یہاں سنت کے مطابق تقریبات کا اہتمام ہونا چاہیے، تاکہ عوام الناس ان رسوم وخرافات سے اجتناب کریں۔ (مرتب)

حافظ صاحبؒ فرماتے تھے: ''جب کسی قوم کے قوائے عمل مضمحل ہوتے ہیں تو اُن علوم اور شعبدوں میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جو بغیر ہاتھ پاؤں کو جنبش دیے آسائش کی زندگی کا دل کش خواب دکھاتے ہوں۔'' چنانچہ اس زمانے میں بعض لوگوں کو کیمیا بنانے کی فکر رہتی تھی، اسی دھن میں ان لوگوں کا وقت گذرتا تھا، حافظ صاحبؒ نے اپنے ملفوظات میں جگہ جگہ ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے۔

ف: ماشاء اللہ! یہ توکل کی نہایت مفید تعلیم ہے، جو عوام وخواص تمام کے لیے لائحۂ عمل بنانے کے لائق ہے۔ (مرتب)

اخلاق: حافظ صاحبؒ اخلاقِ محمدی کا جیتا جاگتا نمونہ تھے، انسانی مساوات اور

اُخوت پر ان کا ایمان تھا، اپنے عمل سے اس کی تائید کرتے تھے، ایک مرتبہ دسترخوان پر بیٹھے تھے، نظر پڑی تو دیکھا کہ ایک موچی میاں اسلم کے جوتے سی رہا ہے، فرمایا: ''اپنے ہاتھ دھو کر آ اور کھانا کھا۔'' اور اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلایا۔

جاڑے کے موسم میں ایک غریب شخص حضرت حافظ صاحبؒ کے پاس آ کر ٹھہرا، اس کے پاس جاڑے کا لباس نہ تھا، حافظ صاحبؒ نے اس کو اپنے بستر میں اپنے پاس سلایا۔

حافظ صاحبؒ جب محفل میں مدعو کیے جاتے تو کبھی ممتاز جگہ پر نہ بیٹھتے، سفر و حضر میں خادموں کے ساتھ کام میں شریک رہتے تھے، بعض اوقات روٹیاں اپنے ہاتھ سے پکا لیتے تھے، اظہارِ مشیخت سے نفرت تھی، بلکہ اس قسم کی تواضع جس سے بڑائی کا اظہار ہو پسند نہ کرتے تھے۔

اتباعِ سنت: اتباعِ سنت پر بہت زور دیتے تھے، مناقبِ حافظیہ میں لکھا ہے:

''حضرت شیخ الاسلام را چوں کہ در اتباعِ نبوی بسیار کد و کوشش بود، و دائم در احیاءِ سنتِ سنیہ نبویہ و انہدامِ رسوماتِ واہیۂ ہند مستعد و آمادہ می ماندند۔''

حضرت شیخ الاسلام کو چوں کہ اتباعِ نبوی میں بہت کد و کوشش تھی، ہمیشہ سنتِ نبویہ کے زندہ رکھنے اور اہل ہند کی باطل رسوم کو مٹانے کے واسطے مستعد اور آمادہ رہتے تھے۔

ان کی مجلسوں میں مسائل شریعت اور سنت کے علاوہ کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا، اپنے مریدوں کو سنت نبوی پر عمل کرنے کی برابر تاکید کرتے تھے، حافظ صاحبؒ اپنے مریدوں کو بتایا کرتے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع کے بغیر کوئی چیز

حاصل نہیں ہوتی، اور محبتِ الٰہی کا دعویٰ بغیر اتباعِ نبوی جھوٹا دعویٰ ہے۔

''ودعوائے محبتِ الٰہی بے اتباعِ نبوی دعوائے کاذب است۔''

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ بغیر اتباعِ نبوی کے جھوٹا دعویٰ ہے۔

حافظ صاحبؒ اپنے مریدوں کو احسان وسلوک کی صرف ان کتابوں کے مطالعہ کی ہدایت فرماتے تھے جن میں شریعت پر خاص زور دیا گیا ہو، چنانچہ ''عوارف المعارف'' (مؤلفہ حضرت شیخ شہاب الدینؒ سرحلقۂ سلسلۂ سہروردیہ) ان کو بہت پسند تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں ہر مسئلہ حدیث شریف سے لکھا گیا ہے۔

مریدوں کی تربیت: حافظ صاحبؒ اپنے مریدوں کی اصلاح وتربیت میں بڑی دل چسپی لیتے تھے، فرمایا کرتے تھے: ''مرشدوں کو مریدوں کا اس طرح خیال رہتا ہے جس طرح ماں کو اپنے لڑکوں کا خیال رہتا ہے۔''

اظہارِ مشیخت سے ناراض ہوتے تھے، حکم تھا کہ ہر چیز کا اخفا کیا جائے، ایک دِن ایک مرید میر محمد علی ان لکڑیوں پر جن سے کپڑا بنا جاتا ہے بیٹھے ہوئے تھے، اتفاقاً حافظ صاحبؒ کی نظر ان پر پڑ گئی، فرمایا: ''ایسا فعل نہیں کرنا چاہیے جس سے لوگ یہ سمجھیں کہ یہ شخص نہایت متواضع اور منکسر ہے۔''

ایک مرید نے اپنی رضائی ایک مسکین کو دے دی تو سخت ناراض ہوئے، فرمایا: ''اس فعل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص ایسا باخدا ہے کہ ایک رضائی اس کے پاس تھی وہ بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے دی۔''

ہدایات ونصائح: مریدوں کی ظاہری وباطنی زندگی کی اصلاح میں بڑی جد وجہد کرتے تھے، مرید کرتے وقت یہ ہدایتیں فرماتے تھے:

''شریعت پر قائم رہو۔''

''اللہ تعالیٰ کی محبت میں دل کو ثابت رکھو۔''

''جب تک تحصیل علم سے فارغ نہ ہو ذکر نہ کرو۔''

''دنیا کی محبت میں لگے نہ رہو، اس سے محبتِ الٰہی کی لذت سلب ہوتی ہے۔''

تعویذ وعملیات سے اجتناب: جب مذہبی ذہن پریشان ہوتا ہے تو عملیات میں غیر معمولی اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے، اس طرح قوائے عمل شل ہو جاتے ہیں اور اوہام کا تار و پود زندگی کے سرچشموں کو خشک کر دیتا ہے، حافظ صاحبؒ کے زمانے میں اسلامی سوسائٹی انحطاط پذیر تھی، عملیات، تعویذ اور گنڈوں میں انتہا سے زیادہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا، حافظ صاحبؒ کو یہ چیز سخت ناپسند تھی، ''مناقب'' میں لکھا ہے: ''شیخ الاسلام عملیات سے نفرت رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے منع فرماتے ہیں۔''

ف: مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا بھی یہی مذاق تھا (مرتب)

مثنویٔ مولانا رومیؒ: حافظ صاحبؒ کو مثنویٔ مولانا رومیؒ پر بڑا عبور تھا، انہوں نے حضرت مولانا رومیؒ کے معارف کا مطالعہ نہایت بالغ نظری سے کیا تھا اور ان کو نہایت ہی بلیغ اور دل نشین انداز میں بیان کرتے تھے، ''مناقب المحبوبین'' میں لکھا ہے: ''گویند ''مثنوی'' را مثل ایشاں کسے نمی خوانانید۔'' لوگ کہتے ہیں کہ ان کی طرح مثنوی کو کوئی نہیں پڑھاتا۔

اشراق کی نماز کے بعد وہ ''مثنوی'' کا درس دیتے تھے، مرتبِ مناقبِ حافظیہ کا بیان ہے:

’’بایں کتابِ شریف شیخ الاسلام را کمالِ تعلقِ محبت بود، ومعانی ومطالبِ ایں کتاب را کسے دراں زماں ہمچوں آں حضرت بیان نمی کرد۔‘‘

ترجمہ: اس کتابِ شریف کے ساتھ حضرت شیخ الاسلام کو کمالِ تعلق اور محبت تھی، اور اس کے معانی اور مطالب اس زمانے میں آں حضرت کے مانند کوئی بیان نہیں کرتا تھا۔

حافظ صاحبؒ اپنے اعلیٰ مریدوں کو ’’مثنوی‘‘ کے مطالعہ کی ہدایت فرمایا کرتے تھے، وہ مثنوی کو حقائق ومعارف اور اسرار ورموز کا ناپیدا کنار سمندر سمجھتے تھے، اس لیے اس کی شرح لکھنے کو بھی اچھا نہ سمجھا، ایک روز مجلس میں فرمانے لگے کہ مولانا جامیؒ نے مثنوی کی شرح لکھنی شروع کی، اس کے دو تین اشعار کی شرح لکھنے پائے تھے کہ آں حضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ ’’مولوی صاحب تمہارے شرح لکھنے سے ناخوش ہوتے ہیں، انہوں نے اپنے اسرار کو در پردہ کہا ہے اور تم ان کو ظاہر کرنا چاہتے ہو۔‘‘ یہ سن کر مولانا جامیؒ نے شرح لکھنی بند کردی۔

ف: ہمارے شیخ العلماء دیوبند حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کو مثنوی سے بہت شغف تھا، آپ فرماتے تھے کہ میں تین کتابیں اپنے پاس رکھتا ہوں: قرآن شریف، دلائل الخیرات اور مثنوی شریف، چنانچہ اس کا مکہ مکرّمہ میں بھی درس دیتے تھے جس میں عرب بھی شریک ہوتے تھے۔ اور ان کے خلیفہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کی شرح بھی ’’کلید مثنوی‘‘ کے نام سے لکھی ہے، جس میں اس کے علوم و معارف کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

ہمارے شیخ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کو بھی اس کتاب مثنوی سے بہت تعلق تھا، چنانچہ ہم لوگوں کو اس کا مستقل درس دیتے تھے اور اثناءِ درس ''کلید مثنوی'' کو سامنے رکھتے تھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رومیؒ کے عشق ومحبت کا ایک حصہ ہم لوگوں کو بھی نصیب فرمائے اور حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کو جزاءِ خیر دے کہ انہوں نے اس مبارک کتاب کا ہم سب کو درس دیا۔ (از: مرتب عفی عنہ)

درس وتدریس: حافظ صاحبؒ کی خانقاہ میں درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، مولانا رومیؒ، حضرت ابن عربیؒ اور مولانا جامیؒ کی تصانیف کا درس وہ خود دیتے تھے، اور اس انداز میں دیتے تھے کہ بڑے بڑے عالم ان سے استفادہ کے لیے حاضر ہوتے تھے، مولانا فضل حق خیرآبادیؒ جو خود بڑے جید عالم تھے ''فصوص'' کا درس لینے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

حافظ صاحبؒ معاصرین کی نظر میں: حافظ صاحبؒ ان مخصوص بزرگوں میں تھے جن کی روحانی عظمت اور علمی تبحر کی تعریف کرنے پر خود ان کے معاصر علماء ومشائخ مجبور ہو گئے تھے۔ مولانا انوار الحق صاحبؒ لکھنؤ کے اکابر اولیاء میں سے تھے، حافظ صاحبؒ کو وہ ہمیشہ ''شبلیؒ وقت'' کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حافظ صاحبؒ ان کی مجلس میں تشریف رکھتے تھے، ایک شخص نے آکر مولاناؒ سے مصافحہ کیا، مولانا نے حافظ صاحبؒ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''ان کے ہاتھ پر بوسہ دو، یہ شیر حق ہیں۔'' ایک مرتبہ مولانا انوار الحق صاحبؒ نے اپنی مجلس میں فرمایا: ''حافظ صاحبؒ دولہا ہیں اور ہم باراتی۔''

لکھنؤ کے عظیم المرتبت بزرگ مولانا عبدالرحمن صاحبؒ بھی ان کے بے حد مداح تھے اور بہت عزت کرتے تھے، ایک مرتبہ فرمانے لگے: ''حافظ صاحبؒ اپنے عہد کے سلطان المشائخ ہیں۔''

حافظ صاحبؒ جب دہلی تشریف لائے تھے تو شاہ غلام علی صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی تھی۔ حاجی نجم الدین صاحبؒ ان کے متعلق ''پیوملانی'' میں لکھتے ہیں:

کری جوانی خرچ جن پیچ خدا کی یاد　　　اور محمد علی شاہ ساکن خیرآباد
دن دن شہرا جگ اندر ان کا ہوا مرید　　　یہ ہیں صاحبِ سلسلہ صدہا لوگ مرید

امراء سے اجتناب: حافظ صاحبؒ کا ''صُحبَةُ الأَغنِيَاءِ لِلفُقَرَاءِ سِمٌّ قَاتِلٌ'' (یعنی اغنیاء کی صحبت فقراء کے لیے زہر قاتل ہے۔) پر راسخ اعتقاد تھا، وہ کسی امیر کے پاس جانا اچھا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کی صحبت سے اجتناب کرتے تھے، لیکن اگر کوئی آجاتا تو سنتِ نبوی کے مطابق اخلاق سے پیش آتے، حیدرآباد قیام کے زمانے میں ایک مرتبہ محی الدولہ احمد یار خان نے عرض کیا کہ حضور! یہاں کے رئیس کو آپ سے ملنے کا بے حد شوق ہے، فرمایا: ''تم اور وہ دونوں جھوٹے ہو، اگر اس کو ملاقات کا اشتیاق ہے تو وہ میرے پاس کیوں نہیں آتا، اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ میرے دروازے پر نہ بوّاب (دربان) ہیں، نہ حُجّاب (پہرہ دار) ہیں۔

بہادر شاہ ظفرؔ اور حافظ صاحبؒ: بہادر شاہ ظفرؔ نے چند مرتبہ حافظ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی اور ملاقات کا شوق ظاہر

کیا، لیکن حافظ صاحبؒ نے یہ فرمایا کہ ہمیں ملاقات کی حاجت نہیں ہے، شوق کا دل ہی میں رہنا اچھا ہے، بہادر شاہ نے اصرار کیا، لیکن حافظ صاحبؒ راضی نہ ہوئے، بالآخر بہادر شاہ نے کالے صاحب کی وساطت سے ملنے کی کوشش کی، کالے صاحب وقت کے منتظر رہے، قطب صاحبؒ کے عرس کے دنوں میں حافظ صاحبؒ آستانہ شریف کی مسجد میں رونق افروز تھے، کالے صاحب نے فرمایا: ''حافظ صاحب! ایک ضرورت سے جاتا ہوں، جب تک میں حاضر نہ ہوں آپ یہیں تشریف رکھیں،'' یہ کہہ کر بادشاہ کے پاس گئے اور اس کو لے آئے، حاضرین نے شور کیا کہ بادشاہ مسجد کی طرف آرہے ہیں، جب یہ آواز حافظ صاحبؒ کے کانوں میں پہنچی تو فوراً دیوار پھاند کر چلے گئے۔

ف: سبحان اللہ! یہ تھا حضرت حافظ صاحبؒ کا امراء سے نہ ملنے کا خاص ذوق، مگر ہمارے بعض مشائخ خاص مصالح کی بنا پر امراء وملوک سے ملے بھی ہیں، ایسی صورت میں یہ مصرع پڑھا جاسکتا ہے: ''ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر ست''
(از: مرتب عفی عنہٗ)

تاریخ وفات: حافظ صاحبؒ کو آخر عمر میں فالج کا مرض لاحق ہوگیا تھا، رفتہ رفتہ مرض اس قدر بڑھ گیا کہ ہاتھ پاؤں بے کار ہو گئے، عبادت میں بھی جب دقت ہونے لگی تو فرمایا: ''جسم بھاڑے کا ٹٹو ہے، آخر ساتھ نہ دیا۔'' ماہِ ذی قعدہ (۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۴۹ء) کو وصال فرمایا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ خیرآباد، سیتاپور (یوپی) میں سپردِ خاک کیے گئے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔

(تاریخ مشائخِ چشت: ۵/ ۳۳۹)

حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ[۱] متوفی ۱۲۶۷ھ

نام ونسب: نام شاہ محمد سلیمان، والد کا نام زکریا بن عبدالوہاب بن عمر خان تھا، یہ خاندان افغان قوم کے جعفریہ قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، آپ چوں کہ افغان تھے اس لیے اس علاقہ میں روہیلہ کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ اور تونسہ افغانستان میں ہے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۱۸۴ھ مطابق: ۱۷۷۰ء میں بمقام گڑگوجی پنجاب میں ہوئی۔

فضل وکمال: پنجاب میں حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ کا فیض اور چشتیہ نظامیہ سلسلہ کا نام شاہ نور محمد صاحب مہارویؒ کے ذریعہ پہنچا، اور شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کے ذریعہ اس کی تکمیل ہوئی، شاہ محمد سلیمانؒ بڑے برگزیدہ بزرگ تھے، ان کے ارشاد وتلقین سے پنجاب اور افغانستان کے ہزاروں گمراہانِ بادیۂ ضلالت نے ہدایت پائی، ان کے خلفاء ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے اور رشد وہدایت کے وہ چراغ روشن کیے کہ ایک بار پھر صوفیۂ متقدمین کی خانقاہوں کے نقشے آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے، وہ سلسلۂ نظامیہ کے آخری عظیم الشان بزرگ تھے، اُن کا تبحر، تقدس اور اسلامی سوسائٹی (معاشرہ) کی اصلاح

۱ـ ''تاریخ مشائخ چشت'' حصہ پنجم مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی سے آپ کے ضروری حالات اور تعلیمات نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ (مرتب)

کے لیے جدوجہد اپنی نظیر آپ تھی۔
بیعت: مشہور ہے کہ شاہ فخر صاحبؒ نے خواجہ نور محمد مہارویؒ کو ایک شہباز مقید کرنے کی بشارت دی تھی اور فرمایا تھا کہ اس سے سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی تبلیغ و اشاعت میں چار چاند لگ جائیں گے، چنانچہ شاہ نور محمدؒ ہر سال اوچ اور کوٹ مٹھن اس باز کی تلاش میں آتے تھے، آخری بار جب اوچ آئے تو اپنے ایک عزیز محمد حسین سے فرمانے لگے: ''اے محمد حسین! آپ کو معلوم ہے کہ میں ہر سال اس ملک میں کیوں آتا ہوں؟'' عرض کیا: ''آپ خود ارشاد فرمائیں'' اس پر خواجہ نور محمدؒ نے فرمایا کہ ''میں ایک شہباز کا شکار کرنے کے لیے آتا ہوں، اور یہ شاہ فخر صاحبؒ کا حکم ہے۔''
جب شاہ محمد سلیمانؒ شاہ نور محمدؒ کی خدمت میں پہنچے تو ان کا عالم ہی بدل گیا، فوراً مرید ہونے کی درخواست کی، شاہ نور محمدؒ نے ان کو حضرت سید جلالؒ کے مزار کے سرہانے لے جا کر مرید کرلیا، یہ شاہ محمد سلیمانؒ کی نوعمری کا زمانہ تھا، لیکن وہ اپنے پیر سے عقیدت اور ان کے احکام کی بجا آوری میں کہنہ سال مریدوں سے بازی لے گئے۔
دہلی کا سفر: شاہ نور محمد صاحبؒ نے اس نوعمر طالب علم کو مرید کرنے کے بعد شاہ فخر صاحبؒ کی خدمتِ بابرکت میں حاضری کا حکم دیا، جس شہباز کو دام میں لانے کی بشارت انہوں نے دی تھی وہ مقید ہو چکا تھا، شاہ محمد سلیمانؒ نے تعمیل حکم میں دہلی کا ارادہ کرلیا، دلاور، جودھ پور، جے پور، ریواڑی ہوتے ہوئے (۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴ء) میں وہ دہلی پہنچے، یہ گرمی کا زمانہ تھا، آفتاب کی وہ تمازت کہ پرندوں

نے درختوں میں پناہ لے لی تھی، ریگستان کا یہ عالم کہ میلوں تک پانی ندارد، نہ کوئی سواری، نہ کوئی دوست، لیکن یہ محبوبِ سبحانی، سلیمانِ ثانی کمالِ ذوق وشوق سے قبلۂ عالم کا حکم بجالا رہا تھا، اور سفر کی صعوبتوں اور راستے کی تکلیفوں کی کچھ پرواہ نہیں کرتا تھا، عشق ومحبت کا یہ متوالا سفر کی صعوبتیں ذوق وشوق کے ساتھ برداشت کرتا ہوا دہلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ شاہ فخر صاحبؒ وصال فرما چکے۔ ؎

اے بسا آرزوئے کہ خاک شدہ

اس کے بعد آپؒ اپنے گاؤں تشریف لے گئے اور وہیں سے شیخ کی خدمت میں مہار آتے تھے۔

خلافت: پندرہ یا سولہ برس کی عمر میں خواجہ محمد سلیمانؒ خواجہ مہارویؒ سے بیعت ہوئے تھے، شیخ کی صحبت کا فیض کل چھ سال تک اٹھایا، خود ایک جگہ فرماتے ہیں:

''مارا صحبتِ ظاہریٔ حضرتِ قبلۂ عالم شش سال یا کم بود۔''

ہمیں حضرت قبلۂ عالمؒ کی ظاہری صحبت چھ سال یا کچھ کم حاصل رہی۔

تونسہ میں قیامِ خانقاہ: تونسہ ڈیرہ غازی خاں سے تیس (۳۰) کوس کے فاصلے پر ایک غیر معروف گاؤں تھا، پیرو مرشدؒ نے حکم دیا کہ اپنا وطن چھوڑ کر وہاں تونسہ میں آباد ہو جاؤ، شاہ محمد سلیمانؒ نے فوراً گڑگوجی کو الوداع کہا اور تونسہ پہنچ گئے، آپؒ کے قیام کے بعد رفتہ رفتہ تونسہ بارونق اور پرفضا مقام بن گیا اور دور دور سے لوگ وہاں آنے لگے، فاربس نے اپنے فیصلے میں قیامِ تونسہ کے متعلق لکھا ہے: ''خواجہ محمد سلیمان صاحبؒ کے زمانے میں جو حالات تونسہ کے تھے ان سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اور ان کے خلفاء ہی نے اس کو آباد کیا تھا۔''

مدارس کا قیام: شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے تونسہ میں سکونت پذیر ہونے کے بعد سب سے پہلا کام قیامِ مدارس کا کیا، آپؒ کے دولت کدہ کے چاروں طرف متعدد مدرسے تھے، پچاس استاذ وہاں رہتے تھے، تعلیم و تربیت کا کام نہایت وسیع پیمانہ پر جاری تھا، علومِ دینیہ کی ترقی و ترویج میں بے حد کوشش کی جارہی تھی، مدرسوں کا اجرا شاہ صاحبؒ کے مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ تھا، صرف اسی طرح سے اسلامی شعار کی ترویج ممکن تھی، تونسہ جیسی بستی میں پچاس مدرسین کی موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ تونسہ اس علاقہ کا تعلیمی مرکز بن گیا تھا اور دور دور سے شائقین علم وہاں جمع ہونے لگے تھے۔

درس و تدریس: شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کو خود درس دینے کا بڑا شوق تھا، وہ اپنے خاص شاگردوں اور مریدوں کو سلوک و احسان کی کتابوں کا درس دیتے تھے، ان کے ملفوظات میں بعض جگہ ان کتابوں کا ذکر آ گیا ہے جن کو وہ اکثر پڑھایا کرتے تھے، ایک جگہ جامع ملفوظ لکھتا ہے:

''حضرت قبلۂ من قدس سرّہ العزیز درا ثناءِ تعلیمِ کتاب ''احیاء العلوم'' ایں عبارت را برزبانِ درفشاں راندند۔''

''احیاء العلوم'' اور ''فتوحات'' کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے اپنے کچھ مریدوں کو ''کنز'' اور ''کافیہ'' بھی پڑھائی تھیں، چنانچہ حاجی چراغ الدینؒ نے ''کنز'' اور ''کافیہ'' ان ہی سے پڑھی تھیں۔

علمی تبحر: شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کا مطالعہ نہایت وسیع اور نظر بہت گہری تھی، قرآن، حدیث اور فقہ پر ان کو پورا عبور تھا، ملفوظات میں جگہ جگہ آیاتِ

قرآنی اور احادیث نبویہ نقل کرتے ہیں، تصوّف کی اعلیٰ کتابوں کا مطالعہ نہایت بالغ نظری سے کیا تھا، ''عوارف المعارف'' اور ''فتوحاتِ مکیہ'' نوکِ زبان تھیں، اور شیخ سہروردیؒ اور امام اکبرؒ کے بنیادی خیالات پر کافی غور کیا تھا۔

عسرت کی زندگی: شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے اپنا ابتدائی زمانہ بڑی عسرت اور تنگی میں بسر کیا تھا، جب تونسہ میں وہ ایک طالب علم کی حیثیت سے آئے تھے تو ان کے خورد ونوش کا کوئی بندوبست نہیں تھا، مگر کچھ عرصہ بعد فتوحات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

قناعت وتوکل: شاہ صاحبؒ کی طبیعت میں قناعت اور توکل کا جذبہ حد درجہ تھا، ہر قسم کی فتوح ان کے دروازہ پر آتی تھیں، لیکن وہ ایک ہاتھ سے لیتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے تقسیم کر دیتے تھے، شاہ صاحبؒ اپنے مریدوں کو بھی یہی ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ وہ صابر وشاکر وقانع بنیں۔

نظامِ اوقات: شاہ محمد سلیمان صاحبؒ اپنے اوقات اور معمولات کے بہت پابند تھے، مغرب کی نماز کے بعد ایک پہر ذکرِ جہری میں مشغول رہتے تھے، ذکر سے فراغت کے بعد ہر شخص کو حاضری کی اجازت ہوتی تھی، جب اس سے فرصت ملتی تو رات کا کھانا نوش فرماتے، پھر عشا کی نماز باجماعت پڑھنے کے بعد حجرہ میں چلے جاتے تھے، تہجد کے بعد ذکرِ جہری کرتے تھے، نمازِ فجر کے بعد تخت پر آرام فرماتے تھے، جب اذان ہوتی تو مسجد میں تشریف لاتے، نماز کے بعد پھر حجرہ میں چلے جاتے، ایک پہر دن گذرنے پر پھر عام مجلس شروع ہوجاتی، اس کے بعد کھانا کھاتے اور کسی قدر قیلولہ کے بعد نمازِ ظہر ادا کرتے، پھر عصر تک کلامِ پاک کی تلاوت میں مشغول رہتے، عصر سے مغرب تک مسجد میں قیام فرماتے۔

''مناقبِ حافظیہ'' میں لکھا ہے کہ ''شیخ کے ان معمولات میں خواہ حضر ہو یا سفر فرق نہیں ہوتا تھا۔''
تعلیمات و ارشادات: جب کسی قوم کا سیاسی زوال شروع ہوتا ہے تو اس کے افکار و اعمال اور عادات و اطوار بھی انحطاط پذیر ہونے لگتے ہیں، یہ قومی زوال کی آخری منزل ہوتی ہے، اخلاقی زوال کے اثرات سیاسی زوال سے کہیں زیادہ مہلک ہوتے ہیں، اس کے بعد کچھ عرصہ کے لیے تجدید و احیا کی سب راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ شاہ محمد سلیمانؒ نے جس وقت ارشاد و تلقین کا ہنگامہ برپا کیا تھا اس وقت مسلمانوں پر سیاسی اِدبار کی گھٹائیں چھا رہی تھیں، اس زوال کو سب دیکھ رہے تھے، لیکن بہت کم لوگ ایسے تھے جن کی حقیقت بیں نگاہیں سیاسی زوال کے پیچھے ایک خطرناک اخلاقی زوال کے اثرات بھی دیکھتی ہوں، ایسے لوگوں نے سلطنت کا ماتم کرنے میں اپنا وقت صرف نہیں کیا، انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اسلامی اخلاق و شعائر کی نگہبانی کی، شاہ محمد سلیمانؒ بھی ان ہی چند بزرگوں میں تھے جن کی کوششوں کا محور (مدار) اخلاق و عادات کی درستی تھا۔
چنانچہ حضرت شاہ محمد سلیمان صاحبؒ چاہتے تھے کہ مسلمان رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آئینہ میں اپنے اخلاق و عادات کو سنواریں، ان کا عقیدہ تھا کہ اچھے فضائل اور عادات صرف متابعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:
''خوب خصال وحمیدہ افعال بغیر متابعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاصل نہ شود۔''
''متابعت'' کی تشریح اس طرح فرماتے ہیں:
''متابعت'' عبارت از دو چیز است، آنچہ خدا و رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امر

کردہ اند بباید کرد، وآنچہ منع فرمودہ اند نباید کرد۔“

ترجمہ: ”متابعت“ سے مراد دو چیزیں ہیں، جو کچھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حکم فرمایا ہے اسے کرنا اور جس چیز سے منع فرمایا ہے اس سے بچنا۔

شاہ صاحب ؒ کی اخلاقی کوششوں کا مرکزی نقطہ یہی تھا، انہوں نے ہمیشہ اسی جد و جہد میں وقت گزارا کہ عوام کے اعمال درست کیے جائیں، فرمایا کرتے تھے کہ ”اس زمانے میں آدمی بہت ہیں، لیکن آدمیت نہیں۔“

ایک جگہ فرماتے ہیں: ”آدمی کم موجود شوند، کہ اکثر صورتِ آدمی دارند وخصالِ آدمی ندارند، آدمیت عبارت از خوب خصال وحمیدہ افعال است۔“

فرمایا کرتے تھے کہ آدمی ہونا بہت مشکل ہے، ”آدمی شدن بسیار مشکل است۔“ انتہا یہ تھی کہ کہا کرتے تھے کہ ”سلک السلوک“ میں آدمی کی جو صفات لکھی ہیں وہ خود میرے اندر بھی نہیں ہیں۔“

ملفوظات میں جگہ جگہ بری صحبت، غیبت، غرور، عیب جوئی، شراب نوشی، عشق بازی اور رشوت خوری سے بچنے کی ہدایت ہے، اور بار بار ادب، مہمان نوازی، نیکی، عجز و انکسار اور ایمان داری کا درس دیا گیا ہے، ”نافع السالکین“ میں شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ہو جہاں اصلاحِ اخلاق پر زور نہ دیا گیا ہو، ان سب اصلاحی مشوروں کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) بری صحبت سے بچو، اس کے اثرات بہت خطرناک ہوتے ہیں اور جلدی اثر کرتے ہیں، جگہ جگہ ارشاد ہوتا ہے:

صحبتِ صالح ترا صالح کند — صحبتِ طالح ترا طالح کند

صحبت کے اثرات بتانے کے سلسلہ میں وہ نہایت نصیحت آموز حکایتیں اور قصے بیان کرتے ہیں، رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں نقل کرتے ہیں۔ بری صحبت کے اثرات بیان کرتے ہوئے ''عوارف المعارف'' کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں کہ ''ایک سانپ ایسا ہوتا ہے کہ جس پر اس کی نظر پڑ جاتی ہے وہ سوختہ ہوجاتا ہے، جب حیوان کے یہ اثرات ہیں تو انسان کے اثرات کا کیا کہنا۔''

ف: چنانچہ حضرت مرشدی مولانا محمد احمد صاحبؒ اکثر فرماتے تھے کہ ''العین حق'' یعنی نظر بد حق ہے، اپنا عقیدہ ہے کہ نظر بد کا اثر برا ہوتا ہے، تو کیا نظر نیک کا اثر نہ ہوگا؟ چنانچہ بزرگوں کی نظر سے کتنے قلوب صلاح وتقویٰ سے آراستہ ہوجاتے ہیں۔ (مرتب)

(۲) غرور وتکبر سے بچو، کسی کو حقارت سے نہ دیکھو، عجز سے رہو، اپنے آپ کو سب سے بدتر اور کم تر سمجھو، فرماتے ہیں: ''ہر کہ خودرا از ہمہ کس کم داند او مقبول ومحبوبِ حق تعالیٰ باشد۔''

شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''حضرت بایزید بسطامیؒ کی سی انکساری پیدا کرنی چاہیے۔'' ایک مرتبہ بارش کی کمی ہوئی، نمازِ استسقا کے باوجود جب بارانِ رحمت نازل نہیں ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ برے لوگوں کی شامتِ اعمال سے یہ ہوا ہے، حضرت بایزید بسطامیؒ نے جب یہ سنا تو فوراً شہر سے نکل کھڑے ہوئے کہ سب سے برا تو میں ہی ہوں۔

ف: اب یہاں اشکال ہوسکتا ہے کہ کیا بایزید بسطامیؒ ایسے گنہگار تھے کہ ان کے شہر چھوڑنے کی وجہ سے بارش ہوگئی؟ نہیں، یہ بات نہیں، بلکہ انہوں نے

اپنے گناہوں کا اعتراف کیا، جیسا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ”أَنَا الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِیْ“ فرمایا، اس لیے اعترافِ ذنب کی سنت پر عمل کرنے کی برکت سے بحرِ بخشائش میں جوش اُٹھا اور بارش ہوگئی۔ (مرتب)

اسی کو مولانا رومیؒ نے فرمایا کہ ؎

تا نہ گرید کودکِ حلوا فروش　　بحرِ بخشائش نمی آید بجوش

تا نگرید ابر کے خندد چمن؟　　تا نگرید طفل کے جوشد لبن؟

ترجمہ: (۱) جب تک حلوا بیچنے والے کا بچہ نہیں روتا اس کی بخشش کا دریا جوش میں نہیں آتا۔ (۲) جب تک بادل نہیں روتا باغ نہیں ہنستا (نہیں کھلتا)۔ اور جب تک بچہ نہیں روتا ماں کے پستان میں دودھ جوش نہیں مارتا۔

ف: سبحان اللہ، کیا عمدہ اور مؤثر مضمون ہے، اللہ تعالیٰ اس کے مطابق ہمارا حال فرمائے اور اپنی رضا سے مشرف فرمائے۔

یہ مضمون ”اعترافِ ذنوب“ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بہت ہی عزیز تھا، اس لیے ۱۳۸۲ھ کے پورے رمضان کی مجالس میں اس کو بیان فرماتے رہے، جس کا مجموعہ بطورِ خلاصہ ”اعترافِ ذنوب“ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے، اس کے ساتھ اس حقیر نے ”اعترافِ قصور“ کو اس مبارک کتاب میں شامل کر دیا ہے، جس کو علماء و مشائخ بہت پسند فرما رہے ہیں، مجالس میں سنانے کا بھی معمول ہے۔ اللہ تعالیٰ صحیح معنوں میں ہم سب کو اعترافِ ذنوب وقصور کی توفیق دے اور قبول فرما کر اپنی رضا وخوشنودی سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔ (مرتب)

حضرت شاہ صاحبؒ چاہتے تھے کہ ان کے مریدوں میں عجز وانکسار کا مادّہ پیدا ہو اور وہ شفقت ومہربانی کے ساتھ خلقت کے ساتھ پیش آئیں، ارشاد ہوتا ہے:

''سالک را باید کہ ہمہ خلق را چہ شریف و چہ خسیس بہ شفقت ورحمت ناظر باشد، تا حق تعالیٰ بروے رحمت کند۔''

ترجمہ: سالک کو چاہیے کہ تمام مخلوق کو خواہ وہ شریف ہو یا رذیل، شفقت ورحمت کی نظر سے دیکھے، تاکہ حق تعالیٰ اس پر رحمت فرمائیں۔

غرور ونخوت سے نہ صرف دینی کام میں رُکاوٹ پڑتی ہے، بلکہ خود انسان کے اندر روحانی ترقی کی صلاحیتیں مردہ ہو جاتی ہیں۔

(۳) حسد وکبر سے بچو۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''گلِ توحید نہ روید در زمینے کہ در وخارِ شرک وحسد وکبر وریا است۔''

ترجمہ: ایسی زمین (قلب) جس میں شرک، حسد، کبر اور ریا کے کانٹے ہوں اس میں توحید کا پھول نہیں اُگا کرتا۔

(۴) عیب جوئی سے بچو۔ فرماتے تھے کہ اپنے عیوب کی تلاش مقدم ہے:

''سالک را باید کہ بہ سببِ عیب بینیٔ خویش از عیبِ خلق چشم بہ بندد، کہ عین سعادت ورضامندیٔ حق سبحانہ دریں مندرج است، چنانچہ در حدیث وارد است: ''طُوْبیٰ لِمَنْ شَغَلَ دِیْنُہٗ عَنْ عُیُوْبِ النَّاسِ۔''

ترجمہ: سالک کو چاہیے کہ اپنی عیب بینی کے سبب سے مخلوق کے عیب سے آنکھ بند کرلے، کہ اس میں حق سبحانہ کی رضامندی اور بندہ کی عین سعادت ہے، چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ ''خوش خبری ہے اس شخص کے لیے جس

کا دین اس کو لوگوں کے عیوب سے غافل کردے۔‘‘

(۵) غیبت سے بچو۔ قرآنِ پاک کا حکم ہے:

{وَ لاَ یَغْتَبْ بَعْضُکُمْ بَعْضًاط أَیُحِبُّ أَحَدُکُمْ أَنْ یَأْکُلَ لَحْمَ أَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ} (پارہ:۲۶/سورۂ حجرات:۱۲/رکوع:۲)

یاد رکھو: ’’غیبت از سرقہ بد است، زیرا کہ در سرقہ سارق چیز دزدیدہ می خورد، ودر غیبت ہیچ سود نیست، بلکہ اعمالِ غیبت کنندہ خاکستر شوند۔‘‘

ترجمہ: غیبت چوری سے بری ہے، اس لیے کہ چوری میں چور چرائی ہوئی چیز کھاتا ہے، اور غیبت میں کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ غیبت کرنے والے کے اعمال جل کر خاک ہوجاتے ہیں۔

پھر یہ شعر پڑھتے ہیں:

آں کس کہ بسوئے غیبت افراختہ است — او از تنِ مردگاں غذا ساختہ است

وآں کس کہ بعیبِ خلق پرداختہ است — زاں است کہ عیبِ خویش نہ شناختہ است

ترجمہ: وہ شخص جو غیبت کی طرف دوڑتا ہے گویا مردوں کے جسم سے غذا تلاش کرتا ہے، اور وہ شخص جو مخلوق کی عیب جوئی میں لگ جاتا ہے وہ اس لیے کہ وہ خود کے عیب سے ناواقف ہوتا ہے۔

وہ اپنی نصیحت کو پرزور اور زود اثر بنانے کے لیے آیاتِ قرآنی، احادیث اور اشعار برمحل نقل کرتے تھے، جب اخلاقی درس دیتے ہیں تو ان کے لہجے میں اصولی سختی اور تبلیغی نرمی کا نہایت ہی حیرت انگیز امتزاج ہوتا ہے، نصیحت کرنے کا جو موقع ملتا ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جس قسم کے لوگ آتے، جس قسم کا مسئلہ

زیر بحث ہوتا، وہ اخلاقی درس کو نہ بھولتے، وہ چاہتے تھے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اخلاقی اصول کارفرما ہوں، کسی بھی قسم کی گفتگو ہوتی وہ اس کا اخلاقی پہلو ضرور نمایاں کر دیتے تھے، ایک دِن تجارت کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی تو ارشاد فرمایا:

''اگر کسے سوداگریٔ دانۂ گندم کند، بریں نیت کہ غلہ را بہ قیمتِ گراں خواہم فروخت، ایں امر در شریعت ممنوع است، بلکہ ہر کہ ایں نیت کند عاقبۃ الامر خوار شدہ بمیرد۔''

ترجمہ: اگر کوئی اس نیت سے گیہوں کی تجارت کرے کہ اس کو گراں بیچوں گا، تو یہ امر شریعت میں ممنوع ہے، بلکہ جو کوئی ایسی نیت کرتا ہے وہ بالآخر خوار اور ذلیل ہو کر مرتا ہے۔

جانوروں کو پالنے کے متعلق گفتگو ہوتی ہے تو فوراً ہدایت فرماتے ہیں کہ ''جو شخص جانوروں کو پالتا ہے، لیکن ان کی خبر گیری نہیں کرتا اس سے قیامت کے دِن پرسش ہوگی۔''

بظاہر یہ معمولی باتیں ہیں، لیکن اپنے اخلاقی درس کو وہ یہاں بھی نہیں بھولتے۔ مریدوں کے لیے ان کی اخلاقی تعلیم کے مرکزی نقطے یہ تھے:

(۱) **عملِ صالح:** ''سالک را باید کہ در اعمالِ صالحہ مداومت نماید۔''

ترجمہ: سالک کو چاہیے کہ وہ اعمالِ صالحہ کرنے میں مداومت اختیار کرے۔

(۲) **نیکی:** ''کارِ ما بہ بداں ہم نیکی کردن است۔''

ترجمہ: ہمارا کام بروں کے ساتھ بھی اچھائی کا معاملہ کرنا ہے۔''

(۳)ادب:

از خدا خواہم توفیق ادب بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

ترجمہ: اللہ تعالیٰ سے میں ادب کی توفیق چاہتا ہوں، اس لیے کہ بے ادب اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم رہتا ہے۔

مریدوں کی اخلاقی تعلیم میں وہ ان ہی تین چیزوں پر زور دیتے تھے، ملفوظات میں متعدد جگہ ان ہی کو مختلف انداز سے دل نشیں کرایا گیا ہے۔

ف: سبحان اللہ، کیسے مفید نصائح و ہدایات ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان تعلیمات پر عمل کی توفیق دے۔ آمین۔ (مرتب)

ارکانِ اسلام کا تحفظ: حضرت شاہ محمد سلیمانؒ کو ارکانِ اسلام کے تحفظ کا بڑا خیال تھا، جس وقت انہوں نے اصلاح و تربیت کا کام شروع کیا تھا اس وقت لوگوں میں فسق و فجور بہت بڑھ گیا تھا، خود شکایت کرتے ہیں: ''دریں زمانہ مردماں فسق و فجور می کنند۔'' اس زمانہ میں لوگ فسق و فجور کرتے ہیں۔

لوگوں میں دین سے بے اعتنائی عام تھی، بدعت کے کاموں میں سیکڑوں جمع ہوجاتے تھے، لیکن کارِ خیر میں حصہ لینے کے لیے کوئی تیار نہ ہوتا تھا، فرماتے ہیں:

''ہر جا کہ بدعت و بازی باشد خلق بسیار جمع شود، و ہر جا کہ کارِ نیک باشد خلق کم رود۔''

جہاں کہیں بدعت یا کھیل ہوتے ہیں بے شمار لوگ جمع ہوجاتے ہیں، لیکن جہاں نیک کام ہوتا ہے وہاں کم آتے ہیں۔

ایک شخص جس نے بڑی سیاحت کی تھی، شاہ صاحبؒ سے عرض کیا:

''من ملکِ خراسان و ہندوستان را دیدہ ام کہ ہیچ جا دین داری نیست مثل بخارا، ودیگر درتونسہ مبارک، کہ ازسببِ برکتِ آں صاحب بسیار دین داری است۔''

ترجمہ: میں نے خراسان اور ہندوستان میں گشت کیا ہے، کہیں ایسی دین داری نہیں ہے جیسی بخارا اور تونسہ میں ہے، تونسہ مبارک میں حضرت شاہ صاحبؒ کی برکت سے بڑی دین داری ہے۔

تونسہ کی یہ حالت تو شاہ صاحبؒ کی مسلسل کوشش اور تلقین پیہم کے بعد ہوئی تھی، ورنہ اور جگہ حالت یہ تھی کہ عوام ارکانِ اسلام سے نابلد تھے اور طرح طرح کے حیلے بہانے بنا کر فرائض سے بچتے تھے، نماز اور روزہ جو اسلام کے ستون ہیں غفلت اور بے توجہی کے باعث کمزور ہوتے جا رہے تھے، ملفوظات میں جگہ جگہ عوام کی اس بے اعتنائی پر غم و غصّے کا اظہار کیا گیا ہے، ایک شخص نے عرض کیا کہ میں علاوہ پنج وقتہ نماز کے کوئی کارِ خیر نہیں کرتا، ارشاد ہوا:

''ہر کہ دریں زمانہ نمازِ پنج وقت با جماعت بخواند او ولی است، کہ دریں زمانہ بے دینی تمام است۔''

ترجمہ: جو شخص اس زمانے میں پنج وقتہ نماز با جماعت پڑھ لیتا ہے وہ ولی ہے، کہ اس زمانے میں بے دینی بہت ہے۔

روزہ سے لوگ بچتے تھے، کہتے تھے کہ روزہ رکھنے سے خشکی ہوتی ہے، شاہ صاحبؒ نے ان خیالات کے خلاف جہاد کیا اور بتایا کہ ایسا کرنا گمراہئ نفس پر مبنی ہے، فرماتے ہیں:

''دنیا داراں در ماہِ رمضان شریف روزہ ندارند و گویند کہ مارا خشکی می شود،

ایں سخن از گمراہیٔ نفس وشیطان است۔‘‘

ترجمہ: دنیادار رمضان المبارک کے روزے نہیں رکھتے اور کہتے ہیں کہ ہمیں خشکی ہوتی ہے، یہ بات نفس کی گمراہی اور شیطان (کے غلبہ) کی بنا پر ہے۔

ف: سبحان اللہ، کیا خوب ارشادات و ہدایات ہیں جو نقش قلوب کیے جانے کے لائق ہیں۔ واللہ الموفق۔ (مرتب)

صوفیہ کی اصلاح: اس زمانے کے صوفیہ مختلف قسم کی بد اعتقادیوں کا شکار تھے، روحانی ترقی اس لیے چاہتے تھے کہ دنیاوی دشواریاں حل ہو سکیں۔ اعمال وظائف میں حد سے زیادہ اعتقاد تھا اور سارا وقت اسی میں صرف ہوتا تھا، شاہ صاحبؒ نے اس گمراہی کو محسوس کر لیا اور فرمایا:

’’سالک را باید کہ در عملیات تضییعِ وقت نہ کند، کہ ایں رہزن و مانعِ راہِ فقر است، و مقصودِ اصلی یاد کردنِ حق است۔‘‘

ترجمہ: سالک کو چاہیے کہ عملیات میں وقت کو ضائع نہ کرے، ایسے مشغلے راہِ فقر کے ڈاکو اور رُکاوٹیں ہیں، اصل مقصود اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہے۔

ان وظائف کی جگہ جن کا مقصد کسی دنیاوی مشکل کا حل کرنا ہوتا تھا شاہ صاحبؒ نے ذکرِ جہری پر زور دیا اور فرمایا:

’’ذکرِ جہر بہ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ از ہمہ اوراد و وظائف بہتر است، چنانچہ در حدیث شریف وارد است: ’’أَفْضَلُ الذِّكْرِ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ۔‘‘

ترجمہ: ذکرِ جہر بہ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ تمام اوراد و وظائف سے بہتر ہے، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سب سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے۔

ف: سبحان اللہ، کیا خوب وظیفہ ارشاد فرمایا ہے۔ واللہ الموفق۔

شاہ صاحب کی کوشش تھی کہ صوفیہ میں اطاعتِ حق کا صحیح جذبہ اور دین کا غم پیدا ہو، وہ اس دینی طبقے کو مادّی الجھنوں میں پھنسا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے، فرماتے ہیں:

''سالک را باید کہ غمِ دین خورد، کہ مقصودِ دارین است۔''

ترجمہ: سالک کو چاہیے کہ دین کی فکر رکھے، اس لیے کہ مقصودِ دارین یہی ہے۔

غمِ دیں خور، کہ غم غمِ دیں است　　ہمہ غمہا فروتر ازیں است

ترجمہ: دین کی فکر رکھو، کہ اصل غم وہی ہے، دیگر تمام غم اس سے کم درجہ کے ہیں۔

وہ صوفیہ کو دنیا داری سے دین داری کی طرف بلاتے تھے اور ان کو بتاتے تھے کہ کل تم کیا تھے؟ آج کیا ہو گئے ہو؟ تمہاری کوششوں اور عبادتوں کے مرکز کیوں تبدیل ہو گئے؟ تم نے دین کے بجائے دنیا سے کیوں دل لگا لیا؟ تم نے اپنے اعتقادات میں کیوں فساد پیدا کر لیے؟ صحیح مذہبی جذبہ پیدا کرو، کہ وہی سعادتِ دارین کا باعث ہوگا۔

شاہ صاحبؒ کی بالغ نظر ہر گمراہ روِش کو دیکھ لیتی تھی اور وہ اس کے خطرناک اثرات سے فوراً آگاہ ہو جاتے تھے، انہوں نے محسوس کیا کہ لوگ اپنے شیخ پر بے جا اعتقاد اور اس کی روحانی امداد پر بے جا اعتماد رکھتے ہیں، چنانچہ انہوں نے صاف طور سے لوگوں کو آگاہ کر دیا کہ تم اپنے پیر سے جس قدر امداد

چاہتے ہو اور کائنات کے کاموں میں اس کا جس قدر دخل خیال کرتے ہو، یہ سب باتیں اس کے احاطۂ اختیار سے باہر ہیں، اللہ تعالیٰ پر صحیح بھروسہ رکھو، سوائے اس کے کسی سے التجا نہ کرو، اسی سے عرضِ مدّعا کرو اور اسی پر اعتماد رکھو۔

ف: سبحان اللہ، کیا خوب توحیدِ خالص اور توکل کا وظیفہ بلکہ فریضہ تعلیم فرمایا ہے، جو پیش نظر رکھنے ہی کے قابل نہیں؛ بلکہ ان پر عمل کرنا واجب ہے۔ واللہ الموفق۔ (مرتب)

ایک جگہ ان ہی گمراہیوں کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

''سالک را باید کہ ہر فعلِ ایزد تعالیٰ را عین حکمت پندارد، اگر چہ برآں اطلاع نداشتہ باشد، و بروے اعتراض نہ کند، ہر کہ اعتراض کند فھو مردود فی الدارین۔''

ترجمہ: سالک کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر فعل کو عین حکمت سمجھے، اگر چہ اس (حکمت) سے واقف نہ ہو، اس پر اعتراض نہ کرے، جس نے اعتراض کیا وہ دارین میں مردود ہو گیا۔

ف: أَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ سُوْءِ الْعَمَلِ وَ الْحَالِ۔ (مرتب)

علماء کی اصلاح: شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے اسلامی معاشرہ کے جس طبقہ کو بھی غلط راستے پر پایا اس کی طرف فوراً توجہ کی، علماء کی بے راہ روی دیکھی تو وہ کانپ اٹھے اور فرمایا: ''فَسَادُ الْعَالِمِ فَسَادُ الْعَالَمِ۔'' یعنی عالِم کا فساد سارے عالَم کے فساد کا موجب اور سبب ہے۔

وہ علماء کی گمراہی کو ساری قوم کی گمراہی کے مترادف سمجھتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ عامی کی گمراہی خود اسی تک رہتی ہے، لیکن علماء کی گمراہی کا عوام

بھی شکار ہو جاتے ہیں۔علماء کے متعلق فرماتے ہیں:

''نہ در جنت تنہا می روند، و نہ در دوزخ، بلکہ ہر دو طرف با جماعتِ کثیر روانہ می شوند۔''

ترجمہ: وہ نہ جنت میں تنہا جاتے ہیں اور نہ دوزخ میں، دونوں جگہ جماعتِ کثیر ان کے ساتھ ہوتی ہے۔

چنانچہ علماء کو ہدایت فرماتے ہیں:

''عالم را باید بر علم عمل کردن، **والا کمثل الحمار یحمل أسفارا۔**''

ترجمہ: عالم کو علم کے مطابق عمل کرنا چاہیے، ورنہ وہ اس گدھے کے مانند ہے جو بڑی بڑی کتابیں اٹھاتا ہے۔

علم کا مقصود شاہ صاحبؒ کی نظر میں یہ تھا:

''مقصود از علم، عمل و ہدایت و محبتِ باری تعالیٰ حاصل کردن است۔''

ترجمہ: علم سے مقصود، عمل، ہدایت اور حق تعالیٰ کی محبت حاصل کرنا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اپنے زمانے کے نصابِ تعلیم کے خلاف بھی آواز بلند کی، فرمایا کہ علماء کو فقہ اور تفسیر پر زور دینا چاہیے، ان ہی کے مطالعہ سے مذہبی زندگی سنورتی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''علمِ فقہ و تفسیر ضروری است، کہ دانستنِ فرض و واجب و سنت و مستحب و مکروہ موقوف بر علمِ فقہ است، و باقی ہمہ علوم سر دردی است۔''

ترجمہ: علمِ فقہ اور تفسیر لازمی ہیں، فرض، واجب، سنت، مستحب اور مکروہ کا جاننا علم فقہ پر موقوف ہے، باقی علوم تو دردِ سر ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''علم بغیر عمل، وعمل بغیر عقیدۂ صاف کہ اہل سنت و جماعت است فائدہ ندہد۔''

ترجمہ: علم بغیر عمل اور عمل بغیر عقیدۂ اہل سنت و الجماعت فائدہ نہیں پہنچاتا۔

اگر ایسا نہیں ہے تو سب فضول ہے۔

علم چنداں کہ بیشتر خوانی چوں عمل در تو نیست، نادانی

ترجمہ: علم جتنا بھی پڑھ لو، جب تم میں اس پر عمل نہیں تو تم عالم نہیں، نادان ہی ہو۔

اصلاح معاشرہ: زوال وانحطاط کے زمانے میں سیکڑوں سماجی اور اخلاقی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ان کی ابتدا گھر کی چہار دیواری سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ ساری قوم مجموعی حیثیت سے ان میں مبتلا ہو جاتی ہے، ''ملفوظات'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں سماج کی وہ حالت نہ رہی تھی جو مہذب اور تربیت یافتہ سوسائٹی کے افراد کی ہونی چاہیے، گھر کی چہار دیواری مدنی زندگی کا گہوارہ ہے، جب گھر میں اخلاقی خرابیاں رونما ہونے لگتی ہیں تو مدنی زندگی کے سرچشمے معدوم ہو جاتے ہیں، ''نافع السالکین'' میں ایسے متعدد واقعات درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کا ادب و احترام بالکل جاتا رہا تھا، ایک شخص نے آکر خدمت اقدس میں عرض کیا: ''حضرت! میرے عیال واطفال مجھے گالیاں دیتے ہیں اور میری خدمت نہیں کرتے۔'' شاہ صاحبؒ کو یہ سن بے حد رنج ہوا، لیکن آپؒ انسانی نفسیات سے واقف تھے، اس

شخص کوتو یہ کہہ کر تسلی دے دی:

''تکیۂ حق بکار آید، وتکیۂ غیر بے کار، واگر کسے تکیہ بر عیال واطفال کند کہ مرا خدمت کنند، ہیچ فائدہ نمی دہد۔''

ترجمہ: اللہ تعالیٰ پر اعتماد و بھروسہ کام آتا ہے، ورنہ غیر پر بھروسہ کب کام آسکتا ہے؟ اگر کوئی اپنے بال بچوں پر بھروسہ کرتا ہے کہ وہ میری خدمت کریں گے تو اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

لیکن پھر ایک موقع پر نہایت افسوس کے ساتھ فرمایا:

''از علاماتِ قیامت است کہ پسر با پدر بہ جنگ ونزاع باشد۔''

ترجمہ: قیامت کی علامتوں میں سے ہے کہ بیٹا باپ سے جھگڑا کرے گا۔

پھر یہ شعر پڑھا:

پسراں را ہمہ بدخواہِ پدر می بینم   دختراں راہمہ جنگ است وجدل با مادر

ترجمہ: لڑکیوں کو اپنی ماں سے جھگڑا وفساد ہے، اور لڑکوں کو بھی اپنے باپ کا بدخواہ پاتا ہوں۔

ف: جب حضرت شاہ صاحبؒ کے زمانے کا یہ حال تھا تو پھر اس زمانے کا حال تو اس سے بدتر ہے، جو بالکل عیاں ہے وعیاں راچہ بیاں۔ (مرتب)۔

جب کوئی اخلاقی یا سماجی کمزوری شاہ صاحبؒ کے علم میں آجاتی تھی تو وہ اس کو دور کرنے کی بے حد کوشش کرتے تھے، جب انہوں نے یہ حالات دیکھے تو مختلف طریقوں سے والدین اور اولاد کے تعلقات میں شگفتگی، اطاعت اور فرماں برداری پیدا کرنے کی سعی فرمائی، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

’’خدمت وفرماں برداریٔ والدین از دل و جاں باید کرد، کہ در حدیث آمدہ کہ والدین مثلِ کعبۃ اللہ اند، اگر کسے والدین رارد کند ہرگز مقبول نہ شود۔‘‘

ترجمہ: والدین کی خدمت اور فرماں برداری دل وجان سے کرنی چاہیے، حدیث میں آیا ہے کہ والدین کعبۃ اللہ کے مانند ہیں، جو والدین کو رد کرتا ہے وہ خود کبھی مقبول نہیں ہوگا۔

اس طرح ڈرانے کے بعد ایک جگہ نہایت خوشی سے فرماتے ہیں:

’’اگر پسر با پدر خوش دل شدہ تکلم نماید، آں را مبارک بادی نمایند۔‘‘

ترجمہ: اگر لڑکا باپ کے ساتھ خوشی سے بات کرتا ہے تو اس کو مبارک بادی دینی چاہیے۔

ف: معلوم ہوا کہ جو لڑکا ماں باپ سے خوشی سے بات کرتا ہے تو قابل مبارک باد ہے، کاش کہ اولاد اس کو سمجھتی تو سعادتِ دارین سے مشرف ہوتی، مگر افسوس۔ (مرتب)۔

شاہ صاحبؒ نے سوسائٹی کی اور بھی بہت سی خرابیوں کی مذمت کی ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں: ’’پہلے زمانے میں قاضی صاحبِ نسبت ہوا کرتے تھے، اب رشوت خور ہوتے ہیں۔‘‘ رشوت خوری کی مذمت اس طرح بیان فرماتے ہیں:

’’ہر کہ حرام خورد، رزقِ او تنگ شود و عاجز باشد، چنانچہ دزداں ہمیشہ خوار باشند۔‘‘

ترجمہ: جو کوئی حرام کھاتا ہے اس کا رزق تنگ ہوجاتا ہے، اور وہ عاجز ہو جاتا ہے، چنانچہ قوم کے نزدیک چور ہمیشہ ذلیل وخواہ ہی رہتے ہیں۔

سلطنت کے کار پردازوں کا حال: اہل کاروں کی مذمت ایک سلسلہ

میں اس طرح کرتے ہیں:

''ہر اہل کار دریں زمانہ کہ می آید از سابق بدتر باشد۔''

ترجمہ: اس زمانے میں ہر اہل کار جو آتا ہے پہلے سے بدتر آتا ہے۔

ف: جیسا کہ فی الحال دیکھ رہے ہیں، جس کی وجہ سے سارا ملک اضطراب کا شکار ہے۔ (نومبر/۲۰۱۶ء، مرتب)

ایک جگہ شراب خوری کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''جب اللہ تعالیٰ کسی کے نفس پر شیطان غالب کرتا ہے تو وہ شراب خوری وغیرہ کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔''

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عشق بازی سے بچنا چاہیے:

''عشق ورزیدن با کودکاں و زناں بلائے است، ازیں دور باید بود۔''

ترجمہ: عورتوں اور لڑکوں سے عشق کرنا ایک بلا ہے، اس سے دور رہنا چاہیے۔

ف: یہ ساری امت کے لیے نصیحت ہے، خواہ عوام ہوں یا خواص۔ (مرتب)۔

اتباعِ شریعت کی تلقین: شاہ محمد سلیمان صاحبؒ شریعت کے معاملہ میں نہایت سخت گیر تھے، فرمایا کرتے تھے:

''ہر کہ خواہد کہ مقبول و محبوبِ حق سبحانہ و تعالیٰ گردد باید کہ در متابعتِ شریعت ظاہراً و باطناً کوشش نماید، چنانچہ نص دریں باب وارد است: {إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ}

ترجمہ: جو شخص چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کا محبوب بن جائے اسے چاہیے کہ ظاہر و باطن میں شریعت کی متابعت کرے، چنانچہ قرآن پاک میں فرمایا گیا

ہے: {إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ} اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو سنن ظاہرہ میں بھی اور سنن باطنہ میں بھی، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔

بار بار ارشاد ہوتا ہے: ''از امر غیر مشروع دور باشید۔'' غیر شرعی چیزوں سے دور رہو۔

شاہ صاحبؒ کو سوائے قرآن وحدیث کے کوئی گفتگو پسند نہ تھی، فرمایا کرتے تھے:

''بغیر ذکرِ اللہ ورسول اللہ ہمہ سردردی است۔''

ترجمہ: شاہ صاحبؒ کا خیال تھا کہ انسانیت کا کمال بغیر متابعتِ شریعت دشوار ہے:

''وصولِ کمالِ انسانی بغیر متابعتِ شریعت ظاہری وباطنی از قبیل محالات است۔''

فرمایا کرتے تھے کہ ''صفائی قلب جو روحانی ترقی کے لیے از بس ضروری ہے، بغیر اتباعِ شریعت کے حاصل نہیں ہوتی، اگر کوئی ولی بھی خلافِ شرع عمل کرتا ہے تو اس کی ولایت اور روحانیت کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

''یک فعلِ غیر مشروع بندہ را از مرتبۂ ولایت بیفگند۔''

ترجمہ: ایک غیر شرعی فعل بندے کو مرتبۂ ولایت سے نیچے پھینک دیتا ہے۔

شاہ صاحبؒ تصوّف وسلوک کی مستند کتابوں کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا کرتے تھے کہ صراطِ مستقیم سے مقصود راہِ شریعت ہے، شیخ محي الدین ابن عربیؒ نے ''فتوحاتِ مکیہ'' میں اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے ''عوارف المعارف'' میں یہی

بتایا ہے کہ شریعت کی مدد کے بغیر روحانیت کی دشوار گذار راہیں طے نہیں کی جاسکتیں۔

شاہ صاحبؒ جب لوگوں کو شریعت سے بے اعتنائی برتتے ہوئے پاتے تھے تو ان کو سخت صدمہ ہوتا تھا، ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ''اگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب بالفرض اس وقت موجود ہوتے تو اس زمانے کے لوگوں کو کافر کہتے، اس لیے کہ انہوں نے شریعت کا اتباع چھوڑ دیا ہے، اور مخلوق ان کو دیوانہ کہتی، اس لیے کہ ان کے افعال و اخلاق شریعت کے مطابق ہوتے۔

متابعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت: شاہ صاحبؒ مسلمانوں کے تمام مصائب اور مشکلات کا سبب اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سستی کو قرار دیتے تھے، ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت بھی اس لیے نکلی ہے کہ انہوں نے متابعتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''دریں زماں چوں مسلماناں متابعتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گذاشتہ اند، حق سبحانہ و تعالیٰ کفار را برایشاں مسلط کردہ است۔''

ترجمہ: اس زمانے میں چوں کہ مسلمانوں نے اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ دیا ہے اس لیے حق تعالیٰ نے ان پر کفار کو مسلط کر دیا ہے۔

اکثر ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ جب سکھوں نے ملتان کا محاصرہ کیا تو ایک بزرگ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں امداد کے طالب ہوئے، خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''امتِ من متابعتِ من گذاشتہ اند۔'' میری امت نے میرا اتباع چھوڑ دیا ہے، اس کا یہ برا نتیجہ ہے۔

حکومت کو بھی اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضرورت ہے: فرمایا کرتے

تھے کہ ''دین اور دنیا دونوں میں کامیابی کا انحصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع پر ہے، بے متابعت حصولِ مقصد ناممکن ہے، حکومت بھی اسی وقت مل سکتی ہے جب زندگی کے ہر شعبہ میں اس اکمل ترین انسان کا اتباع ہو، اور روح کا کمال بھی اسی وقت ممکن ہے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقشِ قدم پر گامزن ہو، سلوک و معرفت کی راہیں بغیر اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طے نہیں کی جاسکتیں۔''

مذہبی اور روحانی تعلیم: شاہ صاحبؒ اپنے مریدوں میں صحیح مذہبی جذبات پیدا کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو صحیح راستے پر لگانے کے لیے بے چین رہتے تھے، ان کی نظر میں پیر کا کام مشاطہ کی طرح اپنے مرید کے روحانی خط وخال سنوارنا تھا، جس وقت خواجہ مہارویؒ نے ان کو خلیفہ بنانا چاہا تھا تو انہوں نے یہ عذر کیا تھا: ''قبلہ! زمانہ کی حالت دگرگوں ہے، لوگ بہت گمراہ ہو گئے ہیں، یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا، مجھ میں استطاعت نہیں کہ اس کام کی ذمہ داری قبول کروں۔'' لیکن جب پیر و مرشدؒ نے اصرار کیا تو انہوں نے یہ ذمہ داری قبول فرمائی اور ساٹھ سال اس ذمہ داری کو اس طرح پورا کیا کہ ان کی دور رس نگاہ زندگی کے ہر شعبہ تک پہنچی اور ان کے اصلاحی ہاتھ کا اثر دور دور تک محسوس کیا گیا، ان کے آخری زمانے کا ایک دل چسپ واقعہ ''ملفوظات'' میں درج ہے:

ایک عورت نے سوال کیا: ''حضرت والا! لکھوکھا آدمی، کیا مرد، کیا عورتیں، آپ کے دست پر بیعت ہوتے ہیں اور یہ حال ہے کہ آپ کسی کو زیادہ دیر بیٹھنے نہیں دیتے، اور کیا دِن ہو کیا رات، بیعت کرتے رہتے ہیں، اور ہر ایک کا بھروسہ ہے کہ قیامت کے دِن آپ کام آئیں گے اور امداد کریں گے، مگر حیرانی ہے کہ

کروڑوں مخلوق میں سے آپ اپنے مرید کس طرح پہچان سکیں گے؟'' جواب میں ارشاد فرمایا: ''رات کا وقت ہوتا ہے، اور چھ سات چرواہے اپنی اپنی بھیڑیں ملا دیتے ہیں، پھر جب چاہتے ہیں ہر ایک اپنے ریوڑ کو جدا کر لیتا ہے، حالاں کہ بہت سی بھیڑیں ہم رنگ ہوتی ہیں، اور حالاں کہ لوگ چرواہوں کو احمق اور بے وقوف کہا کرتے ہیں، تو کیا میں اپنے مریدوں کو شناخت نہ کر سکوں گا؟''

شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کی مذہبی اور روحانی تعلیم کے بعض اہم پہلو یہ ہیں:

عبادت: فرمایا کرتے تھے کہ ''انسان کی زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: {وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ}

کبھی یہ شعر پڑھتے تھے:

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی

ترجمہ: زندگی بندگی کے لیے ہے، زندگی بغیر بندگی کے شرمندگی ہے۔

شاہ صاحبؒ کی حیثیت ایک روحانی طبیب کی سی تھی، وہ ہر شخص کو اس کی طاقت، استعداد اور صلاحیت کے مطابق عبادت کا حکم دیتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ ''ریاضت بقدرِ استطاعت کرنی چاہیے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شروع میں انتہائی زیادہ ریاضت کر لی جاتی ہے، مگر بعد میں ناتوانی اور ضعف کے باعث فرائض کی ادائیگی میں بھی کوتاہی ہونے لگتی ہے۔

اللہ تعالیٰ پر صحیح اعتقاد و اعتماد: شاہ صاحبؒ اپنے مریدوں کو اللہ تعالیٰ پر پختہ اعتماد اور کامل بھروسہ کا درس دیتے تھے، اس سلسلے میں ان کی تعلیمات {اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ} کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''التجا وتکیہ بہ حضرتِ حق سبحانہ وتعالیٰ باید کرد، نہ بغیر او''۔ ''سالک را باید کہ سوائے جنابِ حق عزوجل تکیہ گاہِ خود نہ بیند۔''

ترجمہ: دعا اور بھروسہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہی پر کرنا چاہیے، اس کے سوا کسی پر نہیں، سالک کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی پر بھی توکل نہ کرے۔

حبِ دنیا سے پرہیز: شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے اپنے ملفوظات میں جگہ جگہ دنیا کی محبت اور دنیاداروں کی صحبت سے بچنے کی تلقین کی ہے، اس سے ان کا مقصد گوشہ نشینی یا رہبانیت نہ تھی، خود اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''سالک را بجز چند چیز در دنیا چارہ نیست، وآں را صوفیۂ کرام از دنیا نمی شمارند، بلکہ از امورِ دینیہ انگارند، چنانچہ قوتِ ضروری برائے عبادت و جامۂ ضروری بنا بر سترِ عورت وآبِ ضروری بہ جہتِ بقاءِ حیات ومسکن ضروری برائے عبادت وعلم ضروری برائے عمل۔''

ترجمہ: سالک کو دنیا کی چند چیزوں کے بغیر چارہ نہیں، اور ان کو صوفیۂ کرام دنیا میں شمار نہیں کرتے، بلکہ ان کو امورِ دینیہ میں گنتے ہیں، چنانچہ غذا جو عبادت کے لیے ضروری ہو، اور کپڑا جو ستر چھپانے کے لیے درکار ہو، اور پانی جو بقاءِ حیات کے لیے ہو، اور مسکن (مکان) ضروری برائے عبادت اور علم برائے عمل وہ چیزیں ہیں جو دنیا میں شمار نہیں۔

ف: سبحان اللہ، حاجاتِ ضروریہ کی ضروری تفصیل بیان فرمائی، جو خوب ہے۔ **فجزاھم اللہ۔** (مرتب)

امراء سے بے تعلقی: شاہ محمد سلیمانؒ امراء اور دنیا دار لوگوں سے بے تعلق رہتے

تھے، ان کا خیال تھا کہ ایسے لوگوں کی صحبت سے دل مردہ ہو جاتا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

(۱) ’’سالک را باید کہ از صحبتِ اہلِ دنیا دور باشد۔‘‘

(۲) ’’قربِ ایشاں ہلاکتِ جاں است‘‘۔ ’’قربِ سلطاں آتشِ سوزاں بود۔‘‘

(۳) ’’صُحْبَةُ الأَغْنِيَاءِ تُمِيتُ الْقَلْبَ، وَ لَوْ كَانَتْ سَاعَةً۔‘‘

اغنیاء کی صحبت قلب کو مردہ کر دیتی ہے، اگر چہ ایک لمحہ ہی کیوں نہ ہو۔

فرمایا کرتے تھے کہ ’’اہلِ دنیا سفید چشم اور بے وفا ہوتے ہیں، جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو پیر و فقیر کی تلاش میں پھرتے ہیں اور آہ و زاری کرتے ہیں، لیکن ویسے بلا مطلب وہ کبھی فقراء کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

ف: آج کل عموماً یہی حال ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی اصلاح فرمائے، آمین (مرتب)

جاگیر کے بارے میں فیصلہ: شاہ صاحبؒ نے جاگیر کے معاملے میں بھی اپنے بزرگوں کے مسلک پر عمل کیا، چنانچہ ایک مرتبہ عبد الجبار خان نواب ڈیرہ غازی خان نے درویشوں کے خرچ کے لیے جاگیر پیش کی، جواب میں فرمایا:

’’ما ایں جاگیر نہ گیریم، کہ خلافِ سنتِ پیراں و شیخانِ ما ہرگز نہ خواہیم نمود، کہ ایشاں قبول نہ کردہ اند۔‘‘

ترجمہ: ہم اس جاگیر کو قبول نہیں کریں گے، ہم اپنے بزرگوں اور مشائخ کے طریقے کی خلاف ورزی ہرگز نہیں کریں گے، اس لیے کہ انہوں نے بھی اسے قبول نہیں کیا ہے۔

کچھ لوگوں نے عرض کیا کہ صاحب زادہ گل محمد کے لیے جاگیر قبول فرما

لیجیے، تو جواب دیا:

''گل محمد را نیز حاجتِ جا گیر نیست، اگر نعلین درویشاں راست کند برائے خدمتِ او مقرباں خدمت گار شوند۔''

ترجمہ: کہ گل محمد کو بھی جا گیر کی کوئی ضرورت نہیں، اگر وہ مشائخ کی جوتیاں سیدھی کرے گا (یعنی ان کی خدمت کرے گا) تو مقربین اس کی خدمت کریں گے۔

شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''اللہ تعالیٰ کا مہمان بن کر زندگی بسر کرنی چاہیے، تاکہ دینی کام پوری ذہنی مرکزیت کے ساتھ انجام پا سکیں۔

ف: شاہ صاحبؒ نے بہت ہی اہم مضامین بیان فرمائے ہیں، جو یقیناً علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ اس کی توفیق دے، آمین (مرتب)

وصال: ماہِ صفر/ ۱۲۶۷ھ (مطابق: دسمبر/ ۱۸۵۰ء) کا چاند دیکھ کر خواجہ صاحبؒ نے فرمایا: ''ہمارے سفر کا مہینہ ہے، اللہ تعالیٰ خیر فرمائے۔'' کچھ دن بعد زکام کی شکایت ہوئی اور ۷/ صفر کو جان جاں آفریں کے سپرد کر دی، آپؒ نے دو صاحب زادے چھوڑے، خواجہ گل محمد اور خواجہ درویش محمد۔ نوابِ بھاول پور نے ۷۰ ہزار روپے کے صرفہ سے سنگِ مرمر کا عالی شان روضہ تیار کروایا۔ مولوی حسین علی فتح پوریؒ نے تاریخ وصال کہی:

سلیمانِ زماں رحلت چو فرمود　　یکا یک در جہاں ظلمت بیفزود
پئے سالِ وفاتش ہاتف ِ غیب　　بگفت: ''او آفتابِ چشتیاں بود''

۱۲۶۷ھ

رحمہ اللہ تعالیٰ ونوّر مرقدہٗ (مشائخ چشت/ حصہ پنجم/ صفحہ: ۲۸۴ تا ۳۳۷)

حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ متوفی ۱۲۶۷ھ

نانوتہ میں صدیقی خاندان کے جدِ اعلیٰ اور ان کا عہد: نانوتہ میں اس خاندان کی آمد اور قیام کا عہد نویں صدی ہجری کا آخری یا دسویں صدی ہجری کا ابتدائی دور ہے، نانوتہ میں اس خاندان کے جو بزرگ سب سے پہلے تشریف لائے وہ قاضی میراں عرفِ قاضی بڑے تھے، قاضی میرانؒ کے والد قاضی مظہر الدینؒ جن کا سلسلۂ نسب سینتیس (۳۷) واسطوں سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہٗ تک پہنچتا ہے، وہ سمرقند کے رہنے والے تھے، اور سلطان بہلول لودھی کے زمانۂ حکومت میں سمرقند سے ہندوستان آگئے تھے، قاضی مظہر الدینؒ کو جہاں آباد (کڑہ مانک پور) کا قاضی مقرر کیا گیا، قاضی صاحبؒ کا جہاں آباد میں قیام رہا، وہیں ان کی وفات ہوئی، قاضی صاحبؒ کے کئی فرزند تھے، جن میں سے ایک قاضی میراں عرف قاضی بڑے تھے، قاضی میرانؒ کو بااختیار حاکم اور قاضی بنا کر نانوتہ بھیجا گیا، اس علاقہ میں ڈاکوؤں اور باغیوں کی سرکشی اور لوٹ مار کی وجہ سے بے اطمینانی اور بدانتظامی کا دور دورہ تھا، قاضی میرانؒ نے جرأت وہوش مندی سے کام لے کر ان کی جتھہ بندی اور جنگی قوت کو ختم کر کے علاقہ میں امن وامان قائم کیا، جو حکومت کی خوشنودی کا سبب ہوا، قاضی میرانؒ کی رجب ۹۰۲ھ مطابق: مارچ/۱۴۹۷ء میں تقریباً ستانوے سال کے عمر میں وفات ہوئی، قاضی میرانؒ کے عہد سے آج تک یہ خاندان نانوتہ میں مقیم ہے، اس

خاندان میں اللہ تعالیٰ نے بہت وسعت وبرکت عطا فرمائی اور اس کی کئی شاخیں ہوگئیں، بعد کی نسلیں ان ہی شاخوں یا خاندان کے خاندان شخصیات کی نسبت سے مشہور ہوئیں، ایسی ہی ایک شاخ وہ ہے جس کو شیخ محمد ہاشمؒ کی اولاد یا خاندان کہا جاتا ہے، مولانا محمد ہاشمؒ عہدِ شاہجہاں کے علماء میں تھے، اور مفتی محمود صاحب نانوتویؒ کے الفاظ میں علم ومعرفت کے ایک جلیل القدر شیخ ہوئے۔

آپؒ کا نسب: مولانا مملوک العلی بن مولوی احمد علی بن حکیم غلام مشرف بن حکیم عبداللہ بن شیخ ابوالفتح بن شیخ محمد مفتی بن شیخ عبدالسمیع بن مولوی محمد ہاشم رحمہم اللہ۔

سن ولادت: مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کی رائے کے مطابق آپؒ کی ولادت ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ابتدائی تعلیم: مولاناؒ کی ابتدائی تعلیم کے متعلق معلومات کا فقدان ہے، مگر مولاناؒ کے خانوادے میں متعدد علماء اور طبیب موجود تھے، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ مولاناؒ کی ابتدائی تعلیم خاندان کے بڑوں اور اہل علم کی نگرانی میں ہوئی ہوگی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مولاناؒ کی ابتدائی تعلیم وتربیت (حضرت مفتی الٰہی بخشؒ کے نانوتوی شاگردوں) مولانا عبدالرحمنؒ یا مولانا عبدالرحیم نانوتویؒ کے سپرد کی گئی ہو۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی کا سفر: مولانا مملوک العلیؒ نے مولانا سید محمد قلندر جلال آبادیؒ اور مولانا مفتی الٰہی بخشؒ سے متوسطات کی کتابیں پڑھ کر دہلی کے اکابر علماء اور ان کے علوم وفنون کے حصول کے لیے دہلی کا سفر کیا، یہ سفر کب ہوا؟ اس کی صراحت نہیں مل سکی، مگر مولاناؒ ۱۲۳۰ھ مطابق: ۱۸۱۵ء کے اوائل میں دہلی میں موجود تھے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے تبرک کے لیے ایک سبق:

مولانا مملوک العلی صاحبؒ نے دہلی میں کئی علماء اور مدرسین سے پڑھنا چاہا، مگر مولاناؒ جس عالم سے بھی پڑھنے جاتے وہ ایک دوسبق پڑھانے کے بعد مزید تعلیم سے منع کر دیتے تھے، مولانا مملوک العلی صاحبؒ اس غیر متوقع کیفیت سے پریشان تھے، پریشانی میں (علماءِ ہند کے امیر و سربراہ) حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، دعا اور توجہ کی درخواست کی، شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ''کل آنا'' دوسرے دن جب گئے تو اس وقت حضرت شاہ صاحبؒ نے ہدایۃ النحو کا ایک سبق پڑھایا اور فرمایا: ''جاؤ، اب جس استاذ سے پڑھو گے وہ پڑھانے سے انکار نہیں کرے گا۔''

مولانا رشید الدین خانؒ سے تلمذ: غالباً حضرت شاہ صاحبؒ کے اس ارشاد کے بعد آپؒ نے مولانا رشید الدین خانؒ سے رجوع کیا ہوگا، مولاناؒ نے اس خدمت کو منظور فرمالیا، مولانا مملوک العلیؒ مولاناؒ کے تلامذہ میں شامل ہو گئے، اور اعلیٰ درسیات مولانا رشید الدین خانؒ سے حاصل کیں۔

مولانا رشید الدینؒ کی شفقت اور نظرِ عنایت: مولانا مملوک العلیؒ مولانا رشید الدین خانؒ کے عزیز ترین شاگرد تھے، مولانا مملوک العلیؒ کی تعلیم پوری ہونے کے بعد بھی مولانا رشید الدین خانؒ سے نیاز مندانہ روابط ہمیشہ قائم رہے، مولاناؒ کو بھی اپنے شاگرد کی خاطر عزیز تھی، وہ مولانا مملوک العلیؒ کی فرمائشوں کو پورا کرنے کا اہتمام فرماتے اور مولانا کا خاص خیال رکھتے تھے، کریم الدین پانی پتی کی اطلاع ہے کہ مولانا رشید الدین خانؒ نے اپنی اہم کتاب

''صولتِ غضنفریہ'' مولانا مملوک العلیؒ کی فرمائش پر لکھی تھی، اور جب دہلی کالج کا قیام ہوا اور اس میں مدرسِ اوّل کے عہدہ پر مولانا رشید الدین خانؒ کا تقرر کیا گیا اس وقت بھی مولانا رشید الدینؒ نے مولانا مملوک العلیؒ کو یاد رکھا اور مدرسِ دوم کے عہدہ کے لیے مولانا مملوک العلیؒ کا نام پیش کر کے اس کو منظور کر لیا تھا۔

دہلی کالج کی ملازمت: مولانا مملوک العلیؒ کی دہلی میں موجودگی کی قدیم ترین اطلاع ۱۲۳۰ھ مطابق: ۱۸۱۵ء کی ہے، دہلی کالج اس کے دس سال بعد ۱۲۴۰ھ مطابق: ۱۸۲۵ء میں شروع ہوا، مگر یہ معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ (مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی) نہیں کہ مولانا مملوک العلیؒ نے یہ دس سال کا عرصہ کہاں گزارا؟ کب تعلیم مکمل ہوئی؟ کب تک دہلی میں رہے؟ کب وطن واپس آئے؟ یا اس دوران وطن اور دہلی کے علاوہ اور کہیں قیام یا تعلیمی و تدریسی مصروفیت تھی؟ کچھ معلوم نہیں، مگر جب دہلی کالج کا شوال/ ۱۲۴۰ھ مطابق: جون/ ۱۸۲۵ء میں افتتاح ہوا اس وقت مولانا مملوک العلیؒ دہلی میں موجود تھے، کالج کے مدرس مقرر ہوئے، اور زندگی کے آخری لمحات تک اس خدمت پر فائز رہ کر دہلی میں مقیم رہے، وہیں وفات پائی۔

دہلی کالج کے قیام کا مقصد اور اس کی ابتدائی حیثیت: دہلی کالج شمالی ہندوستان میں انگریزوں کا قائم کیا ہوا سب سے پہلا بہت باوقار اور اہم ترین تعلیمی ادارہ تھا، اس کی ابتدا کے وقت اس کے مقاصد صاف تھے، اور اس میں انگریزوں کے مذہبی یا سیاسی مفادات کارفرما نظر نہیں آتے تھے، بلکہ اس کا خاص مقصد دہلی اور نواحی علاقوں میں بڑھتے ہوئے تعلیمی زوال کو کم کرنا اور اچھے

خاندانوں کے بچوں کو ہر قسم کی تعلیم سے آراستہ کر کے ان کے معاشی و معاشرتی مرتبہ کو برقرار رکھنا تھا، غالباً اسی لیے کالج کی ابتدا ایک مدرسہ کی طرح ہوئی تھی، وہی طور وطریق اور تقریباً ایسا ہی نصابِ تعلیم تھا، توسیع اور ترقی کا سلسلہ آہستہ آہستہ شروع ہوا، مختلف زبانیں اور علوم دہلی کالج کے نصابِ تعلیم میں شامل کیے گئے، پڑھانے کے لیے مسلم اور غیر مسلم اساتذہ کا تقرر رہوا، اور دہلی کالج نے تعلیمی و تدریسی راستہ پر تیزی سے قدم بڑھائے اور اس کے اثرات بھی ظاہر ہوئے، لیکن کالج کے نصابِ تعلیم میں اسلامی دینی علوم اور عربی و فارسی کی اوّل دن سے جو اہمیت تھی وہ آخر تک بڑی حد تک برقرار رہی۔

جب تک مولانا رشید الدین خانؒ زندہ تھے وہ کالج کے علمی سربراہ رہے، مولاناؒ کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری مولانا مملوک العلیؒ کے کاندھوں پر آ گئی تھی، مولانا مملوک العلیؒ نے پوری زندگی اس کی پاسداری فرمائی، اور اس خدمت کو اس حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا کہ (کریم الدین پانی پتی کے الفاظ میں) ''بناءِ مدرسۂ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔''

مولانا مملوک العلیؒ کا ابتدائی منصب اور ترقی: مولاناؒ کا دہلی کالج کے افتتاح کے وقت شوال ۱۲۴۰ھ مطابق: جون/ ۱۸۲۵ء میں عربی کے مدرسِ دوم کے عہدہ پر تقرر رہوا تھا، مولوی سید محمدؒ مدرسِ سوم تھے، مولانا رشید الدین خانؒ کی وفات کے بعد مدرسِ اوّل کا عہدہ خالی ہو گیا تھا، ضابطہ کے مطابق مولاناؒ کی وفات کے بعد اس منصب پر مولانا مملوک العلیؒ کا فوراً تقرر رہونا چاہیے تھا، مگر اس میں بہت دیر بلکہ کئی سال لگ گئے، اور مشکلات کے علاوہ ایک بڑی رُکاوٹ یہ

تھی کہ نواب حامد علی خان نے (جو دہلی کالج کے لیے وقف اعتماد الدولہ لکھنؤ کے متولی تھے) مولوی جعفر علی چارجوی کو شیعہ دینیات کا مدرس مقرر کر دیا تھا، اور چاہتے تھے کہ چارجوی صاحب کو کالج کا مدرس اوّل بنا دیا جائے، مگر کالج کے ذمہ دار اس کے لیے تیار نہیں تھے، معاملہ تصفیہ کے لیے مولانا مفتی صدر الدین آزردہؒ کے پاس بھیجا گیا، مفتی صاحبؒ نے مولانا مملوک العلی صاحبؒ کے فضل وکمال کی تعریف کی اور مولاناؒ کے حق میں رائے دی، مگر اس پر اتفاق نہ ہوسکا، اس لیے اس وقت اس عہدہ کو خالی رکھنے کا فیصلہ ہوا، جو کئی سال تک اسی طرح رہا، کئی سال کے وقفہ کے بعد ۲۳ / رمضان المبارک / ۱۲۵۷ھ مطابق : ۸ / نومبر / ۱۸۴۱ء کو مولانا مملوک العلیؒ مدرسِ اوّل نامزد کیے گئے۔

تنخواہ : مولاناؒ کی کالج میں تقرری کے وقت پچاس روپئے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی تھی، مدرسِ اوّل کے عہدہ پر تقرر کے وقت تک یہی تنخواہ تھی، صدر مدرس مقرر ہونے کے بعد اس میں دس روپئے کا معمولی اضافہ کیا گیا، بعد میں کسی وقت اور اضافہ ہو کر تنخواہ سو روپئے ماہانہ ہوگئی تھی، جو مدرسِ اوّل کی مقررہ تنخواہ تھی، اس اضافہ کی تاریخ معلوم نہیں، مگر ۱۲۶۳ھ مطابق : ۱۸۴۷ء میں مولاناؒ کو ایک سو روپئے ماہوار ملتے تھے، کریم الدین پانی پتی نے لکھا ہے کہ مدرسِ اوّل مدرسہ دہلی جناب مولوی مملوک العلی مدظلہٗ عالم بے بدل اور مفتیٔ بے مثل اور فاضل کامل ہیں، عہدۂ میر مولوی بمشاہرہ سو روپیہ ماہواری مدرسہ میں مقرر ہیں، اس تنخواہ پر کسی اضافہ کی اطلاع نہیں ملتی، اس منصب اور تنخواہ پر مولانا آخر تک کام کرتے رہے اور اسی پر وفات پائی۔

علمی آثار و باقیات: جیسا کہ گزر چکا مولاناؒ بے حد مصروف رہتے تھے، اور ان کے دِن رات کا کوئی حصہ درس اور تعلیم دینے سے فارغ نہیں تھا، فرصت عنقاء تھی، تحریر و تصنیف کے لیے جس یکسوئی اور اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے اس کا کوئی موقع میسر نہیں تھا، اس لیے مولاناؒ کی علمی تحریری باقیات بہت کم ہیں، تحقیق و تصنیف، حواشی اور تراجم پر مشتمل صرف چھ کتابیں یادگار ہیں، اس کی تفصیل اصل کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

تلامذہ: طلبہ کو پڑھانا اور ان کی تربیت کرنا مولاناؒ کا مقصدِ حیات اور زندگی کا محور تھا، دہلی کالج میں داخل ہوں یا کالج سے غیر متعلق طلبہ، مولاناؒ کا دامن شفقت اور بابِ علم و کمال سب کے لیے کھلا تھا، اور مولاناؒ کسی طالب علم کی پڑھنے کے لیے درخواست رد نہیں کرتے تھے، کریم الدین پانی پتی کے یہ الفاظ گزر چکے ہیں کہ ''سوائے مدرسہ کے اوقات کے ان کے گھر پر طلبہ پڑے رہتے ہیں، ہر وقت ان کو گھیرے رہتے ہیں، اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ کسی کو انکار بھی نہیں کر سکتے، سب کو پڑھاتے ہیں، تمام شب اور دن میں شاید دو پہر رات کو آرام کرنا ان کو نصیب ہوتا ہوگا، ورنہ رات دن درس دہی طلبہ میں گزرتا ہے۔''

مولاناؒ کے اخلاقِ کریمانہ اور طالب علموں پر مہر و عنایت کی نظر کی وجہ سے طلبہ ہر وقت مولاناؒ کو گھیرے رہتے تھے، دن رات اسباق اور تعلیم کا سلسلہ رہتا تھا، معقولات و منقولات کی چھوٹی بڑی کتابوں تک ہر ایک کتاب کا حسب ضرورت درس ہوتا تھا، اور علم و فن کے مباحث کی گرہ کشائی ہوتی تھی، حدیث شریف کا سبق ہوتا ہوگا، مگر اس کا کہیں ذکر نہیں ملا، یہ طلبہ جن میں مولانا کے

فرزند، قریب ترین عزیز اور وطن کے اطراف ونواح کے طلبہ شامل تھے، اس کے علاوہ دور و دراز سے آئے ہوئے غریب وامیر اہل علم اور اصحابِ ذوق ہوتے تھے، اس میں نہ علاقہ کی پابندی تھی نہ کسی رنگ ونسل کی قید، سب آتے تھے، پڑھتے تھے اور مولاناؒ کے کمالات سے بلا تامل مستفید ہوتے تھے، اور اپنی اپنی منزلوں کو چلے جاتے تھے، مگر افسوس ہے کہ مولاناؒ کی مجالس درس سے فائدہ اٹھانے والے چند ہی اہل کمال کے نام محفوظ ہیں، حالاں کہ مولاناؒ کا حلقۂ درس خاصا معروف اور ممتاز تھا، جو دہلی کالج کی ملازمت سے لے کر مولاناؒ کی وفات تک برابر جاری رہا۔

اکابرین آپ کے شاگرد تھے: مگر یہاں اس کے تعارف کی گنجائش نہیں، البتہ برصغیر کی دینی، علمی، تعلیمی، تصنیفی، اصلاحی اور فکری تاریخ کا کون واقف اور طالب علم ایسا ہے جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (والد شیخ الہند مولانا محمود حسن) مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی، مولانا قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی، مولانا عالم علی صاحب مراد آبادی، مولانا سید جمال الدین صاحب کنانوی (مدار الہام بھوپال) مولوی سمیع اللہ صاحب دہلوی (رفیق سرسید) مولوی کریم الدین پانی پتی، ڈپٹی نذیر احمد اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب (رحمھم اللہ تعالیٰ) کو کون نہیں جانتا؟ ان میں سے ہر ایک ہماری دینی، ملی اور علمی تاریخ کا غازہ اور ایک تابناک عنوان ہے، اور ان میں سے ہر ایک مولانا

مملوک العلیؒ کے دریائے فیض کا جرعہ نوش اور مولاناؒ کے فیض صحبت سے منور و مستفید ہے، سر سید احمد کو بھی متعدد اصحاب نے مولاناؒ کا شاگرد لکھا ہے، مگر یہ اطلاع درست نہیں، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

وفات اور مدفن: مولاناؒ اپنے معمول کے مطابق تعلیم و افادہ میں مشغول تھے کہ ذی الحجہ/ ۱۲۶۷ھ کو پہلی تاریخ سے طبیعت خراب ہوئی، بخار اور یرقان ہو گیا تھا، پہلے معمولی بیماری تھی، آخر میں چار پانچ دن بہت بے چینی اور تکلیف رہی، گیارہ روز کل مرض رہا، اس کرب و بے چینی میں تریسٹھ سال کی عمر میں ۱۱ / ذی الحجہ/ ۱۲۶۷ھ مطابق: ۷ / اکتوبر/ ۱۸۵۱ء کو وفات ہوگئی، إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔ اس وقت مولاناؒ کا دہلی میں کوچۂ چیلان میں قیام تھا، تدفین کے لیے مہندیان کا انتخاب ہوا، جو حضرت شاہ ولی اللہ اور خاندانِ ولی اللہ کا معروف قبرستان ہے، مولانا کو دہلی دروازہ کے پیچھے (قبرستانِ خاندان شاہ ولی اللہ کے پڑوس میں) مہندیان کی پرانی مسجد کے صحن سے متصل چبوترہ پر دفن کیا گیا۔

(سوانح علماءِ دیوبند: ۱۵۰)

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الأبرار الصالحین، و جزاہ اللہ عنا و عن المسلمین خیر الجزاء و أحسن الجزاء۔

حضرت مولانا علی کبیر جونپوریؒ متوفی ۱۲۶۹ھ

ولادت وتعلیم: آپؒ خلف مولوی علی محمد ممتاز العلماء اور افضل الفضلاء تھے، ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے، آپؒ نے اپنے والدؒ کے ظل عاطفت میں پرورش پائی، پانچ سال کی عمر میں آپؒ مکتب میں بیٹھے اور دو سال کے اندر ابتدائی کتب ختم کر کے علومِ عربی وفارسی کی طرف متوجہ ہوئے، علومِ رسمیہ کی مختصرات اپنے والد سے پڑھیں، بعدہٗ لکھنؤ گئے اور مولوی محمد مبین فرنگی محلیؒ سے تمام علوم کی تحقیق وتکمیل کی، اور وہیں دستارِ فضیلت سے آراستہ ہوئے۔

فضل وکمال: آپؒ حسن اخلاق اور رحم ومروّت میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے، دو کتابیں آپؒ کی تصانیف میں زیادہ مشہور ہوئیں، ایک ''مخروطاتِ جبری'' اور دوسری ''مخروطاتِ ہندی'' پھر آپؒ مراحل خدا شناسی، صفائی قلب اور اصلاحِ باطن میں مصروف ہو گئے اور حضرت شاہ محمد آفاقؒ سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی، علوم کی تکمیل کے بعد ملازمت کی طرف مائل ہوئے اور سرکارِ انگریزی کی طرف سے مفتی مقرر ہوئے، اور اس قدر عزت حاصل کی کہ آپؒ کے تمام اہل خاندان منصفی، صدر امینی اور صدر الصدوری پر مقرر ہوئے اور مچھلی شہر ضلع جونپور کے عروج وترقی کے باعث ہوئے۔

بالآخر ۱۲۴۴ھ میں انگریزی ملازمت ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار فرمائی اور بہت مجاہدہ وریاضت فرمائی، مشاہدۂ حق کی منزل پر پہنچ گئے، گو آپؒ کی

عمر ایک سو سال تک پہنچی، مگر آنکھ کی بصارت میں فرق نہیں آیا، تمام عمر کتب بینی کا مشغلہ جاری رہا، سعادتِ حج اور زیارتِ شہرِ نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) سے بھی سرفراز ہوئے۔ (تاریخ شیرازِ ہند جون پور: ۲/ ۱۷۲۹)

حضرت مولوی علی کبیر صاحبؒ نقشبندیہ سلسلہ میں حضرت شاہ محمد آفاقؒ سے بیعت تھے، جو بڑے ہی اولوالعزم اولیاء اللہ میں گذرے ہیں، اور حضرت امامِ ربانی مجددِ الفِ ثانیؒ کی اولاد میں سے ہیں، آپؒ کے نامور خلفاء میں حضرت مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادیؒ بھی تھے، جو مسلکِ عشق کے پیرو تھے، حضرت مولوی علی کبیرؒ کو معرفتِ الٰہی حاصل ہوئی، پیرروشن ضمیر نے آپؒ کو جعفری سونا بنادیا تھا۔

انسانِ کامل کی حقیقت: انسانِ کامل کیا ہے؟ ملاحظہ فرمائیں، انسان جسم کے اعتبار سے ایک حقیر ذرّہ ہے، لیکن روح کے اعتبار سے ایک بلند زحل ستارہ ہے، اسی طرح انسان جسم کے اعتبار سے ایک لنگڑی چیونٹی ہے، اور روح کے اعتبار سے سلیمان ہے، خوب فرمایا ہے اور اس طرح سے اس راز سے حضرت عارف رومیؒ نے پردہ ہٹایا ہے، فرماتے ہیں:

اے بصورتِ ذرّہ! کیواں را ببیں — مورِ لنگی رو سلیماں را ببیں
تو نۂ ایں جسم، بل آں دیدۂ — وا رہی از جسم گر جاں دیدۂ
آدمی دید ست وباقی لحم و پوست — ہرچہ چشمش دیدہ است، آں چیز اوست

ترجمہ وتشریح: اے انسان! تو بظاہر ایک ذرّہ ہے، ذرا تو زحل ستارے پر نظر کر، تو جسم کے اعتبار سے لنگڑی چیونٹی ہے، لیکن جا! حضرت سلیمان علیہ السلام کو دیکھ، تو یہ جسم نہیں ہے، بلکہ وہ آنکھ ہے کہ اگر تو اپنی روح کو دنیا کی آلودگی سے

پاک کرلے تو جسم سے نجات پا جائے اور دیدارِ حق حاصل ہو، آدمی دید ہے، باقی گوشت و پوست ہے، جواس کی آنکھ نے دیکھا ہے چیز وہی ہے۔

یعنی انسان جسم کا نام نہیں ہے، بلکہ انسان دیدۂ حق بیں ہے، انسان کی اصل حقیقت دیدۂ حق کا آلہ یعنی روح ہے، اور باقی محض گوشت پوست ہے، اور جو کچھ وہ چشمِ باطن سے دیکھتا ہے وہی اصل ہے، ورنہ سب دھوکہ ہے، پھر آگے فرماتے ہیں:

چشمۂ خم چوں باز باشد سوئے یم — کوہ را غرقہ کند یک خُم زنم
خُم با جیحوں بر آرد اُشتلم — چوں بدریا راہ شد از جانِ خُم
گرچہ نطقِ احمدِ گویا بود — زاں سبب قل گفتۂ دریا بود
کہ دلش را بود در دریا نفوذ — گفتۂ او جملہ در بحر بود
چہ عجب در ماہئ دریا بود — دادِ دریا چوں ز خُم ما بود
تش مر می بینی و او مستقر — چشمِ حس افسردہ بر نقشِ مر
ورنہ اوّل آخر، آخر اوّل ست — ایں دوئی اوصافِ دیدِ احول ست

ترجمہ وتشریح: وہ مٹکا جس کا تعلق سمندر سے ہو وہ اپنے پانی میں پہاڑ کو غرق کردیتا ہے، جب مٹکے کی جان سے دریا کی طرف راستہ ہوجاتا ہے تو وہ مٹکا عظیم دریائے جیحون سے زور آزمائی کرتا ہے، اسی وجہ سے (قُلْ) ''کہہ دے'' دریا کا کہا ہوا ہوگا، اگرچہ زبان احمد ﷺ کی ہوگی، اور اس ذات احمد مرسل ﷺ کا سب فرمایا ہوا سمندر کا ہوتا ہے، کیوں کہ ان کے دل کا دریا میں راستہ تھا، جب ہمارے مٹکے سے دریا کی عطا کا چشمہ جاری ہوتو پھر کیا تعجب ہے اگر کوئی مچھلی دریا بن جائے، ظاہری حس کی آنکھ راستہ کے نقش پر ٹھٹھری ہوئی ہے، تو چشم ظاہر سے

گذرگاہ دیکھ رہا ہے، حالاں کہ وہ قرارگاہ ہے، یہ دوئی بھینگا دیکھنے کے اوصاف میں سے ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اوّل آخر ہے اور آخر اوّل ہے۔

قارئین! ذرا غور فرمائیں، چوں کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صفات حضرتِ حق کی صفات میں فنا ہو چکی تھیں، اس لیے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کہا ہوا حق کا کہا ہوا ہے، قرآن شریف میں مختلف جگہوں پر لفظِ "قُلْ" آیا ہے، وہ بظاہر آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مقولہ ہے، لیکن حقیقۃً وہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ ہے۔ ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود   گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

یہ ایک راز ہے، جس سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مرتبہ ومقام کا اندازہ ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دل کی وابستگی جب بحرِ حقیقت سے ہوگئ تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مقولہ اسی سمندرِ وحدت کا موتی ہے، جب پوری اطاعت، فرماں برداری اور رضا کے بعد انسانوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتے ہیں تو پھر اس میں کیا تعجب اور انکار کی بات ہے کہ کسی عارف کو فنا فی الذات کا مرتبہ حاصل ہو جائے، غور وفکر کو راہ دو اور تعصب کی عینک کو اُتارو تو صاف نظر آئے گا کہ اب مٹکے میں سے سمندر کا پانی گذر رہا ہے، لیکن تمہاری ظاہر فالج زدہ نظر محض پانی کی گذرگاہ کو دیکھتی ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود سمندر ہے، اب فنا فی الذات کے بعد مٹکے اور سمندر کو دو سمجھنا بھینگا پن، تنگ نظری اور حقیقت کے خلاف ہے، ورنہ دونوں ایک ہیں، دو سمجھنے والا حالتِ شرک میں ہے، حضرت عارفِ رومیؒ پھر آگے یوں فرماتے ہیں:

بیں گذر از نقشِ خُم در خُم نگر   کاندرو بحر ست بے پایاں وسر

پاک از آغاز و آخر آں عذاب　　مانده محروماں ز قہرش در عذاب
تا چنیں سِر در جہاں ظاہر شود　　مقبل اندر جستجو ماہر شود
تا فزاید در جہاد و کوشش او　　تا میسر گردش دیدارِ ہو
اہل دل ہمچوں کہ جو در وے رواں　　بے دوئی یک گشتہ با دریائے جاں
ایں چنیں خُم را تو دریم داں یقیں　　زنده از وے آسمان و ہم زمیں
بلکہ وحدت گشت او را در وصال　　شد خطابِ او خطابِ ذوالجلال

ترجمہ وتشریح: خبردار اور آگاہ ہو جاؤ کہ مٹکے کی صورت سے بڑھ کر مٹکے میں تو دیکھ، اب اُس میں سمندر ہے، جس کی نہ ابتدا ہے اور نہ انتہا ہے، وہ شیریں پانی ابتدا (ازل) اور انتہا (فنا) سے پاک ہے، جو محروم و منکر ہیں وہ اس کے قہر سے عذاب میں ہیں، یہ اس لیے اسرار ظاہر کیے جا رہے ہیں تا کہ ایسا راز دنیا میں ظاہر ہو جائے اور نصیبہ ور اس کی جستجو میں ماہر ہو جائے، تا کہ وہ مجاہدہ میں کوشش کر کے ترقی کرے اور مقامِ مشاہدہ میں پہنچ جائے، اور اُسے دیدارِ الٰہی حاصل ہو، اہل دل (اولیاء اللہ) ایسے ہیں کہ ان میں حق کی نہر جاری ہے، اور وہ روحِ اعظم کے ساتھ بغیر دوئی کے ایک ہو گئے ہیں، اب ایسے مٹکے کو یقیناً سمندر سمجھ، کیوں کہ اب اس سے آسمان بھی زندہ ہے اور زمین کی سرسبزی و شادابی ہے، بلکہ وصال میں اس کو وحدت حاصل ہو گئی ہے، ان کا کلام کلامِ حق بن گیا ہے، اور کائنات میں اب وہ تصرف کا مجاز ہے، اس کے بعد وہ "أنا الحق" منصور کی طرح کہتا ہے، تا کہ وہ بدنامی کی سولی پر چڑھ جائے، اور علماءِ ظاہر کا قلم ان کو پھانسی پر لٹکا دیتا ہے، پھر وہ حق سے جا ملتے ہیں، لیکن اب غور کرو کہ "أنا الحق" کون کہتا ہے، کیوں کہ اب

اس کی زبان اللہ کی زبان ہوگئی ہے، ایک عارفِ کامل نے خوب کہا ہے ؎

زباں منصور کی ہے، بولنے والا ہے پردے میں

"أنا الحق" صاف ہے، آواز پہچانی نہیں جاتی

حضرت منصور حلاجؒ کے "أنا الحق" کے بارے میں حضرت عارفِ رومیؒ نے خوب کہا ہے، اپنی مثنوی میں وہ فرماتے ہیں: ؎

چوں قلم در دستِ غدارے بود لا جرم منصور بردارے بود

ترجمہ: جب علمِ باطن سے نابلد اور غداروں کے ہاتھ میں قلم ہوگا تو بے قصور منصورؒ یقینا پھانسی کے تختے پر نظر آئے گا۔

ف: علماءِ شریعت نے شریعت کی حرمت اور اس کی حفاظت کے لیے ایسا کیا، جس میں وہ عند اللہ معذور قرار پائیں گے؛ بلکہ ان شاء اللہ ماجور ہوں گے۔ **واللّٰہ أعلم بحقیقۃ الحال۔** (مرتب)

حقیقت یہ ہے کہ چشم بصیرت کی ضرورت ہے، کہ مٹکے کو نہ دیکھو، یعنی اولیاء اللہ کی صرف بشریت پر نظر نہ کرو، جو کچھ اس مٹکے میں ہے اسے دیکھو، کہ اس میں ایک لامحدود سمندر موج زن ہے، انسانِ کامل صوفیہ ُ کرام کے اندر فیوضِ الٰہی کا سرچشمہ ہے، جو لامحدود ہے، پاک ہے، اور اہل بصیرت اس کو تسلیم کرتے ہیں، جو منکر ہیں وہ ان کے فیوض و برکات سے محروم ہیں۔

انسان کو فیوضِ الٰہی کا مظہر بنانے میں یہ حکمت الٰہی ہے کہ اس سے رازِ وحدت ظاہر ہو، اور کوئی بلند اقبال اس چشمہ کی تلاش میں سرگرداں ہو، اس مظہر خداوندی کو دیکھ کر بانصیب شخص مجاہدہ و ریاضت میں لگے گا، اور اس طرح وہ

اپنے وجود اور ہستی کی نفی کر کے مقامِ فنا حاصل کرے گا، جو مشاہدہ کا دریچہ ہے، تا کہ مشاہدۂ حق حاصل ہو جائے، اہل دل (اولیاء اللہ) کی مثال یہ سمجھو کہ ان میں ایک نہر جاری ہے، اور ان کو ذاتِ حق سے اتحاد حاصل ہے، یہی اہل دل (صوفیۂ کرام) ہیں، جن سے آسمان وزمین قائم ہیں۔

اتحاد تو دو چیزوں میں ہوتا ہے، ان کو ذاتِ حق سے ایسا اتصال ہے کہ دوئی ختم ہو چکی ہے، اب ان کی بات اللہ تعالیٰ کی بات اور ان کی زبان اللہ تعالیٰ کی زبان ہے، اور جب یہ مقامِ وحدت حاصل ہو جاتا ہے تو وہ منصور حلاجؒ کی طرح ''أنا الحق'' کا نعرہ لگا دیتا ہے، اور موت کی سولی نہ سہی تو بدنامی کی سولی پر چڑھ جاتا ہے، لیکن یہ تعلق مع اللہ بقا بعد الفنا سے معلوم ہوگا، اور یہ وہ مقام ہے جہاں عقل معاش نہ کوئی مدد کر سکتی ہے اور نہ بحث ومباحثہ سے یہ مسئلہ حل ہوگا، جب تک مقامِ فنا حاصل نہ ہو اسرارِ وحدت ظاہر نہ ہوں گے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تعلق مع اللہ جو تریاق ہے اسی وقت حاصل ہوگا جب تعلق غیر اللہ کا علم چھوڑ دو گے، اللہ تعالیٰ سے قربت ومحبت تب ہی پیدا ہوگی جب غیر اللہ سے تعلق منقطع کر لو گے۔

وفات: آپ کی وفات حج سے لوٹتے وقت موضع فرید پور متصل براواں مچھلی شہر کے قریب شب جمعہ ۲۳؍ربیع الاول ۱۲۶۹ھ کو ہوئی، اور اپنی خانقاہ جون پور میں مدفون ہوئے۔ (تاریخ شیراز ہند جون پور: ۲/ ۱۷۲۹)

حضرت مولانا ولایت علی صادق پوریؒ پٹنہ بہار[1] متوفی ۱۲۶۹ھ

نام ونسب: نام مولانا ولایت علی اور والد کا نام فتح علی ہے۔

ولادت وتعلیم: آپؒ کی ولادت صادق پور، پٹنہ میں (۱۲۰۵ھ) کو ہوئی، ان کا خاندان دین سے عشق، دنیا کی سعادت، خاندان ونسب کی عزت وسربلندی اور جاہ ومرتبت سے بہرہ ور تھا، جب مولانا صادق پوریؒ چار سال کے ہوئے تو ان کا گاؤں کے مکتب میں داخلہ ہوا، اور بارہ سال کی عمر میں انہوں نے ابتدائی علوم سے فراغت حاصل کی، اور اس کے بعد لکھنؤ آ کر تعلیم مکمل کی، انہوں نے شیخ محمد اشرف صاحبؒ سے دینی علوم کی کتابیں پڑھیں۔

حضرت سید صاحبؒ کے وعظ کا سماع اور تاثیر: ایک موقع پر لکھنؤ میں سید احمد شہیدؒ کی خدمت میں جانا ہوا تو وہاں آپؒ نے ان کے بعض مواعظ سنے، اور بس ان ہی کے ہو کر رہ گئے۔ یہی مواعظ ان کی حالت کی تبدیلی کا سبب بنے اور ان کی زندگی کے رُخ نے ایک نیا موڑ لیا، اس کے بعد انہوں نے عیش وتنعم کی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اور خوش حالی اور عیش کوشی کے وسائل سے یکسر قطع تعلق کر لیا اور اپنی بقیہ زندگی سید احمد شہیدؒ کے ایک خادم بن کر ان کے دیگر مریدین ومتبعین کی طرح ایک عام انسان کی طرح گزار دی، اور اپنی

---

[1] آپؒ کے حالات وتعلیمات حضرت مولانا سعید الرحمن صاحب اعظمی مہتمم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے ''تذکرۂ اہل دل'' میں تحریر فرمائے ہیں، اُسی سے نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ (مرتب)

مرفہ الحالی اور خوش حالی کے ایام کو ایک قصہ پارینہ کی طرح فراموش کر دیا۔

انہوں نے اپنی زندگی کے سفر کو نئے سرے سے شروع کیا اور اپنی گذشتہ زندگی پر وہ نادم و پشیمان ہوئے کہ انہوں نے اسے لاپرواہی کی حالت میں گزار دیا اور سارا وقت عیش و عشرت، ناز و نعم اور آرام و راحت کے نذر کر دیا، جو نہ ہی ایک مسلمان کو زیب دیتا ہے اور نہ تو اس دنیاوی زندگی کا مقصود ہے۔

انہوں نے اپنی گذشتہ زندگی کی کوتاہیوں کی تلافی چاہی اور اس مقصد کے لیے سید صاحبؒ کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اور ان کے حلقۂ مریدین و متبعین میں شمولیت کی درخواست کی، سید صاحبؒ نے ان کے اخلاص و ایمان کی قدر کرتے ہوئے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ توجہ و رغبت اور دل سے نکلی ہوئی ایک صدا ہے، اس لیے اسے قبول کر لیا۔

چنانچہ نوجوان ولایت علی نے ہر سرور و سرمستی اور ہر نعمت و آرائش کو خیر باد کہا اور سید صاحبؒ اور ان کے اصحاب کے ساتھ رائے بریلی میں ان کی صحبت اختیار کر لی، اور پوری عمر تحقیق و مطالعہ، ریاضت و مجاہدہ میں گزار دی، اور وہ اپنا بیشتر وقت عبادت و ریاضت، انابت الی اللہ اور ذکر و نوافل میں صرف کرنے لگے، اس کے ساتھ وہ جنگی فنون کی مشق اور دشمنانِ خدا سے جہاد و قتال کی تیاری میں بھی اپنا بہت سا وقت گزارا کرتے تھے، تاکہ اس کے ذریعہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ کے درس میں شرکت: شاہ اسماعیل شہیدؒ کے درسِ حدیث میں بھی شریک ہوتے، اور جب موقع ملتا تو جنگلوں اور باغات کی طرف

نکل جاتے اور وہاں سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور اپنے سر پر بھاری بوجھ اٹھاتے، اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کرتے، تعمیراتی کاموں کو بھی انجام دیتے، چنانچہ مستقل مٹی اور اینٹ اٹھانے کی وجہ سے ان کے چہرے کی رنگت تبدیل ہو گئی تھی، اور کام، خدمت اور عبادت و ریاضت کی کثرت کے باعث ان کا جسم بہت زیادہ کمزور ہو گیا تھا، اس سلسلے میں ان کے عجیب و غریب واقعات بھی قابلِ ذکر ہیں۔

فنائیت کا عالم: اس سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا ولایت علی صاحبؒ کے والد شیخ فتح علیؒ نے ایک بار اپنے خادم کو اپنے بیٹے ولایت علی کے پاس ایک خطیر رقم اور کپڑوں کے ساتھ بھیجا، یہ خادم پہلے ولایت علی کی خدمت پر مامور تھا، جب خادم رائے بریلی پہنچا تو اس نے لوگوں سے ولایت علی کے بارے میں دریافت کیا، لوگوں نے ان کا پتہ بتا دیا، اس وقت وہ عمارت سازی کے لیے مٹی تیار کرنے میں لگے ہوئے تھے اور مزدوروں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اس سخت مشقت کی وجہ سے ان کے چہرے کی رنگت بھی بڑی حد تک تبدیل ہو چکی تھی، اس لیے خادم ان کو پہچان نہ سکا اور پوچھا کہ ”شیخ ولایت علی عظیم آبادی کہاں ملیں گے؟“ تو شیخ نے جواب دیا کہ ”وہ تو میں ہی ہوں“ لیکن خادم نے بے اعتنائی سے کہا کہ ”میرا مطلب تم سے نہیں ہے، بلکہ شیخ ولایت علی بن شیخ فتح علی اور ریاستِ بہار کے حاکم سید رفیع الدین کا نواسہ مراد ہے“ تو شیخ ولایت علیؒ نے ان سے کہا: ”بھائی! صادق پوری ولایت علی تو میں ہی ہوں“ وہ نوکر خفا ہوا اور بولا کہ ”تم مجھ سے ہنسی کرتے ہو؟“

چنانچہ دعوت واصلاح اور اخلاص وروحانیت کے عمل میں اس فنائیت کی وجہ سے وہ دین میں بلند مقام پر فائز ہوئے اور اس امانت کو انہوں نے بہتر طور پر انجام دیا۔ فجزاھم اللّٰہ أحسن الجزائ۔

کارنامے اور خدمات: جب مولانا ولایت علیؒ سید احمد شہیدؒ کے رنگ میں پورے طور پر رنگ گئے تو ان کے اہل خاندان نے انہیں سید صاحبؒ کی کامل اتباع، ان کو اُسوہ بنانے اور دین وزندگی کے تمام امور میں ان ہی کی سربراہی کو اپنانے پر ابھارا، اور جب سید صاحبؒ حج کے لیے تشریف لے گئے تو انہوں نے حضرت مولانا ولایت علی صاحبؒ کو دعوت واصلاح اور دین اسلام کی تبلیغ اور لوگوں کی تعلیم وتربیت پر مامور کیا، اور جب سید صاحبؒ نے جہاد کا قصد کیا تو شیخ ولایت علیؒ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اس کے لیے پرجوش ہوئے، اور دشمن سے جہاد کرنے کے لیے تیاری میں آپؒ سب سے پیش پیش تھے، لیکن اس وقت سید صاحبؒ نے انہیں سفارت کے کام سے کابل بھیج دیا، جہاں انہوں نے ڈیڑھ ماہ قیام کیا، اور وہاں دورانِ قیام اپنے روزانہ کے مواعظ ومحاضرات کے ذریعہ انہوں نے عوام سے ربط وتعلق پیدا کیا، اور انہیں دشمن سے جنگ وقتال پر آمادہ کیا، ان کے دلوں میں دین کے لیے مر مٹنے اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے فنا ہو جانے کی رغبت پیدا کی، اور انہیں شرک کے ہر شائبہ سے خالص توحید کو اختیار کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامل پیروی اور ان کی مکمل اقتدا پر اُبھارا۔

شیخ ولایت علیؒ کابل سے بمبئی اور حیدرآباد واپس آئے، اور وہاں چند ہی روز کے قیام میں حیدرآباد کے اطراف اور دور دراز کے علاقوں میں ان کی

شہرت ہوگئی۔

امیر مبارز الدولہ (حاکم حیدرآباد، دکن) ان کے پاس تشریف لائے، ان سے بیعت کی، اور لوگوں نے مسلک ومشرب کے اختلاف کے باوجود ان سے استفادہ کیا اور ان کی مجلسوں سے فیض اٹھایا جن میں وہ روزانہ وعظ کہتے تھے اور حدیث شریف کا درس دیا کرتے تھے، یہاں تک کہ لاکھوں لوگوں نے توبہ کی، دعوت وارشاد کے اس عمل میں جب وہ حیدرآباد میں مشغول تھے اسی دوران انہیں سید صاحبؒ کی شہادت اور واقعۂ بالاکوٹ کی جانکاہ خبر ملی، اس خبر سے ان کو سخت صدمہ پہنچا۔

اس کے بعد دعوت واصلاح اور سید صاحبؒ کے مشن کو فروغ دینے کی ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ شیخ ولایت علیؒ کے سر آئی، اور انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی ذمہ داری کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے، اور ان کا ناتواں جسم اس بار کو اٹھانے کی تاب نہیں رکھتا، لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ کیا اور اپنے اس مشن اور کارِ دعوت کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی، اور سید صاحبؒ کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے کمر ہمت کسی، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول: { وَ مَا مُحَمَّدٌ إِلاَّ رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ } سے تسلی وروشنی حاصل کی، انہوں نے اپنے اندر ایک نیا عزم وحوصلہ پیدا کیا اور نیا جوش وخروش محسوس کیا، چنانچہ اپنی تمام مساعی اور حقیر جان کو دعوتِ دین کے لیے پیش کر دیا، انہوں نے لوگوں کی جانب سے بے پناہ شوق محسوس کیا اور لوگوں کو اتباعِ سنت اور دینی امور کو سیکھنے کی طرف

رغبت دلائی۔

اور جب وہ یہاں سے اپنے وطن پٹنہ پہنچے تو وہاں بھی دعوت وتبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے مسلمانوں کو منظم کرنے میں لگ گئے، لوگوں نے انہیں سید صاحبؒ کا خلیفہ وجانشین تسلیم کیا، انہوں نے بیت المال قائم کیا، اور صوبۂ بہار میں انہوں نے داعیوں اور مبلغوں کو مقرر کیا، اور اپنے بھائی شیخ عنایت علی کو بنگال میں داعی کی حیثیت سے روانہ کیا، اور بعض دوسرے لوگوں کو مختلف ملکوں اور علاقوں میں اصلاح وارشاد اور دین اسلام کی اشاعت کے لیے متعین کیا، اس کے ساتھ وہ خود بھی دین اسلام کی اشاعت کے لیے گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھرے اور تبلیغ ودعوت کے اس کام میں وہ ہر مصیبت کو برداشت کرتے اور اسے اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھتے تھے، وہ اپنا ایک ایک لمحہ دعوت وتبلیغ اور اسلام ومسلمانوں کی فلاح وخیر میں صرف کرتے تھے، کبھی آرام وراحت کا خیال بھی ذہن میں نہ لاتے تھے، اور دعوتِ دین کے لیے رات دِن ایک کردیا کرتے تھے۔

ف: کام اس طرح کے عزم وہمت ہی سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق دے۔ آمین۔ (از: مرتب عفی عنہٗ)

اخلاقِ فاضلہ: شیخ ولایت علیؒ صحابہؓ جیسے اخلاق سے متصف تھے، اور فضل وکمال میں اس قدر بڑھے ہوئے تھے جس سے ان کے اللہ تعالیٰ سے انتہائی قرب کا پتہ چلتا ہے، وہ فقراء اور مساکین کی طرح سادہ فقیرانہ زندگی بسر کرتے اور دنیا کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کی مجالس دل میں دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی فکر پیدا کرنے والی ہوتی تھیں، ان کے چہرہ سے اللہ تعالیٰ کی

قدرت کے سامنے انکسار و تواضع، اس کے لیے فکر مندی اور حزن وملال ظاہر تھا، اکثر و بیشتر وہ اپنے ہاتھوں کو آسمان کی جانب اٹھاتے اور دیر تک حق تعالیٰ کے سامنے گڑگڑایا کرتے، موٹے جھوٹے لباس اختیار کرتے اور روکھی سوکھی روٹی پر اکتفا کرتے، وہ فقراء کے ساتھ بہت ہی معمولی اور متواضع زندگی بسر کرتے تھے، اور بیت المال کے پیسوں کو مستحقین پر خرچ کیا کرتے تھے، اور اس کے ہدایا مساکین اور پریشان حال لوگوں پر صرف کیا کرتے، اور لوگوں کے اندر دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی طرف رغبت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں تواضع و انکساری اختیار کرنے کی بھی دعوت دیتے تھے، تاکہ انسان کے اندر سے گھمنڈ اور حسب ونسب پر فخر وغرور کا خاتمہ ہو، اور علماء کے دلوں سے رفعت وسربلندی اور زاہدوں کے اندر سے اپنی عبادت پر کلی اعتماد کو ختم کریں، اور مالداروں کے اندر کے تکبر وغرور کو زائل کر کے ان کو باوجود فکر وخیال کے اختلاف کے حق وخیر کے متلاشی بننے کی دعوت دیتے تھے، تاکہ ان کے اندر فقراء اور مزدور پیشہ افراد سے محبت پیدا ہو، اور جہلاء اور گنہگاروں کے کرتوت پر ان کے اندر بے چینی پیدا ہو، اور وہ دین کے فروعی مسائل میں میانہ روی سے کام لیں، وہ صرف اس کی دعوت ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ اپنے کردار سے اس کو ثابت بھی کرتے تھے۔

ف: سبحان اللہ! کیسی عالی ہمت اور عزم تھا، ساتھ ہی کس قدر بلند آپؒ کے اخلاق تھے، اور اہم تعلیم و تربیت تھی، جو اس زمانہ میں مریدین سے تو کیا، مصلحین سے بھی عنقاء ہوتی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ ہم لوگوں میں بھی یہ صفات پیدا فرمائے، **وما ذلک علی اللہ بعزیز۔** (از: مرتب عفی عنہ)

آپؒ کے مواعظ کی اثر انگیزی: آپؒ دعوتِ دین کے لیے وعظ ونصیحت کے کسی بھی قیمتی موقع کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی بات دل سے نکلتی تھی اور دل پر اثر کرتی تھی، وہ لوگوں کو ہدایت، دعا، عبادت، بطورِ خاص تہجد وغیرہ پر آمادہ کرتے تھے، اس لیے ان کے متبعین دعا اور تہجد کا اہتمام کرتے تھے، وہ دین پر پورے طور پر کاربند رہتے تھے، ان کی ایسی تربیت ہوئی تھی کہ ان کے دل شہادت کے لیے بے چین رہا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سی سنتوں کے زندہ کرنے کا موقع عطا فرمایا تھا، اور درحقیقت اگر ان کی مسلسل مساعی اور کوششیں نہ رہتیں تو اس ملک سے ان سنتوں کا نام ونشان مٹ گیا ہوتا۔

سفرِ حج: اپنے وطن میں دو سال کے قیام کے بعد اداءِ حج وزیارت کے لیے انہوں نے حجازِ مقدس کا رُخ کیا اور حج وزیارت کے مناسک کی ادائیگی کے بعد وہ یمن تشریف لے گئے اور کئی عرب علاقوں مثلاً نجد، عسیر، مسقط اور حضر موت وغیرہ کا سفر کیا، اور ان علاقوں میں اپنا پورا وقت دین اسلام کی خدمت اور اشاعت میں صرف کیا، اس دیار میں بھی ان کا کارِ دعوت ثمر آور ہوا اور بہت سے دلوں کو اسلام کے پیغام کی طرف راغب کرنے اور بہت سے لوگوں کے دین اسلام کی آغوش میں پناہ لینے کے آپ محرک بنے، آخر میں انہوں نے علامہ محمد بن شوکانیؒ سے حدیث شریف کی سماعت کی اور اس کی سند حاصل کی، اس کے بعد آپؒ وطن واپس آگئے، مگر نامناسب حالات کی بنا پر وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔

چنانچہ سب سے پہلے شیخ ولایت علیؒ دہلی تشریف لے گئے، وہاں تک

پہنچنے میں انہیں ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا، لیکن اس دوران انہوں نے کبھی رُشد وہدایت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، سفر میں ارشاد ودعوت اور اصلاح وہدایت پر کاربند رہے، دہلی میں انہوں نے پورا مہینہ گزارا، وہاں پر جمعہ کو بہت اہم خطاب کرتے، کبھی جامع مسجد دہلی میں تو کبھی مسجد فتح پوری میں، ہر جگہ اصلاح و دعوت کا موضوع ہوتا، دور دور سے لوگ آ کر ان کے درس میں شریک ہو کر فیض یاب ہوتے تھے۔

شاہِ ہند بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار میں ایک وعظ: ایک دن اچانک آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفرؔ اور بیگم زینت محل نے شیخ کو مدعو کیا، شیخ نے بادشاہ کو متوجہ کرنے اور اس کے سامنے اپنی بات رکھنے کے لیے اس موقع کو بہت غنیمت سمجھا، اور انہوں نے سوچا کہ شاید اس کے اندر بہت زیادہ خیر ہو، بادشاہ کے بہت زیادہ اصرار پر انہوں نے دعوت قبول کی اور لال قلعہ پہنچے، بادشاہ نے اپنے دیوانِ خاص میں انتہائی درجہ کے اکرام واعزاز اور جوش وجذبہ کے ساتھ ان کا استقبال کیا، اور بہت سے امراءِ مقربین اور حکومت کے نمائندوں کے سامنے بادشاہ نے شیخ کو اپنی جگہ بٹھایا۔

شیخ نے دیوان میں اپنے وعظ کو شروع کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ آیت پڑھی:

{وَ اعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِیْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌ بَیْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ...الخ}

شیخ نے بہت ہی پرزور انداز میں اس آیت کی تفسیر بیان کی اور دنیاوی

زندگی کی ایسی تصویر کشی کی کہ اس کو سن کر دل بے قرار ہو گیا، لوگوں کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہو گئی اور ان کے سامنے جنت و دوزخ، موت وفنا اور حساب و کتاب کی تصویر آ گئی، اور وہ بے شمار اور دشوار گذار مراحل جن سے انسان کو گزرنا ہوگا گویا آنکھوں کے سامنے عیاں ہو گئے، اور شیخ جب اس آیت کی تفسیر پر پہنچے تو وزیر نے ان کے کان میں کہا کہ بادشاہ کے سامنے وہ عذاب اور دوزخ کا ذکر نہ کریں کہ اس سے بادشاہ کو کہیں تکلیف نہ پہنچے، تو شیخ نے کہا کہ علماء کی یہ عادت ہو گئی ہے کہ وہ اپنے مواعظ میں جب کسی بادشاہ یا حکمران کے سامنے وعظ کرتے ہیں تو ایسی چیزیں پیش نہیں کرتے، یہ سوچ کر کہ کہیں ان کو تکلیف نہ پہنچ جائے، ان کے مواعظ محض جنت کے تذکرہ تک محدود رہتے ہیں۔

شیخ نے اپنے خطاب کو اسی طرح جاری رکھا گویا کہ انہوں نے وزیر اعظم کی بات ہی نہ سنی ہو اور انہوں نے بادشاہ کے رنج و تکلیف کی پرواہ نہیں کی، بلکہ انہوں نے دوزخ کے عذاب، قیامت کے دن کی شدت اور قبر کے عذاب کو مزید صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا، انہوں نے اس مضمون کو ایسے دل سوز انداز میں بیان کیا کہ پورا مجمع آہ و بکا سے گونج اٹھا، یہاں تک کہ خود بادشاہ بھی اپنے نفس پر قابو نہ پا سکا اور اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے، پھر جب بادشاہ کو کچھ سکون ہوا تو اس نے کہا کہ ”میں نے دنیا کی مذمت میں کچھ اشعار کہے ہیں۔“ (اس لیے کہ بہادر شاہ ظفرؔ ایک صاحبِ دیوان شاعر بھی تھے) شیخ نے اس کے سامنے یہ آیت پڑھی:

{وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا}

اور فرمایا کہ ''اشعار کا پڑھنا یہ بے ادبی ہے۔'' بادشاہ خاموش ہو گیا اور اس کے بعد اس نے اپنی زبان نہیں کھولی، اس نے شیخ کے وعظ کی طرف پوری توجہ مرکوز کر دی، اور شیخ کے وعظ سے اس نے گہرا اور بہت اچھا تاثر لیا۔

جب شیخ اپنی بات ختم کر چکے تو انہوں نے بادشاہ سے ان اشعار کو سنانے کی فرمائش کی جو اس نے دنیا کی مذمت میں کہے تھے، بادشاہ نے وہ اشعار سنائے، پھر اپنے مصاحب سے کہا کہ وہ شیخ کو قلعہ میں سیر کرائے، چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد شیخ وہاں سے واپس ہوئے۔

جب تک شیخ دہلی میں رہے بادشاہ ان کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرتا رہا اور لوگ بھی ان سے فیض یاب ہوتے رہے اور دین کی تعلیم حاصل کرتے رہے، بہت سے گنہگاروں اور مجرموں نے توبہ کی، اور لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی، ایسا لگ رہا تھا کہ دہلی اور اس کے اطراف میں ایمان وعمل کی بادِ بہاری چلی ہو، اور دہلی کے اُفق پر دین وعلم کی فضا چھا گئی ہو۔

بادشاہ نے شیخ ولایت علیؒ سے درخواست کی کہ اگر وہ قلعہ کے اندر ماہِ رمضان گزارنے کے لیے آمادہ ہو جائیں اور قلعہ کے تمام لوگ نمازِ تراویح میں شریک ہوں تو یہ اس کے لیے بڑی سعادت اور نیک بختی ہوگی۔

لیکن شیخ نے جب بعض دشمنوں کی جانب سے سازش محسوس کی تو انہوں نے بہت تیزی کے ساتھ دہلی سے نکلنے کو غنیمت سمجھا، انہوں نے بادشاہ کی اس دعوت کو قبول کرنے سے معذرت کر دی اور دہلی سے لدھیانہ پہنچے، اور وہاں سے استھانہ پہنچے، اور ان کے ساتھیوں کی جماعت ایک مدرسہ میں تبدیل ہو گئی، جس

میں وہ دینی علوم کا درس دیتے تھے، آپؒ کی جماعت مجاہدین کی ایسی خانقاہ میں تبدیل ہوگئی جہاں تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق کا عمل جاری رہتا تھا۔

نواب صدیق حسن خان صاحبؒ شیخ ولایت علیؒ کے وعظ اور اس کی تاثیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''شیخ ولایت علیؒ کے وعظ میں جو گہرا اثر میں نے محسوس کیا وہ میں نے کبھی کسی وعظ میں نہیں دیکھا، ان کی صحبت دل کو ایسی حالت میں چھوڑتی ہے کہ پھر اسے دنیاوی زندگی میں کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی، اور دل کبھی دنیا کی خرافات میں نہیں پڑتا، دل کے اندر ایک دینی جذبہ گھر کر لیتا ہے، اور میں نے ان کی زبان سے ایک فقرہ سنا جس کا مفہوم یہ ہے کہ تم لوگ جلد عشق و محبت کا ایک دوسرا طریقہ اپناؤ گے۔''

وفات: استھانہ میں شیخ کا تین سال قیام رہا، پھر ان کو ڈفتھیر یا (دمہ) کا مرض ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے وطن کی واپسی کو مقدر کر دیا تھا، آخر تک وہ اس مرض سے شفایاب نہ ہو سکے، ۱۲۶۹ھ میں ۶۲ سال کی عمر میں آپؒ نے وفات پائی، نور اللہ مرقدہ۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہجرت برائے دین، دشمنانِ دین کے خلاف معرکہ آرائی اور انفس و آفاق میں اسلام کے جھنڈے کو بلند کرنے کی ان کی آرزو کو پورا فرمایا۔ **ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ رحمہ اللہ تعالیٰ و نوّر مرقدہٗ۔** (تذکرۂ اہل دل/صفحہ: ۱۶۲ تا ۱۸۵)

حضرت علامہ سید محمود آلوسی بغدادیؒ متوفی ۱۲۷۰ھ

(صاحبِ روح المعانی)

نام و نسب: ابوالفضل شہاب الدین سید محمود بن عبداللہ بن محمود افندی بغدادی۔ آپ کا نسب چند پشتوں پر نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے ملتا ہے، اس لیے آپؒ کو نسباً حسینی کہا جاتا ہے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۲۱۷ھ میں بغداد کے علاقہ کرخ میں ہوئی، اس لیے نسبۃً آپؒ کو بغدادی کہا جاتا ہے۔ ہلاکو خاں تاتاری نے جب بغداد میں دہشت پھیلائی اس وقت آپؒ کے جدِ امجد وہاں سے ہجرت کر کے شہر آلوس تشریف لے گئے تھے، جو دریائے فرات کے درمیان ایک جزیرہ ہے، اس کی جانب نسبت کرتے ہوئے آپؒ کو آلوسی بھی کہا جاتا ہے۔

علمی مرتبہ: آپؒ عراق کے علماء کے سردار اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے، یکتائے روزگار اور بے نظیر تھے، آپؒ نے بہت سے اصول وفروع کو جمع کیا، یہاں تک کہ آپؒ منقول ومعقول کے سنگ میل ہو گئے، آپؒ اصول وفروع کو بہت زیادہ سمجھنے والے، بے مثال محدث اور بے نظیر مفسر تھے۔

تحصیل علم: آپؒ نے اپنے وقت کے مشہور ومعروف علماء سے علم حاصل کیا، آپؒ کے اساتذہ میں سے آپؒ کے والد محترم بھی ہیں اور شیخ خالد نقشبندیؒ اور شیخ علی مویدیؒ ہیں، آپؒ کو طلب علم کا حد سے زیادہ شوق تھا، آپؒ علم میں بہت

بلند نصیب تھے۔

درس و تدریس: آپؒ تیرہ سال کی عمر میں تدریس و تالیف میں مشغول ہو گئے اور بہت سے مدارس میں آپؒ نے تدریسی خدمات انجام دیں، جب آپؒ مذہب حنفی کے مفتی مقرر ہوئے تو اپنے ہی گھر میں درس دینا شروع کر دیا، آپؒ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی، قریب و بعید کے ملکوں کے لوگوں نے آپؒ سے علم حاصل کیا اور مختلف ملکوں کے فضلاء کی ایک جماعت تیار ہوئی۔

طلبہ کے ساتھ معاملہ: آپؒ بسا اوقات طلبہ کے لباس وطعام اور ان کے قیام کا انتظام بھی اپنے گھر کے اوپر ہی منزل میں کرتے، نثر نگاری اور خطاطی میں آپؒ بے نظیر تھے، کثرتِ املا اور عمدہ تعبیروں کے استعمال میں آپؒ کا کوئی ثانی نہ تھا، آپؒ نے بہت سے خطبات، رسائل، فتاویٰ اور مسائل املا کرائے، لیکن اکثر گردشِ دوراں کی نذر ہو گئے، ان کی نشانی ختم ہوگئی اور لوگوں کے ہاتھوں میں ان میں سے زیادہ نہ پہنچ سکے۔

منصبِ افتاء: آپؒ ۱۲۳۸ھ میں مذہب حنفی کے مفتی مقرر کیے گئے، اور وفات سے ایک ماہ قبل مدرسہ مرجانیہ کے اوقاف پر والی مقرر ہوئے، اس مرتبہ ومنصب پر فائز ہونے کے لیے شرط تھی کہ صاحب منصب اس زمانے کا سب سے بڑا عالم ہو اور یہ بات معزز وزیر علی رضا کے نزدیک ثابت ہوگئی کہ آپؒ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔

مذاہب کا علم: آپؒ مذاہب کے اختلاف سے اچھی طرح واقف تھے، ائمہ اربعہ میں حضرت امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کی اتباع کرتے تھے۔

علمی خزانہ: آپؒ نے بہت سا مفید علمی خزانہ لوگوں کے لیے چھوڑا، ان میں سب سے زیادہ مشہور و معروف ''تفسیر روح المعانی'' ہے۔ (التفسیر والمفسرون: ۱/ ۳۵۲)

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم اپنی مشہور و معروف کتاب ''علوم القرآن'' میں تفسیر روح المعانی کا یوں تعارف کرا رہے ہیں:

''اس کتاب کا پورا نام ''**روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی**'' ہے، چوں کہ یہ آخری دور کی تفسیر ہے، اس لیے انہوں نے کوشش کی ہے کہ سابقہ تفاسیر کے اہم مباحث اس میں جمع کر دیں، چنانچہ اس میں لغت، نحو، ادب، بلاغت، فقہ، عقائد، کلام، فلسفہ، ہیئت، تصوف اور متعلقہ روایات پر بھی مبسوط بحث کی ہے اور کوشش یہ فرمائی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علمی گوشہ تشنہ نہ رہے، روایاتِ حدیث کے معاملہ میں بھی علامہ آلوسیؒ دوسرے مفسرین کے مقابلہ میں محتاط رہے ہیں، اس لحاظ سے اس کتاب کو سابقہ تفاسیر کا خلاصہ کہنا چاہیے اور اب تفسیر قرآن کے سلسلہ میں کوئی بھی کام اس کی مدد سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔'' (علوم القرآن/صفحہ: ۵۰۵)

اقتباسات: اب ہم نصیحت و موعظت کے لیے ''روح المعانی'' کی ان عبارتوں کو نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں جن کو مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پسند فرمایا ہے اور اپنی مختلف کتابوں میں درج فرمایا ہے۔

(۱)...... چنانچہ صاحبِ روح المعانی {فَأَنْزَلَ اللّٰہُ سَكِيْنَتَہٗ} کے تحت لکھتے ہیں کہ ''**وھي الطمانينة التی يسكن عندھا القلوب**'' یعنی سکینہ اس

اطمینان کا نام ہے جسے پا کر قلوب تسکین حاصل کریں۔ پھر کچھ دور کے بعد باب الاشارہ میں لکھتے ہیں:

{ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ}...الآية: وكانت سكينته عليه الصلوٰة والسلام كما قال بعض العارفين من مشاهدة الذات، وسكينة المؤمنين من معاينة الصفات۔

ولهم في تعريف السكينة عبارات كثيرة متقاربة المعنىٰ، فقيل: "هي استحكام القلب عند جريان حكم الرب، بنعت الطمانينة لخمود أثار البشرية بالكلية، و الرضا بالبادى من الغيب من غير معارضة واختيار۔"

و قيل: "هي القرار على بساط الشهود و بشواهد الصحو والتأدب بإقامة صفاء العبودية من غير لحوق مشقة ولا تحرك عرق بمعارضة حكم۔" و قيل: "هي المقام مع الله تعالىٰ بفناء الحظوظ۔"

(روح المعانی: ۱۰/۹۴) (تالیفاتِ مصلح الامتؒ: ۴/۱۴۸)

ترجمہ: حق تعالیٰ کے ارشاد {ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ} میں ''سکینہ'' جو آیا ہے اس کے متعلق بعض عارفین یہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سکینہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشاہدۂ ذات تھا اور مومنین کا سکینہ صفات کا معاینہ تھا، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حالت میں حق تعالیٰ کی ذات کے مشاہدہ سے متلذذ تھے اور مومنین اللہ تعالیٰ کی صفات کا مراقبہ کر کے مطمئن تھے۔ آگے فرماتے ہیں کہ---

''سکینہ'' کی تعریف میں مشائخ کی مختلف تعبیرات ہیں، عنوان مختلف ہیں، لیکن معنیٰ اور معنون قریب قریب سب کا ایک ہی ہے۔ چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ ''سکینہ'' اس قوتِ قلبیہ کا نام ہے جس میں اطمینان کی آمیزش ہو حق تعالیٰ کا حکم سننے کے وقت اور اس کی وجہ سے انسان کے بشری تقاضے بالکلیہ سوخت ہو جائیں اور پردۂ غیب سے جو چیز بھی ظاہر ہو بغیر کسی معارضہ کے اور بدون اپنا اختیار چلائے ہوئے انسان اس پر راضی ہو۔

اور ایک قول یہ ہے کہ ''سکینہ'' اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنے پورے ہوش وحواس کے ساتھ حق تعالیٰ کے مشاہدہ کی بساط پر فائز ہو اور خالص عبودیت کی اقامت کے ادب سے متأدب ہو اس طرح پر کہ اس کو ان کی ادائیگی میں نہ تو کچھ تعب ہو اور نہ کسی حکم سے معارضہ کی رگ پھڑکے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ ''سکینہ'' اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنے حظوظ کو فنا کر کے بقا باللہ حاصل کرے۔

(۲)......منافقوں کی علامات کے سلسلے میں بہت ہی واضح اور مفصل تشریح روح المعانی: ۱/ ۱۲۹ میں مذکور ہے، جس کا اُردو ترجمہ پیش خدمت ہے:

منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کہے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ اور صحاح میں اس کی ایک اور نشانی کا ذکر ہے، وہ یہ کہ جب جھگڑا کرے تو فحش کلامی پر اُتر آئے۔ لیکن ان امور کے علامات (منافق ہونے پر) ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ ان علامات والے تو کافر تھے اور یہ عادتیں تو ایک ایسے مسلمان میں بھی پائی جاتی ہیں جس کے اسلام میں کوئی شک وشبہ نہیں

ہوتا اور (عام مسلمان تو درکنار) ہمارے زمانے کے اکثر علماء ان میں سے اکثر کے ساتھ بلکہ سبھی کے ساتھ متصف ہیں۔ اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ ساری عادتیں چوں کہ نفاق کی عادات میں سے ہیں، لہٰذا جس کے اندر یہ صفات پائی جائیں گی وہ ان کے ساتھ متصف ہونے میں منافقین کے مشابہ ہوگا، (کہ جس طرح یہ منافق میں ہوا کرتی ہیں اس میں بھی ہیں) اسی طرح وہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ چار چیزیں ہیں جس کسی میں وہ (سب) ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا، اس سے بھی مراد یہ ہے کہ ایسا شخص شدید الشبہ بالمنافقین ہے (یعنی منافقین سے بہت زیادہ مشابہ ہے) نہ کہ حقیقی منافق (یعنی کافر)

روح المعانی میں منافقین کی خصال کا مسلمان میں پائے جانے کا شبہ اور اس کا جواب دیکھ کر میرا ایک عرصہ کا تردّد مرتفع ہوا، وہ یہ تھا کہ اکثر مسلمانوں میں (کیا عوام کیا خواص) دیکھتا تھا کہ یہی باتیں جن کو علاماتِ نفاق کہا جارہا ہے پائی جارہی ہیں، علامات وشرط کا پورے طریقے پر پایا جانا مشروط کے تحقق کا متقاضی ہوتا تھا، لیکن نفس ایمان کا ان میں موجود ہونا اس حکم سے مانع ہوتا تھا، خیال کرتا تھا کہ یا اللہ! ایسے لوگوں کو کن میں شمار کیا جائے اور ان پر کیا حکم لگایا جائے؟ اگر ان کو منافق کہا جائے تو کیوں کر کہا جائے؟ جب کہ ایمان ان میں موجود ہے، اور اگر مخلصین میں شمار کیا جائے تو کیسے؟ جب کہ غیر مخلصین کے اوصاف سے متصف ہیں، یہ ایک بڑا اخلجان تھا جو درپیش تھا، جب روح المعانی کی عبارت نظر سے گزری تو بڑی مسرت ہوئی کہ مدت کی ایک گتھی سلجھ گئی، ایسے لوگوں کا حکم معلوم ہوگیا، یعنی یہ کہ وہ مسلمان ہونے کے باوجود شبیہ بالمنافقین بلکہ شدید

الشبہ بالمنافقین ہیں۔اس سے اصلاح میں بہت مدد ملی کہ پہلے طبیعت جھجھک محسوس کرتی تھی، حکم معلوم کرنے کے سبب اب یہ خلجان جاتا رہا، اطمینان ہوگیا، اور نفع بھی اس سے زیادہ دیکھ رہا ہوں۔

الغرض یہ بحث نہایت مشکل ہے اور علماء نے اس کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے، مگر افسوس کہ ہماری غفلت نے ان مباحث سے آنکھ بند کر لی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ نفاق کی شاید ہی کوئی خصلت ہو جو ہم میں نہ ہو، یہ ہم نے مانا کہ ہم منافق اعتقادی نہیں، مگر منافقین کے خصال ہم میں موجود ہیں، یہ کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی ان خصال پر لازمی ہے۔(تالیفاتِ مصلح الامتؒ:۱/ ۱۲۴)

(۳)...... { فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا } کی تفسیر صاحب روح المعانی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمائی ہے، جس کا اُردو ترجمہ پیش خدمت ہے:

ترجمہ: ''مرض'' اہل لغت کے نزدیک وہ حالت ہے جو انسان کی طبیعت سے تو خارج ہو، مگر سر دست اس کو تکلیف اور نقصان پہنچا رہی ہو، مرض کے ایک معنیٰ ہیں اثر، یعنی تکلیف کے اور ایک معنیٰ آتے ہیں تاریکی کے اور ایک معنیٰ قلب کی کمزوری اور سستی کے، یہی معنیٰ بہت سے لوگوں نے بیان کیے ہیں، اور مجازی طور پر مرض ایسی حالت کو بھی کہتے ہیں جو انسان پر عارض ہو اور اس کے روحانی کمالات و ترقی میں خلل انداز ہو، جیسے غفلت، بدعقیدگی اور حسد وغیرہ (وہ تمام اوصاف) جو مانع کمالات ہیں اور مشابہ ہیں امراضِ جسمانیہ کے اور مانع ہیں لذاتِ روحانیہ سے، اور ایسی ہلاکت روحانی کی طرف پہنچانے والے ہیں جو ہلاکت جسمانی سے بدرجہا بڑھ کر ہے، حضرت ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ،

مجاہدؒ، قتادہؒ اور تمام صالحین سے منقول ہے کہ یہاں آیت میں یہی مجازی معنیٰ مراد ہیں۔ اور بلا شبہ ان منافقین کے قلوب ان خبیث امراض (روحانیہ) سے بھرے ہوئے تھے، جنہوں نے آخر کار ان لوگوں کو روک ہی دیا اس (نعمت اسلام) سے جن سے کہ روکنا چاہا تھا، اور جو جہنم کے سب سے نیچے طبقہ میں انہیں پہنچا کر رہا۔ (تالیفاتِ مصلح الامتؒ: ۱/۱۳۶)

(۴)...... {دَاعِيًا إِلَى اللهِ بِإِذْنِهِ} کی تفسیر صاحب روح المعانی ؒ یوں فرماتے ہیں:

{ بِإِذْنِهِ} أي: بتسهيله و تيسيره، و "بإذنه" من متعلقات "داعيا"، و قيدت الدعوة بذلك إيذانا بأنها أمر صعب المنال، و خطب في غاية الإعضال، لا يتأتى إلا بإمداد من جناب قدسه، كيف لا، و هو صرف للوجوه عن القبل المعبودة، و إدخال الأعناق في قلادة غير معهودة۔"

{ بِإِذْنِهِ} یعنی اللہ تعالیٰ کی تسہیل و تیسیر کے ساتھ، اور لفظ "بِإِذْنِهِ" یہ "دَاعِيًا" کے متعلق ہے، چنانچہ دعوت کو "بِإِذْنِهِ" سے اس لیے مقید کیا گیا ہے تاکہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے کہ اس امر کا حصول بہت ہی دشوار ہے، امر عظیم ہے، نہایت ہی مشکل ہے، اس کو بغیر جناب قدس سے امداد کے ادا نہیں کیا جا سکتا، اور کیوں نہ ہو، جب کہ حال یہ ہے کہ وہ (یعنی دعوت) وجوہ کا پھیرنا ہے ان قبلوں سے جن کی عبادت کی جا رہی ہے اور غیر معہود قلادہ میں گردنوں کو ڈالنا ہے۔

حضرت مصلح الامتؒ بطورِ افادہ یوں رقم طراز ہیں:

دیکھئے مفسرین تو یہ فرما رہے ہیں کہ ”بِإِذْنِہٖ“کی قید اس لیے لگائی ہے تاکہ یہ بتلادیں کہ دعوت کا کام نہایت مشکل و دشوار ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب تک نصرت و تائید نہ ہو کوئی شخص کر ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ اس میں لوگوں کے رُخ کو پھیر کر اللہ تعالیٰ کی طرف لانا ہوتا ہے اور ایسے قلادہ میں گردنوں کو ڈالنا ہوتا ہے جو غیر مانوس و غیر معہود ہوتا ہے، ظاہر ہے یہ کتنا دشوار امر ہے، مگر اب کے لوگ سب سے آسان کام دعوت الی اللہ ہی کو سمجھتے ہیں، کہ نہ اس میں عقل کی ضرورت ہے اور نہ علم کی، مدارِ کامیابی مجمع کی کثرت کو سمجھتے ہیں۔ صاحب روح المعانیؒ {قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ} کے تحت اپنے زمانے کے دعاۃ کا حال بیان فرما رہے ہیں، سنئے:

”والدعاة إلى الله تعالىٰ اليوم من هؤلاء الذين نصبوا أنفسهم إلى الإرشاد بزعمهم أجهل من حمار الحكيم توما، وهم لعمري في ضلالة مدلهمة و مهامه يحار فيها الخريت، و هم يحسبون أنهم يحسنون صنعا، ولبئس ما كانوا يصنعون۔“

ترجمہ: اور آج کل کے داعی الی اللہ جنہوں نے اپنے زعم میں اپنے کو مسند ارشاد پر نصب کرلیا ہے وہ تو بھٹکتے رہنے میں حکیم کے گدھے سے بھی زیادہ جاہل ہیں۔ قسم ہے میری عمر کی یہ لوگ بہت ہی زیادہ ضلالت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایسے جنگلوں میں ہیں جن میں ماہر رہبر بھی حیران ہوجاتا ہے، اور یہ لوگ گمان کررہے ہیں کہ کوئی اچھا کام کررہے ہیں، حالاں کہ جو کچھ کررہے ہیں بہت ہی برا ہے۔

اخیر میں حضرت مصلح الامتؒ مزید توضیح بلکہ بطورِ تنبیہ یوں رقم فرماتے ہیں:
''یہ صاحب روح المعانیؒ فرمارہے ہیں، میں نہیں کہہ رہا ہوں۔خوب سمجھ لیجیے۔'' (تالیفاتِ مصلح الامتؒ: ۲/۲۰۶)

(۵)...... {فَأَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهِۦٓ إِخۡوَٰنًا} کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب روح المعانی نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے اہل عرب کا یہ حال تھا کہ وہ سب کے سب آپس کی عداوت اور دشمنی میں ہلاک تھے اور کوئی دو شخص بھی ان میں باہم ایک دِل نہ تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جب فضل فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو سارے اہل عرب مانند ایک نفس کے ہوگئے، یا تو دو آدمیوں میں اتفاق نہ تھا یا کل کے کل عرب مانند ایک نفس کے ہوگئے، سبحان اللہ یہ محض حق تعالیٰ کے فضل سے ہوا، ورنہ اتنی بڑی تبدیلی کسی کے بس کی بات نہ تھی، اسی کو فرمایا:

{لَوۡ أَنفَقۡتَ مَا فِي ٱلۡأَرۡضِ جَمِيعٗا مَّآ أَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوبِهِمۡ}

یعنی اگر آپ زمین بھر کی چیزیں خرچ فرمادیتے تو ان کی عداوت کو ختم نہ کرسکتے تھے، کیوں کہ ان کی عداوت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، اور روپیہ پیسہ کا یہ کام نہیں کہ وہ قلبی اُلفت پیدا کرسکے اور دو دلوں کو جوڑ سکے، اور مودّت تو وہی ہے جو قلب اور قالب دونوں سے ہو، البتہ یہ قوت اخلاق میں ہے کہ اس کے ذریعہ سے قلب اور قالب دونوں تابع ہوجاتے ہیں، مال میں یہ طاقت نہیں کہ وہ دل کو بھی جھکا سکے، بس اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ آدمی کا قالب تابع ہو جائے گا، مگر وہ بھی ظاہری طور سے، لیکن اس کے لیے یہ تو ضروری نہیں کہ قلب

بھی تابع ہو جائے، اور یہاں اللہ تعالیٰ کا فضل کچھ ایسا شامل حال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ان کو اخلاق سکھائے تو اس کی وجہ سے سب لوگوں میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کا میل ہو گیا، قالب بھی باہم متحد ہو گئے اور قلوب بھی سب متفق ہو گئے۔ (تالیفاتِ مصلح الامتؒ: ۲/ ۲۷۵)

(۶) صاحب روح المعانی نے ابلیس کے قصہ کی تفسیر کرتے ہوئے نہایت ہی عمدہ اور خوب کلام فرمایا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر اس کو بھی بیان کروں۔ فرماتے ہیں کہ

”ثم الظاهر أن كفره كان عن جهل، بأن استرد سبحانه و تعالیٰ منه ما أعاره من العلم الذی كان مرتديا به حين كان طاؤس الملائكة، و أظافير القضاء إذا حُكت أدمت، و قسي القدر إذا رمت أصمّت“ شعر:

و كان سراج الوصل أزهر بيننا　　فهب به الريح من البين فانطفیٰ

ترجمہ: ظاہر تو یہی ہے کہ ابلیس کے کفر کا منشا اس کا جہل ہوا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ علم اس کو مرحمت فرمایا تھا جسے وہ چادر بنائے ہوئے تھا جب کہ فرشتوں کے درمیان طاؤس بن کر رہتا تھا، وہ علم اس سے سلب فرمالیا، اور قضا کے ناخون جب گاڑے جاتے ہیں تو زخمی بنا دیتے ہیں اور قدر کی کمان جب تیر اندازی کرتی ہے تو بہرا بنا دیتی ہے۔

شیطان زبانِ حال سے کہتا تھا کہ وصل کا چراغ ہمارے اور ہمارے محبوب کے درمیان روشن تھا کہ اچانک فراق کی ہوا چلی اور وہ بجھ گیا۔

و قيل: عناد حمل إليه حب الرياسة و الإعجاب بما أوتي من

النفاسة، ولم يدر المسكين أنه لو امتثل ارتفع قدره، و سما بين الملأ الأعلىٰ فخره، ولٰكن:

إذا لم يكن عون من الله للفتىٰ   فأول ما يجنى عليه اجتهاده

و كم أرقت هذه القصة جفونا، و أراقت من العيون عيونا، فإن إبليس كان مدة في دلال طاعته، يختال في رداء مرافقته، ثم صار إلى ما ترىٰ، و جرىٰ ما به القلم جرىٰ۔ شعر:

وكنا و ليلىٰ في صعود من الهوىٰ   فلما توافينا ثبتُّ و زلَّت

ترجمہ: ایک قول یہ ہے کہ اس کے کفر کا سبب اس کا عناد تھا، جس پر حب جاہ اور جس شرف سے وہ مشرف تھا اس پر عجب نے اس کو اُبھارا تھا، اور مسکین نے یہ بھی نہ جانا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے حکم کا امتثال کر لیتا تو اس کی قدر اور بڑھ جاتی اور عالی مرتبت ملائکہ میں اس کا شہرہ اور بلند ہو جاتا۔

لیکن ''بات یہ ہے کہ جب کسی شخص کے شامل حال اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں ہوتی تو اوّل جو چیز اس کو نقصان پہنچاتی ہے وہ اس کا اپنی ذاتی اجتہاد ہوتا ہے۔'' (یعنی اس کی عقل ماری جاتی ہے)۔

اور یہ واقعہ ایسا ہے کہ اس نے نہ جانے کتنی آنکھوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیند ہی اُڑا دی اور ان کے لیے پلک جھپکانے کو حرام کر دیا، اور نہ معلوم کتنی چشم ہیں جنھوں نے اس قصہ کو سن کر چشمے جاری کر دیے، اس لیے کہ شیطان ایک زمانے تک اپنی طاعت کے غرور و ناز میں تھا اور حق تعالیٰ کے تعلق کی چادر میں اتراتا پھرتا تھا، لیکن اس کے بعد اس کا جو حشر ہوا وہ تم کو معلوم ہی ہے، تقدیر کا لکھا

سامنے آیا اور اس کا مصداق ہو گیا کہ ''ہم اور لیلیٰ عشق ومحبت کے پہاڑ پر چڑھے چلے جا رہے تھے، پس جس وقت کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے ہی تھے کہ میں تو ثابت رہا اور وہ پھسل گئی۔'' (روح المعانی:۱/ ۲۱۲)

ابلیس کا یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے، یہی سب سے پہلا قصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بیان فرمایا ہے، اس لیے اس میں بڑی ہدایت رکھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے بہت سے بندوں نے اس قصہ سے ہدایت حاصل کی ہے، جیسا کہ صاحب روح المعانیؒ نے لکھا ہے کہ نہ معلوم کتنی آنکھوں سے اس واقعہ نے نیند اُڑا دی اور نہ معلوم کتنی آنکھوں نے اس کی وجہ سے آنسوؤں کے دریا بہا دیے، لیکن یہ سب اسی وقت تھا جب قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھا پڑھایا جاتا تھا، اب ہم لوگ بھی ان آیات پر سے گزرتے ہیں مگر ذرا قلب میں حرکت نہیں پیدا ہوتی، حالانکہ کبر وعجب جیسے رذائل کو بیخ وبُن سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے یہی ایک واقعہ کافی ہے کہ ابلیس عجب و پندار میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گیا اور حضرت سیدنا آدم علیہ السلام نے توبہ وانابت کی تو قصور معاف ہو گیا اور مقبول ومحبوب ہو گئے۔ (تالیفاتِ مصلح الامتؒ:۲/ ۱۰۲)

(۷)...... فرعون کی دعا کا قبول ہونا

اب آپ کے سامنے فرعون کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جسے صاحب روح المعانی نے {وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ} کے تحت لکھا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ بڑی ہی عبرت اور نصیحت کا واقعہ ہے، اس لیے ہم اس کا اُردو ترجمہ نقل کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

’’حکیم ترمذی نے نوادرالاصول میں اور ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آلِ فرعون کو قحط میں مبتلا کیا تو ان کے یہاں کی ہر چیز خشک ہوگئی، تمام جانور اور مویشی مر گئے، یہاں تک کہ مصر کا مشہور دریا نیل بھی خشک ہوگیا، یہ دیکھ کر قوم کے سب لوگ فرعون کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ اگر تو ویسا ہی ہے جیسا کہ تیرا گمان ہے (یعنی معاذ اللہ خدا ہے) تو ہمارے دریائے نیل میں پانی لے آ، اس نے کہا: اچھی بات ہے، کل صبح اس میں پانی آ جائے گا، جب لوگ اس کے پاس سے واپس چلے گئے (اور فرعون تنہا ہوا) تو اس نے اپنے دل میں کہا کہ اب میں کیا کروں گا؟ میں تو پانی لانے پر قادر نہیں، نتیجہ یہی ہوگا کہ یہ لوگ کل صبح میری تکذیب کر دیں گے (اور میں رُسوا ہو جاؤں گا) چنانچہ جب آدھی رات ہوئی تو فرعون اٹھا، غسل کیا، صوف کا جبہ پہنا اور ننگے پاؤں نیل کے پاس آیا اور دریا کے بیچ کھڑے ہوکر یہ دعا کی کہ اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں تجھ کو اس بات پر قادر سمجھتا ہوں کہ دریائے نیل کو تو پانی سے بھر سکتا ہے، لہٰذا تو اسے پانی سے بھر دے، اس کا اتنا کہنا تھا کہ اسے پانی کے آنے کا شور محسوس ہوا، فوراً دریا سے باہر نکل آیا اور دریائے نیل پانی سے لبریز ہوکر رواں ہوگیا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت اسی نیل میں غرق ہوکر مقدر تھی۔

(روح المعانی:۹/ ۲۸)

سبحان اللہ! یہ روایت عجیب روایت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کافر کی دعا بھی قبول فرما لیتے ہیں، دیکھئے! فرعون کی دعا کو بھی شرفِ قبول بخشا،

حالاں کہ وہ خدائی کا مدعی تھا، لیکن جب تنہائی میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز کا اقرار کیا اور معاملہ کو اسی کے حوالے کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی شانِ قدرت دکھائی کہ دریا کو جاری فرما دیا، اور اس کی پروا تک نہیں کی کہ یہ کافر ہے، میری ہمسری کا دعویٰ دار ہے، اور اس میں شک نہیں کہ یہ خدائی اخلاق ہی تھے جو دشمن کے ساتھ بھی ایسا معاملہ روا رکھا گیا، دوسرا کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔

یہاں میں اتنی بات اور کہتا ہوں کہ جب کافر کی دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ فرما دیا تو اگر اللہ تعالیٰ سے کوئی مومن، موحد اور اللہ تعالیٰ کا ماننے والا خلوص کے ساتھ صدق دل سے حالت اضطرار میں اپنی کوئی حاجت طلب کرے گا تو کیا اللہ تعالیٰ اسے قبول نہ فرمائیں گے؟ ضرور قبول کریں گے ؎

دوستاں را کجا کنی محروم   تو کہ با دشمناں نظر داری

ترجمہ: دوستوں کی ذاتِ عالی آپ کے کرم سے کیوں کر محروم ہو سکتی ہے، جب کہ آپ نے دشمنوں پر بھی نظر رحمت فرمائی ہے۔

میں اپنے احباب کو وصیت کرتا ہوں کہ اس قصہ کو بار بار پڑھیں اور اسے ذہن میں مستحضر کر لیں، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت پر بھی نظر ہو جائے گی اور ان شاء اللہ تعالیٰ معرفت کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہی نصیب ہو جائے گا۔ (تالیفاتِ مصلح الامتؒ: ۱/ ۱۷۳)

وفات: آپؒ کی وفات جمعہ کے دِن ۲۵/ ذوالقعدہ/ ۲۷۰ھ کو بغداد میں ہوئی، شیخ معروف کرخیؒ کے مقبرہ بغداد ہی میں مدفون ہوئے۔ نور اللہ مرقدہٗ۔

(التفسیر والمفسرون)

حضرت حافظ محمد ضامن شہید تھانویؒ متوفی ۱۲۷۴ھ

ولادت باسعادت: حضرت حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے چند سال بڑے تھے اور حضرت حاجی صاحبؒ ۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ لہذا آپ کی ولادت اس سے پہلے ہوئی ہوگی۔

سلسلۂ نسب: حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، سے جاملتا ہے۔

بیعت: حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ نے جب حضرت میاں جی نور محمد صاحب قدس سرہٗ سے بیعت کی درخواست کی تو اولاً انہوں نے انکار فرما دیا، در اصل آپؒ کا مقصد حضرت حافظ صاحبؒ کی طلب اور خواہش کا امتحان کرنا تھا، حضرت حافظ صاحبؒ مسلسل حضرت میاں جی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے، یہاں تک کہ دو تین ماہ بعد حضرت میاں جیؒ نے ازخود پوچھا: ''کیا اب بھی تمہارا وہی خیال ہے؟'' حافظ صاحبؒ نے عرض کیا کہ ''میں برابر اسی خیال سے آرہا ہوں، مگر خلافِ ادب ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں کہا اور نہ اصرار کیا'' اس پر میاں جیؒ نے خوش ہو کر فرمایا کہ ''اچھا، وضو کر کے دو رکعات پڑھ کر آؤ'' چنانچہ اس کے بعد آپؒ نے حضرت حافظ صاحبؒ کو بیعت فرمالیا۔

اجازتِ بیعت و تلقین: حضرت حافظ صاحبؒ عرصۂ دراز تک حضرت میاں

جیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور فیوض سے مالا مال ہوتے رہے، چنانچہ حضرت میاں جی قدس سرہٗ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں حضرت حافظ صاحبؒ کو اجازتِ بیعت وتلقین عطا فرمائی، چنانچہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ فرماتے ہیں کہ ’’ایک دفعہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب قدس سرہٗ بعد نمازِ جمعہ وصیت فرمانے لگے تو لوہاری والے سخت مغموم ہوئے اور عرض کیا کہ ’’ہم تو جانتے تھے کہ ہمارے گھر میں دولت رکھی ہے، جب چاہیں گے مستفید ہوں گے، آپ کی باتوں سے ہمارا دل پاش پاش ہو جاتا ہے‘‘، ارشاد ہوا: ’’گھبراؤ نہیں، میرے بہت سے یار تمہارے پاس موجود ہیں، ان کو میرا قائم مقام سمجھو‘‘، چنانچہ اس وقت حضرت حافظ صاحب شہیدؒ، حضرت حاجی صاحبؒ اور دیگر حضرات کو خلیفہ بنایا اور بالتصریح فرمایا کہ ’’ہم نے ان کو اِجازت دی۔‘‘

کرامت: ایک صاحب کشف بزرگ حضرت حافظ صاحبؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے لگے تو ان سے فرمایا: ’’جاؤ، فاتحہ کسی مُردہ پر پڑھو، یہاں زندوں پر فاتحہ پڑھنے آئے ہو؟‘‘ بعد میں لوگوں نے ان کو بتایا کہ یہ کسی مردہ کا مزار نہیں ہے، بلکہ ایک شہید کی آرام گاہ ہے۔......ع

طمع فاتحہ از خلق نداریم نیاز　　عشقِ من از پسِ من فاتحہ خوانم باقی ست

حافظ ضامن شہیدؒ صاحب نسبت ولی اللہ تھے: حضرت مولانا حافظ محمد ضامن شہیدؒ کا اصلی وطن تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر ہے، آپؒ صاحب نسبت کامل ولی اللہ تھے، حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی قدس سرہٗ کے مرید باصفا اور خلیفہ ومجاز تھے، بڑے صاحب فضل وکمال اور کشف وکرامات تھے، مگر

تواضع کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی پاس آتا تو فرماتے کہ بھائی! اگر تجھے مسئلہ پوچھنا ہے تو (حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ کی طرف اشارہ کر کے) کہتے وہ بیٹھے ہیں اور اگر تجھے مرید ہونا ہے تو (سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی طرف اشارہ کر کے) کہتے وہ بیٹھے ہیں اور اگر حُقّہ پینا ہے تو یاروں کے پاس بیٹھ جاؤ۔" (اَرواحِ ثلاثہ:۲۴۵)

باوصف خانہ داری اور اہل وعیال سے نہایت آزاد اور مستغنی رہتے تھے، گویا فکر دنیا پاس بھی نہ پھٹکا تھا، دانائے عصر اور علماءِ زمانہ میں ہر ایک آپؒ کا مخلص اور منقاد تھا، ہر وقت عشق الٰہی میں مست وسرشار رہتے تھے، دل کی کیفیت چہرۂ مبارک سے معلوم ہوا کرتی تھی، محبت الٰہی کا صورتِ شریف پر ہر آن ظہور تھا۔ (بیس بڑے مسلمان:۱۵۷)

پیرومرشد سے محبت: حضرت مولانا حافظ محمد ضامن صاحبؒ کو اپنے شیخ سے اتنی محبت تھی کہ حضرت میاں جی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ جوتا بغل میں لے کر اور توبرہ گردن میں ڈال کر جھنجھانہ شریف جاتے تھے، ان کے صاحب زادہ کی سسرال بھی وہیں تھی، لوگوں نے کہا کہ اس حالت میں جانا مناسب نہیں، وہ لوگ حقیر سمجھ کر کہیں رِشتہ نہ توڑ ڈالیں، فرمایا: "رشتہ کی ایسی کی تیسی! میں جانے میں اپنی یہ حالت ہرگز نہ چھوڑوں گا۔" (اَرواحِ ثلاثہ:۲۴۶)

حضرت مولانا مہاجر مکیؒ کی نظر میں: حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ اپنے خواجہ تاش حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

عالم و زاہد ولی اہل مقام　　متقی و پارسا و نیک نام
یعنی ہیں حافظ محمد ضامن اب　　فیض کی طالب ہے جن سے خلق اب

(مجموعہ کلیاتِ امدادیہ: ۱۴۰)

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے محبت: حضرت حکیم الامت تھانوی نوّر اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ ''حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سپاہی منش اور نہایت خوش مزاج آدمی تھے، مجھ سے کمالِ اُلفت فرماتے تھے۔''

(اَرواحِ ثلاثہ: ۲۴۷)

(واضح ہو کہ حضرت حکیم الامتؒ اس وقت بچے تھے۔)

ملفوظات: (بروایت حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ)

(۱) ذکر اللہ کے ثمرات:

فرمایا کہ ''جو شخص لذات کا طالب ہے وہ حق تعالیٰ کا طالب نہیں، کیوں کہ لذت عین حق تو نہیں، پس عاشق صادق وہ ہے جو حق کا طالب ہو، نہ احوال کا، نہ مواجید کا، کیوں کہ یہ باتیں نہ موعود ہیں، نہ لازم ہیں، کبھی ہوتی ہیں، کبھی نہیں ہوتیں، اس لیے ان کی طرف التفات ہی نہ کرنا چاہیے، توجہ صرف اس چیز کی طرف کرو جو بوجہ موعود ہونے کے مرتب ہوتی ہے، وہ کیا ہے توجہِ حق الی العبد۔'' چنانچہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ اسی کی نسبت فرماتے تھے کہ ''ہمارا مقصود تو ذکر ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

{فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ} یعنی تم مجھ کو یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔''

یہ ایسا ثمرہ ہے کہ جس میں بوجہ وعدہ کے کبھی تخلف ہی نہیں ہوا کرتا، یعنی

ہم اللہ تعالیٰ کو اس لیے یاد کیا کریں کہ وہ ہمیں یاد کیا کریں گے، اس کے سوا حیاتِ دنیا میں ہم کسی اور ثمرہ کے طالب نہ ہوں، باقی اصل ثمرہ یعنی رضا و دخولِ جنت وہ تو آخرت میں ہی ہوگا، بس اور کیا چاہیے؟ ایسا شخص جس کا یہ مطلوب ہو کبھی پریشان نہیں ہوتا، یہ ہے حقیقت مقصود سلوک کی، مگر ہم اس میں بھی بدونِ اتباعِ ہوا کیسے ہوئے نہ رہے۔ (الھویٰ والہدیٰ:۳۱)

ف: اتباعِ ہدیٰ کے بجائے جب اتباعِ ہوا ہوگا تو پھر مقصد سلوک کیسے حاصل ہوگا؟ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے، آمین۔ (مرتب)۔

(۲) نیک صحبت کا اثر: ان ہی حضرت حافظ صاحب قدس سرہٗ کا ایک اور واقعہ ہے کہ کوئی جوان آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، اس کی حالت بدلنے لگی، ایک بار اس کا باپ حاضر ہوکر نہایت بے باکی سے کہنے لگا کہ ''جب سے میرا بیٹا آپ کے پاس آنے لگا بگڑ گیا ہے''، حضرتؒ تھے بڑے جلالی، فرمایا: ''اپنے بیٹے کو ہمارے پاس نہ آنے دو، روک دو، ہمارے پاس جو آئے گا تو ہم تو اسے بگاڑیں گے ہی، جس کو لاکھ مرتبہ غرض ہو اور بگڑنا چاہے وہ ہمارے پاس آئے، ہمیں تو بگاڑنا ہی آتا ہے، ہم نے تو اپنے پیر سے بگاڑنا ہی سیکھا ہے، اجی! جو بگڑنے سے ڈرے وہ ہمارے پاس آئے ہی کیوں؟ ایسے کے پاس جائے جسے سنوارنا آتا ہے، لوگ کیوں ہمارے پاس بگڑنے آتے ہیں؟ ہم کسی کو بلانے نہیں جاتے۔'' (طریق القلندر کحریق السمندر:۳۹، فضائل العلم والخشیۃ:۵۵)

(۳) مجاہدہ کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا......

فرمایا: ''حضرت حافظ ضامن صاحب قدس سرہٗ سے کسی نے عرض کیا کہ

''حضرت! بارہ تسبیح بتا دیجیے''، حضرتؒ خفا ہوکر فرمانے لگے کہ ''واہ! ساری عمر میں ایک یہی شئ تو حاصل ہوئی ہے، یہی تجھے بتلا دیں، میاں! جس طرح ہم کو ناک رگڑ کر ملی ہے اسی طرح تم ناک رگڑو، جی چاہے گا تو بتا دیں گے، تم چاہتے ہو مفت سفت میں دولت حاصل ہو جائے؟ دیکھو! اگر کسی تاجر کے پاس جاؤ اور کہو کہ ''ایسا طریقہ بتا دو کہ دس روپے روز آجایا کریں''، تو وہ یہی کہے گا کہ ''میاں! تم احمق ہو، کام کرو، ہم سے اصولِ تجارت سیکھو، ہماری خدمت کرو اور اللہ تعالیٰ پر نظر رکھو، اس کے بعد تجارت کرو، دیکھو! اللہ تعالیٰ برکت کرنے والے ہیں، بتدریج مالدار ہو جاؤ گے۔'' (اسباب الفضائل: ۱۴)

بعینہٖ فضائلِ دینیہ بھی بدون بزرگوں کی صحبت میں رہے اور مجاہدہ کیے بغیر گھر بیٹھے حاصل نہیں ہو سکتے، عارف باللہ حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح فرمایا: ع

مے یہ ملی نہیں یوں ہی، دل و جگر ہوئے ہیں خوں
کیوں میں کسی کو دوں؟ مے میری مفت کی نہیں

اس لیے ہمیں حتی المقدور بزرگوں کی صحبت میں رہ کر مستفید و مستفیض ہونا چاہیے۔

(۴) اتباعِ سنت میں ہر امر میں اعتدال ہے......

فرمایا: ''حضرت حافظ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک شخص بارادۂ بیعت آیا، حضرتؒ نے فرمایا: ''کچھ دنوں کھانا کم کھایا کرو، تب بیعت کریں گے''، ایک روز کے بعد وہ شخص پھر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ''حضرت! اگر

حکم ہوتو روزہ رکھ لوں؟ مگر یہ تو بڑی مشکل بات ہے کہ سامنے مزہ دار حلال طیب کھانا موجود ہو، پھر کم کھاؤں''، حضرتؒ نے فرمایا کہ ''بس اسی منہ سے کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا نام لوں گا، اتنا بھی نہیں ہوسکا، صاحبو! سنت کا اتباع اسی واسطے لوگوں کو ناگوار ہے کہ اس میں ہرامر میں اعتدال ہے اور یہ نفس کو بھاری اور کٹھن ہے۔ اور منشا اس ناگواری کا یہ ہے کہ نفس چاہتا ہے آزادی کو، نیز شہرت کے لیے اپنے حظوظ کو بالکلیہ ترک کر دینا تو اس لیے آسان ہے کہ اس میں ایک آزادی ہے اور مخلوق کی نظروں میں بڑائی ہے کہ فلاں درویش کھانا نہیں کھاتے، اتنے برسوں سے انہوں نے کھانا چھوڑ دیا ہے۔ اور اعتدال دشوار ہے کہ اس میں شہرت نہیں ہوتی، کیوں کہ اس میں صورۃً امتیاز نہیں ہوتا۔'' (معارفِ اکابر:۲۰۶)

شہادت: حافظ صاحبؒ نے شاملی کے جہادِ آزادی میں حصہ لیا، جس کے لیے پہلے سے تیاری فرما رہے تھے، بلکہ اپنی شہادت کا قبل از وقت علم ہو گیا تھا، جیسا کہ اپنے مرید باصفا حکیم محمد ضیاء الدین صاحبؒ کو بذریعۂ مکتوب جلد ملنے کی ہدایت فرمائی تھی اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو بوقت شہادت پاس رہنے کی وصیت فرمائی تھی۔

چنانچہ معرکۂ شاملی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار مقابلہ فرما کر ۲۴/ محرم الحرام/ ۱۲۷۴ھ کو جامِ شہادت نوش فرمایا۔

جس کی صورت یہ ہوئی کہ گولی لگنے کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ آپؒ کو قریب کی مسجد میں لے گئے اور اپنے زانو پر حضرت حافظ صاحبؒ کا سر رکھا اور اسی عالم میں اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

اسی معرکہ میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ زخمی ہوئے اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کو گرفتار کرلیا گیا، جس کے چھ ماہ بعد رہا کردیے گئے۔

سید الطائفہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ نے آپؒ کی جدائی اور فراق کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

لایا اتنے میں زمانہ اور رنگ   ہوگیا کچھ اور ہی عالم کا ڈھنگ
ہو گئے بس حضرت حافظ شہید   شامِ غم ہو کر ہوا نوروزِ عید
خوش نہ آئی اس جہاں کی رنگ و بو   چل دیے بس جنت الفردوس کو
ہم بے چاروں کو تڑپتا چھوڑ کر   سوئے حق راہی ہوئے مُنہ موڑ کر

حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب بے دلؒ نے تاریخ وفات یوں نکالی:

جو پوچھے سن شہادت، کہا فلک نے کہ ہائے

۱۲۷۵ھ

ہوئے شہید وہ شاہِ جری محرم میں

اور میاں عبدالغفور صاحبؒ نے یوں:

حوریں سب مل کر بولیں واہ، واہ!

پیر کے دِن خلد میں پیر آ گئے

۱۲۷۴ھ

سعادت: آپؒ کی قبر تھانہ بھون میں ہے اور زیارت گاہِ عوام وخواص ہے، الحمدللہ! متعدد بار حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ فللّٰہ الحمد۔

اولاد: حضرت مولانا حافظ محمد یوسف صاحبؒ حضرت حافظ صاحبؒ کے صاحب زادے تھے، ابتدا میں الور میں ملازم تھے اور ریاست بھوپال میں تحصیل دار بھی رہے، نہایت ظریف، خوش طبع، صاحب تصرف وکشف وکرامات بزرگ تھے، سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے مخصوص خلفاء میں سے تھے، حضرت حاجی صاحبؒ نے ''ضیاء القلوب'' ان ہی کی فرمائش پر لکھی تھی۔

مجازین: حضرت حکیم ضیاء الدین صاحبؒ حضرت حافظ صاحبؒ سے بیعت تھے اور انہیں حضرت حافظ صاحبؒ کی طرف سے مجازِ بیعت ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رُکن بھی رہے، ۲۸/ رمضان المبارک/ ۱۳۱۲ھ کو انتقال فرمایا۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔

(معارفِ اکابر: ۲۰۹)

حضرت مولانا سخاوت علی جون پوریؒ متوفی ۱۲۷۴ھ

نام ونسب: نام مولانا سخاوت علی، والد کا نام رعایت علی بن مولوی درویش علی فاروقی ہیں، جو حضرت شیخ محمد کوفی فاروقی رحمہ اللہ کی اولاد میں ہیں، حضرت شیخ محمد کوفی رحمہ اللہ کا مزار ظفر آباد متعلقہ جون پور میں مخدوم ''چراغِ ہند'' کی قبر کے متصل ہے، آپؒ کا سلسلۂ نسب بواسطۂ فرخ شاہ کابلیؒ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے، مولانا سخاوت علیؒ کا خاندان جون پور کے مشہور رؤساء وشرفاء کے خاندانوں میں شمار ہوتا تھا، مولانا رعایت علی خانؒ رزیڈنسی کے میر منشی تھے اور دہلی میں اکثر قیام رہا، ''خان'' کا خطاب بھی تھا۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۲۲۶ھ کو قصبہ منڈیاہوں، ضلع جون پور میں ہوئی، جو شہر جون پور سے ۱۱ کیلومیٹر جنوب میں واقع ہے۔

ظاہری وباطنی علوم کی تحصیل: مولانا سخاوت علیؒ نے ابتدائی کتابیں مولوی قدرت علی ردولویؒ سے پڑھیں، پھر مولوی احمد اللہ انامیؒ تلمیذ حضرت مولانا شاہ اسحق دہلویؒ سے تکمیل علومِ نقلی وعقلی فرمائی، مولانا عبدالحی دہلویؒ اور مولانا اسماعیل شہید دہلویؒ سے بھی تلمذ تھا اور سند حدیث حاصل تھی، حضرت سید احمد صاحب شہید رائے بریلویؒ سے بیعت تھے، مولاناؒ کی درخواست پر حضرت سید صاحبؒ قصبہ منڈیاہوں میں بھی تشریف لائے تھے اور بہت سے لوگ مشرف بہ بیعت ہوئے، مولاناؒ کے اعزہ میں سے مولوی فتح علیؒ برادر مولوی فیاض

علیؒ مرحوم بیعت کے بعد حضرت سید صاحبؒ کے ہمراہ جہاد میں بھی تشریف لے گئے اور وہیں شہید ہوئے، سید صاحبؒ نے مولوی فتح علیؒ کا نام بدل کر عبدالقدوس کر دیا تھا۔

علمی شغف: مولانا سخاوت علیؒ تمام عمر درس وتدریس میں مشغول رہے، محض حسبۃً للہ طلبہ کو درس دیتے رہے اوران کی کفالت بھی کرتے رہے، مولاناؒ کا دولت کدہ ایک مستقل مدرسہ بنا رہا، بہار، غازی پور، بنارس، اعظم گڈھ اور جون پور کے طلبہ بکثرت مولاناؒ کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، جامع مسجد شاہی جون پور میں ایک مدرسہ قرآنیہ بھی قائم فرمایا، جس سے اطراف واکناف میں بکثرت حفاظِ قرآن مجید پیدا ہوئے، تھوڑے دنوں نواب ذوالفقار علی خان بہادر والیٔ باندہ کے یہاں ریاست باندہ میں بسلسلۂ درس وافتاء مشاہرہ دوسو (۲۰۰) روپیہ ماہوار قائم رہے، لیکن اپنی والدہ کی پیرانہ سالی کا خیال فرما کر وطن واپس چلے آئے اور ملازمت چھوڑ دی۔

ف: والدہ کی خدمت کے لیے ملازمت کو ترک فرما دیا، یہ آپؒ کی سعادت تھی، ورنہ آج کل والدین کی معمولی رعایت بھی گوارا نہیں کی جاتی، العیاذ باللہ، پھر کیسے ان کی دعا اولاد کے حق میں قبول ہوگی؟ (مرتب)۔

فضل وکمال: مولاناؒ نہایت متقی، پرہیزگار اور متبع سنت بزرگ تھے، مولاناؒ کے ذریعہ قدیم جاہلانہ رسوم کا ابطال اور مذہبی شعائر کا اِجرا بہت ہوا، وعظ وتلقین سے ہمیشہ ردِ بدعات اور اتباعِ سنت کی ترویج واشاعت میں کوشاں رہے، فتویٰ مدلل لکھتے تھے، اقوالِ فقہاء میں سے ہمیشہ اس قول پر فتویٰ دیتے تھے جس کی

تائید قرآن وسنت صحیحہ سے ملتی تھی، مولاناؒ کا یہ فیض ہے کہ اب تک جون پور میں کوئی سنی تعزیہ داری نہیں کرتا، مولاناؒ نہایت درجہ باعمل عالم تھے، تمام عمر اولِ وقت پر مسجد میں باجماعت نماز کا خاص اہتمام تھا، عصر کی نماز ہمیشہ ایک مثل پر اور فجر کی نماز قراءتِ طویلہ کے ساتھ غلس میں پڑھتے رہے۔

حضرت سید صاحبؒ سے تعلق: مولاناؒ کو حضرت سید صاحبؒ کے ساتھ نہایت درجہ حسن اعتقاد اور تعلق تھا، اتباعِ سنت، حسن خلق، تواضع اور خود شکنی کی وہ تمام صفات آپؒ میں پائی جاتی تھیں جو آپؒ کی جماعت کے خواص اور تربیت یافتہ ومزکیٰ نفوس کی خصوصیات ہیں۔ رسالہ ''وصول'' میں فرماتے ہیں: ''اور ان سب میں طریقہ محمدیہ جناب امیر المومنین امام المسلمین امام اوحد سید احمد رضی اللہ عنہ، ودامت برکاتہ الیٰ یوم القیامۃ سے ظاہر ہوا کہ جامع ہے سب طریقوں کی نسبت کا......الخ۔''

تصانیف: مولاناؒ کی استعدادِ علمی اور ذہانت وقابلیت اور مولاناؒ کے صحیح خیالات کا آئینہ خود مولاناؒ کی تحریریں اور تصانیف ہیں، اگرچہ مولاناؒ کو کثرتِ درس سے تصنیف وتالیف کا موقع بہت کم ملتا تھا، جو تصانیف تھیں ان میں سے بھی بعض ناپید ہوگئیں اور جو پائی جاتی ہیں ان میں چند کتب کے اسماء حسب ذیل ہیں:

القویم فی احادیث النبی الکریم (مطبوعہ صدیقی پریس، بنارس) رسالہ تقویٰ دررد بدعات، رسالہ اسلم درعلمِ منطق، یہ رسالہ سلم کے مقابلہ میں نہایت مختصر اور جامع ہے، اس رسالہ کی ایک شرح مولانا علی نعمت پھلواری نے لکھی اور ایک شرح مولانا عبدالوہاب بہاری نے اسی (۸۰) جزو میں لکھی ہے، عقائد نامہ

اردو، رسالہ کلماتِ کفر وغیرہا۔

تلامذہ: مولاناؒ کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے، ان میں سے چند نام درجِ ذیل ہیں:

مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادیؒ، مولانا رجب علی جون پوریؒ، مولانا محمد شریف جون پوریؒ، ملا غلام محمد جگدیش پوریؒ، مولانا قاضی شیخ محمد مچھلی شہریؒ، مولانا سید محمد یعقوب دسنوی بہاریؒ، مولانا سید مصطفی شیر دسنوی بہاری مدرس مدرسہ خانقاہ سہسرام، مولانا شجاعت حسین بہاری، مولانا محمد عمر غازی پوری، مولانا غلام جیلانی بازید پوری غازی پوری، مولانا فیض اللہ مؤوی اعظم گڑھی، مولانا رحیم اللہ ساکن ضلع بستی۔

مولاناؒ نہایت خوش رُو، کشیدہ قد اور گداز بدن تھے، آخری عمر میں بدن زیادہ بھاری ہوگیا تھا، کپڑا نہایت صاف اور سادہ پہنتے تھے، بہت خوش خوراک تھے، مولاناؒ کا دسترخوان بہت وسیع رہتا تھا، ٹھنڈے پانی کا بڑا اہتمام ہوتا تھا۔

وفات: آخر عمر میں ہندوستان کے مشہور ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے چھ ماہ قبل مولانا امیر علی صاحب شہیدؒ کی شہادت کے بعد مولانا ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے، اہلیہ ساتھ تھیں، مولوی مکیؒ وہیں پیدا ہوئے، مولاناؒ وہیں اپنے اوقات عزیز اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف کرتے اور درس وتدریس میں مشغول رہتے، بالآخر شوال المکرم/ ۱۲۷۴ھ میں انتقال فرمایا اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

(از افادات: مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی مرحوم، سابق ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، نبیرۂ مولانا سخاوت علیؒ، کاروانِ ایمان: مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

مجاہد آزادی حضرت مولانا فیض احمد بدایونی ؒ (متوفی ۱۲۷۴ھ کے بعد)

نسب وولادت: مولانا فیض احمد بن حکیم غلام احمد مولوی محلہ، شہر بدایوں میں ۱۲۲۳ھ مطابق: ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ آپ ؒ کی عمر قریب تین سال رہی ہوگی کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا، مگر آفریں آپ ؒ کی والدہ کو جنہوں نے آپ ؒ کی تربیت باحسن وجوہ فرمائی۔

تعلیم وتربیت: مولانا کو قدرت نے شروع ہی سے وہ دل ودماغ بخشا تھا کہ جس پر آپ ؒ کے ہم درس طلبہ کو رشک آتا تھا، جو چیز ایک بار پڑھ لی یاد ہوگئی، اور ایک دفعہ نظر سے گزر گئی دل پر نقش ہوگئی، تحقیق وتدقیق آپ ؒ کا حصہ تھا، اہل خاندان خیال کرتے تھے کہ مستقبل قریب میں یہ بچہ فخر خاندان ہوگا۔

بالائے سرش ز ہوش مندی　　　می تافت ستارۂ بلندی

ترجمہ: ان کے سر پر بچپن ہی سے بلندی کا ستارہ چمک رہا تھا۔

والدہ نے اس ہونہار بچے کو اپنے بھائی مولانا فضل رسول کے سپرد کردیا، آپ نے نہایت محبت اور ناز ونعم سے پرورش فرمائی، مولانا فیض احمد ؒ نے تمام علومِ منقول ومعقول صرف چودہ سال کی عمر میں حاصل فرمائے، اس کے بعد آپ ؒ کو درس کی اجازت مل گئی، دوسرے فنونِ مروّجہ خطاطی وشعر وشاعری وغیرہ میں بھی آپ ؒ نے کمال حاصل کیا، ایک قلیل عرصہ میں آپ ؒ کا شہرہ ہوگیا اور تشنگانِ علم نے اس منبعِ علم وفضل کی طرف رُخ کیا۔

بیعت: جب مولاناؒ نے علومِ ظاہری سے فراغت پالی تو علومِ باطنی کا خیال آیا، حضرت اچھے میاں مارہرویؒ کے خلیفۂ اجل آپؒ کے نانا حضرت مولانا شاہ عبدالحمیدؒ مسند رشد و ہدایت پر جلوہ افروز تھے، آپؒ نے سلسلۂ قادریہ برکاتیہ میں اپنے نانا صاحب سے بیعت فرما کر علومِ باطنی کی تکمیل کی۔

درس و تدریس: آپؒ نے جب مسند درس کو سنبھالا تو ایک عالم مستفید ہوا، طلبہ سے ایک خاص تعلق ہوتا تھا، اُن کی خبر گیری اور بسا اوقات ان کی مدد کرنا آپؒ کے معمولات سے تھا، دورانِ ملازمت بھی آپؒ طلبہ کو درس دیتے تھے اور یہ اُس دور کی خصوصیات سے تھا، آپؒ کے تلامذہ کا شمار دشوار ہے۔

اخلاق: مولانا فیض احمدؒ نے اخلاق بڑے وسیع پائے تھے، اہل وطن کی آپؒ بڑی مدد کرتے تھے، بدایوں کا جو شخص پہنچا اور جس کام میں مدد کا خواستگار ہوا اس کی حتی الوسع امداد کی، قیام و طعام کی کفالت کرتے، بعض اوقات ان مصارف کے لیے قرض کی ضرورت پڑتی۔ صاحب اکمل التاریخ لکھتے ہیں: ''باوجود ثروت و وقار کے دل فقیرانہ، مزاج شاہانہ تھا، فقراء سے محبت اور غرباء سے اُلفت، طلبہ کے شائق اور علم کے شیدائی تھے، شاگردوں کی تمام ضروریات کے خود متکفل ہوتے تھے، سلسلۂ درس و تدریس اقامت آگرہ میں برابر جاری رہا۔''

جامع مسجد آگرہ کا نظم: یہ ہندوستان کی قابل فخر تاریخی جامع مسجد اس زمانہ میں عجیب حالت میں تھی، صرف بیچ کا حصہ خالی تھا، جس میں ستر اسّی نمازی نماز پڑھ سکتے تھے، باقی حصہ پر کبوتر بازوں کا قبضہ تھا یا رسّیاں بٹنے والے رسّیاں بٹتے تھے، مسجد کی دُکانیں بنیوں کے پاس رہن تھیں، مولاناؒ نے یہ صورت دیکھی تو

بے چین ہو گئے اور طویل جد و جہد کا سلسلہ شروع کر دیا، جس کا اندازہ مقدمات کے کاغذات کے معاینہ سے ہوسکتا ہے، بالآخر مولاناؒ کو کامیابی ہوئی، دُکانیں خالی کروائی گئیں، مسجد کا انتظام درست کیا گیا، کبوتر بازوں کو نکالا گیا، رسّی بٹنے کی لعنت ختم کر کے مسجد کی درستی کرائی گئی اور مسجد کے انتظام کے لیے لوکل ایجنسی آگرہ کا قیام عمل میں آیا، جس کے تحت آج تک جامع مسجد آگرہ کا انتظام ہے۔

مولانا فیض احمد صاحبؒ دہلی میں: دہلی میں ایسے ذی علم، سنجیدہ اور بااخلاص اصحابِ فکر کی ضرورت تھی، آپؒ کو وہاں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، آپؒ مرزا مغل کے پیش کار مقرر ہوئے، مختلف معرکوں میں آپؒ نے شرکت فرمائی۔

۱۹/ستمبر ۱۸۵۷ء مطابق: ۱۲۷۴ھ کو جب جنرل بخت خان نے دہلی سے کوچ کیا تو مولانا فیض احمد صاحبؒ اور ڈاکٹر وزیر خان جنرل بخت خان کے ساتھ تھے، اُس وقت لکھنؤ میں معرکۂ کارزار گرم تھا، مولانا شاہ احمد اللہ صاحبؒ دادِ شجاعت دے رہے تھے، مولانا فیض احمد صاحبؒ اور ڈاکٹر وزیر خان لکھنؤ پہنچے اور تمام اہم معرکوں میں شاہ صاحبؒ کے ساتھ رہے۔

آپؒ کی گم شدگی: سقوطِ لکھنؤ کے بعد مولانا فیض احمد صاحبؒ بدایوں پہنچے، شاہ زادہ فیروز بھی بدایوں پہنچ چکے تھے، پھر جب یہاں بھی ناکامی ہوئی تو قصبہ محمدی پہنچے، جہاں مولانا احمد اللہ شاہ صاحبؒ نے حکومت قائم کی تھی، مولانا شاہ احمد اللہؒ کی شہادت کے بعد ایسے روپوش ہوئے کہ آپؒ کے ماموں مولانا فضل رسول نے آپؒ کی تلاش میں قسطنطنیہ تک سفر کیا، مگر کہیں سراغ نہ لگ سکا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ آپ ۱۲۷۴ھ میں بقیدِ حیات تھے۔ (علماءِ ہند کا شاندار ماضی: ۴/۳۵۶)

حضرت شیخ محمد گلاب ملکا پوریؒ متوفی ۱۲۷۰ھ

نام ونسب: آپؒ شیخ محب بن شیخ ابراہیم بن دین محمد براریؒ کے صاحب زادے ہیں، نسباً وحسباً صدیقی الاصل ہیں، آپؒ کی والدہ صاحبہ بنت محمد صدیق علی خان بن محمد معالی خان بن عبد الحق بن قاضی عبدالوہاب اقضی القضاۃ عالمگیری نبیرۂ محمد طاہر پٹنی ہیں۔

تعلیم وتربیت: آپؒ کا مولد ملکا پور، برار ہے اور پرورش بھی وہیں کی آب وہوا میں ہوئی، نو دس سال کی عمر میں ختم قرآن ومختصراتِ رسائلِ دینیات سے فارغ ہوئے، ابتداءِ شعور سے آپؒ کا میلانِ طبع تقویٰ وورع کی طرف زیادہ تھا، اکثر اوقات تلاوتِ قرآن ووظائف ودلائل الخیرات میں گزارتے تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، نوافل وسنن کو بھی مثل فرائض وواجبات سمجھتے تھے، قرآن وحدیث، تفسیر اورفقہ پرفریفتہ تھے، آپؒ ملکا پور سے بغرضِ تحصیل علوم برہان پور گئے، وہاں تعلیم علوم کا بازارگرم تھا، متعدد مقامات میں درسگاہیں تھیں، آپؒ نے مولوی جلال الدین بخاری عرف اللہ والے صاحبؒ کی درسگاہ میں شریک ہوکر حدیث وفقہ میں خوب مہارت ولیاقت حاصل کی، مسائل دینیات، احادیث اورادعیۂ ماثورہ کے حافظ تھے، آپؒ کا سینہ مسائل جزئیات کا سفینہ تھا، جو کچھ آپؒ سے پوچھا جاتا تھا فوراً جواب دیتے تھے، سائل کوانتظار کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، بالا پور، برار کے علماءِ عنایت الٰہی سے بھی استفادہ کیا ہے، مولوی مطیع اللہ عرف اللہ دیا صاحب برادرِ اللہ والے صاحب

برہان پوریؒ کی خدمت میں مدتِ دراز تک رہے، علمِ ظاہری وعلمِ باطنی میں جو کچھ پایا دونوں بھائیوں سے پایا، آپؒ ان حضرات کے شاگرد و مرید رشید تھے، بزرگانِ اہل اللہ کی خدمت وصحبت کی برکت سے آپؒ خادمی سے مخدومی کے درجہ کو پہنچے۔

علم وفضل وخدمتِ خلق: آپؒ اگرچہ فارغ التحصیل نہیں تھے، لیکن اکثر علماء وفضلاء کے محافلِ مواعظ میں شریک رہتے تھے، آپؒ کا حافظہ مذاکرۂ علوم ومسائل دینیات سے معمور تھا، آپؒ راست باز اور خیر خواہِ اسلام تھے، خلائق کی تعلیم وتہذیب لوجہ اللہ فرماتے تھے، آپؒ کے درس میں عام خلائق کے لوگ ہوتے تھے، آپؒ تمام کے ساتھ حسن خلق و نیک سلوک فرماتے تھے، آپؒ کے مزاج میں ہمدردی ایک جزءِ اعظم تھی، آپؒ میں اسلام کی حمیت کامل تھی، علم دوست تھے، علماء کی خدمت جان ومال سے کرتے تھے، مہمان نواز تھے، مسجد میں جو مسافر غریب وارد ہوتا تھا اس کی خدمت میں جو کچھ حاضر ہوتا لے کر پہنچتے تھے اور اُس کے لیے قصبات والوں سے چندہ کر کے زاد وراحلہ کا انتظام کر دیتے تھے، لہٰذا آنے والے آپؒ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے روانہ ہوتے تھے۔

آپؒ کی حسن خدمت کی شہرت سن کے اکثر حجاج وغرباء ملکاپور میں ضرور آتے تھے، کامیاب ہو کر جاتے تھے، آپؒ کی ہمدردی سے ایک یہ بات برار میں اظہر من الشمس ہے کہ آپؒ قصبہ کی بیوگانِ پردہ نشین کا ضروری سامانِ خوراک وپوشاک بازار سے خرید کے لاتے تھے، اوران کا کاتا ہوا سوت فروخت فرماتے تھے، آپؒ جب سنتے تھے کہ فلاں شخص فوت ہوگیا ہے آپؒ ضرور اس کی تجہیز وتکفین میں شریک ہوتے تھے، اور جمعہ کے روز مزارات کی زیارت فرماتے تھے، بیماروں کی عیادت آپؒ کی

عادت تھی، مریض کی دعا و دوا سے اعانت فرماتے تھے، ان ہی صفاتِ پسندیدہ کے سبب آپؒ مخدومِ خلائق ومقبولِ خالق تھے۔ فالحمدللہ حمدا کثیرا۔

قصبات ودیہات کے محافل خوشی وغمی میں آپؒ کا ہونا ضروری تھا، لوگ اعتقاداً باعث برکت ورحمت سمجھتے تھے، آپؒ کی کسر نفسی وبردباری اس درجہ تھی کہ اگر کوئی آپؒ کو برائی سے یاد کرے تو اس کو برا نہیں جانتے تھے اور آب دیدہ ہوکر فرماتے تھے کہ ''میرا نفس اس سے زیادہ برا ہے۔''

ایک روز آپؒ راستہ سے گزر رہے تھے کہ ایک بوڑھیا لکڑیوں کا بوجھ سر پر لیے جارہی تھیں، لیکن بوجھ کی وجہ سے چل نہیں سکتی تھیں، آپؒ نے اس کا بوجھ اپنے سر پر اٹھالیا، ہر چند مانع ہوئی، لیکن آپؒ نے نہیں مانا، اور قصبہ کے لوگوں نے چاہا کہ آپؒ سے بوجھ منتقل کریں، مگر آپؒ نے ان کی بھی نہیں سنی، اس بوڑھیا کے گھر پہنچادیا، ہمیشہ لڑکیوں اور لڑکوں کو پند ونصائح سے سرفراز فرماتے تھے، بزرگانِ سلف کی حکایتیں وقصص سناتے تھے، ہر ایک کو صوم وصلوٰۃ کی تاکید فرماتے تھے، طہارت وآداب کے طریقے بتاتے تھے، درود وکلماتِ طیبات کے فضائل سے آگاہ کرتے تھے، آپؒ مستجاب الدعوات تھے، صبح وشام مسلمین وغیر مسلمین کی عورتیں بچوں کو لیے ہوئے آپؒ کے پاس آتی تھیں، آپؒ ہر ایک بچہ پر دعا پڑھ کے پھونکتے تھے، فضل الٰہی سے بچے صحت یاب ہوتے تھے، قصبہ کے معزز وغیر معزز تمام آپؒ کی بزرگی کو مانتے تھے، قصبہ کے قاضی خواجہ محمد صاحب وخواجہ احمد صاحب جاگیر دار موضع ہیگنہ پرگنہ ملکاپور ونواب میر قادر علی خان تعلق دار آپؒ سے حسن اعتقاد رکھتے تھے، آپؒ سے ہر وقت مستفید ہوتے

تھے، اور منشی میر ہدایت علی صاحب مرحوم آپ ؒ کے گویا مرید تھے، اور ان کی حرماتِ محترمات بھی آپ ؒ کے ارادت مندوں میں شامل تھیں، آپ ؒ کی ترغیب سے تمام مستورات صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں، جب آپ ؒ ان کے پاس جاتے تھے تو ہر ایک کو نصیحت فرماتے تھے، کوئی حضرت رابعہ بصریہ ؒ کا، کوئی حضرت فاطمہ زہراء ؓ کا، کوئی ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ وحضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما کا حال دریافت کرتی تھیں، آپ ؒ نہایت خوبی کے ساتھ بیان فرماتے تھے، تمام بیبیاں دل چسپی سے سنتی تھیں، آپ ؒ مستورات سے فرماتے تھے کہ ''شوہر کے زوجہ پر اور زوجہ کے شوہر پر یہ حقوق ہیں، ہر ایک کو باہم اتفاق سے رہنا چاہیے اور کبھی اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔''

صاحبِ ترجمہ (یعنی حضرت شاہ محمد گلاب صاحب ؒ) جیسے بزرگوں کے پند ونصائح کا اب تک یہ اثر ہے کہ برار میں کوئی عورت تا بمرگ اپنے شوہر سے کبھی جدائی نہیں چاہتی تھی، اور کبھی برار میں کسی بی بی نے اپنے شوہر پر مہر کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ شوہر کا جنازہ اٹھاتے وقت مہر کی بخشش کے لیے کہا جاتا ہے تو خوشی سے بخش دیتی ہیں، اگرچہ طلاق دینا شرعاً درست ہے، مگر کوئی شوہر زوجہ کو طلاق نہیں دیتا ہے، بلکہ طلاق کو ننگ وعار سمجھا جاتا ہے، ایسے ہی بزرگوں کی نصیحتوں سے لڑکے صالحین اور لڑکیاں صالحات کے طبقات میں شامل ہوتی ہیں، بچیاں شرم وحیا میں ڈوبی رہتی ہیں، علیٰ ہذا القیاس لڑکے بھی بزرگوں کے سامنے شوخی و بے ادبی نہیں کرتے، مگر افسوس صد افسوس! ہمارے زمانے میں یہ پرانی باتیں اور اچھی عادتیں نسیا منسیا (بھولی بسری) ہو رہی ہیں، اس کی وجہ سوا اس کے کچھ

نہیں کہ جہالت وخود پسندی عام ہورہی ہے، اپنے سوا کوئی کسی کو کچھ نہیں سمجھتا۔

آپ ؒ کو دینی خدمات سے بہت دل چسپی تھی، چنانچہ ملکا پور کے خورد بازار جمعہ دروازہ کے قریب ایک مسجد المعروف بہ ’’خورد مسجد‘‘ کسی مومن بافندہ کی بنائی ہوئی تھی، اس مسجد کی امامت پر مولاناؒ بدونِ مشاہرہ واُجرت مقرر تھے، مسجد بے خبری کی وجہ سے شکستہ وریختہ ہورہی تھی، صحن تو بالکل زمین کے برابر ہوگیا تھا، آپ ؒ نے مسجد کی ترمیم وتعمیر کا بیڑہ اٹھایا، تمام معتقدین سے اور بطورِ خاص نواب میر قادر علی خان بہادر تعلق دار سے ترمیم وتعمیر کی بابت درخواست کی، نوابِ مذکور نے آپ ؒ کی درخواست منظور کی، ۱۲۶۵ھ میں مولاناؒ نے خود اپنے اہتمام سے مسجد کے صحن کی تعمیر وترمیم کی، اور دو حجرے جدید اور ایک حمامِ جدید ودیوارِ احاطہ تعمیر فرمائی، جو کچھ خرچ ہوا نواب صاحب ؒ نے کل عطا کیا، اور کچھ یومیہ تیل وچراغ کے لیے بھی مقرر کرایا، صاحب ترجمہ (شاہ محمد گلاب صاحب ؒ) یومیہ کی رقم مع شئ زائد جیب خاص سے مسجد کے کام میں صرف فرماتے تھے۔

وفات: آخر آپ ؒ نے ۱۲۷۴ھ میں اس دارِ فانی سے عالم باقی کی طرف رحلت فرمائی، حسبِ وصیت مسجدِ مذکور کی شمالی جانب میں دفن ہوئے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔ رحمہ اللّٰہ تعالیٰ ونوّر مرقدہٗ۔

کسی شاعر نے یہ مصرع آپ ؒ کی تاریخ وفات کے متعلق لکھا ہے:

’’عبادت اُٹھ گئی گویا حرم سے۔‘‘

(۱۲۷۴ھ)

(محبوب التواریخ: ۲/ ۱۰۳۸)

حضرت مولانا شاہ احمد سعید رامپوریؒ متوفی ۱۲۷۷ھ

نام ونسب: آپؒ کا نام احمد سعید اور والد کا نام شاہ ابوسعید ہے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۲۱۷ھ میں رامپور، یوپی میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت: آپؒ کی عمر دس سال کی تھی کہ حضرت شاہ غلام علی صاحب قدس سرہٗ سے اخذِ طریقہ کیا، حضرت شاہ صاحبؒ آپؒ کے حال پر نہایت الطاف ومہربانی فرماتے، جب آپؒ سبق پڑھ کر آتے اور حضرت شاہ صاحبؒ کا حلقہ ہوتا وہاں جاتے، اگر زیادہ ازدحام کے سبب بیٹھنے کو جگہ نہ ملتی اور شاہ صاحبؒ آپؒ کو دیکھ لیتے تو بلاکر مسند کے قریب بٹھاتے اور بقوتِ تمام توجہ فرماتے۔

فرمایا کہ ''میں نے اکثر کتبِ تصوف مثل رسالہ قشیری، عوارف المعارف، احیاء العلوم، مکتوباتِ شریف اور مثنوی مولانا رومیؒ حضرت شاہ صاحبؒ سے پڑھی ہیں یا سنی ہیں، اور بعض کتب اور حدیث بھی پڑھی ہیں، اور کتب معقول ومنقول دیگر علماءِ وقت مثل مولوی فضل امام اور مولوی رشید الدین خان سے استفادہ کی ہیں، نیز حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب، مولانا رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب رحمہم اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، اور حدیث کی سند مجھ کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ قدس سرہٗ سے حاصل ہے۔''

فرمایا کہ ''جن ایام میں پڑھا کرتا تھا تو اکثر شب مطالعہ میں گزر جاتی تھی، اور اسی طرح ذکر وفکر اور شاہ صاحبؒ کے حلقہ ومراقبہ کا بھی التزام رکھا تھا،

اور اگر حضرت شاہ صاحبؒ سے مفارقت ہوتی تو اپنے والدؒ سے توجہ لیا کرتا تھا، بلکہ شاہ صاحبؒ کی موجودگی میں بھی ان سے توجہ لیتا تھا۔‘‘

فرمایا کہ ’’میں نے جمیع مقامات پر اپنے والدؒ سے بھی توجہ لی ہے، اور اسی سبب سے سلسلہ میں ان کے نام کے بعد اپنا نام داخل کیا ہے، ورنہ کسبِ نسب واجازت اور خلافت حضرت شاہ صاحبؒ سے حاصل ہے۔‘‘

فرمایا کہ ’’حضرت شاہ صاحبؒ قبلہ بوجہِ وفورِ عنایت فرمایا کرتے تھے کہ تم پر کبھی توجہ ناغہ نہیں ہوئی، خواہ تم یہاں رہے یا نہیں، اور اس سبب سے مدتِ صحبت پندرہ سال ہوتی ہے۔‘‘ جب آپؒ کا سن شریف قریب دس سال تھا اس وقت حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا، اس میں بعد ذکر آپؒ کے والدؒ کے آپؒ کی نسبت اس میں تحریر فرمایا ہے کہ ’’حضرت احمد سعید فرزند حضرت ابوسعید بعلم وعمل وحفظِ قرآنِ مجید واحوالِ نسبتِ شریفہ قریب است بوالدِ خود۔‘‘

ارشادات: فرماتے تھے کہ ’’مرید نارسیدہ بمنزلہ طفل شیرخوار کے ہوتا ہے، کہ اپنے نفع ونقصان سے واقف نہیں ہوتا، اگر بچہ قبل از مدتِ مقررۂ رضاعت اپنی دودھ پلائی سے علیحدہ ہوتا ہے تو اس کے نشوونما میں نقصان ہوجاتا ہے، اسی طرح اگر مرید قبل از استعداد جدا ہوجائے تو ناقص اور ابتر رہ جاتا ہے۔‘‘ اگر طالب میں میل دنیا اور رغبت اغنیاء دیکھتے تو اس سے مایوس ہوجاتے، اور اسی طرح نکاح کی جانب مائل دیکھتے تو اس سے بھی نااُمید ہوجاتے اور کلمۂ استرجاع پڑھتے۔

فرماتے تھے کہ ’’مبتدی کے واسطے کوئی چیز مثل عورت کے مضر نہیں ہے، جس وقت اس بلا میں مبتلا ہوا دنیا دار ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کی طلب اس کے دل سے

جاتی رہی۔'' اور اکثر یہ شعر پڑھتے:

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں   ایں خیال است ومحال است وجنوں

فرمایا کہ ''صحبتِ اغنیاء و اربابِ تنعم طالب کے واسطے سمِ قاتل و سد سکندری ہے، اور اس سے مجاریٔ فیض بند ہو جاتے ہیں، اور قلب پر ظلماتِ کثیفہ طاری ہو جاتی ہیں، خیال کرو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ وصیت فرمائی:

''إِيَّاکِ وَ مُجَالَسَةَ الأَغْنِيَاءِ، وَ أَحِبِّيْ المَسَاكِيْنَ وَ قُرْبَتَهُمْ۔''

ترجمہ: اپنے آپ کو مالداروں کے ساتھ نشست و برخاست سے بچا، اور مساکین اوران کے قرب سے محبت رکھ۔

بلکہ فقراء اور طالبانِ طریقت کی بھی آپس میں زیادہ صحبت پسند نہیں فرماتے تھے۔ فرمایا کہ ''طالبِ حق کسی کی طرف التفات نہیں کرتا، بلکہ غیر سے متنفر ہوتا ہے۔'' طالبین میں سے جو شخص حجرہ بند کر کے ملتزمِ ذکر وفکر ہوتا اس کو بہت پسند فرماتے۔

فرمایا کہ ''طالب اس وقت اللہ تعالیٰ کا مرید ہوتا ہے کہ اپنے سینے سے جمیع مرادات دفع کرے اور سوائے رضاءِ حق سبحانہ کوئی مراد اس کی نہ ہو اور ''مردہ بدستِ زندہ'' ہو رہے۔''

اور بارگاہِ الٰہی میں ہر وقت بتضرع وزاری دعا کرے کہ الٰہی! جو کچھ تیری رضا ہو اس پر قائم رکھ، اور ایک لحظہ مجھ کو خود سے دور نہ کر۔

فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ اس کی تمنائے قلبی پر اس کو پہنچائے۔'' فرمایا

کہ ’’آرزوئے فقیر یہی ہے کہ انفاسِ مستعارِ حیات اللہ تعالیٰ کی مرضی میں گزریں اور گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر زبان بتکرارِ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تازہ رہے۔‘‘

فرمایا کہ ’’دوامِ ذکر اور دوامِ توجہ الی اللہ بانکسارِ تمام اسبابِ قبولیت بجنابِ الٰہی ہیں، اس میں غفلت نہیں کرنی چاہیے، کہ اس راہ میں طالبانِ حق جل وعلا کے واسطے بہت ضروری ہیں، اور چاہیے کہ دل کو وعدہائے الٰہی پر قوی رکھے، کہ یہی خلاصۂ زندگی ہے۔‘‘

فرمایا کہ ’’امورِ دین و دنیا کو بواسطۂ پیرانِ کبار جنابِ الٰہی میں تفویض کرے، اور مجاریٔ احوال کو تقدیر سے جانے، اور وقائع پر چون و چرا نہ کرے، اور ماسوا سے نا اُمید رہے، صبر، توکل، قناعت، رضا، افتقار، انکسار، خاکساری اور تواضع کی عادت ڈالے، کتبِ صوفیہ میں مکتوبات شریف (مجدد الفِ ثانیؒ) کو مطالعہ میں رکھنا بہت ضروری ہے۔‘‘

ف: اللہ، اللہ، کیسی کیسی نصیحتیں ہیں، کاش! ان پر عمل ہوجاتا تو کام بن جاتا، اللہ تعالیٰ ان پر عمل کی توفیق مرحمت فرما کر فوز و کامرانی سے شاد فرمائے، آمین۔ (مرتب)

اخلاقِ حسنہ: آپؒ نہایت کریم النفس، رقیق القلب، دائم الذکر والفکر، حلیم اور صاحب رحمت وشفقت تھے، مریدوں میں اگر کسی سے لغزش ہوجاتی تو اس کو اپنی طرف منسوب کرتے اور فرماتے کہ قصور میرا ہے، اگر مجھ میں کمال ہوتا تو تم سے یہ بات صادر نہ ہوتی، بلکہ میرے عکس سے میرے اوصافِ رذیلہ ظاہر ہوئے، شکست ومسکنت اور دیدِ قصور آپؒ میں بدرجۂ غایت پائی جاتی تھیں۔

معمولاتِ شب وروز: شب و روز میں تین مرتبہ حلقہ فرمایا کرتے تھے،

بعد نمازِ صبح، بعد نمازِ ظہر اور بعد نمازِ مغرب، جب تک مرید کا رُشد ظاہر و باطن نہ دیکھ لیتے اس کو رخصت نہ فرماتے، بلکہ اگر وہ بمبالغہ والحاح طلبِ رُخصت کرتا تب بھی اجازت نہ دیتے۔

وفات: آپؒ نے ایامِ جہاد (۱۸۵۷ء) میں دہلی سے حرمین شریفین کو ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار فرمائی، وہاں بانواعِ انعامات وتشریفاتِ حضرت محبوبِ رب العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرف ہوئے، دو سال کے قیام کے بعد آپؒ کا بتاریخ: ۲/ ربیع الاول/ ۱۲۷۷ھ میں وصال ہوا، بقیع میں قریب روضۂ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دفن ہوئے۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔

(مشائخ نقشبندیہ: ۴۴۵)

مجاہد آزادی حضرت مولانا فضل حق خیرآبادیؒ متوفی ۱۲۷۸ھ

نام ونسب: نام فضل حق، والد کا نام مولانا فضل امام خیرآبادی ہے، سلسلۂ نسب کے لحاظ سے آپؒ فاروقی ہیں، چودہ واسطوں کے بعد آپؒ کا سلسلۂ نسب سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے شجرۂ نسب سے مل جاتا ہے۔

ولادت اور تعلیم وتربیت: مولانا فضل حق صاحب ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں اپنے آبائی وطن خیرآباد میں پیدا ہوئے، والد ماجد مولانا فضل امام صاحب دہلی میں صدر الصدور تھے، مولانا فضل حق کی تعلیم وتربیت آپؒ کے ہی زیر سایہ دہلی میں ہوئی، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ قدس اللہ سرہما کی بارگاہِ فیض پناہ سے علم حدیث کی خوشہ چینی کی، تیرہ سال کی عمر میں تمام عقلی ونقلی علوم کی تکمیل کرلی، چار ماہ اور چند روز میں قرآن مجید حفظ کیا۔ (علماءِ ہند کا شاندار ماضی: ۴/ ۴۴۳)

مولانا کی گرفتاری وحق گوئی: آپؒ منطق وفلسفہ کے امام تھے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا تھا اور ان سے جہاد کو فرض کہا تھا، اس جرم میں ۱۸۵۹ء میں سیتاپور سے گرفتار کرکے لکھنؤ لائے گئے، مقدمہ چلا، سرکاری وکیل کے مقابل مولانا خود بحث کرتے تھے، جج مولانا کی عظمت اور تبحر علمی سے واقف تھا، وہ کسی وجہ سے چاہتا تھا کہ مولاناؒ کو رہا کردیا جائے، لیکن بحث کے تیسرے دِن مولاناؒ نے عدالت سے کہا کہ ''جس مخبر نے

فتویٰ کی خبر دی اب میں اس کی توثیق کرتا ہوں، اس گواہ نے سچ رپورٹ لکھوائی تھی، اب عدالت میں میری صورت سے مرعوب ہوکر جھوٹ بولا ہے، میں اقرار کرتا ہوں کہ فتویٰ میرا لکھا ہوا ہے اور میرے ہی مشورے سے علماء نے دستخط کیے ہیں، مجھے اللہ کے حضور جانا ہے، غلط بات مذہب کے معاملہ میں نہیں بول سکتا ہوں۔'' اس اقرار کے بعد اس کے سوا اور کوئی دوسری سزا ہو ہی نہیں سکتی کہ مولاناؒ کو حبس دوام بعبورِ دریائے شور کی سزا دی جائے، چنانچہ عدالت نے فیصلہ سنا دیا، مولاناؒ نے بڑی خوشی سے فیصلہ سنا اور منظور کیا، پھر مولاناؒ کو انڈمان روانہ کردیا گیا۔

فن ہیئت میں مہارت: انڈمان میں مولاناؒ کو بہت ذلیل خدمت سپرد کی گئی، آپؒ کے ذمہ قیدیوں کے بارکوں کی صفائی تھی، کہاں ہندوستان کا علامۂ زماں اور علمی دنیا میں بے تاج کا بادشاہ اور کہاں کوڑا کرکٹ کی ٹوکری؟ مولاناؒ جس جیل میں تھے اس کا سپرنٹنڈنٹ ایک انگریز تھا، اس نے فن ہیئت میں ایک کتاب فارسی زبان میں لکھی تھی، ایک قیدی جو مولوی تھے انگریز نے ان کو دی کہ تصحیح کردیں، لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی، مولوی صاحب نے سپرنٹنڈنٹ سے کتاب لی اور سیدھے مولانا فضل حق صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے، مولاناؒ نے ایک ہفتہ میں کتاب کو درست کرکے مفید اِضافے کیے اور اس پر جگہ جگہ حاشیہ بھی لکھا، مولوی صاحب جو کتاب لے کر آئے تھے ان کے ذریعہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو بھیج دی، اس نے سمجھا کہ مولوی صاحب نے یہ کام کیا ہے، لہٰذا ان کی خوب تعریف کی، تو مولوی صاحب نے کہا کہ حضور! یہ میرا کارنامہ نہیں ہے، بلکہ مولانا فضل حق کا ہے، جو فتوائے جہاد کے سلسلہ میں یہاں قید کرلیے گئے

ہیں، اسی وقت سپر نٹنڈنٹ مولوی صاحب کو لے کر مولانا کے ٹھکانے پر آیا، علامہؒ نہیں تھے، وہ انتظار کرتا رہا، دیکھا کہ ایک شخص ٹوکرا بغل میں دبائے چلا آرہا ہے، مولوی صاحب نے کہا کہ یہی مولانا فضل حق ہیں، یہ منظر دیکھ کر انگریز کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور مولاناؒ سے معذرت کر کے اپنی پیشی میں لے لیا۔

(تحریکِ آزادی اور مسلمان/صفحہ:۷۴)

جیل کی دردناک منظر کشی: علامہؒ نے حالت قید میں اپنی تکلیفوں کا حال اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الثورۃ الہندیہ'' (باغی ہندوستان) میں بیان کیا ہے:

''مکر و تلبیسِ نصاریٰ نے جب مجھے قید کر لیا تو ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کر دیا، مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہنچایا، میرا جوتا اور لباس اُتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیے، نرم و بہتر بستر چھین کر خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا گیا، گویا اس پر کانٹے بچھا دیے گئے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئیں، میرے پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن نہ چھوڑا، بخل سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا۔

پھر ترش رو دشمن کے ظلم نے مجھے دریائے شور کے کنارے (جزیرۂ انڈمان) ایک بلند و مضبوط ناموافق آب و ہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا، جہاں سورج ہمیشہ سر پر رہتا تھا، اس میں دشوار گزار گھاٹیاں اور راہیں تھیں، جنہیں دریائے شور کی موجیں ڈھانپ لیتی تھیں، اس کی نسیمِ صبح بھی گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی نعمت زہر ہلاہل سے زیادہ مضر تھی، اس کی غذا حنظل سے

زیادہ کڑوی، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے زیادہ ضرر رساں، اس کا آسمان غموں کی بارش کرنے والا ہے، اس کا بادل رنج وغم برسانے والا ہے، اس کی زمین آبلہ دار، اس کے سنگریزے بدن کی پھنسیاں اوراس کی ہوا ذلت وخواری کی وجہ سے ٹیڑھی چلنے والی، ہر کوٹھری پر چھید تھا، جس میں رنج ومرض بھرا ہوا تھا، میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں، ہوا بدبودار اور بیماریوں کا مخزن تھی، مرض سستا اور دوا گراں، بیماری بے شمار، خارش اورقوباء (وہ مرض جس میں کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے) عام تھی، بیمار کے علاج میں تندہی، بقاءِ صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہ تھی، بخار موت کا پیغام، نصرانی ماہر طبیب مریضوں کی آنتوں کو تنور کی طرح جلاتا اور مریض کی حفاظت نہ کرتے ہوئے آگ کا قبہ اس کے اوپر بناتا ہے، مرض نہ پہچانتے ہوئے دوا پلا کر موت کے قریب پہنچا دیتا ہے، جب کوئی ان میں (قیدیوں میں سے) مرجاتا ہے تو نجس وناپاک خاکروب جو درحقیقت شیطانِ خناس ہوتا ہے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا غسل اورکفن کے بغیر اس کے کپڑے اُتار کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے، نہ قبر کھودی جاتی ہے نہ نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے۔'' (فخر وطن/صفحہ:۱۱۱)

وفات: علامہؒ کے صاحب زادے نے ولایت میں اپیل کر رکھی تھی اور افسرانِ بالا سے تعلق رکھنے والوں نے سفارشیں کی تھیں، جس کے نتیجہ میں مولاناؒ کی رہائی کا پروانہ آگیا، صاحب زادے مولوی شمس الحق رہائی کا پروانہ لے کر انڈمان گئے، تاکہ والد صاحب کو اپنے ساتھ لائیں، جب جہاز سے جزیرے میں اُترے اور شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر آیا، جنازہ کے ساتھ ہزاروں

آدمیوں کی بھیڑ چل رہی ہے، اعلیٰ حکام جنازہ کے ساتھ چل رہے ہیں، مولوی شمس الحق نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ مولانا فضل حق خیرآبادیؒ کا جنازہ ہے، کل ۱۲/صفر/۱۲۷۸ھ مطابق : ۱/اکتوبر/۱۸۶۱ء کوانتقال ہوا ہے، اب پیوند خاک کرنے کے لیے جنازہ جارہا ہے، مولوی شمس الحق اپنے ہاتھوں باپ کو جزیرہ میں دفن کر کے تنہا وطن واپس لوٹ آئے۔نوراللہ مرقدہٗ۔(تحریک آزادی اور مسلمان:۷۴)

رحمۃ اللہ تعالیٰ علی المظلومین، و أدخلھم اللہ فی جنات النعیم، و لعنة الله على الظالمين، و أدخلهم فى النار الحميم، آمين يا رب العالمين بحرمة النبي الكريم، صلّى الله عليه و على آله و أتباعه أجمعين۔

مجاہد آزادی حضرت مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی لکھنویؒ متوفی ۱۲۷۸ھ

(صاحب علم الصیغہ)

نام ونسب: نام مفتی عنایت احمد، والد کا نام منشی محمد بخش بن منشی غلام محمد ہے، آپؒ قریشی النسل تھے، آپؒ کے اجداد میں امیر حسام نامی ایک شخص بغداد سے آکر قصبہ دیوہ، ضلع بارہ بنکی، یوپی میں سکونت پذیر ہوئے۔

آپؒ اپنے وقت کے زبردست عالم، بہترین مصنفؒ، تحریکِ آزادی کے علم بردار، حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلویؒ کے شاگردِ رشید اور مدرسہ فیض عام کانپور کے بانی تھے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۹/شوال/۱۲۲۸ھ مطابق: ۱۸۱۳ء میں قصبہ دیوہ، ضلع بارہ بنکی، یوپی میں ہوئی، بعد میں آپؒ کے دادا غلام محمد مرحوم کی سسرال کاکوری میں ہونے کی وجہ سے آپؒ کے والد منشی محمد بخشؒ اور چچا شیخ عبدالحسیبؒ نے نہالی تعلق کی بنا پر کاکوری میں سکونت اختیار کرلی، پھر آپؒ کے تمام قریبی رشتہ دار بھی کاکوری میں آکر سکونت پذیر ہوگئے، اور اس طرح آپؒ کاکوروی سے مشہور ہوگئے۔

تعلیم وتربیت: ابتدائی تعلیم کاکوری میں حاصل کی، تیرہ سال کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے رامپور تشریف لے گئے، وہاں مولوی سید محمد صاحب بریلویؒ سے صرف ونحو، مولوی حیدر علی صاحب ٹونکیؒ اور مولوی نورالاسلام صاحبؒ سے

دوسری درسی کتابیں پڑھیں، رامپور سے درسی کتابیں ختم کر کے دہلی پہنچے، وہاں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلویؒ سے کتبِ حدیث سبقاً سبقاً پڑھیں اور سند حدیث حاصل کی، دہلی سے علی گڑھ آئے، جہاں مولانا بزرگ علی مارہرویؒ (شاگردِ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ وشاہ رفیع الدین دہلویؒ) سے تمام معقولات اور منقولات کی کتابیں پڑھیں اور فارغ التحصیل ہوئے۔

درس وتدریس: فراغت کے بعد اپنے استاذِ محترم مولانا بزرگ علی مارہرویؒ کے مدرسہ میں ان کے انتقال (۱۲۶۲ھ) کے بعد تدریس کا عہدہ سنبھالا، ایک سال تک مدرّس رہے، اس کے بعد علی گڑھ میں مفتی ومنصف کے عہدہ پر فائز ہوئے، اس کے بعد آپؒ کا قیام بریلی میں رہا، جہاں آپؒ صدر امین ہوئے، اس دوران درس وتدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا، علی گڑھ کے تلامذہ میں مولوی لطف اللہ صاحب علی گڑھیؒ بڑے نامور شاگرد ہوئے، اسی طرح بریلی کے تلامذہ میں قاضی عبدالجمیل قاضیٔ شہر، مولوی فدا حسین منصفؒ مشہور لوگ گزرے ہیں، مولوی سید حسین شاہ صاحب بخاریؒ نے بھی اسی زمانہ میں پڑھا ہے۔

اجلاس میں سبق: مولوی سید حسین شاہ بخاریؒ فرمایا کرتے تھے کہ مفتی صاحبؒ مجھ کو ہدایہ اجلاس میں پڑھایا کرتے، جیسے ہی کسی مقدمہ سے فرصت ہوتی اشارہ ہوتا، میں پڑھنا شروع کر دیتا، پھر کوئی سرکاری کام آجاتا تو اس میں مصروف ہو جاتے، اس دوگنا مشغولیت کے باوجود مسائل اس طرح ذہن نشین کرا دیے کہ کبھی فراموش نہ ہوئے، آپؒ طلبہ سے خاص تعلق رکھتے تھے، مولوی لطف اللہ صاحبؒ کی تعلیم کے زمانے میں ہی مفتی صاحبؒ کا تبادلہ علی گڈھ سے

بریلی ہو گیا تھا، مولوی لطف اللہ صاحب بریلی ساتھ گئے، وہاں جملہ کتب درسیہ ختم کیں، صبح کی نماز کے بعد مفتی عنایت احمد صاحبؒ تلاوت فرماتے تھے، مولوی لطف اللہ صاحب خدمت میں حاضر رہتے، دورانِ تلاوت اگر کوئی مشکل صیغہ آتا تو مفتی صاحبؒ ان کی طرف دیکھتے، یہ حل کرتے، حل نہ کر سکتے تو بعد تلاوت خود حل کر کے بتاتے۔

قیامِ بریلی : بریلی کے قیام میں مفتی عنایت احمد صاحبؒ صدر امین ہوئے، درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا، بریلی کے تلامذہ میں قاضی عبدالجمیل صاحب قاضیٔ شہر، مولوی فدا حسین منصف اور نواب عبدالعزیز خان مشہور لوگ گزرے ہیں، آخر الذکر حافظ الملک نواب حافظ رحمت خان کے پوتے تھے، درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اسی زمانہ میں بریلی میں مفتی عنایت احمد صاحبؒ کے ہم وطن مولوی رضی الدین بن علم الدین (متوفیٰ: ۱۲۷۴ھ) صدر الصدور تھے، ۱۲۷۳ھ میں آگرہ کے صدرِ اعلیٰ مقرر ہوئے، ابھی بریلی سے روانگی عمل میں نہیں آئی تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ شروع ہوئی، مفتی صاحبؒ آگرہ نہ جا سکے۔

انقلابِ ۱۸۵۷ء : نواب خان بہادر خان نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خان نے روہیل کھنڈ میں علم جہاد بلند کیا، تو مفتی عنایت احمد صاحبؒ بھی اس میں شریک ہوئے، بریلی اور رامپور آپؒ کی سرگرمیوں کی آماج گاہ رہے، جب تحریک آزادی ناکام ہوئی اور انگریزوں کا ملک پر دوبارہ تسلط ہو گیا تو مفتی عنایت احمد صاحبؒ گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا اور عبورِ دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی۔

آپؒ کا سیاسی وعلمی کارنامہ: آپؒ نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں زبردست حصہ لیا، تحریکِ آزادی کے خاطر جیل کی صعوبتوں کو برداشت کیا، آپؒ پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا، کالے پانی کی سزا ہوئی، جزیرۂ انڈمان بھیج دیا گیا، صرف کی مشہور کتاب ''علم الصیغہ'' جو مدارس میں داخل نصاب ہے وہیں جزیرۂ انڈمان میں تصنیف فرمائی، ایک انگریز کی فرمائش پر ''تقویم البلدان'' کا ترجمہ کیا، جو دو سال میں ختم ہوا، اور یہی رہائی کا سبب بنا۔

۱۲۷۷ھ میں رہائی پا کر آپؒ کاکوری آئے، مولوی لطف اللہ صاحب علی گڈھی نے تاریخ رہائی لکھی اور خود کاکوری حاضر ہو کر پیش کی:

چوں بفضل خالق ارض و سما — استاذم شد ز قید غم رہا
بہر تاریخ خلاصِ آں جناب — بر نوشتم: ''إن أستاذی نجا''

۱۲۷۷ھ

قیامِ کانپور: انڈمان سے واپس آکر مفتی صاحبؒ نے مستقل قیام کانپور میں رکھا، مدرسہ فیض عام قائم کیا، جو کہ کانپور کی مشہور دینی درسگاہ ہے، کانپور کے مسلمان تاجر مدرسہ کے مصارف برداشت کرتے تھے، ان میں حافظ برخوردار خاص طور سے مشہور تھے، مفتی صاحبؒ اپنے مصارف کے لیے صرف پچیس تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ لیتے تھے، بقول مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی رحمۃ اللہ علیہ اسی مدرسہ کا فیض بالآخر ندوۃ العلماء کی شکل میں ظاہر ہوا۔

تبحرِ علمی: مفتی عنایت احمد صاحبؒ کا علم وفضل مسلم ہے، آپؒ کی تصنیفات اس پر دال ہیں، منقول ومعقول ہر دو علم میں تبحر حاصل تھا، تمام علوم پوری قوت

سے پڑھاتے تھے، ریاضی میں خاص امتیاز حاصل تھا، ادب کا ذوق تھا، جب مفتی صاحبؒ کانپور میں مقیم تھے تو روزانہ شام کو میدان میں ہواخوری کے لیے تشریف لے جاتے تھے، مولوی سید حسین شاہ بخاریؒ سے اکثر علمی وادبی ذکر ہو جاتے تھے، مفتی صاحبؒ کو اُردو اساتذہ کا اکثر کلام یاد تھا۔

تصانیف: مفتی عنایت احمد صاحبؒ کی تصانیف بھی بہت ہیں، جو آپؒ کے علم وفضل پر دال ہیں، خاص بات یہ ہے کہ آج تک کسی نے مفتی صاحبؒ کی کتابوں پر اعتراض نہیں کیا، اور مفتی صاحبؒ نے اُردو میں جو رسالے لکھے ہیں ان کی زبان نہایت صاف اور بامحاورہ ہے، مضامین اخلاقی اور اصلاحی ہیں، ایک مختصر سا فنڈ جمع کرلیا تھا، اس کی مدد سے مفتی صاحبؒ کی یہ تصانیف طبع ہوکر تقسیم وشائع ہوتی تھیں، چند مشہور کتابوں کے نام درج کیے جاتے ہیں:

علم الفرائض، ملخصات الحساب، الکلام المبین فی آیات رحمۃ للعالمین، ضمان الفردوس، بیانِ قدرِ شب براءت، رسالہ در مذمتِ میلہ ہا، فضائل علم وعلماءِ دین، فضائل درود وسلام، ہدایات الاضاحی، تواریخ حبیب اللہ، علم الصیغہ، ترجمہ تقویم البلدان، نقشہ مواقع النجوم، لوامع العلوم اور اسرار العلوم جیسی اہم کتابیں مشہور ہیں۔

وفات: رہائی کے دو سال بعد آپؒ نے حج کا ارادہ فرمایا، امیر الحجاج کی حیثیت سے جارہے تھے کہ جدّہ کے قریب جہاز پہاڑ سے ٹکرا کر ڈوب گیا، آپؒ بحالتِ نماز احرام باندھے ہوئے ۷/شوال/ ۱۲۷۸ھ مطابق: ۱۸۶۲ء کو غریق وشہید ہوگئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اس سفینۂ علم کے ساتھ ایک نادر تصنیف کا مسوّدہ بھی غرقِ آب ہوا جس کی تلافی ناممکن ہے، مفتی عنایت احمد صاحبؒ نے چالیس فن کے ایک ایک مسئلہ کا انتخاب کیا تھا اور ہر ایک مسئلہ پر چالیس ورق لکھنے کا التزام اس صفت کے ساتھ تھا کہ مسئلہ بھی بے نقطہ ہو اور اس پر پوری بحث بھی شگفتہ عبارت میں اسی التزام کے ساتھ کی جائے، تفسیر میں "**وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا**" کی آیت اور حدیث میں "**کل مسکر حرام**" (**رواہ مسلم**) منتخب فرمائی تھی، بڑا حصہ مکمل ہو چکا تھا۔ ("علماءِ ہند کا شاندار ماضی": ۴ / ۴۳۴، "تحریک آزادی اور مسلمان" / صفحہ: ۷۲)

حضرت مولانا صاحب علی گھوسویؒ متوفی ۱۲۸۱ھ

نام ونسب وولادت: مولانا صاحب علی خان بہادر بن دولت علی بن عبداللہ بن احمد بن لعل محمد بن ابراہیم بن شیخ بوڈھن بن ملک جلال بن ملک کمال صدیقی گھوسوی اس دیار کے علماء کبار میں سے تھے، علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت میں آپ نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

آپ کے مورث اعلیٰ ملک محمد کمال نے شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں کٹرہ مانک پور سے ترک سکونت کر کے قصبہ گھوسی کو اپنا موطن ومسکن بنایا، یہیں ۱۲۰۹ھ میں مولانا صاحب علیؒ کی ولادت ہوئی۔

تعلیم: سن شعور کو پہنچے تو تحصیل علم کی غرض سے جونپور کا سفر کیا، جونپور اس زمانے میں علوم دینیہ کا اہم ترین مرکز تھا اور ارباب علم کی ایک کثیر تعداد یہاں قیام پذیر تھی، مولانا صاحب علی صاحبؒ نے یہاں کے مشاہیر علماء وفضلاء سے اکتساب فیض کیا، جن میں الشیخ مولانا سخاوت علی العمری الجونپوری متوفی ۱۲۷۴ھ اور ہادیٔ بنگال الشیخ مولانا کرامت علی جونپوری متوفی ۱۲۹۰ھ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، پھر یہاں سے کلکتہ تشریف لے گئے اور مولانا مفتی محمد مراد تلمیذ رشید حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے فقہ حنفی کی مشہور ترین کتاب ہدایہ کی تحصیل کی، مولانا صاحب علی صاحبؒ کے اساتذہ میں شیخ علی کبیرؒ کا ذکر بھی تذکرہ کی کتابوں میں ملتا ہے۔

آپ کی خدمات: تحصیل وتکمیل کے بعد کلکتہ میں رئیس المفتیین کے عہدہ

پر مولانا کا تقرر ہو گیا پھر اس عہدہ سے ترقی کر کے ۱۲۴۲ھ میں حکومت برطانویہ کے گورنر جنرل ہند کے میر منشی منتخب ہوئے، اس دور میں میر منشی کا عہدہ بڑا ہی اہم تھا، چنانچہ اس عہدہ پر فائز ہو جانے کے بعد مولانا کی شہرت و مقبولیت میں چار چاند لگ گئے اور انگریزی حکومت میں آپ کا بڑا اثر ورسوخ پیدا ہو گیا، امراء اور حکام سلطنت آپ کے علم وفضل کے بڑے معترف تھے اور آپ کے ساتھ نہایت تعظیم وتوقیر کا معاملہ کرتے تھے، آپ کی علمی صلاحیت اور حسن کارکردگی کے اعتراف میں حکومت برطانیہ نے خان بہادر کا لقب دیا تھا اور خلعت فاخرہ سے بھی ممتاز کیا، اس وقت کابل بھی حکومت برطانیہ ہی کے زیر نگیں تھا جس کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری گورنر ہند ہی سے متعلق ہوتی تھی، چنانچہ ۱۲۵۲ھ میں گورنر ہند کابل گیا تو مولانا صاحب علی کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا، مولانا نے وہاں دو سال قیام کیا اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے ساتھ وہاں کے علماء وفضلاء سے علمی استفادہ بھی کرتے رہے۔

مولانا صاحب علی صاحب ؒ خالص علمی آدمی تھے، مطالعۂ کتب اور علماء کی مجلسوں میں نشست وبرخاست اور ان سے علوم وفنون میں مباحثہ ومذاکرہ مولانا کی اصل فطرت تھی جس کے لئے ملازمت کی ہنگامہ خیز زندگی میں کوئی جگہ نہیں تھی، ساتھ ہی حکومت کی پالیسیوں سے بھی مولانا کو بالکل اتفاق نہیں تھا، انگریزوں کی اسلام دشمنی کی وجہ سے مولانا کو برطانیہ حکومت سے انتہائی تنفر ہو گیا، اس لئے ۱۲۵۵ھ میں کابل سے رخصت لے کر گھر چلے آئے اور یہاں سے اسی سال حج وزیارت کی غرض سے حرمین شریفین چلے گئے اور حج سے واپسی

کے بعد ملازمت سے بالکلیہ الگ ہو گئے۔

مدرسہ کی بنیاد: اب مولانا کو اپنے ذوق علمی کے تقاضوں کی تکمیل کا موقع میسر ہوا اس سلسلے میں آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے آبائی وطن قصبہ گھوسی میں ۱۲۵۱ھ میں ایک دینی درسگاہ کی بنیاد رکھی [۱] اور اس کے پہلو میں ایک عالی شان جامع مسجد بھی تعمیر کی، ساتھ ہی ایک کتب خانہ بھی قائم کیا جس میں تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور لغت کی ہزاروں کتابیں تھیں، آگے چل کر مولانا صاحب علی کے ابناء واحفاد نے ان کی قائم کردہ درسگاہ کو بڑی ترقی دی اور اس کے تعلیمی معیار کو بلند کیا جس کے لئے ضلع کے مشاہیر اساتذہ کی خدمات حاصل کیں؛ لیکن تقسیم ہندو پاک کے بعد جب حکومت نے زمیندارانہ نظام کو ختم کردیا تو دیگر نجی مدارس کی طرح یہ مدرسہ بھی انقلاب کی نذر ہو گیا اور اس کی ساری علمی چہل پہل ختم ہوگئی، تاہم مدرسہ اب بھی جاری ہے اور اپنی بساط کے مطابق علوم دینیہ کی خدمات انجام دے رہا ہے۔

مولانا صاحب علی صاحبؒ حرمین شریفین کی زیارت اور وہاں کے ایمان افروز مناظر سے دیدہ ودل کو شاد کام کر آئے تھے، مگر روح کی تشنگی تاہنوز باقی تھی اس لئے ۱۲۷۵ھ میں دوبارہ اس پاک دیار میں حاضر ہوئے اور اس بار مسلسل دو برس تک مقیم رہ کر حرمین شریفین کی برکتوں سے خوب خوب استفادہ کیا۔

بیعت وخلافت: حرمین شریفین کے قیام کے دوران حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنیؒ سے بیعت کی، چنانچہ اپنے روزنامچہ میں ۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۵ھ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

۱؎ جب کہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ۱۲۸۳ھ میں رکھی گئی۔ مرتب

امروز قریب باب النساء درحرم شریف مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام از جناب مولانا مرشدنا مولوی عبدالغنی عرف حاجی میاں برادر کو چک حضرت شاہ ابوسعید صاحب زیدت فیوضہم وبرکاتہم مشرف بیعت بخاندان قادریہ شدم وارشاد شد کہ ذکر وشغل درخاندان مابرطریقۂ نقشبندیہ می نمود۔ الخ

بیعت کے ساتھ حضرت شاہ صاحبؒ سے حدیث پاک کی اجازت وسند بھی حاصل کی، اسی مدت قیام میں حضرت شاہ صاحب نے مولانا صاحب علی کو اپنی خلافت واجازت سے سرفراز فرمایا اور ہندوستان کی جانب مراجعت کا حکم دیا۔ چنانچہ اپنے شیخ ومرشد کے حکم سے ۱۲۷۷ھ میں وطن تشریف لائے اور علوم دینیہ کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔

وفات: تاآنکہ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۲۸۱ھ میں محبوب حقیقی کا پیغام آ گیا اور آپ نے مسکراتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، مولانا اس وقت اپنی چھاؤنی واقع حیدر گنج ضلع غازی پور میں تھے، وفات کے بعد جنازہ گھوسی لایا گیا جہاں اس علم وعمل کے شیدائی کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ نور اللہ مرقدہ (تذکرہ علماء اعظم گڈھ: ۱۶۷)

ف: ماشاء اللہ ہمارے دیار کے حضرت مولانا صاحب علی صاحبؒ کے کیا ہی علمی وعملی کمالات تھے جس کو معلوم کر کے فرح ہی نہیں بلکی ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

مزید خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ کی ولادت قصبہ گھوسی میں ہوئی جہاں سے دو تین کیلومیٹر کے فاصلہ پر بجانب جنوب قریۂ صغیرہ ’’کاری ساتھ‘‘ ہے جہاں اس حقیر کی پیدائش ہوئی ہے، والد ماجد کا اسم گرامی سلطان احمد متوفی ۱۴۱۹ھ ہے۔

اور احقر کی ابتدائی تعلیم مکتب کے بعد مڈل کلاس تک قصبہ گھوسی کے اسکول میں ہوئی۔ عموماً اسکول جانے میں حضرت مولانا صاحب علی کے مکان اور ان کے قائم کردہ مدرسہ ''ناصر العلوم'' سے گذر ہوتا تھا تو کبھی کبھی مدرسہ میں حضرت مولانا سید عبدالمجید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کی زیارت کا شرف حاصل کرتا تھا۔ فللہ الحمد والمنہ

اور خوشی کی بات یہ ہے کہ کاری ساتھ میں لب روڈ ہماری کئی ایکڑ زمین ہے جس میں کاشت ہوتی ہے جو ہم لوگوں کو وراثت میں ملی ہے۔ جس میں ہم نے والد صاحب کے نام پر ایک خوشنما مسجد ''مسجد سلطان'' کے نام سے بنوائی ہے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس مسجد کو ذکر وتلاوت اور نمازوں سے آباد رکھے اور کھیتوں کو غلہ، پھلوں اور پھولوں سے شاداب رکھے۔ آمین یارب العالمین

سعادت: ہماری سعادت ہے کہ ہمارے قریہ صغیرہ سے چند کیلومیٹر کے فاصلہ پر جانب جنوب میں قریہ کبیرہ ''فتح پور تال نرجا'' واقع ہے جہاں حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی ولادت ہوئی، وہاں حضرت مصلح الامتؒ کا مکان، مسجد، مدرسہ اور خانقاہ موجود ہے۔ مگر افسوس کہ ۷/رمضان ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۵ء میں سیاسی فساد کی بناء پر حضرت مصلح الامتؒ وہاں سے اخیر رمضان کو گورکھپور پھر ۱۹۵۷ء میں بغرض علاج الہ آباد آ گئے۔ اور یہاں ہی مقیم ہو گئے، مگر شعبان ۱۳۸۷ھ اثنائے سفر حج میں رحلت فرما گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ، اور سمندر ہی میں مدفون ہوئے۔ نوراللہ مرقدہ۔ اور ابھی آپ کے متعلقین یہاں ہی قیام پذیر ہیں۔ فللہ الحمد والمنہ

الحمدللہ حضرت مولانا صاحب علی صاحبؒ کے خاندان کا ہمارے خاندان سے قدیمی تعلق تھا۔ چنانچہ ہمارے جدامجد محمد نذیر خاںؒ اکثر اس خاندان کے لوگوں کے حسن اخلاق کی تعریف کرتے تھے۔اوراب حضرت مولانا صاحب علی صاحبؒ کے پرپوتے عزیزم مولانا عمار احمد سلمہ ہیں (جن کا سلسلۂ نسب یوں ہے۔مولانا عمار احمد ابن مولانا عبدالغفار صاحب ابن مولانا محمد نصیر صاحب ابن مولانا صاحب علی صاحبؒ۔) جو حضرت مصلح الامتؒ کے خاص تلمیذ ومسترشد ہیں۔ الحمدللہ ان سے بچپن سے لے کر اب تک تعلق استوار ہے۔ ان کے دو بڑے بھائی مکرم مولانا وقار احمد صاحب اور مولوی اظہار احمد صاحبؒ (جو وفات پاچکے ہیں) ان سے بھی خاص محبت کا تعلق تھا۔

محمد قمرالزمان الہ آبادی

دارالمعارف الاسلامیہ کریلی الہ آباد

۲۲؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ

حضرت مولانا شاہ مظفر حسین کاندھلویؒ متوفی ۱۲۸۲ھ

نام ونسب: نام مظفر حسین، والد کا نام مولانا محمود بخش کاندھلوی، آپؒ کے چچا مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ اور دادا حضرت شیخ الاسلام محمد کاندھلویؒ ہیں۔

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۲۲۰ھ مطابق: ۱۸۰۵ء کو کاندھلہ میں ہوئی۔

ظاہری و باطنی تعلیم وتربیت: تعلیم اپنے فاضل چچا مفتی الٰہی بخشؒ سے حاصل کی، علوم کی تکمیل نہ کر سکے تھے کہ مفتی صاحبؒ کا انتقال ہو گیا، تو بقیہ ظاہری و باطنی تعلیم شاہ محمد اسحق دہلویؒ نواسۂ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے حاصل کی، حضرت شاہ محمد یعقوب صاحبؒ سے بیعت ہوئے اور ان ہی کے مجاز ہوئے، زہد وتقویٰ اور سادگی، دنیا اور اربابِ دنیا سے نفرت اپنے والد صاحبؒ سے ورثہ میں پائی، آپؒ کا خاص جوہر احتیاط اور زہد وتقویٰ تھا، یہ بات مشہور اور مسلم تھی کہ آپؒ کے معدہ نے کبھی کوئی مشتبہ چیز قبول نہیں کی، تواضع اور استقامت نماز کے واقعات ابھی تک زبان زدِ عوام وخواص ہیں، رمضان المبارک میں تمام شب عبادت میں گزار دیتے اور ایک لمحہ نہ سوتے تھے، یادِ آخرت سے ہر وقت آنسو بہتے رہتے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ ''شاہ محمد اسحق صاحبؒ کے شاگردوں میں تین شخص نہایت متقی تھے: اوّل درجہ کے مولوی مظفر حسین صاحب، دوسرے درجہ کے شاہ عبدالغنی صاحب اور تیسرے درجہ کے نواب قطب الدین خان صاحب۔''

تواضع وسادگی کا واقعہ: شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ فرماتے تھے کہ مولانا مظفر حسین صاحب کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستہ میں ایک بوڑھا ملا، جو بوجھ لیے جا رہا تھا، بوجھ کسی قدر زیادہ تھا، اس وجہ سے اسے مشکل سے لے کر چلتا تھا، مولانا مظفر حسین صاحبؒ نے جب یہ حال دیکھا تو آپؒ نے اس سے وہ بوجھ لے لیا اور جہاں وہ لے جانا چاہتا تھا وہاں پہنچا دیا، اس بوڑھے نے ان سے پوچھا: ''اجی! تم کہاں رہتے ہو؟'' آپؒ نے جواب دیا: ''کاندھلہ میں رہتا ہوں'' اس نے کہا: ''وہاں مولوی مظفر حسین بڑے ولی ہیں'' اور آپؒ کی بڑی تعریف کی، مولانا مظفر حسین صاحبؒ نے فرمایا: ''اور تو اس میں کوئی بات نہیں، البتہ نماز ضرور پڑھ لیتا ہے''، اس نے کہا: ''واہ میاں! تم اس بزرگ کو ایسا کہتے ہو؟'' مولاناؒ نے فرمایا: ''میں ٹھیک کہتا ہوں'' اس پر وہ بوڑھا مولاناؒ کے سر ہو گیا، اتنے میں ایک اور شخص آ گیا، جو مولاناؒ کو جانتا تھا، اس نے اس بوڑھے سے کہا: ''بھلے مانس! مولوی مظفر حسین صاحب یہی تو ہیں'' اس پر وہ بوڑھا مولاناؒ سے لپٹ کر رونے لگا، مولاناؒ بھی اس کے ساتھ رونے لگے۔ اس پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یہ شعر پڑھا: ؎

طریقت بجز خدمت خلق نیست   بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

ترجمہ: طریقت بجز خدمت خلق نہیں ہے، تسبیح، مصلّی اور گدڑی سے کچھ نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کے علاوہ مولاناؒ کے زہد وتقویٰ اور احتیاط وسادگی کے سیکڑوں واقعات ہیں جن کے اِحاطے کے لیے دفتر درکار ہیں۔

سفرِ حج: مولاناؒ کی صحبت اِتنی پرتاثیر تھی کہ جو ان کی صحبت میں بیٹھا اس کی کبھی تہجد کی نماز فوت نہیں ہوئی، آپؒ نے چھ حج پیدل کیے، آخری حج کے لیے ۱۲۸۱ھ میں روانہ ہونے سے پہلے خاندان کی مستورات کو جمع کیا اور نصیحتیں کیں، مکہ مکرمہ پہنچتے پہنچتے بیمار ہوگئے، پھر صحت ہوئی اور مدینہ منورہ روانہ ہوگئے، مدینہ کے قریب پھر علیل ہوگئے اور وفات پائی۔ رحمہ اللہ۔

آپ کا اصلاحی کارنامہ: آپؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپؒ نے سنت مطہرہ کی حمایت اور بدعت کی تردید کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی، عقد بیوگان جو اس زمانہ میں بہت ہی معیوب سمجھا جاتا تھا آپؒ نے اس ہندوانہ رسم کی شدید مخالفت کی اور بہت سی بیوہ عورتوں کے نکاحِ ثانی کا اہتمام کیا۔

وفات: آپؒ نے سات حج پیدل کیے، مدینہ منوّرہ میں ۱۰/محرم الحرام ۱۲۸۲ھ مطابق: ۲۵/مئی/۱۸۶۶ء یومِ جمعہ کو انتقال فرمایا، جنت البقیع میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر کے قریب مدفون ہیں۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔

(سوانح مولانا محمد یوسف صاحبؒ: ۵۰)

حضرت مولانا عبدالرحمن شاہ جہاں پوریؒ متوفی ۱۲۸۴ھ

تعارف : آپؒ شاہ جہاں پور کے باشندے تھے، بہت سے بزرگوں کے پاس پہنچے، مگر مقصود حاصل نہ ہوا، آخر بخدمت شاہ غلام علی دہلویؒ حاضر ہوئے، یہاں سلوک طے کر کے خلعت خلافت پائی، اہل دنیا سے بالکل انقطاع رکھتے تھے، ان کی طرف کوئی التفات نہ کرتے تھے، نواب فرخ آباد آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؒ نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ان حضراتِ عشاق کا تو یہ حال ہوتا ہے ؎

بہ چہ مشغول کنم دیدۂ دِل را کہ مدام دل ترا می دید و ترا می جوید

ترجمہ: کس امر میں اپنے آپ کو مشغول کروں، جب کہ دِل تم کو طلب کرتا ہے اور آنکھیں تمہیں دیکھنے کو ترستی ہیں۔(مرتب)۔

ان کے بہت سے خلفاء نسبت قوی اور کشف صحیح رکھتے ہیں، ضلع فرخ آباد اور شاہ جہاں پور میں ان کا سلسلہ خوب پھیلا ہوا ہے، صاحب مرآۃ الانساب مولانا شاہ ضیاء الدین صاحب نقشبندی مجددی امروہیؒ نے اپنے رسالہ ''دعوۃ الحق'' میں حضرت مولانا شاہ جہاں پوریؒ کے حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں، ان میں سے کچھ اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

فضل وکمال: آپؒ کا ذکر خیر تحریر میں نہیں آیا، کیوں کہ آپؒ نے اپنے زمانے میں اس کے اظہار کو اچھا نہیں سمجھا، اگرچہ مختصراً دیگر بزرگانِ سلسلہ نے

بعض تواریخ میں اور حضرت زبدۃ الکاملین شاہ محمد مظہر صاحب مجددیؒ نے مقاماتِ سعیدیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ آپؒ اپنے وطن میں طالبین کے مرجع و مآب تھے، فقیر نے آپؒ کی زیارت کی، نہایت متشرع اور با اخلاق بزرگ ہیں، اہل دنیا سے بچتے اور ہمیشہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے ہیں، نہایت عالی ظرف بڑے صاحب برکت ہیں، آپؒ نے شاہ محمد مظہر صاحبؒ سے اثناءِ گفتگو میں فرمایا تھا کہ حضرت شاہ صاحب (شاہ غلام علی صاحب) قدس سرہ العزیز سے جس قدر اشغال واذکار مجھے حاصل ہوئے ہیں میں نے ابھی تک نہیں چھوڑے اور ان شاء اللہ تعالیٰ آخر دم تک نہیں چھوڑوں گا، مثل مبتدی کے آپؒ پابندی فرماتے تھے۔

ف: یقینا ع......''تا دمِ آخر دمے فارغ مباش'' ......پر عمل ہونا چاہیے، یعنی آخری سانس تک اپنے اَوراد و وظائف پر پابند رہنا چاہیے، غفلت نہ برتنا چاہیے۔ مرتب۔

وطن اصلی آپؒ کا شاہ جہاں پور تھا، آپؒ یہاں کے اکابر اور ذی اقتدار حضرات میں سے تھے، بعد تحصیل علومِ ظاہری آپؒ کو حصولِ باطن کا شوق ہوا اور اس جذبۂ طلب میں آپؒ نے جا بجا سفر کیا، مطلوبِ حقیقی کی تلاش میں عرصہ تک بے قرار رہے، اپنے زمانے کے اکثر بزرگوں سے ملے، بے چین دل کو کہیں تسکین نہ ہوئی، آپؒ شب و روز اس فکر میں پریشان رہتے کہ کوئی رہبر کامل ایسا ملے جو تشنہ کامِ محبت کو ساحل مراد پر پہنچائے، غرض کہ رحمت الٰہی کی کشش ہوئی اور دردِ اشتیاق حد کو پہنچا۔ ؎

زحد گذشت بہ عشق تو بے قراریٔ ما　　　اُمید ہست کہ رحم آوری بہ زاریٔ ما

ترجمہ: میری بے قراری تیرے عشق میں حد سے گزر گئی، اُمید ہے کہ آپ میری آہ وزاری پر رحم فرمائیں گے۔

ف: یقیناً طالب صادق طلب و بے قراری سے بارگاہِ الٰہی میں یوں عرض گذار ہوتا ہے:

اتنا پیغام درد کا کہنا صبا کوئے یار سے
کون سی رات آپ آئیں گے دِن بہت انتظار میں گزرے

(مرتب)

دہلی آمد: جب آپؒ دہلی پہنچے تو حضرت شاہ صاحبؒ حسب معمول مسجد میں نماز کے لیے تشریف لائے، دیکھا کہ مسجد میں ایک مسافر وارد ہے، آپؒ نے اپنے پاس بلایا، اُس وقت آپؒ مولی کھا رہے تھے، اس کا پس ماندہ نیچے کا حصہ از راہِ شفقت مولانا شاہ جہاں پوریؒ کو عطا فرمایا، آپؒ نے اس وقت عرض کیا کہ فقیر جس چیز کا بھوکا ہے اس سے سیری چاہتا ہے، فی البدیہہ حضرت شاہ صاحبؒ نے غالباً کشف کی بنیاد پر فرمایا کہ چند روز یہاں رہو، اگر فائدہ نہ ہو تو جیسے اور جگہ سے چلے آئے ہو یہاں سے بھی چلے جانا، اس کے بعد آپؒ نے قبل بیعت کچھ تصرف فرمایا، اُسی وقت مولانا کے لطائف جاری ہو گئے، آپؒ کے دل میں جو تردّدات تھے ان کا جواب از روئے کشف آپؒ کو مل چکا تھا، بیعت کا اشتیاق بڑھا، آپؒ نے عرض کیا: مجھ کو بیعت فرما لیا جائے، اس وقت شاہ صاحبؒ نے اپنے پاس سے از راہِ شفقت خادم کو پانچ روپے مٹھائی منگانے کے لیے دیے، حالاں کہ مولانا صاحبؒ نے بہت اصرار کیا کہ ہم یہ خدمت انجام دیں، لیکن یہ

جواب ملا کہ کچھ حرج نہیں، پیر کا مال مرید کا مال ہے، ایک دوسرے کے مال میں کچھ فرق نہیں۔

ف: بے شک، ایسا ہی سمجھنا اور ہوجانا ہے، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے، آمین۔ (مرتب)

خلافت: حضرت مولاناؒ پر آپؒ بے حد شفقت فرماتے تھے، چھ سال خدمت اقدس میں رہے، سلوکِ مجددیہ کے اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم فرما کر آپؒ نے ان کو خلافت سے ممتاز فرمایا، جس وقت آپؒ شاہ جہاں پور آنے کی غرض سے دہلی سے روانہ ہوئے ہیں تو حضرت شاہ صاحبؒ رُخصت کرنے کی غرض سے کچھ دور ساتھ ساتھ روانہ ہوئے، خود مولانا صاحب قبلہؒ کا ارشاد ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے لیے دو دعائیں کی ہیں اور تم کو خوش خبری سناتا ہوں کہ وہ قبول بھی ہوگئیں، چنانچہ ایک دعا یہ ہے کہ پروردگارِ عالم آپ کے نواح میں آپ کے ذریعہ سے طریقۂ نقشبندیہ کی اشاعت فرمائے، دوسرے آپ کا امتحان کم ہو۔ آپؒ کے اوراد واذ کار کی پابندی کا یہ حال تھا کہ آخر وقت تک آپؒ کے کسی معمول میں ذرا فرق نہیں آیا۔

تسبیح کا اہتمام: وصال کے وقت یہ کیفیت پیش آئی کہ تسبیح مبارک ہاتھ سے جس وقت چھوڑی ہے تو مولوی غلام بسم اللہ صاحب بریلویؒ نے اس کو اُٹھا کر دیکھا، شمار کیے دانے اپنی پوری تعداد پر تھے، مولوی صاحبؒ نے یہ اس وجہ سے دیکھا کہ آپؒ اپنے خدام سے بر سبیل تذکرہ یہ بات فرمایا کرتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ مرض الموت میں ذکر کے اندر کمی ہو جائے، اور بارہا فرماتے تھے کہ ’’پروردگارِ عالم! یہ تیرے ہی اختیار میں ہے‘‘۔ مولوی صاحبؒ پر آپؒ کی

قبولیت دعا کا حال اس وقت کھل گیا۔

آپ اپنے پیرانِ کبار کے طریقے پر استقامت کا بڑا خیال رکھتے تھے، ایک شخص نے آپؒ سے عرض کیا کہ حضور! آپ کا تو سلطان الاذکار جاری ہے، کثرتِ ذکر وفکر سے آپ سراپا ذکر ہو گئے ہیں، پھر تسبیح کی آپ کو کیا ضرورت ہے؟ آپؒ نے فرمایا: ''بھائی! اوّل تو سمجھنے کی بات ہے کہ جو رفیق ہم کو مقصود تک پہنچائے اس کا چھوڑنا تو عقلمندی کا کام نہیں ہے، جیسا کہ اس تسبیح کی بدولت بقول تمہارے ہم کو یہ حالت نصیب ہوئی، تو اب اس کو چھوڑا جائے یا آخر تک اس کا پیچھا نہ چھوڑنا چاہیے؟''

ف: ایک اسی طرح کا واقعہ حضرت مصلح الامت شاہ وصی اللہ صاحبؒ سنایا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جناب میں حاضر ہونے جا رہے تھے، راستہ میں ایک شخص رو رہا تھا، تو دریافت فرمایا کہ کیوں رو رہے ہو؟ تو اس نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے رو رہا ہوں، ہمارے لیے آپ اللہ تعالیٰ سے سفارش فرمادیں کہ ہمیں عذاب سے نجات دے دے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ رب العزت سے اس کی شفاعت فرمائی، اللہ تعالیٰ نے اُسے معاف فرمادیا، آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بشارت سنادی، آپ سمجھے کہ اب اس کا رونا بند ہو گیا ہوگا، پھر جب دوبارہ تشریف لے گئے تب بھی اس کو دیکھا کہ وہ رو رہا ہے، تو فرمایا کہ ''اب کیوں رو رہے ہو؟ تم کو تو عذاب سے نجات دے دی گئی ہے،'' تو اس نے کیا ہی معرفت کی بات کہی کہ ''واہ! جس کی وجہ سے مجھے عذابِ جہنم سے رہائی ملی اُسی کو چھوڑ دوں؟'' (مرتب)

اہم وصیت: اتباعِ شریعت کا یہ حال تھا کہ آخر وقت میں سب سے پہلے مولوی غلام بسم اللہ صاحبؒ کو آپؒ نے یہ وصیت فرمائی کہ تم خود بھی یہ سمجھ لو اور دیگر احبابِ طریقہ کو بھی اس سے آگاہ کر دینا کہ کوئی فعل میرا اگر سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خلاف دیکھا ہو تو اس کی ہرگز پیروی نہ کرنا، غایت مافی الباب (زیادہ سے زیادہ یہ کرنا کہ) اپنے حسن اخلاق سے میری کسی معذوری پر محمول کرنا، ورنہ عاقبت میں میری گرفت کا باعث ہوگا، خشیت الٰہی کا ہر وقت آپؒ پر غلبہ رہتا تھا اور اتباعِ سنت کا آپؒ کو غایت درجہ اہتمام تھا۔

آپؒ حضرت شاہ غلام علیؒ کے آخری خلیفہ تھے، کل خلفاء آپؒ کے اُنیس (۱۹) ہوئے، جن میں سے مولانا شاہ غلام بسم اللہ صاحب بریلویؒ اور حضرت والدی و مرشدی شاہ بہاء الدین امروہیؒ دونوں حضرات کی ایک جلسہ میں دستار بندی ہوئی اور حضرت والدی بھی اعلیٰ حضرت کے آخری خلیفہ تھے، بحمد اللہ یہ فقیر بھی اپنے والد و مرشد کا آخری خدمت گزار ہے، اگرچہ اس قابل نہیں ہے۔ **فللّٰہ الحمد۔**

وفات: علی ہذا التسلسل ۱۲۸۴ھ میں آپؒ کا وصال ہوا۔ آپؒ کی تاریخ وصال یہ ہے:

شد واصل حق حضرت عبدالرحمن　　محبوبِ رسولِ پاک و مقبولِ صمد
ہاں صوری و معنوی بگفتم تاریخ　　ہشتاد و چہار و یک ہزار و دو صد

(قافلۂ اہل دل/صفحہ:۲۴۸)

حضرت حاجی دوست محمد قندھاریؒ افغانستان متوفی ۱۲۸۴ھ

نام وولادت: حاجی دوست محمد قندھاری پورا نام ہے، قندھار کے قریب ہی ایک بستی میں ۱۲۱۶ھ میں ولادت ہوئی، اپنے ہی وطن میں علوم کی تحصیل فرمائی، کابل شہر میں بھی علماءِ کابل کی خدمت میں رہ کر دینی تعلیم سے فیض یاب ہوئے، تحصیل علم کا شوق بچپن ہی سے تھا، ہوش سنبھالتے ہی اس میں لگ گئے، اولاً قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی، پھر دینی تعلیم کا آغاز کیا، عربی و فارسی میں علوم کے منازل طے کیے، کابل میں قیام رہا، جہاں کی شہری زبان فارسی ہے، اس لیے فارسی میں مہارت حاصل ہوئی، آپؒ کے مکاتیب فارسی زبان ہی میں ہیں۔

اوصافِ حسنہ: علومِ ظاہری و باطنی میں اعلیٰ دسترس رکھنے والے، معرفت وعرفان کے جذبہ سے سرشار، متواضع المزاج، انوارِ الٰہیہ کے جامع، بحارِ معرفت کے منبع اور خانقاہِ موسیٰ زئی قائم کر کے لوگوں کو چراغِ معرفت سے منور کرنے والے صاحب کرامات حاجی دوست محمد صاحب قندھاریؒ جن کے دریائے عشق سے دور دور کے تشنگان آ کر پیاس بجھاتے اور اب بھی لوگ اس دریا سے سیراب ہو رہے ہیں۔

جذبۂ علومِ ظاہری و باطنی: علومِ ظاہری کی تحصیل کے دوران ہی علومِ باطنی سے آپؒ کو رغبت پیدا ہوئی، خود فرماتے ہیں کہ ”ابتداءِ عمر ہی سے فقیر کو اہل اللہ اور عارفانِ حق سے ایک خاص قسم کا اُنس رہا ہے، اگرچہ شروع میں

ظاہری علوم کی مشغولی فقراء کے زمرہ میں شامل ہونے سے مانع تھی، لیکن پھر بھی جب کسی بزرگ اور عارف باللہ کا علم ہوتا تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے حق میں دعا کی درخواست کیا کرتا تھا۔'' تو پھر کیوں نہ آپؒ کا فیض روحانی اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں جاری ہوتا۔

ف: مگر افسوس آج کل کے علماء سے طلب بھی مفقود ہے؛ بلکہ عجب نہیں کہ عارفانِ حق کے فیض اور علومِ باطنی کے منکر ہوں، جس کی وجہ سے ان کی وقعت خشک ملّا کی حیثیت سے زیادہ نہیں، جس سے شیخ عبدالحق محدثِ دہلویؒ کے والد ماجدؒ نے ان کو منع کیا، چنانچہ فرمایا: ''بابا! عالم خشک نباشی''۔ (مرتب)۔

حق کی تلاش میں: بچپن ہی سے طبیعت عارفانِ حق کی تلاش میں تھی، فرماتے ہیں کہ ''کابل میں قیام کے دوران عجیب وغریب کش مکش سے گزر رہا تھا، ایک طرف میلانِ طبع اہل اللہ کی جانب تھا، اور دوسری طرف تحصیل علم کا شوق پابندِ مدرسہ رکھنا چاہتا تھا، فقیر نے ابھی صرف ونحو کی چند کتابیں اور منطق کے بعض رسالے پڑھے تھے کہ درسی علوم سے طبیعت اُچاٹ ہوگئی، اسی اثنا میں ایک روز رات کے وقت میرے سینہ میں ایسا درد اُٹھا کہ جس کی شدت سے میں بے ہوش ہوگیا، بے ہوشی کی یہ کیفیت - جیسا کہ دیکھنے والوں نے بعد میں بتایا - مسلسل تیرہ دِن تک طاری رہی، پھر خود بہ خود ہوش آ گیا، اس وقت بے ساختہ زبان پر ''اللہ'' اور ''سبحان اللہ'' کا ورد جاری تھا، ذکر گاہے آہستہ اور گاہے بآوازِ بلند جاری رہتا تھا، لبوں پر کبھی نالہ ہائے جاں گداز ہوتے تھے، اور کبھی پر درد آہیں بھرتا تھا، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کیفیت کا باعث کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس

زمانہ میں پشاور کے مضافات میں کسی بزرگ کے بارے میں علم ہوا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کی صحبت سے وہ ذوق وشوق جو ذکر کے جاری ہونے کے باعث مجھے نصیب ہوا تھا یکسر ختم ہوگیا، اور اس کے بجائے باطنی اضطراب و ہیجان پیدا ہوگیا، آخر کار اس بے چینی کے ہاتھوں تنگ آ کر یہ ارادہ کرلیا کہ جس طرح ممکن ہو بغداد شریف جا کر حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے درِ اقدس پر حاضری دوں، تاکہ وہاں اپنے درد کا مداوا حاصل کرسکوں، چنانچہ رختِ سفر باندھا اور بغداد شریف پہنچ کر حضرت کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوا، فاتحہ پڑھی، دعائیں مانگیں، لیکن وہ بے چینی واضطراب باقی رہا، اس کے بعد ہرات اور بصرہ کے بزرگوں کی خدمت میں گیا، مگر وہاں بھی سکون نہ ملا، آخر حضرت شیخ عبداللہ ہرویؒ نے میری زبوں حالی دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ ''حضرت شاہ ابوسعید صاحب دہلویؒ کی خدمت میں دہلی چلے جاؤ، وہاں تمہیں سکون نصیب ہوگا۔'' چنانچہ بمبئی تشریف لے گئے، جس کا تذکرہ آگے مذکور ہے۔

بمبئی میں آمد: قیامِ بصرہ کے بعد فرماتے ہیں کہ وہاں سے براہِ خشکی متعدد شہروں میں گھومتا پھرتا رہا، ہر جگہ ہر شہر کے بزرگوں کی زیارت کی اور ان سے طالب دعا ہوا، آخر کار شہر قلات نصیر خان پہنچا، یہاں اس اضطراب انگیز کیفیت نے پھر جوش مارا، بارگاہِ الٰہی میں طالبِ دعا ہوا، عجز ونیاز کے ساتھ گریہ وزاری کی اور خشوع وخضوع کے ساتھ استخارے کیے، جن کے نتیجہ میں متعدد بشارت آمیز خواب دیکھے، اور اب مصمم ارادہ کرلیا کہ حضرت شاہ ابوسعید دہلویؒ کی خدمت میں باریابی حاصل کی جائے، براہِ بمبئی دہلی کے قصد سے روانہ ہوا، بمبئی

پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب سفرِ حج کی نیت سے یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں اور جہاز کے انتظار میں شہر بمبئی ہی میں قیام پذیر ہیں، یہ خبر سن کر بے حد مسرّت ہوئی، فوراً حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیعت کی درخواست کی، جو حضرت والا نے قبول فرمائی، ایک دن موقع پا کر حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پورا ماجرا از اوّل تا آخر بیان کر ڈالا، جسے سن کر آپؒ نے فرمایا کہ تمہاری باطنی کشائش کے لیے وقت درکار ہے، میں حج پر جا رہا ہوں، اور روح کی تمام لطافتیں سرزمین حجاز کی طرف مرکوز ہیں، لہٰذا اس قلبی اضطراب کی تسکین کے لیے دہلی جا کر میرے فرزند احمد سعید کی صحبت اختیار کرو اور ان سے کسبِ فیض کرتے رہو، یا پھر بمبئی ٹھہر جاؤ اور میری واپسی کا انتظار کرو۔

منازلِ تصوّف وخلافت: حضرت شاہ ابوسعید دہلویؒ کے اس مشورہ کے بعد فرماتے ہیں کہ ”میں نے پہلی شق کو ترجیح دی کہ دہلی جا کر حضرت شاہ احمد سعید صاحب کی خدمت میں رہنا ہی مناسب ہوگا، بمبئی ویسے بھی ایک ایسا شہر تھا جہاں کسی سے میری شناسائی نہ تھی اور موسمِ گرما کی شدت بھی ناقابل برداشت تھی، چنانچہ بمبئی سے دہلی کے لیے روانہ ہوگیا، سفر کے دوران ایک رات خواب دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب قبلہ تشریف فرما ہیں اور مجھ سے مخاطب ہیں: ”شما ماذونِ ما ہستید“ یعنی تم ہمارے مجاز خلیفہ ہو، علی الصبح بیدار ہوا تو دل نے دہلی کی طرف شدید کشش محسوس کی، الغرض دہلی پہنچ گیا، خانقاہِ مظہریہ میں داخل ہوتے ہی شیخ طریقت امامی ومرشدی حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے روئے انور پر نظر پڑی، اور آپ کی زیارت وبرکت سے سابقہ تردد وانتشار لمحہ بھر میں کافور ہوگیا، دل

میں انقلاب آچکا تھا، اب اضطراب راحت میں اور بے قراری سکون میں بدل چکی تھی۔ ؎

''نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں''

فرماتے ہیں کہ حضرت والا کے دستِ مبارک پر تجدید بیعت کی، ایک سال، دو ماہ اور کچھ روز آپ کی خدمت میں رہا، حضرت ممدوح نے اس قلیل مدت میں فقیر کو طریقۂ نقشبندیہ، قادریہ اور چشتیہ کی نسبتوں سے سرفراز فرمایا، اور ہرسہ سلاسل میں خرقۂ خلافت عطا کیا۔

محبتِ مرشد: آپؒ کو اپنے شیخ سے والہانہ عقیدت تھی، لکھا ہے کہ ان کی جوتیاں اٹھا کر اپنے سر پر رکھتے، انہیں آنکھوں سے لگاتے اور فرطِ رقت سے دیر تک روتے رہتے تھے، خاکروبوں کی کسی جگہ کمی نہیں ہوا کرتی، یہاں بھی حضرت کے یہاں بیت الخلا کی صفائی کے لیے خاکروب مقرر تھا، لیکن دہلی میں اپنے قیام کے دوران آپؒ شیخ کے ذاتی بیت الخلا کی صفائی خود اپنے ہاتھ سے کرتے اور اسے موجبِ افتخار سمجھتے تھے، محبت واقعی محبوب کے لیے انسان کو فنا کر دیتی ہے، اور فنا ہو کر ہی انسان کچھ پاتا ہے۔ ؎

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

اجازت نامہ اور تعریفی کلمات: جب شاہ صاحبؒ نے دیکھا کہ حاجی صاحب ایک ایسے مقام تک پہنچ گئے ہیں جس سے خلقت کے فیض یاب ہونے کی اُمید ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے بڑا دینی کام لینا چاہتے ہیں، تو اجازت

وخلافت عطا فرمائی، اور اجازت نامہ میں بڑے مدح کے الفاظ استعمال فرمائے، خوب دعائیں دیں اور لوگوں کو تنبیہ کی کہ حاجی صاحب میرے خلیفہ ہیں، تم پر ان کی اطاعت ضروری ہے اور ان لوگوں کے لیے خوش خبری ہو جو ان کی اقتدا کریں، یہ الفاظ بھی لکھے: ”فَصَارَ مَجْمَعَ الأَنْوَارِ وَ مَعْدِنَ الْبِحَارِ، فَأَجَزْتُهٗ بِإِجَازَةٍ مُطْلَقَةٍ۔“

یعنی حاجی صاحب انوارِ الٰہیہ کے جامع اور بحارِ معرفت کے منبع بن گئے ہیں، لہٰذا میں نے انہیں طریقۂ کامل کی اجازت دے دی ہے۔

رخصت کرتے وقت یہ وصیت فرمائی کہ آپ ایسی جگہ قیام کریں جہاں پشتو اور پنجابی دونوں زبانیں چلتی ہوں، یعنی ایک طرف پختونوں کا علاقہ ہو، دوسری طرف پنجابیوں کا علاقہ ہو۔

چنانچہ شاہ صاحبؒ سے اجازت کے بعد حضرت حاجی صاحب چلے، پاکستان کے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان شہر سے اکتالیس میل دور جنوب مغربی سمت پر واقع موسیٰ زئی قصبہ کو حضرت حاجی صاحب کا مسکن و قیام گاہ بننے کا شرف ملا، یہ قصبہ واقعی حضرت شاہ صاحب کی وصیت کے عین مطابق ہے، اس کے مغربی سمت میں پشتو اور مشرقی اطراف میں پنجابی زبان بولی جاتی ہے، خود موسیٰ زئی میں بھی دونوں زبانوں کا استعمال ہوتا ہے، آپؒ اپنے مریدوں کے ساتھ یہاں تشریف لائے اور موسیٰ زئی کے مغرب میں ڈیرہ ڈال دیا، اور خانقاہ آباد فرمائی، جو اب بھی موجود ہے۔

ف: دل سے دعا ہے کہ ایسی اہل دل کی خانقاہیں زیادہ سے زیادہ قائم ہوں،

تا کہ شریعت وطریقت کی اشاعت ہواور اللہ تعالیٰ کی محبت ونسبت کے حصول کا ذریعہ ہو۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ (مرتب)۔

قیام اور کرامت کا ظہور: آپؒ نے موسیٰ زئی میں اپنے قیام کے لیے مغربی سمت میں ایک پہاڑی نالے کے کنارے ڈیرہ لگایا، کیوں کہ پانی کی کمی تھی، اور اس جگہ کے انتخاب میں خورد ونوش اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی سہولت پیش نظر تھی، تھوڑے ہی عرصہ میں قبیلۂ تاجوخیل کے لوگ آپؒ سے بے حد مانوس ہو گئے اور بہت سے داخل طریق بھی ہو گئے، لیکن دوسرے قبائل کے چند رئیسوں کو جو اسی بستی میں رہتے تھے آپؒ کا یہاں ٹھہرنا اور آپؒ کے درویشوں کا نالے کے پانی کو استعمال کرنا سخت نا گوار گزرا، انہیں حاجی صاحب کے ساتھ تاجوخیل قبیلہ کی گرویدگی دیکھ کر آپؒ پر سختی کرنے کی ہمت تو نہ پڑتی تھی، البتہ اس فکر میں ضرور رہتے تھے کہ کوئی ایسا ذریعہ اور حیلہ ہاتھ آ جائے کہ حضرت حاجی صاحبؒ اور آپؒ کے درویشوں کو اس جگہ سے بے دخل کر کے ہجرت پر مجبور کر دیا جائے۔

اتفاقاً ایک ہندو تحصیل دار دورہ کرتے ہوئے ادھر آ نکلا، مخالفین جو موقع کی تلاش میں تھے فریادی بن کر تحصیل دار کے پاس پہنچ گئے کہ ایک فقیر نے ہماری زمین پر قبضہ جما لیا ہے، اس کے ساتھ فقیروں کی ایک بڑی جماعت ہے، یہ سب ہمارے نالے کا پانی خراب کرتے ہیں، ہمارے کہنے پر یہ قبضہ نہیں چھوڑتے اور یہاں سے نہیں جاتے، اگر آپ ان فقیروں کو یہاں سے نکال دیں تو ہم احسان مند ہوں گے، تحصیل دار ان کی خاطر مدارات اور تکلف و چاپلوسی سے متاثر ہو گیا، فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی آن بان کے ساتھ حضرت حاجی

صاحب قبلہؒ کے پاس آ دھمکا اور تحکمانہ لہجے میں کہا: ”فقیر صاحب! تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

حاجی صاحبؒ نے اس کا یہ طمطراق دیکھ کر ذرا نرم لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”شیخ صاحب! ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔“ تحصیل دار ہندو تھا، اور اہل اسلام کا خطاب ”شیخ“ سن کر وہ مزید طیش میں آ گیا، اور مکرر سختی کے لہجے میں کہا کہ ”تمہیں یہاں سے جانا ہوگا“ اب حاجی صاحبؒ نے بھی سختی دکھائی، لیکن شیخ صاحب کے لقب کے ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ ”شیخ صاحب! ہمیں یہاں سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔“

ہندو تحصیل دار بڑا برہم ہوا، اسے کہاں بار بار شیخ کا لقب پسند تھا، اس نے سختی اور گستاخانہ انداز میں کہا کہ ”میں ابھی زبردستی تمہیں یہاں سے نکال دوں گا“ حاجی صاحبؒ نے بھی جلالانہ انداز میں فرمایا کہ ”شیخ صاحب! کسی کی مجال نہیں جو فقیر کو یہاں سے ہٹا سکے، یہ فرماتے ہوئے جلال انگیز نگاہ تحصیل دار پر ڈالی، ادھر حضرت حاجی صاحبؒ کی نگاہ اٹھی، ادھر تحصیل دار صاحب گھوڑے سے نیچے گر کر تڑپ رہے تھے، تحصیل دار کے ساتھ آنے والے اور قبیلوں کے رئیس گھبرا اُٹھے اور اسے اٹھا کر گھر لے گئے، جب اسے ہوش آیا تو منت وسماجت کے ساتھ دوبارہ آپؒ کے پاس آنے کی درخواست کی، وہ اسے لے آئے، اس نے سب سے پہلے اپنی بے ادبی و گستاخی کی معذرت کی، پھر کہا کہ ”حضور! میں اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہوں، بشرطیکہ میری تین آرزوئیں پوری ہو جائیں، میری بیوی بھی اسلام لے آئے، میں اپنی جائداد و ورثہ سے

محروم نہ ہو جاؤں، میری ملازمت بھی برقرار رہے، حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے تمہاری جمیع آرزوؤں کو پورا کرے گا، اس نے کلمہ پڑھ لیا اور مسلمان ہو گیا، ادھر بیوی کو دل کا دورہ پڑا، لوگوں نے کوششیں کیں، لیکن ناکام ہوئے، کسی نے کلمۂ طیبہ پڑھنے کو کہا، اس نے پڑھا تو درد جاتا رہا، اس طریقہ سے اس نے بھی غائبانہ اسلام قبول کر لیا، پھر حاجی صاحبؒ کی دعاؤں سے باقی آرزوئیں بھی پوری ہو گئیں، حضرت حاجی صاحبؒ نے اس کا نیا نام شیخ عبداللہ رکھا، اس سے اس کو بار بار ''شیخ صاحب'' کے لقب سے مخاطب کرنے کی حکمت بھی ظاہر ہو گئی، شیخ عبداللہ نے یہ بھی کہا کہ سابقہ قومیت سے اب میرا کوئی رابطہ نہیں ہے، آپؒ نے فرمایا کہ آج سے تمہاری قومیت فقیر ہے، اور آج تک ان کی نسل فقیر کے نام سے چل رہی ہے، یہ کرامت دیکھ کر بستی والے بھی متوجہ ہو گئے، حاسدین کی بھی آنکھیں کھلیں، انہوں نے بھی توبہ کی، اور یوں آپؒ کی تشریف آوری بستی کے لیے رشد و ہدایت کا سبب بنی۔

سالکین کی تربیت: شریعت مطہرہ کا اتباع اور بدعات سے کامل اجتناب آپؒ کے نزدیک لوازمِ سلسلہ سے تھا، یہ آپؒ کی عظمت ولایت کا ادنیٰ کمال تھا کہ تمام وابستگانِ طریقہ پر ہمیشہ ہیبت طاری رہتی تھی، اور کوئی فرد اپنے اوراد و وظائف میں تساہل نہ کر سکتا تھا، گاہے گاہے سالکین کے حجروں میں جا کر ان کے کپڑوں، کھانے پینے کے برتنوں اور کتابوں تک کا جائزہ لیا کرتے تھے، کہ کوئی امر آدابِ طریقہ اور ضوابطِ خانقاہ کے منافی نہ ہونے پائے، جو انتشارِ توجہ کا موجب بنے، خانقاہ میں کم خوردن، کم گفتن، کم خفتن اور با خلق بودن کا اصول کار

فرماتھا،لنگر سے جوغذا ملتی تھی وہ سادہ اور بقدرِ کفایت ہوتی تھی۔

ف: سبحان اللہ! کیا ہی خوب تربیت کے طور وطریقے تھے، جو اب کے مشائخ کو بھی اختیار کرنا چاہیے، تاکہ خانقاہوں سے طریق کا خوب کام ہو، اور سالکین وطالبین اصحابِ نسبت ومعرفت ہوکر نکلیں۔ واللہ الموفق۔ (مرتب)۔

آپؒ کی وفات اور خواجہ محمد عثمانؒ کی جانشینی: آپؒ کی وفات ۱۲۸۴ھ میں ہوئی، إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون۔ جانشینی آپؒ کے خلیفۂ اعظم اور آپؒ کے ممتاز شاگرد خواجہ محمد عثمان دامانی رحمۃ اللہ علیہ کی قسمت میں آئی، جو ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے، تحصیل علم کے دوران ہی آپؒ کی خدمت میں آئے اور بقیہ علوم کی تکمیل آپؒ کی خدمت میں رہ کر کی، درسِ مشکوٰۃ کا ایک واقعہ بھی ہے کہ ''کتاب البیوع'' آیا تو حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا: ''عثمان! ''کتاب البیوع'' بھی پڑھوگے؟'' ملا عثمان فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''حضرت! میرے پاس کوئی نقد مال یا جائداد نہیں، بظاہر مجھے خرید وفروخت کی ضرورت پیش نہ آئے گی'' فرمایا: ''بہت خوب! نہ میرے پاس متاعِ دنیا، نہ تمہارے پاس، کہ ہمیں لوگوں سے خرید وفروخت اور لین دین کی نوبت آئے، پھر شعر پڑھا: ؎

علم کثیر آمد و عمرت قصیر   آنچہ ضرورت ست بداں شغل گیر

ترجمہ: علوم بہت ہیں اور تیری عمر مختصر، جو علم ضروری ہے اس میں اپنے آپ کو مشغول رکھ۔

اور کتاب البیوع چھوڑ کر کتاب الآداب شروع کرادی۔

خواجہ محمد عثمان دامانیؒ حضرت حاجی صاحبؒ کے ساتھ ہمیشہ سفر و حضر میں رہتے، اٹھارہ سال، چار ماہ اور تیرہ روز حاجی صاحبؒ کے ساتھ رہے، حاجی صاحبؒ کی زندگی ہی میں آپؒ جانشینی کے لیے منتخب کیے گئے، حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنی زیرِ نگرانی متعدد خانقاہوں کا انتظام و انصرام بھی آپؒ کے حوالے کر دیا، جن میں موسیٰ زئی شریف اور دیگر خانقاہوں کے علاوہ خانقاہِ مظہریہ دہلی بھی شامل تھی، اور آپؒ کی وفات کے بعد آپؒ کے صاحب زادے حضرت خواجہ سراج الدینؒ نے خانقاہ کو نقطۂ عروج تک پہنچایا۔

ف: اگرچہ تذکرہ طویل ہو گیا، مگر مفید باتیں تھیں اس لیے لکھ دیا، اللہ تعالیٰ اس کو مطالعہ کرنے والوں اور مرتب کے لیے شمع راہ بنائے، آمین۔ (مرتب)۔

(''شخصیاتِ افغانستان کی روح پرور یادیں'' / صفحہ: ۵۰۵)

حضرت مولانا شاہ خاموش دکنی ؒ متوفی ۱۲۸۶ھ

نام ونسب: آپ ؒ کا نام غلام معین الدین ہے، شاہ خاموش آپ ؒ کا لقب ہے، آپ ؒ دکن کے مشاہیر مشائخ میں سے تھے، آپ ؒ کا اصل وطن شہر بیدر دکن ہے، نسب کا سلسلہ بندہ نواز گیسودراز پر منتہی ہوتا ہے۔

فضل وکمال: آپ علاء الدین شاہ علی صابر چشتی ؒ کے سجادہ کے مرید وخلیفہ تھے، مدت تک ہند میں پیر و مرشد کی خدمت میں رہے، عبادت و ریاضت میں نہایت مشقت و جفاکشی کی، بارہ سال تک عالم سکوت میں رہے، کسی سے ہم کلام نہیں ہوئے، اسی وجہ سے ملقب بہ "شاہ خاموش" ہوئے، دائم الصوم و قائم اللیل تھے، آپ ؒ نے ہند و پنجاب وغیرہ ممالک میں بہت سیاحت کی، اکثر بزرگان اہل اللہ سے ملے، ہر ایک مقام سے استفادہ کیا، آخر حضور ناصر الدولہ بہادر نظام الملک آصف جہاں چہارم کے زمانہ میں ہند سے حیدرآباد دکن میں آئے، مکہ مسجد کے عقب میں جو خانقاہ ہے اس میں سکونت پذیر ہوئے، اہل دکن آپ ؒ کے فیضانِ نعمت سے مستفید ہونے لگے، روز بروز مریدوں کی تعداد بڑھنے لگی، آپ ؒ کے کشف و کرامت نے دکن کو مسخر کیا، آپ ؒ اہل دکن کے قلوب پر حکمرانی کرتے تھے۔

اخلاقِ فاضلہ: آپ ؒ کی اخلاقی حالت نہایت ہی درست تھی، سراپا مجسم اخلاق تھے، کسر نفسی و ہمدردی میں عدیم المثال تھے، ہر ایک صغیر وکبیر کی تالیف قلب ودلداری فرماتے تھے، آپ ؒ کی ذات مجمع الحسنات تھی، ہمیشہ آپ ؒ کے یہی

امر مدنظر رہتا تھا کہ خلائق کو نفع پہنچے، غرباء وفقراء کی حاجت روائی ہو جائے، جو کوئی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا حسب اتفاق کامیاب ہو کر آتا تھا، شہر کے اُمراء آپؒ کی بزرگی کو مانتے تھے اور آپؒ سے حسن اِرادت رکھتے تھے، بے شک آپؒ پاک طینت وفرشتہ خصلت تھے، حضور ناصر الدولہ بہادر مرحوم کے بعد حضور افضل الدولہ بہادر تخت نشین ہوئے، آپ فقراء و مشائخ سے حسن اعتقاد رکھتے تھے، ہمیشہ فقیر کامل و عارفِ واصل کے جویاں رہتے تھے، کسی نے شاہ صاحبؒ کا ذکر خیر بادشاہ کے حضور میں کیا، اُسی وقت آپؒ کو بلایا، آپؒ ملازمت میں باریاب ہوئے، بادشاہ نے آپؒ کی بڑی تعظیم وتوقیر کی، بے شمار زر وجواہر نذر کیا، آپؒ فقیر تھے، مگر دل امیر تھا، جو کچھ حضور سے آپؒ کو ملا آپؒ نے تمام مریدین ومعتقدین پر تقسیم فرمادیا، ہمیشہ آپؒ کی یہی عادت تھی، جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ سب فقراء وغرباء کو عطا فرمادیتے، ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتے تھے، آپؒ نے ایک روز بندگانِ عالی حاتم ثانی سے عرض کیا کہ مکہ مسجد کا فرش شکستہ وریختہ ہو گیا ہے، نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے، آپ فرشِ سنگین بنوا دیجیے، حاتمِ زمان نے تیس ہزار روپے اس کام کے لیے عنایت کیے، شاہ صاحبؒ نے مسجد کا تمام صحن سنگین بنوادیا، عنداللہ ماجور وعندالناس مشکور ہوئے، آپؒ نے اس ریاست میں اور بھی بہت سے کام کیے جو یادگار ہیں، شہر میں بلکہ کل ممالک دکن میں ہزارہا آپؒ کے مریدین ومعتقدین ہیں، آپؒ کی ذات ”خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَنْفَعُ النَّاسَ“ کا مصداق تھی، آپؒ نے مدت العمر کسی کو نہیں ستایا، ہمیشہ راضی برضائے الٰہی رہتے تھے، آپؒ کو فنافی اللہ کا مقام حاصل تھا،

آپؒ کے ذریعہ وتوسل سے ہزارہا حاجت مند کامیاب اور اکثر فقراء اُمراء ہو گئے، آپؒ کی خانقاہ غرباء وفقراء کا مرجع تھی، شہر میں جو کوئی بھی غریب الوطن آتا تھا آپؒ کی خانقاہ میں فروکش ہوتا تھا، آرام سے رہتا تھا اور کھا پی کر اطمینان پاتا تھا، غریب کو خانقاہ میں وطن کا لطف ومزہ حاصل ہوتا تھا۔

ف: اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہماری خانقاہوں کا بھی یہی حال ہو اور الحمد للہ، اس کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ **واللہ ولي التوفيق۔** (مرتب)۔

آپؒ موزون الطبع تھے، کبھی کبھی سخن موزون کرتے تھے، (یعنی اشعار کہتے تھے) آپؒ کے کلام سے عرفان وتوحید عیاں ہے اور وجد وحال کا مضمون بھی نمایاں ہے۔

وفات: تاریخ: ۲۲/ ذوالقعدہ/ ۱۲۸۶ھ میں اس جہانِ فانی سے انتقال فرما گئے۔ **إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔**

یوسف شاہ صاحبؒ کے تکیہ کے قریب اپنے باغ میں مدفون ہوئے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ (محبوب التواریخ/ تذکرۂ اولیاءِ دکن: ۱/ ۳۱۲)

حضرت مولانا شاہ عبدالرشید امروہویؒ متوفی ۱۲۸۶ھ

نام ونسب وولادت: حضرت شاہ عبدالرشیدؒ فرزند اکبر تھے حضرت شاہ احمد سعیدؒ کے، آپؒ کی ولادتِ باسعادت ۱۲۳۷ھ میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔

تعلیم وتربیت: پانچ سال کی عمر تھی کہ اپنے جد امجد قیومِ زمان حضرت شاہ ابوسعید قدس سرہٗ کی صحبت میں اکثر حاضر باش رہا کرتے تھے، بلکہ شب کو آپؒ ہی کے پاس سویا کرتے تھے، اور جس وقت کہ حضرتؒ نمازِ تہجد کے واسطے اُٹھتے آپؒ اُٹھتے اور شریک نماز ہوتے اور فیوض سے بہرہ یاب ہوتے، بعد حفظ کلامِ مجید مصروفِ تحصیل علومِ متداولہ ہوئے اور اس کے ساتھ ہی کسب سلوک بھی شروع کردیا۔

بیعت: آپؒ کی عمر سات سال کی تھی کہ آپؒ کے جدامجد قدس سرہٗ نے آپ کو اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ کو کہ دونوں قریب قریب ہم عمر تھے بتاریخ ۲۷/ ماہ رمضان بعد تراویح کے کہ وہ شب، شب قدر تھی طلب فرما کر بیعت سے مشرف فرمایا اور فرمایا کہ توجہ کے وقت ضرور ہوا کرو، آپؒ پہلے ہی حاضر رہا کرتے تھے، اب زیادہ التزامِ حضوریٔ توجہات فرمایا۔ جب تک کہ حضرتؒ کے جدامجد دہلی میں رہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، جب وہ حرمین شریفین کو روانہ ہوئے تو اپنے والد کے حلقہ میں بیٹھنا شروع کردیا اور نسبت مقاماتِ احمدیہ بکمالِ کوشش حاصل کی، آپؒ کا قریب بیس سال سن شریف ہوگا کہ علمِ ظاہری و باطنی سے فراغت حاصل کرکے جامع النورین ہوگئے۔

حج بیت اللہ: اسی زمانہ میں آپؒ کو حج بیت اللہ شریف اور زیارتِ روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شوق دامن گیر ہوا تو اپنے والد بزرگوار کی اجازت حاصل کر کے راہیٔ حرمین شریفین ہوئے، حضرتؒ کے والد ماجد تا دروازۂ شہر وداع کے واسطے تشریف لے گئے، اور عمامہ، کلاہ اور قمیص جو حضرت شاہ غلام علی صاحب قدس سرہٗ سے آپؒ کو تبرک پہنچا تھا وہ صاحب زادے صاحب کو مع اجازتِ عامہ و خلافت مطلقہ عطا فرمایا، یہ خلعت خاص آپؒ کے حصہ میں آیا ہے، اور مخلصین و محبین کو بایں الفاظ خطوط تحریر فرما دیے کہ فرزند اعزی اعظمی نسخۂ معارفِ فقیر ہے، جس کو شوقِ دخولِ طریقت و ذوقِ استفادۂ علوم و معارف ہو ان سے حاصل کرے، کہ درحقیقت ان کا ہاتھ میرا ہاتھ ہے۔

مریدوں کی تربیت: غرض آپؒ حرمین شریفین پہنچے اور وہاں بانواعِ انعاماتِ خداوندی جل شانہٗ وعنایاتِ حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرف ہو کر واپس دہلی پہنچے، بعد مراجعت آپؒ درسِ علومِ ظاہری و آمادۂ معارفِ باطنی اور توجہِ مریدین وتسلیک طالبین میں مصروف ہوئے، آپؒ کی نسبت نہایت قوی اور توجہ بہت پُر اثر تھی، اس سبب سے حضرتؒ کے والد ماجد اپنے مریدوں کو ظہورِ تاثیر کے واسطے آپؒ کے سپرد کر دیتے تھے اور آپؒ کی قوی توجہات سے وہ لوگ جلد متاثر ہو جاتے تھے، حضرتؒ کے والد بزرگوار نے آپؒ کو حسب طلب ولی عہد رامپور نواب کلب علی خاں مرحوم کے وہاں بھیج دیا، نواب صاحب نے آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور تین وقت حلقۂ توجہ میں حاضر ہوتے اور برکات و فیوض سے فیض یاب ہوتے، اوران چندروزہ توجہات کا اثر ان پر تا دمِ مرگ رہا۔

نقل ہے کہ نواب کلب علی خاں کے والد کا مذہب شیعہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کلب علی خاں بھی شیعہ ہو جائیں، مگر انہوں نے قبول نہ کیا اور نوبت بایں جا رسید کہ ان کے والد نے کہا کہ اگر تبدیلئ مذہب نہ کریں گے تو ریاست سے محروم کر دیے جائیں گے، مگر حضرتؒ کی توجہات کی برکت سے انہوں نے اس کی بھی پرواہ نہ کی اور صراطِ مستقیم پر قائم رہے، آخر کار ببرکت پیرانِ کبار بحکم: ”**الحق یعلو و لا یُعلیٰ**“ نواب کلب علی خاں کو ریاست ملی۔

مدینہ شریف کی سکونت: حضرت کو مدینہ منورہ کی سکونت کا کمالِ شوق تھا اور اکثر بکمالِ حسرت فرمایا کرتے تھے: ”دیکھئے! وہ کونسا دن آئے گا جو حرمین شریفین میں چل کر سکونت اختیار کریں گے۔“ آخر کار پردۂ غیب سے ایک سامان پیدا ہوا کہ دہلی میں غدر آگیا اور خلقت پریشان ہوگئی، جس کا جس طرف منہ اُٹھا چل دیا، اور حضرتؒ کے والد ماجد نے مع اہل وعیال حرمین شریفین کا رُخ کیا اور وہاں جا کر سکونت اختیار کی اس طرح مرادِ دلی برآئی، و بانواعِ کمالات و جمالات مثل تحقیق نسبت محبوبیت وحصولِ فناءِ اتم و بقاءِ اکمل مرتبہ مقدسہ حقیقت الحقائق مشرف ہوئے، وہاں قریب دو سال بعد حضرتؒ کے والد بزرگوار کو مرض الموت لاحق ہوا، اور بسبب شدتِ مرض و کثرتِ ضعف حلقاتِ توجہ میں نشست دشوار ہوگئی، آپؒ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا، آپؒ بجائے اپنے والد کے حلقہ کیا کرتے اور اس میں ان کے جمیع خلفاء اور مرید بھی حاضر ہوتے، ان کے انتقال کے بعد سب نے آپؒ کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی اور استفادہ کے واسطے حاضر ہوتے، مردمِ اطراف وجوانب جہاں مثل حجاز وروم وشام و بخارا وخراسان وہندوستان جوق درجوق آکر داخل طریق ہوتے، علماء ومشائخ زماں ترکِ تدریس ومنصب شیخی

کر کے خاک روبیٔ آستانہ کو اپنا فخر سمجھتے اور آپؒ بھی ہمہ تن مصروفِ اشاعت طریقت ہو گئے اور قریب دس (۱۰) سال تک مسند ارشاد کو زینت فرمایا۔

اخلاقِ فاضلہ: آپؒ نہایت مجمع اخلاقِ حسنہ تھے، اپنے تئیں ادنیٰ خادم سے بھی کمتر جانتے تھے، اگر کہیں محفل یگانہ یا بیگانہ میں تشریف لے جاتے تھے تو ایسی جگہ بیٹھتے تھے کہ جہاں کسی قسم کا امتیاز نہ پایا جائے، بلکہ اکثر قریب صف نعال بیٹھ جاتے تھے، اور جب کوئی نہایت مجبور کرتا تھا تب وہاں سے اُٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ جاتے تھے، فرش بچھانے و جاروب میں خدام کی اعانت کیا کرتے تھے، بڑے ذاکر و شاغل تھے، ہمیشہ افکار اور مراقبات و کثرتِ تلاوتِ قرآن شریف و استغفار و درود میں مشغول رہتے تھے، بلا اشد ضرورت کسی سے مجالست و مکالمت نہ کرتے تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

نقل ہے کہ ایک روز آپؒ کے والد بزرگوار نے آپؒ کو فرمایا کہ شیخ الخطباء سید محمد مدنی کے پاس جاؤ، جب حرمِ نبوی میں داخل ہو کر قریب روضۂ مطہرہ پہنچے تو حضرت سرورِ کائنات علیہ افضل الصلوات والتسلیمات ظاہر ہوئے اور دریافت فرمایا کہ کہاں جاتے ہو؟ آپؒ نے عرض کیا کہ سید محمد مدنی کے پاس جاتا ہوں، آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سید محمد مدنی تو میں ہی ہوں، بس پھر آپؒ آگے نہ گئے اور وہیں سے واپس آ گئے۔ (مشائخ نقشبندیہ مجددیہ/صفحہ:۴۵۵)

ف: ظاہر ہے کہ کتنا بڑا شرف حاصل ہوا، جو آپؒ کی غایت سعادت کی علامت ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے، آمین۔ (مرتب)۔

وفات: بتاریخ ۱۶/ ذوالحجہ/ ۱۲۸۶ھ کو مکہ معظّمہ میں انتقال فرمایا اور بائیں جانب قریب روضۂ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جنت المعلیٰ مکہ مکرمہ میں دفن ہوئے۔ نور اللہ مرقدہٗ۔

حضرت مولانا سید نور الحسین بالا پوریؒ متوفی ۱۲۸۸ھ

نام ونسب: آپؒ کا نام سید نور الحسین، والد کا نام مولانا سید نور الاصفیاء صاحبؒ ہے۔

تعلیم وتربیت: آپؒ شعور وبیدار کے بعد ابتدا میں قرآن شریف تمام کر کے تحصیل علوم میں مشغول ہوئے، والد ماجد اور علماء وفضلاء سے علوم وفنون کی کتبِ درسیہ ختم کیں اور تصوف وعلم باطنی کو خاص والد ماجد سے حاصل کیا، جامع علوم ظاہری وباطنی ہوئے۔

ابتدا میں تدریس کا شوق تھا، مگر والد ماجد کی رحلت کی وجہ سے قلیل الفرصت ہو گئے، تمام کارخانجات وجاگیرات کے مہمات آپؒ کے تفویض ہوئے، آپؒ کے اوقات ان ہی امور کے انتظام میں گزرتے تھے، آپؒ نے والد ماجد کے بعد حسن تدبیر وکفایت سے جاگیرات کے اُلجھے ہوئے کاموں کو سلجھایا، جو کچھ قرض والد ماجد کے ذمہ تھا اپنے ذمہ لیا، ہر ایک ساہوکار کا دام ودرم آہستہ آہستہ ادا کیا اور اعزہ واقارب کے ساتھ اس طرح حسن سلوک فرمایا کہ سب احسان مند وشکر گزار ہوئے، اور آشنا وبیگانہ کو بھی خُلق ومودّت سے راضی کیا، غرض کہ آپؒ سے سب راضی وخوشنود تھے، کوئی آپؒ کی شکایت نہیں کرتا تھا۔

آپؒ کے اخلاقِ فاضلہ: کریم الاخلاق وعمیم الاشفاق تھے، علماء دوست

اور فقراء نواز تھے، خوش تقریر وخوش تحریر تھے، ماہِ ربیع الاول، ماہِ ربیع الثانی اور عشرۂ محرم میں والد ماجد کی بنائی ہوئی مسجد میں حدیث بیان فرماتے تھے، مجلس حدیث میں مشائخ، علماء اور اُمراء شریک ہوتے تھے، آپؒ کی خوش بیانی سے سامعین کو لطف آتا تھا، آپؒ کو شعر گوئی کا بھی شوق تھا، کبھی کبھی تفریحاً موزون فرماتے تھے، رفتہ رفتہ صاحب دیوان ہو گئے تھے، فارسی و اردو دونوں زبان میں شعر کہتے تھے، ہم کو آپؒ کے کلام سے کچھ اشعار نہیں ملے، اس وجہ سے ہدیۂ ناظرین نہیں ہو سکے، معذور ہوں۔ والعذر عند کرام الناس مقبول۔

وفات: آپؒ نے ۱۲۸۸ھ میں اس جہاں سے دارِ جنان کی طرف رحلت فرمائی، بزرگوں کے مقبرہ باغ واقعہ عیدگاہ حیدرآباد دکن میں مدفون ہوئے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔

آپؒ کی اولاد: (۱) سید نور العلی، مخاطب بہ قدرت جنگ المتوفیٰ ۱۲۹۸ھ۔ (۲) سید نور العلا، المخاطب بہ سلطان یار جنگ۔ (۳) نور الاصفیاء المخاطب بہ قادر الملک۔ (محبوب التواریخ: ۲/ ۱۰۸۳)

حضرت مولانا سید جعفر علی نقوی بستویؒ[۱] متوفی ۱۲۸۸ھ

ولادت: آپؒ کی ولادت ۱۲۱۸ھ میں ضلع بستی کے مجھوامیر نامی گاؤں میں ہوئی، جسے دو پشت سے آپؒ کے آباءواجداد نے اپنا وطن بنالیا تھا۔

اور خاندانی ایک روایت یوں ہے کہ تاریخ ولادت اور تاریخ وفات ایک ہی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو کہا جائے گا کہ مولانا ۲۰ / رمضان المبارک/ ۱۲۱۸ھ کو پیدا ہوئے، اس لیے کہ تاریخ وفات ۲۰ / رمضان/ ۱۲۸۸ھ ہے۔

مہر صاحبؒ نے مولاناؒ کے تذکرہ میں سن عیسوی ۱۸۰۳ء ذکر کیا ہے، جو ۱۲۱۸ھ کے مطابق ہے۔

تعلیمی نظام: خاندان میں تعلیم وتعلم کا سلسلہ کم ازکم فارسی دانی تک کافی تھا، چنانچہ اس عہد کے بعض اہل خاندان کے مکاتیب بھی فارسی میں محفوظ ہیں۔

انتہائی تعلیم اور لکھنؤ: مولاناؒ نے اپنی تعلیم کی تکمیل لکھنؤ میں فرمائی، اور اس کے بعد رسمی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا، جب والد صاحب متعلقین کے قافلہ کو لے کر حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں تشریف لے گئے تو اس وقت مولاناؒ کی تعلیم جاری تھی، اور اس وقت مولاناؒ لکھنؤ ہی میں مقیم تھے۔

تصانیف: مولانا عبدالحي صاحبؒ نے آپ کی حسب ذیل تصانیف کا تذکرہ فرمایا ہے:

---

[۱] ماخوذ از ''حیات جعفر'' مؤلفہ مفتی عبیداللہ اسعدی

(۱)منتهى الكلام (ضخیم جلد ہے) (۲)إزالة الغين عن بصارة العين (تین ضخیم جلدوں میں ہے) (۳)نضارة العينين فى شهادة الحسنين (۴)كاشف اللثام عن تدليس المجتهد القمقام (۵)الداهية الهاطمة على من أخرج من أهل البيت فاطمة (۶)رؤية الثعاليب و الغرابيب فی إنشاء المكاتيب (۷)ایک کتاب حضرت علیؓ کی حضرت ابوبکرؓ سے بیعت (۸)اورایک حضرت علیؓ کی صاحب زادی ام کلثومؓ سے حضرت عمرؓ کی شادی کے اثبات میں۔

نیز اپنے استاذِ خاص شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی مایۂ ناز تفسیر فتح العزیز کا تکملہ بھی جو کہ کئی ضخیم جلدوں میں ہے آپؒ کے تصنیفی آثر میں سے ہے۔(مگراب شاید دست یاب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ دست یابی کی کوئی سبیل پیدا فرمادے۔آمین۔مرتب)

ذریعۂ معاش: مولانا تعلیم سے فارغ ہوئے تو اعلیٰ علمی صلاحیتوں کے حامل تھے، اہل علم اس عہد میں بھی حسب ضرورت وحال ایسے علمی مشاغل اختیار کرلیا کرتے تھے جس سے ان کے گذر بسر کا نظم بھی ہوجائے، مثلاً رؤساء کے قائم کردہ مدارس یاان کے ذاتی تعلیمی نظام یا اشاعت وطباعت کے کام وغیرہ سے تعلق۔

ان ہی دنوں میں مولاناؒ نے سید صاحبؒ کی رفاقت اورسفر جہاد کا فیصلہ فرمالیا، اس لیے اس وقت اس کو ٹال گئے، اور خود تحریر فرمایا ہے کہ بعض کا تو جواب یہ دیا کہ ابھی فرصت نہیں ہے، اور کچھ کا جواب نہیں دیا۔(کہاں تک بار بارعدمِ فرصت یا کم فرصتی کا جواب دیتے)

جہاد سے واپسی کے بعد سید صاحبؒ کی جو رفاقت میسر آئی تھی اس کے نتیجے میں کسی اور ہی نشے سے سرشار تھے، اس لیے اس کے بعد پھر معاش کی کسی

ایسی شکل کی فکر یا اس کے لیے تگ ودو کا مسئلہ ختم کردیا، اور مولاناؒ نے اپنے لیے جو نظامِ زندگی طے فرمالیا تھا اس میں معاش کا کوئی ایسا نظام جو کہ کسی ایک جگہ قرار کا مقتضی ہوا کرتا ہے ممکن بھی نہ تھا۔

اس لیے معاش کی بابت آبائی زمین اور اس کی یافت پر قناعت فرمالی، ویسے اس وقت تک زمین کافی تھی، اگرچہ متفرق جگہوں پر تھی، اور مولاناؒ اس طرح مسلسل سفر میں رہا کرتے تھے کہ کما حقہ ان کا بھی نظم یا نگرانی ممکن نہ تھی، تاہم باغ وکھیت ہی اخیر تک ذریعۂ معاش رہا، جس سے گھر کے اخراجات کا نظم ہوتا رہا۔

ف: اس کے بعد سوانح نگار زید مجدہٗ نے خاص عنوانات کے تحت اہم مضامین درج فرمائے ہیں، مثلاً ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ (معرکۂ جہاد)، آپؒ کا علمی مرتبہ ومقام، فقہی مسلک وبصیرت، علم وعلماء کا احترام، عیسائیت کے موضوع پر مولانا کی ایک گفتگو، تفسیر وحدیث پر نظر، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا فقہی مسلک، سید صاحبؒ کا فقہی مسلک، فقہی بصیرت کے نمونے وغیرہ تا صفحہ: ۱۲۴، اگر موقع ہو تو اصل سوانح میں ان کا مطالعہ فرمالیں، نہایت بصیرت افروز ہیں۔ وباللہ التوفیق۔ (از: مرتب عفی عنہٗ)

بیعت کا تعلق: خود حضرت مولانا جعفر علی صاحبؒ اس کے متعلق منظورہ کی ابتدا میں تحریر فرماتے ہیں کہ

''ایں خاکسار از حضورِ حضرت امیر المومنین دراں ایام محروم ماندہ، اولاً بردستِ والد ماجد خود کہ نائب ممدوح بود بیعت حاصل کرد۔''

ترجمہ: یعنی چوں کہ یہ خاکسار بیماری کی وجہ سے والد صاحب کے ساتھ سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا تھا، بلکہ محروم رہا تھا، اس لیے اولاً والد

صاحب ہی کے ہاتھوں پر سید صاحبؒ سے بیعت کی سعادت حاصل کی، اس لیے کہ والد صاحب خلافت کے شرف کی وجہ سے حضرت سید صاحب کے نائب تھے۔

ف: اس کے بعد خود آپ بلا واسطہ حضرت سید احمد شہیدؒ سے مع اپنے رفقاء کے بیعت ہوئے۔ **فالحمدللہ رب العالمین۔** (مرتب)

بیعت ونسبت کا فیض: اس بیعت اور نسبت نے کیا کیا ظاہری و باطنی دولتیں مولاناؒ کو عطا کیں؟ آگے مولاناؒ کے اخلاق اور باطنی احوال کی تفصیل پڑھیے، مولاناؒ علامہ اقبالؒ کے وہ مردِ مؤمن ثابت ہوئے جس کے متعلق علامہؒ فرماتے ہیں: ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

مولاناؒ کے حالات مولاناؒ کے حق میں یہی تاثر دیتے ہیں کہ وہ نبوی صفت "کان خلقه القرآن" (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کردار سراپا قرآن تھا) کا پرتو وعکس تھے، عالی اخلاق، قیمتی احوال، مثالی صفات، قابل تقلید کردار...... کونسا وصفِ جوہر ان میں نہ تھا۔

اس کے بعد مولاناؒ کے حسن اخلاق کا تفصیلی تذکرہ فرمایا ہے، جو قابل دید ہی نہیں بلکہ لائحۂ عمل بنانے کے قابل ہے۔

اس کے بعد (صفحہ: ۱۴۶ پر) اوصاف و عادات نیز حلیہ ولباس کا ذکر فرمایا ہے، پھر (صفحہ: ۲۰۰ سے) سفر جہاد کی روداد تحریر فرمائی ہے، اصل کتاب میں ان سب مضامین کا مطالعہ فرمالیں تو ازدیادِ بصیرت کا سبب ہوگا۔

مولانا کا قائم کردہ مدرسہ ملک کے مرکزی اداروں سے بھی قدیم ہے،

مولاناؒ نے مدارس کا جو سلسلہ شروع کیا بظاہر ان کی اولین کڑی یہی مدرسہ ہے، جو مولاناؒ کے آبائی گاؤں سے بھی بہت قریب تھا، اس لیے مولاناؒ کا قیام اور آمد ورفت کا سلسلہ بھی یہاں بہت رہتا تھا، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ مولاناؒ براہِ راست اگر کسی ادارے کو دیکھتے تھے وہ جس حد تک بھی ہو تو وہ یہی ادارہ نہیں تھا، اس لیے کہ مذکورہ اداروں میں باقی ادارے مولاناؒ کے وطن سے کافی دور تھے۔

مولاناؒ کے گاؤں سے قرب کی وجہ سے مولاناؒ کے اعزہ کا بھی اس ادارے سے برابر گہرا تعلق رہا، اور آنا جانا بھی، اور سرپرستی اور فکر بھی، یہ تعلق اس حد تک رہا اور ہے کہ لوگ کرہی کو ہمارا مدرسہ کہا کرتے ہیں، اتفاق یہ کہ ضلع بستی میں مولاناؒ کے خاندان کے جو قرابت دار دوسرے خاندان اور گاؤں ہیں وہ کرہی کے اطراف میں واقع ہیں، کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے چھوٹے دادا جناب سید احمد صاحبؒ مدرسہ کے ذمہ دار تھے، اس کے بعد والد صاحب، جناب مولانا محمد مرتضیٰ صاحبؒ صدر رہے، ان کی وفات کے بعد جناب منیر احمد صاحب وکیل کو یہ شرف حاصل رہا۔

وصایا: حضرت مولانا جعفر علی صاحبؒ نے چھ اہم وصیتیں فرمائی ہیں، جن میں سے چند پیش خدمت ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

(۱)......جن صاحبوں نے اس عاجز کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور محبت کرتے ہیں ان کے لیے بہت ضروری ہے کہ شریعت کی عظمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تابعداری کی اہمیت اپنے دل میں خوب جما کے جتنے احکامِ الٰہی مثلاً نماز، روزہ اور جن لوگوں پر زکوٰۃ واجب ہے اور حج فرض ہے وہ ان کو دل وجان سے مستعد ہو کر ادا کیا کریں، اور اس عمرِ چند روزہ کو اپنے مالک کی رضامندی میں صرف کریں۔

(۲)......فرمایا کہ ''جو مسلمان دنیا سے رخصت ہو کر آخرت کو روانہ ہوا اس کا حق اولاد، اقارب، شاگردوں اور مریدوں وغیرہ مومنین پر اوّل یہ ہے کہ بعد مرنے کے غسل و کفن دے کر نمازِ جنازہ پڑھ کر دفن کریں، اس کے بعد جب یاد کریں تو صدقہ و خیرات کا ثواب پہنچادیں۔''

(۳)......فرمایا کہ ''جب حالت موت کی دیکھیں مثلاً سانس کا جلد جلد آنا اور ہچکی وغیرہ کا آنا تب کلمۂ شہادت اور کلمۂ توحید پکار پکار کر پڑھیں، کہ میرے کانوں میں آواز پڑے اور مجھ کو حکم نہ کریں، اور دنیا کا ذکر اس وقت ہرگز نہ کریں، بلکہ حرام جانیں، اگر ایک بار بھی میری زبان سے ''لا الٰہ الا اللہ'' سنیں تو پھر سب چپ ہو جائیں، چپکے چپکے میرے حق میں آسانئ موت کے لیے دعا کریں، اور پکار کر کچھ نہ بولیں، ہاں، سورۂ یٰسین آسانئ موت کے لیے اور سورۂ بقرہ نصف سرہانے اور نصف پائیں جانب پڑھیں۔''

وفات: حضرت مولاناؒ ان وصایا کے بعد چند دن بیمار رہ کر ۲۰ / رمضان المبارک / ۱۲۸۸ھ کو اس دارِفانی سے عالمِ عقبیٰ کی طرف ہمیشہ کے لیے انتقال فرما گئے۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ اور اپنے گاؤں مجھوا میر ضلع بستی میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالی

تاریخ وفات:

حاجئ حرمین بود و سید عالی مکاں — رہنمائے سالکاں و پیشوائے عارفاں

سالِ تاریخ وفاتش از سروش آمد بگوش — عاجزا! گو غازی و ہادی و علامِ زماں

۱۲۸۸ھ

(حیات جعفر)

حضرت مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادیؒ[۱] متوفی ۱۲۸۹ھ

خاندان: امیر کبیر شیخ الاسلام سید قطب الدین محمد ابن احمد المدنیؒ (متوفی: ۶۷۷ھ، مدفون: کڑہ) کی اولاد میں جو ہندوستان کے حسنی سادات کے مورثِ اعلیٰ ہیں گیارہویں صدی ہجری کی ابتدا میں قصبہ نصیر آباد جائس (ضلع رائے بریلی) میں سید محمد فضیل اور سید محمد اسحق رحمہما اللہ دونامور بھائی تھے تشریف لائے، جو علم وفضل، زہد وتقویٰ اور اتباعِ سنت میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔

حضرت سید محمد فضیلؒ کے صاحب زادے حضرت سید شاہ علم اللہؒ ہیں، جو حضرت سید آدم بنوریؒ (خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ) کے اکبر خلفاء میں سے تھے۔ حضرت سید محمد اسحق رحمہ اللہ کے صاحب زادے دیوان سید خواجہ احمدؒ تھے، جو متبحر عالم، صاحب افتا وتدریس اور شیخ طریقت تھے، علومِ ظاہری میں شیخ محب اللہ الٰہ آبادیؒ کے شاگرد تھے۔

دیوان سید خواجہ احمد صاحبؒ کی پانچویں پشت میں سید محمد یٰسینؒ ہیں، جو باوجود ملازمت شاہی کے ایک صاحب دل اور درویش صفت بزرگ تھے، ان ہی خوش نصیب مردِ خدا کے صاحب زادے خواجہ احمد نصیر آبادیؒ ہیں۔

ولادت: ۷/ جمادیٰ الثانیہ/ ۱۲۴۱ھ کو دو شنبہ کے دِن (جس روز

۱۔ آپؒ کے مختصر حالات حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی تصنیف ''کاروانِ ایمان وعزیمت'' سے درج کر رہا ہوں۔ (قمر الزمان)۔

حضرت سید احمد شہیدؒ نے ہجرت فرمائی) صبح کے وقت طلوعِ آفتاب سے پہلے حضرت سید خواجہ احمد صاحبؒ کی ولادت ہوئی اور اسی روز شام کو بعد نمازِ عصر حضرت سید احمد صاحبؒ نے ہجرت کے لیے رائے بریلی سے کوچ فرمائی۔

تعلیم: آپؒ نے درسی کتابیں مختصرات سے متوسطات مختصر المعانی وغیرہ تک اپنے عزیز بزرگ مولانا سید محمد نصیر آبادیؒ سے پڑھیں، جو اساتذۂ لکھنؤ اور پھر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے شاگردِ رشید اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ ومجاز تھے، ۱۲۵۴ھ میں ۱۴ سال کی عمر میں آپؒ کے والدِ محترم آپؒ کو مولانا سخاوت علی جون پوریؒ (خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ) کی خدمت میں باندہ لے گئے اور ان کو سپرد کر کے چلے آئے، تین سال آپؒ باندہ میں مولاناؒ کی خدمت میں رہ کر علوم کی تحصیل کرتے رہے، مولاناؒ جب باندہ سے اپنے وطن جون پور تشریف لائے تو آپؒ بھی ساتھ آئے، پھر مولاناؒ دوبارہ باندہ تشریف لے گئے تو آپؒ بھی ہم رکاب تھے، ڈیڑھ سال مزید قیام فرما کر علوم کی تکمیل کی اور ۱۲۵۹ھ میں اُنیس سال کی عمر میں آپؒ نے تعلیم سے فراغت حاصل کی۔

بیعت وسلوک: پہلا سلسلہ: سب سے پہلے حضرت شاہ یار محمد صاحبؒ کے ہاتھ بیعت کی، جو حضرت سید شاہ نجم الہدیٰ نصیر آبادیؒ کے خلیفۂ اعظم تھے۔

دوسرا سلسلہ: اس کے بعد آپؒ نے اپنے اُستاذ اور بھائی حضرت مولانا سید محمد بن اعلیٰ نصیر آبادیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی، جو حضرت امیر المومنین سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ تھے، مولانا سید محمد صاحبؒ نے آپؒ کو سید صاحبؒ کے پانچوں سلسلے قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ مجددیہ اور محمدیہ (سید صاحبؒ کا خاص طریقہ) میں

خلافت عطا کی۔

تیسرا سلسلہ: اپنے استاذ شیخ مولانا سید محمد صاحبؒ کی وفات کے بعد جب آپ ۱۲۷۸ھ میں حج کے لیے مکہ مکرمہ گئے تو وہاں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مہاجر مکیؒ (نواسۂ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ) سے طرقِ اربعہ میں خلافت و اجازت حاصل کی اور چھ مہینے ان کی خدمت میں ٹھہر کر ان کے علوم و کمالات کے فیوض سے مالا مال ہوئے اور اعمالِ مشائخ کی اجازتیں، سند حدیث، خرقۂ خلافت اور ملبوسِ خاص عطیہ حاصل کیا۔ اس طرح آپؒ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے صرف ایک واسطے سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے سلسلہ میں داخل ہیں۔

تبلیغ و اصلاح: مولاناؒ کی عظمت و مقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت اور آپؒ کی زندہ و جاوید کرامت وہ دینی اصلاح و تغیر ہے جو آپؒ کی ذات سے رونما ہوا، جب سے آپؒ علم حاصل کر کے آئے دمِ واپسیں تک آپؒ ہدایت و ارشاد میں مشغول رہے اور آپؒ نے اپنی زندگی کا کوئی دِن یہاں تک کہ مرض الموت کا کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔

بیعت فرمانا: اس تبلیغ و ہدایت کا ایک سب سے قوی اور مؤثر ذریعہ بیعت تھا، تحصیل علم اور قطع منازلِ سلوک کے بعد جوق در جوق لوگوں نے آپؒ کی طرف رجوع کیا، دیہاتوں، قصبات اور شہروں کے سفر اور دوروں میں سیکڑوں آدمی بیعت ہوتے اور شرک و بدعت، خلافِ شرع رسوم و اعمال اور معاصی سے توبہ کرتے، احکامِ شریعت کی پابندی اختیار کرتے، یہ بیعت اصلاحِ عقائد و اعمال

کا بہترین ذریعہ تھی اور اس سے آپؒ کا مقصد یہی تھا۔

چنانچہ اپنے ایک اِجازت نامہ میں جو آپؒ نے مولوی حکیم سید فخر الدینؒ کو عطا کیا اپنے قلمِ خاص سے تحریر فرماتے ہیں:

" الحمد للہ رب العالمین، و الصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد سید المرسلین، و علی آلہ و أصحابہ الذین قاموا بنصرۃ الدین۔

اما بعد: می گوید المفتقر الی اللہ الصمد فقیر خواجہ احمد حسنی عفی عنہ واسلافہ کہ مقصود از بیعت بر دست مشائخ طریقت ہمیں است کہ راہِ رضا مندئ حق بدست آید وراہِ رضا مندئ حق منحصر در اتباعِ شریعتِ غرّاء است، ہر کہ سوائے شریعت مصطفویہ راطریق تحصیل رضا مندئ حق انگارد بے شک کاذب وگمراہ و دعوئ او باطل و نامسموع۔ واساسِ شریعت مصطفویہ دو امر ست، اوّل ترکِ اشراک، ثانی ترکِ بدعات، بالجملہ در جمیع عبادات و معاملات و امورِ معاشیہ ومعادیہ طریق خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم را بکمالِ قوت وعلوِ ہمت باید گرفت۔"

ترجمہ: خواجہ احمد حسنیؒ فرما رہے ہیں کہ "مشائخ طریقت کے ہاتھ پر بیعت ہونے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا راستہ معلوم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا راستہ روشن شریعت کی اتباع میں ہے، جو شخص شریعت مصطفویہ کے علاوہ کسی اور راستہ کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے گمان کرتا ہے وہ یقینا جھوٹا اور گمراہ ہے اور اس کا دعویٰ باطل اور نا مقبول ہے، اور شریعت مصطفویہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے، اوّل شرک کو ترک کرنا، دوم بدعات کو ترک کرنا۔ خلاصہ یہ ہے کہ تمام عبادات و معاملات اور امورِ معاش و آخرت میں خاتم الانبیاء محمد رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طریقہ کو پوری قوت اور بلند ہمت سے پکڑے۔‘‘

ف: غور فرمایئے کہ حضرت خواجہ احمدؒ نے اپنے خلیفہ پر مشائخ کے ہاتھ پر بیعت ہونے کی غرض وغایت کی کیسی عمدہ وضاحت فرمائی، جو پیر ہی کو نہیں؛ مرید کو بھی مستحضر رکھنے کے لائق ہے، ورنہ تو یہ سلسلۂ مبارکہ بھی لغو و بے سود ہو کر رہ جائے گا۔ العیاذ باللہ۔ (مرتب)۔

مزارات پر فاتحہ ہاتھ اُٹھا کر نہ پڑھتے، نہ سر جھکاتے، مردوں کا کھانا، ہنود اور اہل تشیع کی دعوت قبول نہ فرماتے، آپؒ فرماتے کہ ’’**طعام المیت یمیت القلب**۔‘‘ (یعنی میت کا کھانا قلب کو مردہ کر دیتا ہے) جن ناموں سے شرک کی بو آتی جیسے ’’حسین بخش‘‘ وغیرہ، ان سے منع فرماتے۔ آپؒ فرماتے تھے کہ ’’روزہ میں جھوٹ بولنے، غیبت کرنے اور برا بھلا کہنے سے اجتناب کیا جائے۔‘‘

والدین کے ساتھ نیکی کرنے، ہم سایہ کی خبر گیری اور سلوک کی تاکید فرماتے، آپؒ فرماتے تھے کہ ’’والدین کے انتقال کے بعد اکثر خیرات وصدقہ کرو۔‘‘ اصل کتاب میں اس کے علاوہ آپؒ کے معمولات و عادات درج ہیں، جن کو شوق ہو مطالعہ فرمائیں۔

وفات: آپؒ کی وفات ۳۰/ جمادی الاولیٰ/ ۱۲۸۹ھ میں ہوئی اور نصیر آباد کی مسجد کے متصل حضرت خواجہ دیوان احمدؒ کے روضہ میں دروازہ کے متصل دفن ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ (مہر جہاں تاب: ۷۲۷)

حضرت مولانا کرامت علی جون پوریؒ[1] متوفی ۱۲۹۰؁ھ

نام ونسب: آپؒ کا نام ''علی'' تھا، چوں کہ آپؒ سے بکثرت کرامتوں کا ظہور ہوا اس لیے لفظ ''کرامت'' آپؒ کے نام کا جز و بن گیا اور لوگ ''کرامت علی'' کہنے لگے، آپؒ کے والد کا نام ابو ابراہیم شیخ امام بخش تھا، آپؒ کا سلسلۂ نسب ۳۵ واسطوں سے خلیفۂ اوّل سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔

ولادت باسعادت: حضرت قطب الارشاد مولانا کرامت علیؒ کی ولادت باسعادت ۱۸ / محرم الحرام ۱۲۱۵؁ھ کو محلہ مُلّا ٹولہ، شہر جون پور میں ہوئی، جب کہ شہر میں اسلامی احکام کے عامل اور شریعت پر عمل پیرا بہت کم تھے، اللہ تعالیٰ نے یہ آفتابِ ہدایت اس لیے طلوع فرمایا کہ اس کے نور سے شہر ہی نہیں؛ بلکہ پوار ملک روشن ہوجائے، چنانچہ آپؒ کی ذاتِ بابرکات سے خلق کثیر کو فیض ونفع دینی پہنچا۔ **ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔**

---

[1] حضرت مولانا عبدالباطن صاحب جو حضرت مولانا کرامت علی صاحبؒ کے پوتے ہیں، انہوں نے مولانا کی سیرت لکھی ہے، اس کو سامنے رکھ کر مولاناؒ کے حالات و ارشادات درج کررہا ہوں، اللہ تعالیٰ مفید بنائے، آمین۔

حضرت مولانا عبدالباطن صاحب حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی خدمت میں فتح پور تال نرجا ضلع مئو تشریف لے گئے تھے، جس سے حضرتؒ بہت مسرور ہوئے اور آپ کی خصوصی ضیافت فرمائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (مرتب)۔

ابتدائی تعلیم: جب حضرت مولاناؒ کسی قدر سن شعور کو پہنچے تو آپؒ کے والد ماجدؒ نے اپنے خاندان کے دستور کے مطابق اولاً پارۂ عم کی تعلیم باقاعدہ شروع کرائی، حافظہ قوی تھا، اس لیے پارۂ عم چند ایام میں حفظ کرلیا اور ساتھ ہی ساتھ نماز کے اَرکان وصفات، سُنن وواجبات، آداب ومستحبات، دعا وثنا اور درود وتسبیحات وغیرہ کو اَزبر کرلیا، چوں کہ مولاناؒ کے والد ماجدؒ اس بد دینی کے دور میں بھی شریعت کے پابند اور سنت کے متبع تھے، لہٰذا جب مولاناؒ سات سال کے ہوئے تو حسب ارشادِ نبیٔ پاک ﷺ نماز کے لیے کھڑا کردیا، اس کا یہ اثر ہوا کہ دس سال کی عمر تک پہنچتے مولاناؒ نماز کے پابند ہی نہیں؛ بلکہ عاشق بن گئے۔

تکمیل علوم: والد ماجدؒ سے ابتدائی تعلیم کے بعد دیگر باکمال اساتذہ اور مشاہیر علماء کی خدمت میں بغرضِ تحصیل وتکمیل حاضر ہوئے اور علوم وفنون میں درجۂ کمال حاصل کیا، چنانچہ علومِ دینیہ مولانا قدرت اللہ ردولویؒ سے، علم حدیث مولانا احمد اللہ اَنامیؒ سے، علمِ معقولات مولانا احمد علی چریاکوٹیؒ سے، علمِ تجوید قاری سید ابراہیم مدنیؒ اور قاری سید محمد اسکندرانیؒ سے علماً وعملاً حاصل کیا۔

فن کتابت: حضرت مولاناؒ نے خوش نویسی کے فن کو حافظ عبدالغنی صاحبؒ سے حاصل کیا تھا، حضرت مولاناؒ چاول کے ایک دانہ پر پوری سورۂ اخلاص مع بسم اللہ لکھتے تھے اور آخر میں اپنا نام بھی لکھ دیتے تھے، خوبی یہ تھی کہ حروف نہایت صاف، خوشخط اور واضح ہوتے تھے کہ دیکھنے والے حیرت کرتے تھے۔

فن سپہ گری: حضرت مولاناؒ کا کمال تھا کہ تحصیل علومِ دینیہ کے ساتھ فرصت کے وقت فن سپہ گری بھی حاصل کرنے جاتے تھے، چنانچہ بہاری نامی سنار جو اس

فن میں ماہر اور استاذ کہلاتا تھا اس کے مکان پر جاتے اور اس کے گھر اگر پانی کی ضرورت ہوتی تو پانی بھر دیتے، اس کے بعد اکھاڑہ میں اُترتے تھے، اس عمل سے وہ بہت خوش رہتا تھا اور تعریف کرتا تھا، جس کی وجہ سے اس نے آپؒ کی طرف خصوصی توجہ دی اور اس فن میں مہارت وکمال حاصل ہوگیا، چنانچہ اس کے ذریعہ بعض دفعہ دشمنوں کے نرغہ میں آجانے کے بعد خود کو بچالیا، چوں کہ استاذ کی خدمت کر کے اور اس کو خوش کر کے فن کو حاصل کرنا حضرت مولاناؒ کا ہمیشہ کا معمول تھا اس لیے روزانہ اس سرعت سے کام میں ترقی ہوتی کہ دیکھنے والوں کو تعجب ہوتا۔

ف: مولاناؒ کے خلوص اور ادب واحترامِ اساتذہ کے ثمرات وبرکات کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا ہی میں دکھلایا کہ لاکھوں آدمی آپؒ کی ذات سے ہدایت یاب ہوئے اور دین اسلام کے پابند بلکہ حامی وشیدائی ہوگئے، آپؒ کی تصنیفات سے بھی بے حد نفع ہوا اور اب بھی ہو رہا ہے، ماشاء اللہ آپؒ کی اولاد واحفاد (پوتوں) میں بھی ایسے باکمال حضرات پیدا ہوتے رہے جن سے امت کو دینی نفع پہنچتا رہا اور پہنچ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قائم رکھے۔ آمین۔

غور فرمایئے کہ مولاناؒ کا تو یہ حال تھا کہ لاٹھی وبنوٹ کے استاذ کی بھی غایت درجہ رعایت وخدمت کرتے تھے، مگر اب حال یہ ہے کہ مدارسِ عربیہ کے طلبہ اپنے قرآن وحدیث کے اساتذہ تک کی تعظیم وتوقیر تو کیا تحقیر وتذلیل تک کا معاملہ کرتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ علم وعمل سے کورے کے کورے ہی رہ جاتے ہیں، اگر کسی درجہ میں علمِ ظاہر حاصل بھی ہو جاتا ہے تاہم عمل سے تو کوسوں دور ہی

رہتے ہیں، رہا کیف وحال، تو اس کا تو سوال ہی نہیں، عارفِ رومیؒ نے کیا خوب فرمایا:

علمِ رسمی سر بسر قیل ست و قال نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

یعنی علمِ رسمی وظاہری سے فقط گفت وشنید، نوشت وخواند اور سوال وجواب کا ڈھنگ تو آجاتا ہے، رہا باطنی حال وکیف، یعنی تقویٰ اللہ اور خشیت الٰہی، توکل وتواضع جیسی صفات وعادات ایسے علم سے میسر نہیں ہوتیں، چنانچہ ایسے غیر نافع علم سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پناہ مانگی ہے، اس لیے کہ علمِ نافع وہ ہے جو خشیت الٰہی اور تقویٰ کا باعث ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {**إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا**} یعنی اللہ تعالیٰ سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو اس کی عظمت کا علم رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنا خوف وخشیت دے کر ہمارے علم کو نافع بنا دے۔ آمین۔ (مرتب)

باطنی تربیت: جب آپؒ کی عمر اٹھارہ سال کی ہوئی تو دل میں درستگیٔ اخلاق اور اصلاحِ باطن کا تقاضا پیدا ہوا، اس وقت جامع البرکات، محی السنۃ حضرت سید احمد شہیدؒ کی ہدایت کا آفتاب طلوع ہو کر ضوفشانی کر رہا تھا، تو مولاناؒ اپنے والد ماجدؒ سے اجازت لے کر حضرت سید صاحبؒ کے آستانۂ فیض پر پہنچے، اس وقت علماء کی ایک جماعت کو وہاں پایا، جو سب کے سب تعلق مع اللہ کے ایک ہی خیال اور ایک ہی دُھن میں باہم متحد تھے۔

ادھر حضرت سید صاحبؒ نے ایک ہی نگاہ اور اوّل ہی ملاقات میں مولاناؒ کو پرکھ لیا اور بیعت سے مشرف فرما کر داخل سلاسل عالیہ کر لیا اور اوّل ہی ہفتہ

میں فرمایا: ''اب ہدایت کے کام میں لگ جاؤ'' اور خلافت نامہ و شجرہ بتوسط حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلویؒ عطا فرمایا، جو اب تک ہمارے (یعنی مولانا عبدالباطن صاحبؒ کے) خاندان میں محفوظ ہے۔

اثنائے قیامِ رائے بریلی میں حضرت سید صاحبؒ سے اٹھارہ دن تک تعلیم تصوف اور توجہ باطنی لیتے رہے، مرشد کامل اور لائق مرید کی یہ اٹھارہ روزہ صحبت بقول ایک صاحب دل بزرگ کہ یہ اٹھارہ روز اٹھارہ سال کی قوت رکھتے تھے، چنانچہ حضرت سید صاحبؒ نے باطنی توجہ اور قلبی تصرف سے اٹھارہ روز میں مولاناؒ کو تمام مقاماتِ سلوک طے کرا دیے۔

دعوت و تبلیغ: جب مولانا اپنے شیخ سے رخصت ہو کر اپنے وطن جون پور تشریف لائے تو دعوت و اصلاح کے کام میں مزید سرگرم ہو گئے اور بڑی کوششوں سے مسجدوں میں پانچوں وقت اذان و نماز و جماعت جاری کرائیں۔

مسلمانانِ جون پور کے دین کی حفاظت کے لیے جامع مسجد جون پور میں بعد نمازِ جمعہ وعظ کا سلسلہ قائم کیا، جس سے اہل جون پور کو بہت نفع ہوا۔ خود مولانا کرامت علی صاحبؒ نے اپنی کتاب ''زاد التقویٰ'' میں جون پور کی دینی حالت کے بارے میں لکھا ہے:

''مسجدوں کا یہ حال تھا کہ لوگ ناچ کرواتے اور ہندوؤں کی بارات اُترتی اور شراب پیتے تھے۔'' (زاد التقویٰ)

جامع مسجد جون پور جو ابراہیم شرقی نے تعمیر کرائی تھی، جس میں خود شیخ نمازِ پنج گانہ ادا کرتے تھے اور علماء کی نوسو پالکیاں نمازِ جمعہ کے لیے آتی تھیں اس کا یہ

حال تھا کہ وہاں مویشیاں باندھی جاتی تھیں اور لید و گوبر کا اس میں انبار رہتا تھا، پھر دوسری مساجد کی زبوں حالی کا خود اندازہ لگا لیجیے۔

جون پور اور اس کے نواحی میں کام کرنے کے بعد سید صاحبؒ کے ارشاد کے مطابق بنگال تشریف لے گئے اور جب تک آپؒ بقید حیات رہے وہاں دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہے، مولاناؒ نے ۷۵ سال کی عمر پائی، جس میں تقریباً ۵۱ سال بنگال، آسام اور ان کے قرب و جوار میں دعوت و تبلیغ کا کام کرتے ہوئے گزرے، ماشاء اللہ تعالیٰ خوب کام ہوا، چنانچہ ''مشاہیر جون پور'' میں ہے:

در ملک بنگال لکھوکھا مردم دست گرفتۂ ایشانند، شاید قریہ و بلدہ باقی نبودے کہ دراں مریداں و مستفیضانِ فیض نماندے۔	بنگال میں لاکھوں آدمی مولانا کے حلقۂ ارادت میں داخل ہیں، کوئی شہر اور کوئی بستی باقی نہ ہوگی جہاں مولانا کے ارادت منداور فیض یافتہ موجود نہ ہوں۔

معاندین کا مکر: ہاں، اثنائے دعوت و تبلیغ دشمنانِ دین سے بھی سابقہ پڑا، جو مبلغین اور واعظین کو یہ کہہ کر عار و شرم دِلاتے کہ ان مبلغین کی دینی جد و جہد روپئے کمانے، دنیا حاصل کرنے اور تحصیل زر کے لیے ہے، اس طرح وہ عوام کی توجہ واعظین سے ہٹانا چاہتے تھے اور دوسری طرف واعظین کو غیرت دِلا کر اس کام سے باز رکھنا بھی چاہتے تھے، چنانچہ اس جدید طرز کے معاندین کے متعلق مولاناؒ فرماتے ہیں:

''چنانچہ کسی کسی مقام پر اس منافقانہ پروپیگنڈہ کا یہ اثر بدظاہر بھی ہوا کہ واعظوں میں تساہلی شروع ہوگئی اور ہدایت یافتہ عوام بگڑنے لگے۔'' ظاہر ہے کہ

اس سے مولانا کو کس قدر قلق وصدمہ ہوا ہوگا؛ مگر مولاناؒ ہمت نہ ہارے، نہ ان کے عزم واستقلال میں ذرا فرق آیا، بلکہ دوبارہ اُن گم کردۂ راہ کو راہِ شریعت پر لانے کی کوشش میں لگ گئے اور چھ ماہ کی جد و جہد میں پہلے سے زیادہ کامیاب ہوئے، اس کامیابی کو اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ مولاناؒ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

علمِ دین کو حاصل کریں: ''بارے الحمدللہ کہ جب یہ خاکسار ایسے ایسے مقاموں پر پہنچا اور وعظ سنایا تو پھر ہزاروں آدمی مرید ہو گئے اور چھ مہینے کے دورے اور سیر میں ہم نے ایک لا مذہب اور گمراہ کرنے والا بدعتی نہ دیکھا، سب بھاگ گئے، تو اب مسلمانوں کو لازم ہے؛ بلکہ ان پر واجب ہے کہ دین کے علم کو طلب کریں۔''

دینی مصلحت کے پیشِ نظر سلسلۂ وعظ ونصیحت کو جاری رکھنے کے لیے مولاناؒ واعظین اور عوام کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

وعظ کی ضرورت: ''وعظ ونصیحت سننے سنانے کی اس زمانے میں بڑی ضرورت ہے، کہ لوگ غافل وجاہل ہو رہے ہیں، وارث الانبیاء علیہم السلام سے وعظ سنیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی نیت سے ان کی عزت اور قدر کے لائق ان کی خدمت گذاری ایسی کریں کہ وہ لوگ ذلت وتنگ دستی سے محفوظ رہیں۔''

(مراد المریدین)

ف: اہلِ مال کو ضروری نصیحت فرمائی، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے، آمین (مرتب)

مولاناؒ کے مفید ارشادات وملفوظات: ذیل میں مولاناؒ کے مفید، کار آمد اور ناصحانہ مختصر اقوال کو مختلف مقامات سے چن کر ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں، ان

ارشادات کی ترتیب میں کسی خاص موضوع کی رعایت نہ ہوگی، واضح رہے کہ یہ ارشادات مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں سے چنے گئے ہیں۔

(۱) جب تک ہر مومن شخص اپنے سارے مقدمہ اور معاملہ میں شریعت محمدی کی طرف رجوع نہ کرے گا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے سارے مقدمہ اور معاملہ میں حَکَم نہ مقرر کرے گا اور مقدمہ اور معاملہ کا جو فیصلہ ان کی شریعت میں نکلے گا، اس کو دل کی خوشی سے قبول نہ کرے گا تب تک وہ شخص مومن نہ ہوگا۔

(حضرت مولانا کرامت علی صاحب جون پوریؒ:۱۳۶)

ف: اس ارشاد کی صحت وخوبی میں کیا شک، جب کہ متعدد آیات واحادیث سے مؤید ومدلل ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارے اکابر ایسی بات کہنے ہی کیوں لگیں جو کتاب وسنت سے ثابت نہ ہو۔ (مرتب)۔

(۲) جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ باطنی باتوں کی تعلیم کا بیان کتاب میں نہیں ہے، سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں، سو غلط ہے، کیوں کہ جو بات کتاب میں نہیں ہے وہ قابل اعتبار نہیں ہے اور دین کی بات نہیں ہے۔

ف: سبحان اللہ! کیسی معرفت کی بات ارشاد فرمائی، جس کا حاصل یہ ہے کہ طریقت وحقیقت کی وہ باتیں جن کی اصل شریعت یعنی کتاب وسنت میں نہیں ہے ان کا کچھ اعتبار نہیں؛ بلکہ وہ لغو وباطل ہیں۔ خوب سمجھ لو۔ (مرتب)۔

(۳) نیک لوگوں کی صحبت نیک کام سے بہتر ہے اور بدلوگوں کی صحبت بدکام سے بدتر ہے۔

ف: اس لیے کہ بری صحبت بہت سی بری باتوں کی جڑ اور پیش خیمہ ہے، جب کہ

اچھی صحبت بہت سی نیکیوں کی اصل اور سر چشمہ ہے، جیسا کہ اس کا تجربہ بلکہ مشاہدہ ہے۔(مرتب)

(۴) بدعتی کی صحبت کا فساد کافر کی صحبت کے فساد سے زیادہ ہے اور بدعتی فرقوں میں سے بہت برے فرقے وہ ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے بغض رکھتے ہیں۔

ف: ظاہر ہے کہ جب اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بغض ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقیدت ومحبت کیسے قائم رہ سکتی ہے؟ اور جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر لعن طعن کیا جائے گا تو پھر دین ہی پر کب اعتماد واطمینان برقرار رہ سکتا ہے؟ اس لیے کہ سارا دین تو صحابہ رضی اللہ عنہم ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، جب وہ حضرات مطعون ہوں گے تو پھر دین بھی مشکوک ہو جائے گا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

(۵) دنیا مانند سایہ کے ہے اور آخرت مانند آفتاب کے ہے، سو سایہ کی طرف کتنا ہی کوئی جائے اس کو پکڑ نہ سکے گا اور جب آفتاب کی طرف جائے گا تب سایہ خود اس کے ساتھ روانہ ہوگا۔

ف: سبحان اللہ! اس مثال کے ذریعہ دنیا وآخرت کی حقیقت وحیثیت کو کتنے سہل اور احسن طریقے سے سمجھایا ہے، جو اہل اللہ ہی کا حصہ ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو سمجھ دے، آمین۔(مرتب)

(۶) اولیاء لوگوں میں سے بعضوں نے جو دنیا کو قبول کر لیا ہے تو اس نیت پر کہ غیروں کو فائدہ پہنچائیں۔

ف: چنانچہ حکایت ہے کہ ایک شخص ایک بزرگ کی خدمت میں گیا، وہاں ان

کی دولت وثروت کو دیکھ کر فی البدیہ یہ مصرع پڑھا: ع

”نہ مرد است آں کہ دنیا دوست دارد“

یعنی وہ شخص ولی اللہ نہیں ہوسکتا جو دنیا سے محبت کرتا ہے۔

پھر اس نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور ایک صاحب حق نے اس کو پکڑا کہ ہمارے حق کو ادا کرو، جب پریشان ہوا تو وہ بزرگ آئے اور اپنے پاس سے اس حق کو ادا کر کے اس کو سبک دوش کر دیا، جب وہ بیدار ہوا تو نادِم ہوا اور بزرگ کی خدمت میں آیا اور معافی مانگی، تو ان بزرگ نے فرمایا کہ ”تم نے جو مصرع پڑھا تھا اس کو پڑھو“، جب اس کو پڑھا تو ان بزرگ نے فرمایا کہ ”اس کے ساتھ یہ مصرع ملا لو، تاکہ مکمل شعر ہو جائے:

”اگر دارد برائے دوست دارد“

یعنی اگر اس کے پاس مال و دولت ہے تو وہ دوستوں کے لیے ہی رکھتا ہے، اب پورا شعر ہو گیا:

نہ مرد است آں کہ دنیا دوست دارد — اگر دارد برائے دوست دارد

(مرتب)

(۷) اگر کوئی عالم کسی درویش یا مجذوب کا خلافِ شرع کام دیکھ کر اس سے انکار کرے اور اس بے شرع شخص کی بات جو خلافِ شرع ہے اس کو نہ مانے تو اس کو کچھ ڈر نہیں؛ بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے مددگار رہیں۔

ف: اس ارشاد میں اس زمانہ کے عوام بلکہ نام کے خواص کے نظریہ وعقیدہ کا علاج ہے، اس لیے کہ بہت سے خانقاہ کے پیر یا جماعت کے امیر علانیہ خلافِ

شرع امور کے مرتکب ہیں، مگر اس کے باوجود ان کے مریدین ومعتقدین ان پر نکیر کرنے سے ڈرتے ہیں کہ پیر صاحب ناخوش ہو جائیں گے؛ بلکہ بہت سے بدعقیدہ تو ایسے ہیں کہ کتاب وسنت کے صریح خلاف ہونے کے باوجود پیر صاحب یا عالم صاحب کی ولایت کا دم بھرتے ہیں اور مردِ حق گو ہی کو گمراہی کی طرف منسوب کرتے ہیں، توبہ توبہ، کس قدر گمراہی کی بات ہے۔ فیا ویلاہ و یا حسرتاہ۔ (مرتب)۔

(۸) کوئی عالم اپنا خرچ مسلمانوں سے لینے میں اپنی بے غیرتی سمجھے اور لوگوں میں مطعون ہونے کے خوف سے وعظ ونصیحت کرنا چھوڑ کے دوسری نوکری چاکری جو اکثر اس زمانے میں مکروہ ومشکوک ہے اختیار کرے تو یہ وسوسۂ شیطانی اور نفسانیت ہے۔

ف: یعنی اس طرح شیطان دین کے کام سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ (مرتب)

(۹) نیک بات بجائے صدقہ کے ہے؛ بلکہ صدقہ سے بہتر ہے۔

ف: اس لیے کہ مالی صدقہ سے تو مخلوق کو دنیوی نفع حاصل ہوتا ہے اور نیک بات سے دینی وایمانی نفع نصیب ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ہزار درجہ اعلیٰ وافضل ہے۔ (مرتب)

(۱۰) اہل اللہ کا طریقہ آدمی کے نفس کے تزکیہ اور نفس کے فساد کی اصلاح کے واسطے ہوتا ہے، اور نفس کا فساد ہر ملک اور ہر زمانہ میں بدلا کرتا ہے، اسی واسطے اہل اللہ کا طریقہ بھی اس وقت کے لوگوں کے نفس کے فساد کی اصلاح کے مناسب ہوا کرتا ہے۔

ف: بالکل صحیح ہے، اللہ تعالیٰ ہی اہل زمانہ کے حال کے مطابق علاج بھی القا

فرماتے ہیں۔(مرتب)۔

(۱۱) ضروری ہے کہ مبتدی اپنے دن ورات کے سارے وقتوں میں سے ایک وقت قرآن کی تلاوت کے واسطے مقرر کردے۔

ف: تلاوتِ قرآن مبتدی و منتہی سبھی کو کرنا چاہیے، اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں، کیوں کہ اذکار میں سب سے زیادہ قربِ الٰہی تلاوتِ قرآن ہی سے نصیب ہوتا ہے، اس لیے اس سے خواہ مبتدی ہو یا منتہی کوئی مستثنیٰ نہیں ہوسکتا۔(مرتب)۔

(۱۲) اس خاکسار نے خوب تجربہ کیا ہے کہ جب فضول کام میں آدمی گرفتار ہوتا ہے تب اس کی سابق پرہیزگاری بھی جاتی رہتی ہے، سو آدمی سے جب کوئی فضول کام ہو پڑے تو فی الفور توبہ کرے، پھر فضول کام کے پاس نہ جائے۔

ف: حدیث پاک ہے: ”**مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ۔**“ یعنی آدمی کے حسن اسلام سے یہ بات ہے کہ لایعنی (فضول) قول و فعل کو ترک کردے۔(مرتب)۔

(۱۳) عمدہ لباس لوگوں کو دِکھانے کے واسطے پہننے میں خواہش نفسانی ہے اور موٹے کپڑے پہننے میں رِیا ہے، تو کپڑا نہ پہنے، مگر اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت پر یعنی موٹا کپڑا یا عمدہ، ہر طرح کے لباس میں اللہ تعالیٰ کی رضا منظور ہو تو کوئی حرج نہیں۔

صاحب عوارف کہتے ہیں کہ ہم کو خبر پہنچی ہے کہ حضرت سفیان ؒ نے اُلٹا کُرتا پہنا اور ان کو اس بات کی خبر نہ تھی، یہاں تک کہ دِن ہوا اور بعض لوگوں نے ان کو اس بات کی خبر دی، تب انہوں نے قصد کیا کہ کُرتے کو اُتار دیں اور سیدھا

کر کے پہنیں، پھر باز رہے اور کہا کہ میں نے اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت پر پہنا تھا، سواب میں اس کو سیدھا کر کے آدمیوں کو دِکھانے کی نیت پر نہ پہنوں گا۔

ف: سبحان اللہ! ہمارے اکابر کو عادات تک میں نیت کی درستگی کا کس قدر اہتمام تھا، تو پھر عبادات میں کتنا اہتمام فرماتے ہوں گے، یہ اس لیے کہ شریعت میں تصحیح نیت اور اخلاص پر بے حد زور دیا گیا ہے، حضور B کی مشہور حدیث کا ابتدائی کلمہ یہ ہے: ''إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَاَّتِ۔'' (یعنی اعمال کی صحت اور اجر وثواب کے حصول کا مدار نیتوں پر ہی ہے) اسی لیے ہمارے اکابر اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کی دولت سے بڑھ کر کوئی دولت نہ سمجھتے تھے اور اس کے مقابلہ میں رضاءِ مخلوق کی ذرا پروانہ فرماتے تھے، چنانچہ ان کے حال کی ترجمانی کرتے ہوئے شیخ سعدیؒ یوں فرمارہے ہیں:

ندارند چشم از خلائق پسند   که ایشاں پسندیدۂ حق بس اند

یعنی اہل اللہ مخلوق سے پسندیدگی کی اُمید نہیں رکھتے، اس لیے کہ ان کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب وپسندیدہ ہیں۔ (مرتب)۔

(۱۴) حقیقت یہ ہے کہ ذکر سے مقصود اصلی اطمینانِ قلب اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا حاصل ہونا ہے، غیبی صورتوں، نوروں اور رنگوں کا دیکھنا مقصود نہیں ہے اور نہ ہی اس واسطے ذکر مقرر ہوا ہے۔

ف: سبحان اللہ! ذکر کے مقصود کی خوب ہی وضاحت فرمادی، ورنہ عموماً غیبی صورتوں اور رنگوں ہی کے دیکھنے کو مقصودِ ذکر سمجھا جاتا ہے اور اس غلطی میں عمر گزر جاتی ہے اور مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ (مرتب)۔

(۱۵) عید کے روز کی سوئیں کو خاکسار نے بریلی میں حضرت مرشد سے پوچھا تھا، ہنس کے فرمایا کہ ''مولانا! کھانے پینے میں بدعت نہیں ہوتی اور عید کے روز میٹھا کھانا مسنون ہے، سوئیں بھی اسی میں داخل ہے۔''

ف: حضرت سید صاحبؒ جو ماحیٔ بدعت ومحیٔ سنت تھے انہوں نے یہ مسئلہ صاف فرمادیا، اس لیے عید کے دِن سوئیں پکانے میں کچھ مضائقہ نہیں، لہٰذا بعض لوگ جو شب براءت کے حلوے پر اس کو قیاس کرتے ہیں وہ صحیح نہیں۔ (مرتب)

(۱۶) ارشاد فرمایا کہ نماز مومنوں کی معراج ہے، کہ اس کے سبب سے بندہ اللہ تعالیٰ کے قرب کے مکان میں پہنچ جاتا ہے اور نماز اللہ تعالیٰ کے دیدار کے مقام کی خبر دیتی ہے، نماز میں اس کے دیدار کی بو آتی ہے، یہ بات کسی اور عبادت میں حاصل نہیں۔ (سیرتِ مولانا کرامت علیؒ: ۱۴۱)

ف: اس ارشاد سے نماز کی اہمیت ونافعیت ظاہر ہے، لہٰذا نماز کا خوب اہتمام کرنا چاہیے۔ (مرتب)۔

اب ہم حضرت مولانا کرامت علیؒ کا وہ خلافت نامہ پیش کرتے ہیں جو سید احمد بریلوی صاحبؒ نے انہیں عطا کیا تھا، اس کا متن مع ترجمہ یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خلافت نامہ

(مرقومہ: دویم ماہِ شعبان ۱۲۳۹ھ)

از فقیر سید احمد بر ضمیر صفا پذیر طالبانِ راہِ حضرتِ حق و سالکین طریق	فقیر سید احمد کی طرف سے حضرتِ حق کی راہ کے طالبوں اور ہادیٔ

آں ہادئ مطلق عموماً و کسانیکہ بایں
فقیر للہ و فی اللہ حاضرانہ و یا غائبانہ
محبت می دارند خصوصاً پوشیدہ نماند کہ
مقصود از بیعت بردست مشائخ
طریقت ہمیں است کہ راہِ
رضامندئ حضرتِ حق بدست آید، و
راہِ رضامندی منحصر در اتباعِ
شریعتِ غراء است، ہر کہ سوائے
شریعت مصطفویہ را طریق تحصیل
رضامندئ حق انگارد بے شک
کاذب و گمراہ و دعوئ او باطل و نا
مسموع۔ و اساسِ شریعت مصطفویہ
دو امر ست، اوّل ترکِ اشراک،
ثانی ترکِ بدعات، اما ترکِ
اشراک پس بیانش آں کہ ہیچ کس را
از ملک و جن و پیر و مرشد و استاذ و
شاگرد و نبی و ولی حلالِ مشکلاتِ خود
نہ پندارد، و حاجاتِ خود را از کسے از
ایشاں طلب نہ نماید، ہیچ کس را

مطلق کے طریق کے سالکوں پر
عموماً اور اس فقیر کے ساتھ للہ و فی
اللہ، حاضرانہ و غائبانہ محبت رکھنے
والوں پر خصوصاً پوشیدہ نہ رہے کہ
مشائخ طریقت کے ہاتھ پر بیعت
سے مقصود یہی ہے کہ حضرتِ حق کی
رضامندیوں کا طریقہ میسر ہو، اور
حضرتِ حق کی رضامندیوں کا
طریقہ شریعت غراء کی اتباع میں
منحصر ہے، جو شخص شریعت مصطفویہ
کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ حضرتِ
حق کی رضامندی کا گمان کرے
بے شک وہ شخص کاذب و گمراہ ہے
اور اس کا دعویٰ باطل اور نا قابل
سماع ہے۔ اور شریعت مصطفویہ کی
بنیاد دو باتوں پر ہے، اوّل ترکِ
اشراک اور ثانی ترکِ بدعات،
ترکِ اشراک کا مطلب یہ ہے کہ
فرشتہ و جن، پیر و مرشد، استاذ و

قادر برحل مشکلات و رفع بلیات و تحصیل منافع نداند، و ہمہ را مثل خود در جنب قدرت و علمِ حضرتِ حق عاجز و نادان شمارد، و ہرگز بنا بر طلب حوائج خود نذر و نیاز کسے از انبیاء و اولیاء و صلحاء و ملائکہ بجا نیارد، آرے ایں قدر داند کہ ایشاں مقبولانِ بارگاہِ صمدیت اند، و ثمرۂ مقبولیت ایشاں ہمیں است کہ در بابِ تحصیل رضامندئ پروردگار اتباعِ ایشاں باید کرد، و ایشاں را پیش وایانِ ایں طریق باید شمرد، نہ آں کہ ایشاں را قادر بر حوادثِ زماں و عالم السر و الاعلان داند کہ ایں امر محض کفر و شرک است، ہرگز مومن پاک را ملوث باں شدن جائز نیست۔

واما ترکِ بدعات پس بیانش آں کہ در جمیع عبادات و معاملات و امورِ معاشیہ و معادیہ طریق خاتم الانبیاء

شاگرد اور نبی و ولی میں سے کسی کو اپنی مشکلات کا حل کرنے والا نہ سمجھے اور ان میں سے کسی سے اپنی مرادیں اور ضرورتیں نہ مانگے اور کسی کو بھی نفع پہنچانے اور بلا و مصیبت کو دور کرنے اور مشکلات کے حل کرنے پر قادر نہ سمجھے، اور سب کو اپنی طرح حضرتِ حق کے علم و قدرت کے مقابلہ میں عاجز و ناداں جانے اور ہرگز اپنی حاجت روائی کے لیے انبیاء، اولیاءس، صلحاء یا ملائکہ میں سے کسی کی نذر و نیاز نہ کرے، ہاں، اس قدر سمجھے کہ یہ سب جنابِ صمدیت کے مقبول ترین بندے ہیں، ان کی مقبولیت کا ثمرہ بس یہ ہے کہ اللہ رب العزت کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے ان کی اتباع کریں اور پیشوائے طریق انہیں سمجھیں،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابکمالِ قوت و علو ہمت باید گرفت، و آنچہ مردمان بعد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قسمِ رسوم اختراع نمودہ اند مثل رسومِ شادی و ماتم و تجمل قبور و بنائے عمارات براں و اِسراف در مجالس اعراس و تعزیہ سازی و امثالِ ذلک ہرگز پیرامون آں نباید گرد، و حتی الوسع در محو کردنِ آں سعی باید کرد، اوّل خود ترک باید نمود، بعد ازاں ہر مسلمان را بسوئے آں دعوت باید کرد، چنانکہ اتباعِ شریعت فرض است، ہمچنیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر نیز فرض است، چوں ایں امر ذہن نشین شد پس جمیع طالبانِ حق را باید کہ ہمیں امور را پیش نظر خود ساختہ با یک دیگر بیعت نمایند، خصوصاً مولوی صاحب مستعد ہدایت مسلمین چالاکِ میدانِ ارشاد و تلقین مولوی

یہ نہیں کہ ان کو حوادثِ زمانہ پر قادر اور ہر غیب و شہود کا عالم سمجھا جائے، اس لیے کہ یہ امر محض شرک و کفر ہے اور ہرگز مومن پاک کو اس بد اعتقادی کے ساتھ ملوث ہونا جائز نہیں۔ اور ترکِ بدعات کا مطلب یہ ہے کہ تمام عبادات و معاملات اور امورِ معاشیہ و معادیہ میں خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ کو پوری قوت اور بلند ہمتی کے ساتھ پکڑا جائے اور جو کچھ دوسرے لوگوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد از قسم رسومات کے گھڑ لیا ہے جیسے شادی اور غمی کی رسمیں اور قبروں کا آراستہ کرنا، اس پر عمارتیں بنانا، عرس کی محفلوں میں اِسراف کرنا اور تعزیہ سازی نیز اسی قبیل کے دوسرے مخترعات (گھڑی ہوئی چیزیں) ہرگز ان کے گرد و پیش نہ

کرامت علی صاحب جون پوری اعانہم اللہ کہ بردست ایں فقیر بیعت نمودہ اند، و ایں فقیر ایں امور را روبروئے ایشاں کما حقہ اظہار نمودہ و ایشاں را مجاز باخذ بیعت و تعلیم اشغال از جانب خود نمودہ، پس برذمۂ ایشاں لازم است کہ اول خود تمسک بامورِ مذکور الصدر نمایند، و قلب و قالب خود را متوجہ بسوئے حق کنند، و اتباعِ شریعت غراء را ظاہراً و باطناً پیش گیرند، و تمامی انجاسِ اشراک و اَلواثِ بدعات را از خود دور نمایند، و بعد ازاں جمیع طالبانِ حق را بسوئے آں ترغیب کنند، و در اخذ بیعت بردست خود از خود ساعی شوند، و ترغیب وافر نمایند، ہرگز انجام ازاں نہ نمایند، چہ دریں بیعت کہ بردست یارانِ فقیر واقع خواہد شد فائدہ شدنی است،

گھومنا چاہیے، اور حتی الوسع ان چیزوں کے مٹانے کی کوشش کرنی چاہیے، پہلے تو خود چھوڑنا چاہیے، پھر ہر مسلمان کو اس کی دعوت دینی چاہیے، اس لیے کہ جیسے شریعت کا اتباع فرض ہے اسی طرح اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے منع کرنا بھی فرض ہے۔ جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی تو تمام طالبین حق کو چاہیے کہ ان ہی امور کو اپنے پیش نظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے بیعت کریں، خصوصاً مولوی صاحب ہدایت المسلمین میں چست اور تبلیغ و ارشاد کے شہ سوار ہیں، یعنی مولوی کرامت علی صاحب جون پوری (اللہ تعالیٰ ان کا مددگار رہنے) جنہوں نے کہ اس فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور فقیر نے ان امور کو ان کے روبرو کما حقہ

ان شاء اللہ کلمہ گویاں از رسومِ شرک پاک خواہند شد و تعظیم شرعِ شریف در دلِ ایشاں جا خواہد گرفت، و فقیر دعاہا خواہد کرد کہ آں بیعت مثمر ثمراتِ جمیلہ و جزیلہ گردد در تعلیم و تفہیم طالبان سعی بدل و جان نمایند، و از ایشاں اخذ بیعت کنند و ایشاں را تعلیم اشغال فرمایند، حق جل و علا ایں فقیر را و جمیع مخلصین و محبین ما را در زمرۂ موحدین و مخلصین و متبعین شریعت غراء گرداند و آمین۔

(مہر سید احمد)

واضح کر دیا ہے، اور ان کو بیعت لینے اور اشغال کی تعلیم دینے میں اپنی جانب سے مجاز کیا ہے، ان کے ذمہ لازم ہے کہ پہلے خود امورِ مذکور الصدر پر مضبوطی سے عمل کریں اور اپنے قلب و جسم کو حق تعالیٰ کی جانب متوجہ کریں اور شریعت غراء کی اتباع کو ظاہراً و باطناً سامنے رکھیں اور شرک کی تمام نجاستوں اور بدعات کی گندگیوں کو خود سے دور رکھیں، اس کے بعد طالبین حق کو اس کی طرف راغب کریں اور-----

-----اپنے ہاتھ پر بیعت لینے میں اپنی جانب سے کوشش کریں اور پورے طور پر رغبت دلائیں، ہرگز اس میں دریغ نہ کریں، کیوں کہ اس بیعت میں جو کہ فقیر کے دوستوں کے ہاتھ پر واقع ہوگی فائدہ کی کامل توقع ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ کلمہ گو رسومِ شرک سے پاک ہوں گے اور شرعِ شریف کی عظمت ان کے دل میں جاگزیں ہوگی، اور فقیر دعائیں کرتا رہے گا کہ وہ بیعت گراں قدر نیک ثمرات کی باعث ہو، مریدین و طالبین کی تعلیم و تزکیہ میں دل و جان سے کوشش کریں اور ان سے بیعت لیں اور ان کو تزکیۂ نفس کے طریقے تعلیم فرمائیں، حق بزرگ

وبرتر اس فقیر اور ہمارے سلسلہ کے تمام مخلصین ومحبین کوموحدین ومخلصین اور متبعین شریعت غراء کے زمرہ میں کردے، آمین۔

ف: یہ خلافت نامہ ہی نہیں؛ بلکہ مستقل ایک نصیحت نامہ ہے، لہٰذا خلفاء کوتو خصوصاً اور جملہ مریدین ومسلمین کوعموماً اس کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے اور اس کے مطابق طاعات پر عمل اور بدعات سے پرہیز کرنا چاہیے۔ واللہ ولی التوفیق۔ (مرتب)

وفات: جو آفتابِ ہدایت ۱۸/محرم الحرام/۱۲۱۵ھ کو شہر جون پور میں طلوع ہوا تھا وہ اپنے نور کو ہر چہار طرف پھیلا کر اور اپنے متبرک کام کو درجۂ تکمیل تک پہنچا کر ۲/ربیع الثانی/۱۲۹۰ھ جمعہ کے مبارک دِن صبح صادق کے وقت کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے خاکِ رنگپور (بنگلا دیش) میں غروب ہوگیا۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

عالم نگر رنگ پور میں آپؒ کی خانقاہ ہے اور رنگ پور جامع مسجد بنگلہ دیش میں آپؒ مدفون ہیں۔ رحمہ اللّٰہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

(سیرتِ حضرت مولانا کرامت علی جون پوریؒ)

حضرت مولانا محمد زماں خان حیدرآبادیؒ متوفی ۱۲۹۲ھ

پرورش وابتدائی تعلیم: آپؒ محمد عمر خان شاہجہاں پوریؒ کے فرزند ہیں، آپؒ کے والد شریف زادے صالحین میں سے تھے، قانع ومتوکل تھے، قناعت وتوکل کو پسند فرماتے تھے، سپاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آپؒ کی ولادت تیسری تاریخ ماہِ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ میں ہوئی، پرورش شہر کی آب وہوا میں ہوئی، جب آپؒ سات سال کے ہوئے تو والدین کی توجہ سے قرآن شریف وابتدائی کتبِ فارسی اساتذہ سے پڑھیں۔

طلبِ علم کے لیے سفر کانپور: بارہ سال کی عمر میں آپؒ کو تحصیل علومِ عربی کا شوق ہوا، مختصراتِ صرف ونحو اور فقہ واصول سے فارغ ہو کر بیس برس کی عمر میں یعنی ۱۲۶۲ھ میں وطن سے کانپور آئے، وہاں مولانا شاہ سلامت اللہ صاحب کشفی صدیقی بدایونیؒ شاگردِ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کے درس وتدریس کا بازار گرم تھا، مولاناؒ کی خدمت میں ہندوسندھ، کابل وقندھار وغیرہ ممالک کے طلبہ مجتمع تھے، آپؒ بھی طلبہ کے زمرہ میں شریک ہوئے، تین سال تک مولاناؒ کی خدمت میں رہے، کتبِ درسیۂ معقول ومنقول سے مستفید ہوئے، حدیث وتفسیر سے بھی فراغت پائی، مولاناؒ کی زبانی سنتے تھے کہ مولانا کرامت علی محدث ومفسر جلیل القدر وحید العصر حیدرآباد دکن میں سرکارِ عالی نظام (خلّد اللہ ملکہ) کی ریاست میں عہدۂ جلیلہ پر مقرر ہیں، باوجود خدمت

سرکاری درس وتدریس کے عاشق ہیں، گھر پر صبح وشام طلبہ کو حدیث، تفسیر، فقہ اور منطق وغیرہ علوم میں تدریس فرماتے ہیں، اکثر طلبۂ افاغنہ وغیر افاغنہ آپ کی خدمت میں جاتے ہیں اور علوم وفنون سے مستفید ہوتے ہیں۔

طلبِ علم کے لیے سفر حیدر آباد: مولانا کرامت علیؒ کی تعریف سن کے آپؒ کے دل میں شوق کی آگ مشتعل (روشن) ہوئی، اور دل میں ٹھان لیا کہ ایسے فاضل عدیم المثل کی خدمت میں پہنچ کر علوم وفنون خاص کر فن حدیث کی تکمیل کروں گا۔ پھر آپؒ شہر کانپور سے روانہ ہوئے اور استاذ علامہ سے ایک خط بنام مولوی کرامت علی صاحبؒ لکھوا کے ہمراہ لیا، رامپور، فرخ آباد، بریلی، گوالیر، بھوپال اور برہان پور وغیرہ بلاد (شہروں) کی سیر کرتے ہوئے ماہِ صفر ۱۲۶۵ھ میں حیدر آباد دکن میں مع الخیر پہنچے، میر اشرف علی صاحب نقشبندی مجددیؒ کے مکان پر فروکش ہوئے، فارغ التحصیل تھے، درس وتدریس میں مشغول ہوئے اور مولانا کرامت علی صاحبؒ سے بھی ملے، مولاناؒ نے آپؒ کی خاطر مدارات کی، آپؒ بھی والد ماجد کی طرح قناعت پسند تھے، کسی کے لیے بارِ خاطر نہیں ہوتے تھے، آن بان کے ساتھ رہتے تھے، ان ہی ایام میں آپؒ کے لیے عدالت میں کوئی خدمت تجویز ہو رہی تھی، لیکن آپؒ اس خدمت کو قبول نہیں فرماتے تھے، چنانچہ آپؒ نے درس وتدریس کا سلسلہ جاری فرمایا، جس کی تفصیل اصل کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

آپؒ کے اخلاق اور انفاق فی سبیل اللہ کا معمول: آپؒ معاش کے تین حصے کرتے تھے، ایک حصہ ذاتی خرچ کے لیے، دوسرا حصہ طلبہ کے لیے اور

تیسرا حصہ والدہ صاحبہ اور دیگر اعزہ و اقارب کے لیے، آپؒ حنفی المذہب وقادری المشرب تھے، تعصب سے کوسوں دور رہتے تھے، احادیث نبوی پر کاربند، حرارتِ دین وحمیت اسلام آپؒ کے دل میں شعلہ زن تھی، معترضین کے اعتراضات کو مدلل طور سے رد کرتے تھے، کتاب ''ہدیۂ مہدویہ'' آپؒ کی حمیت کی شاہدِ عدل ہے، آپؒ صاحب التالیف والتصنیف تھے، چنانچہ آپؒ کی متعدد تالیفات ہیں: مثلاً (۱) خیر المواعظ (۲) سفینۂ بلاغت (۳) خلاصہ ماتم الملوین وسر الشہادتین عربی (۴) بستان الجن فارسی (۵) ہدیۂ مہدویہ ہندی وغیرہ ہیں، بعض مطبوع وبعض غیر مطبوع ہیں، آپؒ جامع علوم عقلی ونقلی تھے، علماءِ باکمال آپؒ کی فضیلت ولیاقت کو تسلیم کرتے تھے، باوجود لیاقت وفضیلت وصاحب جاہ وحشمت ہونے کے نہایت ہی منکسر المزاج وسلیم الطبع تھے، مہمان نوازی، غرباء پروری، طلبہ کی ہمدردی اور فقراء کی دست گیری میں فردِ فرید تھے، جو کوئی محتاج وحاجت مند آپؒ کی خدمت میں جاتا اور اپنی حاجت پیش کرتا تو آپؒ اس کی حاجت روائی میں کوشش بلیغ فرماتے، حسن سلوک اور دست گیری میں کبھی دریغ نہیں فرماتے تھے۔

آپؒ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے، اکثر اوقات وظائف، تلاوتِ قرآن اور تدریس میں گزارتے تھے، ان ہی مشاغل کے دوران کوئی بزرگ اگر ملاقات کے لیے آجاتے تو تواضع اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے، درس کے وقت مقتضائے حال کے موافق بزرگانِ سلف کی حکایات بیان فرماتے تھے، حاضرین مجلس کو خوش بیانی وشیریں زبانی سے محظوظ

فرماتے تھے، ظریف الطبع وخوش مزاج تھے، اکثر بزرگانِ سلف کے واقعات طلبہ کو سناتے تھے، فقیر مؤلف آپ ؒ کی خدمت میں دو ڈھائی سال تک حلقۂ درس میں شریک تھا، حدیث، فقہ اور اصول کی کتب آپ ؒ سے پڑھ کے تکمیل کے لیے لکھنؤ اور لاہور چلا گیا، جناب مولانا واستاذنا العلام مولوی محمد عبدالحي صاحب مرحوم اور مولوی فیض الحسن صاحب مرحوم سے تکمیل کی سند حاصل کی، فقیر ''ہدیہ مہدویہ'' کی تالیف کے وقت حضرت کے مکان پر سکونت پذیر تھا، عنایت ومحبت سے سرفراز فرماتے تھے۔

آپ ؒ کا تقرر اعلیٰ حضرت مرحوم کی تعلیم کے لیے: جب ۱۲۸۷ھ میں اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان نظام الملک آصف جاہ ششم کی تسمیہ خوانی کی رسم نہایت تجمل وشوکت کے ساتھ ادا ہوئی تب نواب مختار الملک مرحوم اوّل نے آپ ؒ کو اعلیٰ حضرت کی تعلیم وتدریس کے لیے بماہوار ایک ہزار روپئے مقرر فرمایا، اس تقرر کے بعد آپ ؒ نے طلبۂ علوم کے لیے ایک مکانِ وسیع تعمیر فرمایا اور اس کو مدرسہ محبوبیہ کے نام سے مسمیٰ کیا، مدارالمہام نے مدرسہ کے اخراجات کے لیے علاوہ تنخواہ چھ روپیہ روزانہ معین کیا، مدرسہ میں ایک سو سے زائد طلبہ تھے، ان کی خوراک، پوشاک، اخراجات اور اساتذہ وغیرہ کا اہتمام شہید مرحوم نجی طور پر فرماتے تھے، خرچ کثیر ہوتا تھا، سرکاری امداد کافی نہیں تھی، آپ ؒ اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ اسی کارِ خیر میں خرچ فرمادیتے تھے، اور آپ ؒ تنخواہ کے تھوڑے سے حصے میں سے ذاتی خرچ فرماتے تھے، طلبۂ علوم کے ساتھ اعزہ واقارب سے بھی زیادہ محبت رکھتے تھے، ہمیشہ ان کے ساتھ حسن سلوک فرماتے تھے، آپ ؒ کی

عادت تھی کہ طالب علمی کی حالت میں طلبہ کو سعی و سفارش کر کے سرکاری ملازمت میں مقرر کرا دیتے تھے، اور نصیحت فرماتے کہ ماہوار جو کچھ ملے والدین اگر زندہ ہوں یا جو متعلقین ہوں ان کے لیے بھیجا کرو۔

ف: سبحان اللہ! آپؒ کی سیرت کیسی نیک تھی اور اس کے مطابق طلبہ کو کیسی نصیحت فرماتے تھے، جو عمل کیے جانے کے لائق ہے۔ (از: مرتب عفی عنہ)

فقیر مؤلف محبوب التواریخ شہر حیدر آباد میں آپؒ ہی کی توجہ وعنایت سے آیا اور آپؒ کی خدمت میں دو ڈھائی سال تک فقہ و حدیث کی کتب پڑھتا رہا، اور آقا سید علی صاحب المخاطب استاذ الملک شستری سے ادب اور دیگر اساتذہ مولانا نیاز احمد صاحب بدخشانیؒ، مولوی محمد مراد صاحب پنجابیؒ اور مولوی روضۃ اللہ شاہ صاحب ولایتیؒ وغیرہم سے بھی مستفید ہوتا تھا، فقیر کی سکونت گاہ شہید مرحوم کا دولت خانہ و مدرسہ تھا۔

معمولات و نظامِ اوقات: آپؒ صبح سے اشراق کے وقت تک اورادِ ماثورہ، تلاوتِ قرآن اور حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر طلبہ کے پڑھانے میں بارہ بجے تک مصروف رہتے تھے، بارہ بجے کے بعد کھانا تناول فرما کے قیلولۂ مسنونہ فرماتے، پھر نمازِ ظہر با جماعت ادا کر کے تالیف و تصنیف اور احباب کی ملاقات فرماتے، عصر تک یہی مشغلہ رہتا، عصر سے عشا تک تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے، اگر اس وقت میں کوئی صاحبِ غرض آپؒ کے پاس آتا تو آپؒ اس کی طرف بھی متوجہ ہوتے اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے، اور اس کی حاجت روائی میں جان و دل سے کوشش فرماتے۔

وفات: آپ ؒ کی عادتِ مستمرہ تھی کہ عصر کی نماز سے فارغ ہوکر مغرب تک اور مغرب سے عشا تک تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے تھے، تلاوت سے فارغ ہوکر فرائض وسنن کی ادائیگی میں مصروف رہتے، چنانچہ عادتِ جاریہ کے موافق بتاریخ شبِ ہفتم ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ میں مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد تلاوتِ قرآن میں مصروف ہوئے، پارہ (۹): {قال الملأ الذین ... الخ} پڑھ رہے تھے اسی اثنا میں ایک پیرزادہ مسمّٰی سید احمد مہدویہ مسجد میں آیا، تلاوت کی حالت میں حضرت ؒ کو پشت کی جانب سے ایک کٹار ماردی، ضربِ شدید ایسی واقع ہوئی کہ سینہ سے کٹار برآمد ہوگئی، آپ ؒ نے پلٹ کر قاتل کو دیکھا، اللہ اکبر کہتے ہوئے قرآن پر سر رکھ دیا، پھر قاتل ظالم نے کٹار کا دوسرا وار مارا، اس ضرب سے شہ رگ کٹ گئی، اسی وقت روحِ مبارک بہشت بریں کو پرواز کرگئی۔ إنا للہ وإنا إلیه راجعون۔

مدرسہ کے صحن میں مدفون ہوئے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔

(محبوب التواریخ: ۲/ ۸۲۱)

مجاہد ملت حضرت مولانا لیاقت علی الٰہ آبادی ؒ[1] متوفی ۱۲۹۵ھ

نام وولادت: حضرت مولانا لیاقت علی صاحب ؒ جونہایت متقی وجامع کمالات بزرگ تھے، مولانا ؒ کے والد مہر علی صاحب مرحوم زراعت پیشہ آدمی تھے، مولانا ؒ کے چچا صوبہ دار دائم علی جولاولد تھے مولانا ؒ نے مدتِ درازان کے زیرسایہ رہ کرفوجی تعلیم حاصل کی۔ آپ ؒ کی ولادت موضع مہگاؤں (جودوآبہ میں شہرالٰہ آباد سے جانب پچھّم جی۔ ٹی۔ روڈ پر ۲۵ رکیلو میٹر دورواقع شرفاء کی ایک بڑی بستی ہے) ضلع الٰہ آباد میں ہوئی، اب اس کوالٰہ آباد سے الگ کرکے مستقل ''کوشامبی'' نام سے ضلع بنادیا گیاہے، تاریخ ولادت کے متعلق ظن غالب یہ ہے کہ آپ ؒ کی ولادت ۱۸۱۱ء سے ۱۸۲۰ء کے درمیان ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تعلیم: بروایت اہل خاندان آپ ؒ نے بھوپال میں تعلیم حاصل کی، بعض مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ آپ ؒ کی تعلیم کا مرکز ٹونک ہے، جہاں مجاہد ملت حضرت مولانا سید احمد شہید رائے بریلوی ؒ (م: ۱۲۴۶ھ) اور مولانا اسماعیل شہید صاحب دہلوی ؒ جیسے حضرات کا قافلہ اقامت گزیں تھا، مولانا سید محمد میاں صاحب ؒ (م: ۱۳۹۵ھ مطابق: ۱۹۷۵ء) کی تحقیق سے بھی ٹونک کی تائید ہوتی ہے، موصوف رقم طراز ہیں:

''مولانا لیاقت علی صاحب ؒ جن کوالٰہ آباد کا امیر اور گورنر بنایا گیا تھا حضرت شاہ

---

[1] اس حقیر کی سعادت ہے کہ حضرت شیخ المشائخ مولانا محمد احمد صاحب ؒ کی معیت میں اس قریہ کبیرہ مہنگاؤں میں حاضر ہوا ہے جہاں حضرت ؒ کے خلیفہ مولانا لئیق احمد صاحب وبرادرم انیس احمد صاحب وغیرہم کے مکانات تھے۔

عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ سے بالواسطہ تلمذ رکھتے تھے۔'' (علماءِ ہند کا شاندار ماضی: ۴/ ۲۱۲)

فوجی ملازمت: تحصیل علم سے فراغت کے بعد آپؒ نے تقریباً تین سال فوج میں ملازمت اختیار کی اور انبالہ یا فیروز پور میں مقیم رہے، فوجی مشق کے ساتھ بقیہ وقت عبادت وریاضت، دعوت وتبلیغ، درس وتدریس اور مطالعۂ کتب میں صرف فرماتے، ان تین سالہ فوجی ملازمت کے زمانہ میں بھی اشاعت اسلام کی فکر مولاناؒ کو برابر دامن گیر رہی اور آپؒ نے سکھوں میں دعوت کی محنت شروع فرمادی، اسلام کے محاسن بیان فرما کر ان کی ذہن سازی کی، آپؒ کی اس محنت وسعی کا اثر یہ ہوا کہ چند سکھ آپؒ کے ہاتھ پر اسلام لے آئے، ان حالات کو دیکھ کر دوسرے چند سکھ سپاہی مذہبی تعصب کی وجہ سے آپؒ کی جان کے درپے ہوگئے، اس لیے مولاناؒ نے فوجی ملازمت سے استعفادے دیا۔

مولانا اور جنگ آزادی: فوجی ملازمت کو خیرباد کہہ کر آپؒ نے ہندوستان کے طول وعرض میں سفر فرمایا اور علماءِ حقانی وصلحاءِ ربانی سے اکتسابِ فیض کیا، کچھ مدت دہلی، پھر ٹونک اور رائے بریلی تکیہ شاہ علم اللہؒ میں سکونت اختیار فرمائی۔ عملاً وعقیدۃً مولانا سید احمد صاحب شہیدؒ کے ہم مشرب تھے، ممکن ہے کہ ان سے خلافت بھی حاصل ہو۔

اس طویل سفر سے مراجعت فرما کر اپنے وطن تشریف لائے اور ایک مسجد[1] کو جو جی۔ ٹی۔ روڈ[2] پر واقع تھی اپنا مستقر بنایا اور خدمت خلق میں مصروف ہو گئے، کبھی درس وتدریس کا مشغلہ رہتا، کبھی دعوت وتبلیغ، کبھی تزکیہ نفس

۱؎ ماشاءاللہ اب اس مسجد کی تعمیر نہایت وسیع عریض اور خوشنما ہوچکی ہے۔

۲؎ یہ شیر شاہ سوری کی بنوائی ہوئی شارع طویل جی ٹی روڈ ہے جو بنگال سے روہتک (ہریانہ) تک گئی ہے۔ جس پر بکثرت مسجدوں اور مسافر خانوں کا بندوبست ہے، اور خاص بات یہ کہ اس روڈ سے حضرت اورنگ زیب عالمگیر جیسا بزرگ بادشاہ کا گذر رہا ہے۔ (مرتب)

فرماتے، زیادہ زور فرائض اور واجبات کی ادائیگی، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پابندی اورمراسم وبدعات کی بیخ کنی پرتھا۔

آپ ؒ کے اخلاص وللّٰہیت کا نتیجہ تھا کہ دور دور سے طالبانِ حق، سالکین راہ آ کر مجتمع ہو گئے اور آپ ؒ کے فیوضِ ظاہری و باطنی سے مستفیض ہونے لگے، مولانا ؒ کا یہ قیام جس میں عقائد واعمال کی اصلاح، تقویٰ وتدین کی علمی وعملی تربیت جو مردوزن کے حق میں نعمت عظمیٰ ثابت ہوئی اور اطراف کے مسلمانوں کے حق میں رحمت ایزدی ثابت ہوئی تھی وہ زیادہ عرصہ نہ رہ سکی اس لئے کہ آپ نے وقت کی اہم ضرورت سمجھ کر اپنی اصلاح ومحنت کا رُخ ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء'' کی جانب پھیر دیا۔اور آپ ؒ کے معتقدین کے علاوہ مسلمانوں کی کثیر تعداد پر مشتمل ایک بڑی جماعت مولانا ؒ کی حمایت کے لیے تیار ہوگئی، آپ ؒ کے اس بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو دیکھ کر شاہ دہلی نے مولانا ؒ کو الٰہ آباد کا محتسب مقرر کر دیا۔

مولانا ؒ بڑی دوراندیشی سے فوج کی تربیت وتنظیم میں مصروف رہے، مکمل نظم ونسق کے بعد قلعۂ الٰہ آباد کی طرف دوآبہ روانہ ہوئے، اس قلعہ کی فتح اگر آپ ؒ کے ہاتھوں ہو جاتی تو دوآبہ اور اَوَدھ کی تاریخ ہی دوسری ہوتی، لکھنؤ اور دہلی پر دشمنانِ اسلام کا تسلط اتنی آسانی سے نہ ہوتا، مگر مشیت کو یہ منظور نہ تھا، اور ۱۶ / جون ۱۸۵۷ء کولابی باغ (کمپنی باغ) کے سامنے آپ ؒ کے ساتھی مخالفوں کی توپوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور ان کا تسلط شہر الٰہ آباد اور ضلع الٰہ آباد پر ہو گیا۔اور ظلم وستم کا بازار گرم کر دیا۔العیاذ باللہ تعالیٰ

مولانا ؒ کی روپوشی اور لاچپور آمد: شکست کے بعد مولانا ؒ کسی طرح قلعہ

سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور اُفتاں وخیزاں اپنی قلیل جماعت کے ساتھ گنگا پار کر کے کسی قریہ میں کچھ دنوں روپوش ہو گئے، مگر وہاں سے نکل کر کانپور، لکھنؤ اور دہلی وغیرہ مقامات سے ہوتے ہوئے سندھ اور ملتان تشریف لے گئے، کچھ مدت وہاں امامت کے فرائض انجام دیے، اس کے بعد مہاراجہ بروڈہ کی عنایت سے تقریباً ایک سال اس کی ریاست میں روپوش رہے، وہاں سے نوساری (سورت) آئے، اہل لاجپور کو جب مولاناؒ کی نوساری تشریف آوری کی اطلاع ملی تو وہ آپؒ کو لاجپور لے آئے، یہاں مولاناؒ کا قیام عرصہ تک رہا، اس لئے قیامِ لاجپور کے دوران ہزارہا افراد نے آپؒ سے فیض حاصل کیا، مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب لاجپوری تحریر فرماتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کے نامور مجاہد مولانا لیاقت علی صاحب الٰہ آبادیؒ جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے جہاد میں بہت بڑا حصہ اپنے وطن عزیز کو انگریزوں سے چھڑانے میں گزارا تھا اور جنہوں نے نہایت بہادری اور شجاعت سے لڑ کر الٰہ آباد انگریزوں سے لے لیا تھا اور خاندانِ تیموریہ کے آخری تاجدار نے مولاناؒ کو الٰہ آباد کا نواب مقرر کر دیا تھا، مگر مولانا کی کوئی چھ ماہ حکومت کے بعد انگریزوں نے بڑی فوج سے الٰہ آباد پر حملہ کر دیا، جس کا مولاناؒ کی جماعت اور آپؒ کا لشکر مقابلہ نہ کر سکا، [۱] بہت کچھ جنگ وجدال کے بعد الٰہ آباد پر انگریزی قبضہ ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولاناؒ اپنی قلیل جماعت کے ساتھ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے قلعہ

---

[۱] معلوم ہوا ہے کہ کریلا باغ سلیم سرائے وغیرہ میں دوبدو (دست بدست) انگریزوں سے جنگ ہوئی مگر افسوس کہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

سے باہر نکل آئے اور روپوشی کی حالت میں نوساری پہنچے اور لاج پور والوں کو اطلاع ملنے پر لاجپور کے چند حضرات مولاناؒ کو اپنے ہاں لے آئے۔

نواب سچین ابراہیم خان ثانی مولاناؒ کی بزرگی کا بہت بڑا معتقد ہو گیا اور مولاناؒ کی حسب مرضی ایک مکان جامع مسجد کے پیچھے قبرستان کے متصل بنوادیا، مولاناؒ اپنے بال بچوں کے ساتھ عرصہ تک لاجپور میں رہے، مولاناؒ کی ذاتِ بابرکات سے مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا۔‘‘

چونکہ حضرت مولانا لیاقت علی شریف خاندان کے نہایت مقدس، متقی اور پرہیزگار، جامع کمالاتِ ظاہری و باطنی بزرگ تھے، اسلئے آپؒ کی طویل صحبت کی وجہ سے مسلمانوں میں دین داری، خداترسی اور علم و عمل کا شوق پیدا ہو گیا۔

سب سے پہلی اصلاح مولاناؒ نے مسلمان عورتوں کے ہندوانہ طرز کے لباس میں فرمائی، کہ عموماً گجرات کی مسلم عورتوں کا لباس لہنگا اور کرتی تھا، مولاناؒ نے مسلمانوں سے اس لباس کے عدمِ استعمال کا عہد لیا، اس روز سے مسلم عورتوں نے گھگرا، لہنگا اور کرتی پہننا موقوف کیا اور نیچا کُرتہ پوری آستین کا، پائجامہ، سربند اور اوڑھنی کا لباس اختیار کیا، رَفتہ رَفتہ گجرات کے اکثر علاقوں میں اِس بہتر اور سادہ لباس کا رِواج شروع ہو گیا، الحمدللہ! اس نیک کام کی ابتدا لاجپور ہی سے ہوئی۔ (تاریخ لاجپور)

مولانا لیاقت علیؒ نے اپنے قیامِ زمانۂ لاجپور میں اشاعت علم دین کی طرف بھی خصوصی توجہ فرمائی، چنانچہ مدرسہ اسلامیہ لاجپور کا افتتاح آپؒ اور صوفی سلیمان صاحبؒ ہی کی محنت کا نتیجہ تھا، ماشاءاللہ کئی سال بخیر و خوبی جاری و ساری

رہا، مگر حضرتؒ کی گرفتاری کی وجہ سے مدرسہ کئی سال بند رہا۔ (ذکر صالحین: ۳/۱۱۶)

''فخرِ وطن'' کے مؤلف محترم فاروق ارگلی نے مولاناؒ کے محاسن اور جنگ آزادی کے کارناموں کو تفصیل سے نقل کیا ہے، اس میں سے کچھ مفید باتیں معلومات کے لیے نقل کرتا ہوں:

مولاناؒ کی سیاسی سرگرمیاں: ''شریعت، طریقت اور روحانیت کی بے پایاں دولتوں سے مالا مال مولوی لیاقت علی قادریؒ صرف ایک عالم دین، فقیہ، معجز بیان واعظ اور تصوف وروحانیت کی اقدار سے متصف صوفی ہی نہیں تھے؛ بلکہ ایک محب وطن سیاسی، سماجی اور ادبی شخصیت کے طور پر بھی معاشرے میں ممتاز تھے۔

(سید عبدالقادر جعفری، بحوالہ: ریوولیوشنری مولوی لیاقت علی ۱۸۵۷ء، از: قاضی نسیم احمد)

مولوی انتظام اللہ شہابی ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی (مجاہد) علماء'' میں لکھتے ہیں:

''مولوی لیاقت علی صاحبؒ قادریہ سلسلہ کے شیوخ میں تھے، چائل اور الہ آباد کے کثیر التعداد نفوس آپؒ سے بیعت تھے، آپؒ نے اپنی زندگی کا آغاز فوج کی ملازمت سے کیا تھا، لیکن حکومت مخالف سرگرمیوں کے الزام پر آپؒ کو ملازمت سے الگ کر دیا گیا، ملازمت چھوٹ جانے کے بعد آپؒ اپنے وطن مہنگاؤں الہ آباد آئے اور وہاں مسجد کی امامت اور درس وتدریس میں مشغول ہو گئے، اپنی علمی صلاحیتوں، مذہبی انہماک، خدا ترسی اور عوام دوستی کی وجہ سے مولوی صاحبؒ کی شہرت قرب وجوار میں پھیل گئی، آپؒ کے تقدس نے لوگوں کو متأثر کیا، اور شہر الہ آباد اور چائل کے بہت سے لوگ آپؒ کے مرید ہو گئے۔

مولوی لیاقت علی جو عرصۂ دراز سے اپنے مریدین کو اپنے وعظ اور پندو نصائح کے ذریعہ ملک کی آزادی کے لیے جنگ کی تیاری کرا رہے تھے، اِرادت مندوں کی کثیر تعداد کے ساتھ منظر عام پر آگئے، جس کی وجہ سے شہر اور دور دراز علاقوں کے ہزاروں مسلمان اور ہندو جنگ آزادی میں شامل ہو گئے، چنانچہ ضلع الٰہ آباد کے ہر طبقہ کے معززین نے متفقہ فیصلہ کے تحت مولوی صاحبؒ کو شہر و علاقہ کی حکمرانی اور تحریک کی قیادت کے لیے منتخب کیا، جس کی وجہ سے پورے ضلع میں بہادر شاہ ظفر کا سبز پرچم لہرانے لگا، مولوی صاحبؒ کو دہلی دربار سے حکمرانی کی سند بھی حاصل ہوگئی، مولوی لیاقت علیؒ نے خسرو باغ کی تاریخی عمارت کو اپنا ہیڈ کواٹر بنایا اور وہیں سے جنگ کا سلسلہ شروع ہوا، مگر افسوس کہ مجاہدین کی جنگی طریقوں سے عدمِ واقفیت کی وجہ سے شکست ہوئی۔

بقول پنڈت سندر لال: ''مولوی لیاقت علی غیر معمولی لیاقت والے انسان تھے، ان کے کردار کی پاکیزگی کی وجہ سے سب لوگ ان کا احترام کرتے تھے، انہوں نے خسرو باغ میں اپنا مستقر بنایا اور شہر میں مکمل امن و امان قائم کر دیا اور دہلی کے بادشاہ کو برابر الٰہ آباد کی صورتِ حال سے باخبر کرتے رہے، اس کے بعد مولوی لیاقت علیؒ نے قلعے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، قلعے میں محصور سکھ فوجیوں کو انہوں نے وطن کی جنگ آزادی میں شامل ہو جانے کی دعوت دی، لیکن سکھوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔'' (بھارت میں انگریزی راج)

مولوی لیاقت علیؒ کی قیادت میں صمد آباد، رسول پور، دریا آباد، منہاج پور اور بخشی بازار محلہ وغیرہ علاقوں پر مجاہدین کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا، مگر انگریز الٰہ آباد پر دو

بارہ قبضہ کے لیے فوری طور پر سرگرم ہو گئے تھے، ۷ر جون ہی سے انگریز دستے قلعے میں پہنچنے لگے تھے، بارہ جون کو کرنل نیل نے تازہ دم انگریز فوجیوں اور سکھ بٹالین کے ساتھ الہ آباد شہر کے دارا گنج علاقہ پر حملہ کیا، مولوی لیاقت علیؒ کے جاں نثاروں نے جرأت مندی سے مقابلہ کیا، لیکن بے سروسامانی اور مجاہدین کی جنگی طور طریقوں سے عدمِ واقفیت کی وجہ سے انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

معلوم ہوا ہے کہ قلعہ کے احاطہ میں بہت وسیع وعریض جامع مسجد تھی، اس کے مسمار ہونے کے بعد حضرت مولانا لیاقت علی صاحبؒ الہ آباد سے رحلت فرما کر ہزارہا مشقت وجاں فشانی کے بعد لاج پور گجرات پہنچے اور وہاں عرصہ دراز مقیم رہ کر حضرت شیخ صوفی سلیمان صاحبؒ کے ساتھ مدرسہ کی تنظیم، تعلیم وتدریس میں شریک رہے۔

مزید وہاں پر عوام مردوں اور عورتوں کے بود و باش یعنی رہن سہن، رسم ورواج اور پوشاک کی اصلاح فرمائی، جیسا کہ مولانا مرغوب احمد صاحب لاجپوریؒ نے تحریر فرمایا ہے۔ فجزاہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

ف: قلعہ کی جامع مسجد: معلوم ہوا ہے کہ قلعہ میں نہایت وسیع وعریض جامع مسجد تھی، بلکہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ منٹو پارک اسی جامع مسجد کے احاطہ میں ہے، اور دریائے جمنا کے کنارے بعض عمارات کھنڈرات کی شکل میں آج بھی موجود ہیں، ان کے متعلق غیر مسلم مؤرخ سے معلوم ہوا کہ وہ قلعہ جامع مسجد کے حدود میں تھیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

عبرتناک خبر: معلوم ہوا ہے کہ قلعہ پر حضرت مولانا لیاقت علی صاحب الہ آبادیؒ

کی فتح ہوچکی تھی، مگر ایک ہم وطن بھائی نے مشورہ دیا کہ مولانا! اب قلعہ پر فتح تو ہوہی چکی ہے، آپ اپنی بستی مہگاؤں جاکر بال بچوں سے مل کر تشریف لائیں، اس کے کہنے پر آپؒ مہنگاؤں تشریف لے گئے، تو مولاناؒ کی غیبوبت کا فائدہ اٹھا کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا گیا، جس سے انگریزی فوج قلعہ کے اندر داخل ہوگئی اور قلعہ کو فتح کرلیا، مسجد کو مسمار کردیا۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔

حضرت مصلح الامتؒ کا کشف والہام: یہ بھی عجیب بات تھی کہ ۱۹۵۷ء میں جب وطن سے ہجرت کرکے الہ آباد تشریف لائے اور محلہ حسن منزل میں قیام فرمایا پھر کچھ دنوں کے بعد بخشی بازار میں قیام فرما ہوگئے تو حضرت مرشدی مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ اپنی عادت کے مطابق رکشے سے ڈاکٹر صلاح الدین احمد صدیقی صاحبؒ کے ساتھ تفریح کے لئے سول لائن اور کبھی قلعہ کے احاطہ میں منٹو پارک پر تشریف لے جاتے تھے اور وہاں ہم لوگ طلبہ علم کی پوری جماعت حسن منزل سے بخاری شریف وغیرہ کتابیں لے کر پاپیادہ جاتے تو وہاں حضرت مصلح الامتؒ درس دیتے، ناشتہ بھی کرتے جب کہ حضرت مصلح الامتؒ کو اس کی تاریخی حیثیت کا بالکل علم نہ تھا کہ یہاں قلعہ اکبری کی وسیع جامع مسجد تھی۔ مگر شوق وذوق سے تشریف لے جاتے اور کتاب وسنت کا درس دیتے۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشآء (مرتب)

مولاناؒ کی گرفتاری: آپ کی گرفتاری کا یہ واقعہ ہوا کہ لاجپور میں نمازِ عید کی امامت نواب سچین صاحب خود فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ نمازِ عید کے لیے نواب صاحب کو آنے میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی، جس کی وجہ سے مولاناؒ کی امامت

میں نمازِ عید ادا کرلی گئی، نمازِ عید سے فراغت کے بعد نواب صاحب کی سواری مع حشم وخدم کے عیدگاہ کے قریب پہنچی، نواب صاحب نے دیکھا کہ لوگ نماز سے فارغ ہوچکے ہیں اور لوگوں نے بتلایا کہ مولاناؒ کی امامت میں نماز ادا کی جاچکی ہے، نواب صاحب نے تو از راہِ ادب سکوت اختیار کیا اور سچین واپس چلے گئے۔

مگر مولانا کے دشمنوں کو دشمنی کا موقع ہاتھ لگ گیا اور نواب صاحب کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ مولاناؒ کو آپ کی توہین کے جرم میں گرفتار کرلیا جائے، چنانچہ نواب صاحب کی طرف سے مولاناؒ کی گرفتاری کا حکم صادر ہوگیا۔جس سے مولانا بہت ناراض ہوئے اور سخت الفاظ بھی فرمائے، اور اتنا ہی نہیں بلکہ آپ کے دشمنوں نے یہاں (الہ آباد یا لکھنؤ) انگریزوں کو اطلاع کردیا کہ آپ کا فلاں مجرم یہاں روپوش ہے اس لئے گرفتاری کا حکم ہوگیا۔ جب مولانا کو معلوم ہوا تو روپوش ہوکر بمبئی کے سفر کے لئے روانہ ہوگئے۔آخر ایک غیر معروف ریلوے اسٹیشن پر بمبئی پولیس کے ہاتھوں مولاناؒ گرفتار کرلیے گئے اور الہ آباد لائے گئے، آپؒ کے خلاف مقدمہ کی سماعت ہوئی، مولاناؒ نے عدالت کے فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور بے خوف سنت یوسفی کی اتباع میں {السِّجنُ أَحَبُّ إِلَيَّ} پڑھتے ہوئے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنے پر آمادہ ہوگئے، حکومت نے مولاناؒ کو جنگ آزادی کے صلہ میں دوامِ حبس بعبورِ دریائے شور کی سزا دی، مگر قید وبند، زندانِ سلاسل کی تکلیفیں اور مردِ حق آگاہ کے پایۂ استقلال میں لغزش نہ دے سکیں، کیوں کہ میدانِ جنگ کی اس خاردار وادی میں جسم وجان کو داؤں پر لگا کر ہی اس جذبہ سے قدم رکھا تھا۔

حکمِ سزا سنانے کے بعد مولاناؒ کی حسب خواہش آپؒ کو قریہ مہگاؤں لایا گیا، مسجد میں تشریف لے گئے، نماز ادا کی، سب سے ملے اور اصلاحِ عقائد، پابندیٔ صلوٰۃ اور بدعات سے احتراز پر چند جملے فرمائے، اس کے بعد سب کو روتا چھوڑ کر ''اب فقیر جاتا ہے، السلام علیکم!'' کہتے ہوئے گاڑی میں سوار ہو گئے اور جزیرۂ انڈامان پہنچادیے گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

المختصر مولاناؒ نے جس ہمت و استقلال اور قربانیوں کے ساتھ قوم کی جو خاموش خدمات انجام دیں، خواہ درس و تدریس سے متعلق ہو یا تزکیۂ نفس کی صورت میں ہو یا دعوت وتبلیغ لسانی وسنانی کی شکل میں ہو، وہ ہمیشہ یاد کی جاتی رہیں گی۔

فنا کے بعد بھی زندہ ہے شانِ رہبری تیری
ہزاروں رحمتیں ہوں اے میرِ کارواں تجھ پر

حضرت مولانا عبدالحی کفلیتویؒ نے اپنی مختصر سوانح میں مولاناؒ کا تذکرہ کیا ہے، ''الجواہر الزواہر'' سے اس کا کچھ حصہ نقل کرتا ہوں:

''اور حضرت شیخ رحمہ اللہ (مولانا لیاقت علی صاحب الٰہ آبادیؒ) ایک متقی، پرہیزگار، زاہد و عابد تھے، خوفِ خداوندی سے اکثر اوقات گریہ و بکا میں مشغول رہتے تھے اور خلوت مع اللہ آپؒ کو محبوب تھی، اعلاءِ کلمۃ اللہ پر حریص تھے، اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے اور دعوت وتبلیغ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے تھے۔'' (الجواہر الزواہر: ۹۔ ذکر الصالحین: ج/۳ ص/۱۲۱)

اب ہم تبرکاً حضرت شیخ مکرم مولانا اسمٰعیل صاحب واڈی ساکن لاجپور

گجرات جو ماشاءاللہ متدین عالم وشیخ کامل ہیں ان کو حضرت مولانا لیاقت علی صاحب الہ آبادی کے کچھ حالات وارشادات معلوم ہیں اس لئے بندہ نے عرض کیا کہ آپ قلمبند کر کے ارسال فرمائیں تو ہم اس کو ان کے تذکرہ میں شامل کردیں تو ان کے فرزندار جمند مولانا فضل حق صاحب سلمہ نے نقل کر کے ارسال فرمایا ہے، جسے نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

حضرت مولانا لیاقت علی صاحبؒ نے شہر کے وسط میں خسرو باغ جو ان کے فوج کی چھاؤنی تھی وہاں سے انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی تھی اور فتحیاب بھی ہو چکے تھے، مگر چونکہ کئی دنوں سے آرام کا موقع نہ ملا تھا، اور کھانا بھی نہیں کھایا تھا، اس لئے ان کے رفقاء میں سے ایک وطنی بھائی نے کہا کہ حضرت آپ مہنگاؤں تشریف لے جائیں، کچھ آرام کرلیں، معاملہ تو قابو میں ہے، اس کے کہنے پر حضرت مہنگاؤں تشریف لے گئے مگر اس کی سازش سے قلعہ کا دروازہ انگریزوں کے لئے کھول دیا گیا جس کی وجہ سے کایا پلٹ گئی اور جیتی ہوئی جنگ ہزیمت سے تبدیل ہوگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

افسوس کہ انگریزوں نے اس کے بعد ظلم کی انتہاء کردی، قلعہ کو بہت نقصان پہنچایا، نہایت عالیشان جامع مسجد کو بھی مسمار کردیا، حضرت کی تمام جائداد ضبط کرلی جو بہت بڑی تھی۔

اس کے بعد حضرت روپوش ہوگئے اور بڑی مصیبتوں اور تکالیف کو برداشت کر کے گجرات تشریف لے آئے اور ہمارے قصبہ لاجپور جو سورت کے مضافات میں ہے قیام فرما ہوئے۔

بدعات اور رسومات کے خلاف وعظ ونصیحت فرماتے اور ان کی وجہ سے علاقہ میں نمایاں دینی رجحان پیدا ہوا۔ حضرت شیخ صوفی سلیمان صاحب (خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی) کے ساتھ مل کر ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جس سے علم کا چرچا ہو گیا، مگر آپ کی گرفتاری کے بعد اس میں کمی آ گئی۔

آپ کا تقویٰ: چونکہ گاؤں کی عورتیں اکثر بے نمازی ہوتی ہیں اس لئے حضرت مولانا لیاقت علی صاحبؒ عورتوں کا پکایا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے، بلکہ ان کے مریدین میں سے کوئی کھانا پکا لیتا تھا تو آپ تناول فرماتے تھے۔

(تمام شد)

ف: ہماری خوش نصیبی ہے کہ مجاہدِ اعظم حضرت مولانا لیاقت علی صاحب الٰہ آبادیؒ سے بستی لاجپور گجرات میں تعلیمی اور اصلاحی خدمات انجام پائیں، اس لیے فقیر اثناءِ قیامِ خانقاہِ کنتھاریہ بھروچ سے متعدد بار لاجپور حاضر ہوتا رہا اور وہاں کے علماءِ کرام سے ملاقات ہوتی رہی، ۱۴۳۶ھ کو کسی مسجد میں بیان بھی ہوا جب کہ عزیزم مولانا عبدالرحیم سلمہ حال مقیم لیسٹر انگلینڈ (جو خاندان صوفی سلیمان صاحبؒ کے چشم و چراغ ہیں) موجود تھے۔ **فجزاهم الله أحسن الجزاء۔**

وفات: انڈامان میں قید و بند کی آزمائش اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے تقریباً زندگی کے تئیس (۲۳) سال گزارے، بالآخر وقت موعود آ گیا اور ۱۸۹۱ء میں (اور بقولِ بعض ۱۲۹۵ھ مطابق: ۱۸۷۳ء) میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

دل کو سکون، روح کو آرام آ گیا　　موت آ گئی کہ دوست کا پیغام آ گیا

حضرت مولانا محمد طاہر معروفی مئویؒ[1] متوفی ۱۲۹۶ھ

ولادت: تیرہویں صدی ہجری کی ایک بے نظیر جامع کمالات شخصیت مولانا محمد طاہر صاحبؒ قصبہ پورہ معروف[2] ضلع اعظم گڑھ (موجودہ مئو) میں ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۷/ اپریل/ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوئے۔

تاریخ ولادت ''اظہر حسن'' وفات ''حافظ محمد طاہر'' اور مدت ''عمر حبیب الواحد'' کے مادّوں سے برآمد ہوتی ہے۔

تعلیم وتربیت: ابتدائی تعلیم جون پور جا کر حضرت مولانا کرامت علی صاحب جونپوریؒ (متوفی: ۱۲۹۰ھ) سے حاصل کی اور ان ہی سے حفظ قرآن، تجوید وقرأت، خوش نویسی اور فن بنوٹ وسپہ گری بطریق احسن واکمل سیکھا اور ان ہی کے دست حق پرست پر بیعت کر کے خلیفہ ومجاز ہوئے، آپؒ کی سند خلافت ''حیاتِ طاہر'' صفحہ: ۱۱۷ پر مطبوع ہے، جون پور ہی میں طب یونانی حاصل کر کے ایک مشہور طبیب حاذق بھی ہوئے، مدرسہ قرآنیہ جون پور میں حضرت مولانا سخاوت علی صاحب جون پوریؒ (متوفی: ۱۲۷۴ھ) سے فارسی وعربی علوم وفنون حاصل کر کے ۱۲۴۹ھ میں

---

[1] آپ کے حالات، تعلیمات اور کرامات وغیرہ حضرت مولانا محمد عثمان معروفی نے ''حیات طاہر'' کے نام سے تحریر کیا ہے، اسی سے اخذ کر کے نقل کر رہا ہوں۔

[2] مگر اب یہ قصبہ ضلع مئو میں آ گیا ہے، یہ قصبہ اپنی مردم خیزی میں مشہور ومعروف ہے، اب بھی بکثرت حفاظ وعلماء پائے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو محفوظ رکھے اور مزید ترقی سے نوازے۔ (مرتب)

فارغ التحصیل ہوئے، کم وبیش پندرہ سال مولانا کرامت علیؒ ومولانا سخاوت علیؒ صاحبان کی صحبت بابرکت میں رہ کر خوب خوب اکتسابِ علومِ ظاہری وباطنی کیا اور ایک جید حافظ قرآن، قاریٔ خوش الحان، علامۂ زماں، مایۂ ناز کاتب وخطّاط، طبیب حاذق، فن بنوٹ وسپہ گری کے اِمام، معرفت وطریقت کے رازداں، مجاہدہ وریاضات کے خوگر، شہ زوری وپہلوانی میں یکتا، تصوف وسلوک کے محرم، علم وعمل کے محور اور خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار ہوکر اپنے وطن پورہ معروف میں آکر مقیم ہوئے، اور اشاعت وتبلیغ دین واصلاحِ مسلمین میں ہمہ تن مشغول ہوگئے۔

پھر ۱۲۵۸ھ میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے اور دیارِ حبیب میں دوسال گزار کر دوحج ادا کیے، اور حضرت مولانا محمد اسحق صاحب دہلوی مہاجر مکیؒ (متوفی: ۱۲۶۲ھ) سے علمِ حدیث پڑھ کر ان سے سند حدیث لے کر وطن واپس ہوئے، پھر اپنے تدریسی وتبلیغی اور اصلاحی مشغلہ میں مصروف ہوگئے، مولانا طاہر صاحب معروفی رحمہ اللہ کا مختصر تذکرہ اور سند حدیث کو محدثِ کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمیؒ نے دسمبر ۱۹۳۷ء کے ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ میں اور اپنی تصنیف ''اعیان الحجاج'' میں صفحہ: ۱۷۱ پر بھی طبع کرادیا ہے، مولانا محمد طاہر صاحبؒ قاضی القضاۃ قاضی محمد سلیم صاحبؒ (متوفی: ۱۲۶۶ھ) کے نائب قاضی بھی تھے، اور مقامی طور پر قضا کے امور بھی انجام دیا کرتے تھے، آپؒ سے متعلق عہدۂ قضا کا تذکرہ ''حیاتِ طاہر'' میں صفحہ: ۱۷۶ پر دیکھا جاسکتا ہے۔

وعظ ونصیحت: حضرت مولاناؒ جمعہ وعیدین کے بھی امام تھے، قصبہ میں صرف ایک جگہ جامع مسجد میں نمازِ جمعہ ہوا کرتی تھی، نمازِ جمعہ کے بعد مستقلاً مختصر سا وعظ

فرماتے، جس میں قصبہ کا ہر شخص شریک ہوتا، وعظ میں آپؒ تاکید فرماتے کہ جو طریقہ میں بتا رہا ہوں اس پر تم لوگ میرے بعد ہمیشہ قائم رہوگے، کیوں کہ یہی اہل سنت والجماعت کا طریقہ ہے، آپؒ نے اپنے مواعظ اور حکمت عملی سے قصبہ کے تمام بدعات وخرافات اور رسومِ فاسدہ کا آہستہ آہستہ بالکل استیصال کر دیا تھا اور سارے لوگ صحیح العقیدہ ہو گئے تھے اور آج تک یہاں کوئی مذہبی فرقہ بندی، دیوبندی، بریلوی، مقلد وغیر مقلد وغیرہ کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا اور قصبہ کی فضا ایسی علمی و دینی بن گئی کہ آج پورہ معروف میں دوسو کے قریب علماء اور اسی قدر حفاظ وقراء اور حجاجِ کرام موجود ہیں اور اطرافِ ملک میں پھیلے ہوئے دینی وعلمی کاموں میں مشغول ہیں۔

ف: ماشاءاللہ! گجرات کے کئی مدارس کے شیخ الحدیث اسی قصبہ پورہ معروف سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً حضرت مولانا عبدالجبار صاحبؒ مدرسہ آنند میں شیخ الحدیث رہ چکے ہیں، اسی طرح حضرت مولانا ایوب صاحب مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل میں شیخ الحدیث رہ چکے ہیں اور آج کل جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا میں حضرت مولانا رضوان احمد صاحب شیخ الحدیث ہیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، آمین۔ (مرتب)

مولاناؒ کے معمولات: جامع مسجد سے متصل ایک بڑا حجرہ تھا، اسی میں آپؒ شب وروز رہتے تھے، رات میں بہت کم سوتے، اخیر شب میں نمازِ تہجد ادا کر کے روزانہ دس پارے کی تلاوت کرتے، یعنی ہر تیسرے دِن تلاوت میں ایک قرآن ختم کرتے، نمازِ فجر کے بعد اوراد ووظائف اور تسبیحات پڑھتے، پھر مریضوں کو دیکھ کر اپنے مطب سے مفت دوا دیتے، زائرین ومتوسلین کی ضروریات پوری کرتے، متعلمین کو درس دیتے، روزانہ ایک پارہ قرآنِ کریم کی کتابت کرتے،

مزید برآں دوسری کتب نقل فرماتے، پہلوان تھے، اس لیے روزانہ ورزش کرتے اور دس سیر کا لیزم، بیس بیس سیر کے مگدر اور پچاس سیر کا پتھر گھمایا کرتے، یہ سارے سامان مسجد کے ایک کمرہ میں بطورِ یادگار آج بھی محفوظ ہیں، حسب موقع اصلاح وتبلیغ کے فرائض انجام دیتے، اطراف میں مریضوں کو دیکھنے بھی جاتے، استفتا کے جوابات لکھتے اور بحیثیت نائب القاضی وقتی مسائل ومعاملات کا تصفیہ بھی فرماتے، اپنی خوش خلقی اور اخلاقِ کریمانہ سے ہر شخص کو متاثر کرلیتے اور کسی شخص پر کبھی خفا نہ ہوتے، لیکن دین کے معاملہ میں کبھی نرمی نہ برتتے، فیاضی و دریا دلی طبیعت ثانیہ تھی، صاحب حیثیت وثروت تھے، ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کرتے، مریضوں کو مفت دوا دیتے، قرآنِ کریم کے نسخے اپنے قلم سے لکھ کر مفت تقسیم کرتے۔

خطّاطی: آپؒ بہترین کاتب وخوش نویس تھے، خط نسخ ونستعلیق دونوں میں بہت باکمال تھے، محتاط اندازہ کے مطابق چار سو مصاحف لکھ کر لوگوں کو ہدیہ کیا، راقم الحروف (مولانا محمد عثمان) کے عزیز کے گھر پر بھی آپؒ کے لکھے ہوئے تین نسخے موجود ہیں، مولاناؒ کی یہ ایک زندہ کرامت ہی کہی جاسکتی ہے، آج بھی آپؒ کے ذاتی کتب خانہ میں مختلف علوم وفنون کی ۴۵ ضخیم ضخیم کتابیں موجود ہیں، جن کی مکمل فہرست ’’حیاتِ طاہر‘‘ میں مذکور ہے، ان میں ’’بخاری، مسلم، مؤطا امام مالکؒ، جامع صغیر، مشکوٰۃ، مجالس الابرار، مسند امام اعظمؒ، شرحِ وقایہ اور حصن حصین قابل ذکر ہیں، بعض بعض کتابیں ہزار اور ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، آپؒ کی لکھی ہوئی ہر ایک کتاب اوّل نظر میں مطبوعہ معلوم ہوتی ہے، روشنائی اتنی

عمدہ اورآب دار ہے کہ ڈیڑھ صدی گزرنے کے بعد بھی وہی تازگی نمایاں ہے، کسی کسی صفحے پر ہفت رنگ کے خوش نما بیل بوٹے بھی ہیں۔

شجاعت و بہادری: آپ ؒ ایسے زبردست پہلوان تھے کہ آپ ؒ کے زمانہ میں شاید آپ ؒ کا مقابل کوئی بھی نہ تھا، مزید برآں جہاد اور اعداءِ دین کی مدافعت کے لیے بنوٹ اور سپہ گری کے فن میں بھی آپ ؒ نے مہارت حاصل کی تھی، یہ فن آپ ؒ نے اپنے شیخ و مرشد اور اُستاذِ مشفق حضرت مولانا کرامت علی صاحب ؒ سے سیکھا تھا، جو اپنے شیخ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی فوج میں بھرتی تھے اور جنگ بالاکوٹ میں شریک تھے، لیکن شیخ رحمہ اللہ نے آپ ؒ کو اصلاحِ بنگال کے لیے واپس کر دیا تھا۔

۱۸۵۷ء کے جہاد کے دوران ایک مرتبہ ایک زبردست گروہ پورہ معروف پر حملہ کرنے آ گیا، مولانا ؒ نے ایک لمبا بانس اکھاڑ کر اس کو گھماتے ہوئے تنہا حملہ آوروں کا تعاقب کیا، یہ منظر دیکھ کر آن کی آن میں میدان چھوڑ کر سب کے سب بھاگ کھڑے ہوئے، مولانا ؒ کی بہادری کے بہت سے حیرت انگیز واقعات مثلاً مست ہاتھی کو ہلاک کر دینا، حملہ آور سانڈ کو مار ڈالنا ''حیاتِ طاہر'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

آپ ؒ کے اقوال: فرماتے تھے کہ وہی طریقہ اختیار کرو جو **''ما أنا عليه وأصحابی''** کا ہے اور اسی میں نجات ہے، آپ ؒ ایک ایک سنت پر عمل پیرا تھے اور دوسروں کو سنت نبوی پر عمل کرنے کی سخت تاکید فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ''عقائد درست رکھو اور کوئی نئی چیز دین سمجھ کر نہ اختیار کرو، کیوں کہ وہ عند اللہ مردود ہے۔''

فرماتے تھے کہ ''قرآنِ کریم سے زیادہ شغل رکھو اور اس کی تلاوت

پابندی سے کرتے رہو۔'' فرماتے کہ ''دین اُس عالم سے سیکھو جو باعمل اور صاحب تقویٰ ہو۔'' فرماتے کہ ''جتنی فاسد رسمیں رائج ہو گئی ہیں ان سب کو چھوڑ دینے ہی میں عافیت ہے۔''

ف: سبحان اللہ! ہمارے جتنے بھی اکابر ہیں سب ایک ہی بات کہتے آئے ہیں، وہ ہے اتباعِ سنت کی اہمیت اور بدعت سے اجتناب کی ضرورت، اسی میں خیر وعافیت کو سمجھتے اور سمجھاتے آئے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین۔ (مرتب)

مولاناؒ کے متعلق محدثِ کبیر مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ کی تحریر

''اعظم گڑھ کے ضلع میں مئو سے ۵ میل پر شمال مغرب جانب ٹونس کے شمالی کنارہ پر ''پورہ معروف'' نامی ایک چھوٹی سی بستی ہے، مولانا محمد طاہرؒ یہیں کے رہنے والے تھے، مولانا سخاوت علی صاحب جون پوریؒ سے علومِ ظاہری اور مولانا کرامت علی صاحب جون پوریؒ سے فیوضِ باطنی حاصل کیے، مولانا کرامت علی جون پوریؒ نے بیعت لینے کی اجازت بھی ان کو عطا فرمائی تھی، مطبوعہ اجازت نامہ جس میں مولوی محمد طاہر صاحبؒ کا نام مولانا کرامت علیؒ نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا تھا حقیر کی نظر سے گزرا ہے، طب میں آپؒ کا شہرہ تھا، حدیث وفقہ میں مہارت حاصل تھی، اعلیٰ درجہ کے خوش نویس بھی تھے، کتابوں کا کافی ذخیرہ آپؒ کے کتب خانہ میں تھا، مگر اب تھوڑی کتابیں رہ گئی ہیں، حسب ذیل قلمی کتابیں میں نے آپؒ کے کتب خانہ میں دیکھی ہیں:

صحیح البخاری، صحیح لمسلم، مجالس الأبرار مکتوبه

:۱۲۶۶ھ۔ الجامع الصغیر للسیوطی علیہ الرحمۃ، المنار للنسفی علیہ الرحمۃ خود مولاناؒ کے ہاتھ لکھی ہوئی بہت خوش خط، مسند الإمام الأعظم علیہ الرحمۃ، کتاب الحج، أشعة اللمعات جلد :۳، صلوٰۃ مسعودی، مؤطا، حصن حصین، رسالۃ فی بیان الخطاب بأغثنی یا رسول اللّٰہ! و اتخاذ الأطعمۃ فی الموالید و الأعراس للشیخ عابد السندی۔"

ایک دوسرے کتب خانہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی "فتح المنان فی تائید مذہب النعمان" کا نسخہ میں نے دیکھا ہے، جو مولانا طاہر صاحبؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کا سالِ کتابت مولاناؒ نے اپنے قلم سے ۱۲۶۱ھ لکھا ہے، مولانا محمد طاہرؒ اِن علمی کمالات کے علاوہ جسمانی طاقت میں بھی شہرۂ آفاق تھے اور اس سلسلہ میں ان کے ایسے ایسے واقعات مشہور ہیں جن کو لوگ بمشکل باور کریں گے۔"

ف: چنانچہ ہمارے دادا محمد نذیر خانؒ جو ماشاءاللہ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ ساتھ پہلوان بھی تھے، وہ اکثر مولانا محمد طاہر صاحبؒ کے زور اور طاقت کے واقعات بیان فرماتے رہتے تھے، چنانچہ ایک واقعہ یہ بیان فرماتے تھے کہ ایک غیر مسلم پہلوان ان کی پہلوانی کی شہرت سن کر مقابلہ کے لیے پورہ معروف آیا، بستی کے باہر ہی دیکھا کہ برگد یا پیپل کی شاخ کو جھکا کر اپنی بکریوں کو پتی کھلا رہے ہیں، اس نے ان سے دریافت کیا کہ بھائی! یہاں کوئی مولوی طاہر پہلوان رہتے ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں، رہتے ہیں، اس شاخ کو پکڑو، میں ان کو بلاتا ہوں، چنانچہ اس شاخ کو اس نے پکڑ لیا اور مولوی طاہرؒ نے اس شاخ کو جیسے ہی چھوڑا وہ شاخ پہلوان سمیت اوپر چلی گئی اور پہلوان اس میں لٹک گیا، وہ سمجھ

گیا اور اوپر ہی سے بولا کہ آپ ہی مولوی طاہر معلوم ہوتے ہیں، بھلا آپ سے کون مقابلہ کرسکتا ہے؟ اور واپس چلا گیا۔ (مرتب)

حضرت مولانا محمد اسحق دہلویؒ کے قلم سے اجازت حدیث:

۱۲۶۰ھ میں آپؒ نے حجاز کا سفر کیا ہے اور اسی سفر میں حضرت مولانا محمد اسحق صاحبؒ سے جو اس وقت ہجرت کر کے مکہ معظّمہ میں مقیم ہو گئے تھے حدیث کی کچھ کتابیں پڑھی ہیں اور حضرت مولاناؒ نے آپؒ کو سند لکھ کر عطا فرمائی ہے، جس کی نقل یہ ہے:

”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین، و الصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین، محمد و آلہ و صحبہ أجمعین، أما بعد... فیقول خادم علماء الآفاق محمد اسحاق عفا اللہ عنہ و تجاوز عن السیئات، أن المولوی محمد طاہر -طھّرہ اللہ فی الباطن والظاہر- قد قرأ علي الأحادیث النبویۃ -علی صاحبہا ألف ألف تحیۃ و صلوٰۃ زکیۃ- فعلیہ أن یشتغل بقراءۃ علم الحدیث و تعلیمہ بشروطہ المعتبرۃ عند أھلہ، و أوصی لہٗ بتقوی اللہ و سنۃ رسول اللہ، و أن یداوم علی طاعۃ اللہ و ذکرہ فی الخلوات والجلوات، و أن یجتنب عن المعاصی والبدعات، و آخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

حرّرہ الثانی من شھر الجمادیٰ الأولیٰ سنۃ ستین بعد الألف والمأتین فی مکۃ المعظمۃ کرّمھا اللہ۔“

وفات: مولانا محمد طاہر صاحبؒ کی وفات ۷۲/سال کی عمر میں بروز شنبہ ۲۴/ربیع الآخر ۱۲۹۶ھ میں ہوئی۔ (حیاتِ طاہرؒ) (منقول از: رسالہ آثر، مرقاۃ العلوم، مئو)

حضرت مولانا شیخ محمد محدث فاروقی تھانویؒ متوفی ۱۲۹۶ھ

وطن اور خاندان: تھانہ بھون ضلع مظفر نگر یوپی کا ایک چھوٹا سا مگر مردم خیز قصبہ ہے، اسی قصبہ نے قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ صاحب کشافِ اصطلاحات، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت حافظ ضامن شہیدؒ، حضرت مولانا فتح محمد تھانویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو جنم دیا، اور یہیں حضرت مولانا شیخ محمد محدثؒ پیدا ہوئے، جو جامع شریعت وطریقت تھے۔

پیدائش، تربیت اور والدین کے سایہ سے محرومی: حضرت مولانا شیخ محمدؒ کی ولادت ۲۰ / جمادیٰ الاولیٰ / ۱۲۳۰ھ مطابق: ۲ / مئی کو پیر کے دِن ہوئی، آپؒ کے والد مولوی حمد اللہؒ جن کے آپؒ تنہا صاحب زادے تھے تحصیل داری کے عہدہ پر فائز تھے، آبائی املاک وجائداد بھی کافی تھی، اس لیے آپؒ کو آنکھ کھولتے ہی ہر طرح کی آسائش نصیب ہوئی، لیکن اس آسائش اور ناز ونعم کے باوجود آپؒ کی تربیت کی جانب سے کبھی غفلت نہیں برتی گئی، بزرگوں کی توجہ اور اپنی پاک طینت کے سبب آپ شروع ہی سے نیکوکاری اور دینداری کی راہ پر گامزن رہے۔

ابتدائی تعلیم: آپؒ کی تعلیم کا آغاز والدین کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا، آپؒ کے پدرِ بزرگوار مولوی حمد اللہؒ خود عالم اور علم دوست انسان تھے، انہوں نے اپنے نورِعین کی تعلیم کا نہایت معقول انتظام کیا، قدیم دستور کے مطابق چار پانچ سال کی عمر میں آپؒ کی تعلیم شروع ہوئی، حافظہ تیز اور ذہن رسا تھا، اساتذہ کی توجہ اور

شفقت نے مل کر ان پر اور جلا بخشی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑے عرصہ میں آپؒ کے جوہر ذاتی کھلنے لگے اور نہایت کم سنی میں آپؒ نے قرآن مجید مع تجوید حفظ کر لیا، پھر فارسی پڑھی، بعدہٗ مولانا عبدالرحیم تھانویؒ اور مولانا قلندر بخش جلال آبادیؒ سے عربی صرف ونحو کی تحصیل وتکمیل کی، غرض دس گیارہ سال کے سن میں یہ سب مراحل طے ہو گئے، آپؒ کی ابتدائی تعلیم کا معمولی سا تذکرہ ''نزہۃ الخواطر'' جلد ہفتم صفحہ: ۴۱۲ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حوالے سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''وَ قَرَأَ عَلیٰ مَوْلَانَا عَبْدِ الرَّحِیْمِ التانوی و الشیخ قَلَنْدَرْ بَخش جَلَالَ آبادی۔''

یہ دونوں بزرگ کون تھے، اور ان کا کیا علمی مرتبہ تھا؟ ان باتوں کا کسی ذریعہ سے پتہ نہ چل سکا۔

تحصیل علم کی غرض سے دہلی کا سفر: حضرت سید احمد شہیدؒ کے دورہ کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ حضرت مولانا شیخ محمدؒ جن کو علومِ دینیہ کی جانب پہلے سے خاصی رغبت تھی اب اس جذبہ سے اور بھی سرشار ہو گئے، دس گیارہ سال کی عمر تک تو وطن میں رہ کر علم حاصل کیا، لیکن جب اس سن کو پہنچے تو یہ دائرہ تنگ معلوم ہونے لگا، اور اس چھوٹی سی عمر میں جب عام بچے گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں آپؒ حصولِ علم کے شوق میں تن تنہا دہلی پہنچ گئے، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت شاہ عبدالعزیزؒ راہیٔ عالمِ بقا ہو چکے تھے، اور ان کی مسند درس وتدریس کی زینت ان کے نواسے شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ تھے، حضرت مولانا محمدؒ نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے، اور حصولِ علم کی جانب اس

قدر توجہ مبذول کی کہ آٹھ سال کی مدت میں علومِ متداولہ کی تحصیل کر کے اٹھارہ سال کے سن میں شاہ صاحبؒ سے سندِ فراغت حاصل کی، اور علم کی دولت سے مالا مال ہوکر اپنے وطن واپس آئے۔

شریعت کا احترام اور طریقت کا معیار: وطن میں چند سال تک حضرت مولاناؒ محض ایک عالمِ دین کی حیثیت سے متعارف رہے، سوائے اس بیعت کے جو آپؒ نے اپنی سات سال کی عمر میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر کی تھی اس وقت تک نہ آپؒ نے اور کسی سے بیعت کی اور نہ علم باطن کی جانب مائل ہوئے، در حقیقت بعض نام نہاد صوفیوں کو دیکھ کر آپؒ اس کوچہ میں آتے ہوئے ڈرتے تھے، آپؒ کے دل میں شریعت کا احترام اتنا تھا کہ طریقت سے اس کو فروتر کہنے یا سننے پر کسی طرح آمادہ نہ تھے، اور جب بعض متصوفین کو یہ کہتے ہوئے سنتے کہ طریقت کے مقابلہ میں شریعت کیا چیز ہے؟ یا طریقت اور شریعت کی راہیں جدا جدا ہیں تو آپؒ کے دل میں قدرتاً ان کے لیے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، راہِ طریقت سے آپ گریزاں نہیں تھے، لیکن اس کے لیے شریعت کو بنیاد بنانا ضروری قرار دیتے تھے، شرحِ حزب البحر میں ایک جگہ اپنے اسی عقیدہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''ایسے جاہل فقیروں اور درویشوں سے جو شریعت اور طریقت کو مخالف بتاتے ہیں دور بھاگنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ ان کی صحبت میں بہ اُمید حصولِ عرفان اور وصل خداوندی کے اصل متاعِ ایمان جو باعثِ نجاتِ اُخروی ہے ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ معاذ اللہ منہا......''

اسی احتیاط کا اقتضا تھا کہ آپؒ کسی پیر طریقت کے حلقۂ بیعت میں داخل

ہونے سے ہچکچاتے رہے، حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ جو آپؒ کے ہم جد اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ جو آپؒ کے پھوپھی زاد بھائی تھے حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی قدس سرہٗ کے زمرۂ مریدین میں شامل ہو چکے تھے، وہ دونوں از راہِ دوستی مصر ہوئے کہ آپ بھی حضرت میاں جی سے بیعت ہو جایئے، لیکن چوں کہ حضرت مولاناؒ کو میاں جی کی علمِ شریعت سے واقفیت پر پورا بھروسہ نہیں تھا اس لیے آپؒ دونوں دوستوں کے مشورہ کو ہنسی میں ٹالتے رہے، بلکہ ایک دو مرتبہ حضرت میاں جی کی شان میں یہ الفاظ بھی کہہ گزرے: ''واہ واہ! اچھا پیر تلاش کیا، مسجد کا میاں جی! میں اس سے کیا بیعت ہوں گا جس کو علمِ شریعت سے بھی پوری آگاہی نہیں۔'' یا یوں کہا کہ ''وہ تو مسجد کے ملا ہیں، ان سے کیا بیعت کروں گا؟''

حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ سے بیعت: کچھ مدت اسی طرح گزر گئی، اور حضرت مولانا راہِ طریقت میں قدم نہ رکھ سکے، آخر وہ وقت آگیا جب پیر کامل کی نظر فیض اثر نے آپؒ کی کیفیت قلب کو یکسر بدل دیا، اور آپؒ نے حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کے ہاتھ پر چشتیہ، صابریہ، نقشبندیہ اور قادریہ سلسلہ میں بیعت کر لی۔

بیعت کے بعد اپنے پیر بھائیوں سے تعلقات: حضرت مولانا شیخ محمدؒ کو طریقۂ نقشبندیہ سے فطری لگاؤ تھا، چنانچہ آپؒ نے اس کی بہت جلد تکمیل کر لی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ اور حضرت محمد حافظ ضامن شہیدؒ کا رجحان طریقۂ چشتیہ صابریہ کی جانب زیادہ تھا، وہ دونوں طریق میں حضرت مولاناؒ سے سبقت لے گئے، اپنے پیر و مرشد حضرت میاں جیؒ سے فیض حاصل کرنے کے

علاوہ یہ تینوں پیر بھائی ایک دوسرے کو بھی فیض پہنچاتے تھے، حضرت مولاناؒ نے رسالہ ''ارشادِ محمدی'' میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے:

''اور ابتدا میں فقیر نے حسبِ ارشادِ حضرت پیر و مرشد اصلی میاں جی صاحب نور الاسلام کے اپنے پیر بھائی حضرت حافظ ضامن علی شاہ صاحب تھانوی مرحوم و مغفور سے بھی کہ مجھ سے پہلے مرید حضرت میاں جی صاحبؒ کے تھے قدرے فیض صرف نسبت چشتیہ کا اٹھایا، علیٰ ہٰذا القیاس برادرِ دینی پیر بھائی میرے جناب حاجی امداد اللہ شاہ صاحب تھانوی سلّمہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان سے فیض اٹھایا، اور بعد تکمیلِ نسبتِ نقشبندیہ مجھ عاجز کے حضرت حافظ صاحب مرحوم نے بعض امورِ نقشبندیہ کو فقیر سے دریافت فرما کر کاربند ہوئے۔''

حضرت میاں جیؒ کی نگاہ میں حضرت مولانا شیخ محمدؒ کا مرتبہ:

حضرت مولانا علومِ ظاہری میں حضرت میاں جیؒ کے تمام مریدوں سے بڑھے ہوئے تھے، بنابریں حضرت میاں جیؒ آپؒ کا بے حد لحاظ کرتے تھے، ملاقات کے موقع پر گفتگو میں اور مراسلت کے وقت خطوط میں آپؒ کے علمی مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہی پیرایہ اختیار کرتے تھے جو آپؒ کے شایانِ شان ہوتا تھا، حضرت میاں جیؒ کے ایک خط کا ترجمہ کر کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے، ملاحظہ ہو:

''مولانا مولوی شیخ محمد صاحب فضیلت مآب کی خدمت گرامی میں! اللہ تعالیٰ ان کے شوق و ذوق کو جو معرفتِ خداوندی میں ہے زیادہ کرے، سلام ہو آپ پر اور اس شخص پر جو ہدایت اختیار کرتا ہے، اس فضیلت مآب مولانا کا گلشن شباب طاعتِ ایزدی کی آبیاری سے سرسبز ہو، داعی کے دل کا بلبل ہر طرح سے ملاقات

کے پھول کے شوق میں مترنم ومشتاق ہے، لیکن یہ سمجھ کر کہ ملاقات اوقاتِ معینہ پر منحصر ہے اپنے مقصدِ اصلی کو ظاہر کرتا ہے، ایسے وقت میں کہ سقائے سحاب نے آلامِ روزگار کی لو میں کمہلائے ہوئے قلوب کو حیاتِ تازہ بخشی اور نہروں اور حوضوں کے رہنے والوں کو پانی کی موجوں کی بہجت آفرینی نے مثل شب بیدار صوفیوں کے جو حلقۂ عبادت ڈال کر معبودِ حقیقی کے قسم قسم کے اذکار واشغال میں لگے ہوئے ہیں اور نوا سنجانِ گلشن کو عروسِ بہار کی جلوہ گری سے بزمِ خرمی کے قوالوں کی طرح کھینچ کر انواع واقسام کے دل فریب نغموں میں مشغول کیا ہے۔ ؎

نبات از گوشۂ خود سر برآورد　　بیادِ حمد ایزد بار بر خورد

زہے موسم کہ در ہر کشت زارے　　شدہ آبِ رواں چوں نو بہارے

نامۂ مسرت کے انبساط انگیز مضمون کو دیکھ کر کہ اس کے ریحانِ الفاظ حسن وخوبی اور طرب ریزی کی وجہ سے نونہالانِ بوستان کی طرح ناز کرتے تھے چشمِ دل نے طراوت تر وتازہ اور تازگی بے اندازہ پائی۔ ؎

صبا رسید و دلم غنچۂ خنداں شد　　شمیم لطفش درمانِ دردمنداں شد

اگرچہ پیمانۂ دل اس کی ارتیاح آیات کے بادۂ مکالمات سے خرم وشاد ہوا، لیکن عارضِ حال نے خوش آئند قانون کی نوازش یعنی ظاہری گفتگو کے بغیر جو منشئ جان ہے اطمینانِ کلی نہ پایا، اللہ تعالیٰ جو جامع المتفرقین ہے حضرت خضر علیہ السلام کی طرح زلالِ وصال کے متمنیوں کو ان کی مراد تک پہنچائے، اس استعداد وشوق کی وجہ سے جو جسمانی معانقہ ومصافحہ میسر نہ آنے کے سبب شدت اختیار کر گیا ہے، سورج کی تیز شعاعیں نوکِ قلم پر آ کر اپنا اظہار کر رہی ہیں، مولانا! غور کیجیے کہ پروانہ

دیدارِ جمالِ شمع کے شوق میں پریشان رہتا ہے اور اس کی حرارت سے پرہیز نہیں کرتا، جس وقت بلبل کو گلزار کے حسنِ دل نواز کے دیکھنے کا اشتیاق ہوتا ہے تکلیف سے نہیں ڈرتا، پس اس صورت میں کہ ایسی مخلوقات کا یہ طریقۂ ورود ہو بنی نوعِ انسان کا کیا ذکر جس کی پیدائش وخلقت نے تخم دوستی ومحبت میں نشو ونما پائی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ تمام امور میں غم خواری اور محبت کی ضرورت ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، رسالہ گل لالہ تصنیف کردہ اس مجمع کمالات کا (یعنی مولانا شیخ محمدؒ کا) جو معارفِ ربانیہ کا پہچاننے والا اور حقائق کی تحقیق کرنے والا ہے فن تصوف میں ہے، اور اس کا نام "**تنقية الاعتقاد و تصفية الفؤاد من الكفر والارتداد**" ہے، میں اس کو دیکھنے کا بے حد شائق ہوں، وہ دن کتنا اچھا ہوگا جب اس کے مشتاقانِ جمال کی آنکھیں اس کے مطالعۂ کحل الجواہر سے روشن ومنور ہوں گی۔

اس کے علاوہ مہربانِ مخلص دل حافظ صاحب، حافظ ضامن علی کو اپنے پال گو پال کی جگہ سمجھ کر اس کے حال پر شفقت ومہربانی کی نظر رکھیں، اگر اتفاقاً بتقاضائے بشریت ان سے کوئی لغزش ہو تو سوائے معافی اور مہربانی کے وجہ ضمیر (ضمیر کے چہرے) پر کوئی نقش نہ رہے، دل کی کدورت اور رنجشِ جسمانی کو اُن اوراد واشغال سے جو آپ کو بتائے گئے ہیں صیقل توجہ سے پاک وصاف کر کے غیبی مہمانوں کے اُترنے کی جگہ بنائیں۔ (دل کو گردِ کدورت سے صاف رکھیں)

دلت چوں غنچہ بذکرش شگفتہ سر بادا | لبش بہ شبنم یادش چوں برگِ تر بادا
مشامِ جانِ من از کوئے او شمی باید | وجودِ نخل ز عشقش تو بارو بادا

زیادہ بجز شوق کیا لکھا جائے، حافظ جی صاحب، حاجی امداد اللہ صاحب، حافظ رفیع الدین صاحب اور مسجد کے اِرد گرد رہنے والے جملہ حضرات کو سلامِ مسنون الاسلام پہنچا دیں، اور بندہ کے پاس اس وقت جو لوگ حاضر ہیں ان میں سے حافظ محمود نانوتوی عفی عنہٗ کی جانب سے مولوی صاحب، حافظ محمد ضامن صاحب اور حافظ امداد اللہ صاحب کو بصد نیاز و انکساری آداب و تسلیمات پہنچے۔

ف: سبحان اللہ، کیا خوب مکتوبِ گرامی ہے، جو ہم جیسے لوگوں کو باوجود نثر کے سمجھنا مشکل ہے۔ بظاہر میاں جی نور محمد جو مکتب کے ملا تھے مگر اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی جامعہ کے معلم ہوں، تبھی تو حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ ان سے بیعت ہوئے، مر مٹے، یہی حال حضرت شیخ العلماء حضرت حاجی امداد اللہؒ کا تھا، ان کے علم و فضل کو دیکھ کر ہی حجت الاسلام مولانا محمد قاسمؒ جیسے عالم ان کے سامنے جھک گئے، اور ان کے علم و معرفت کے معترف ہوئے، اور یقیناً اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ ؎

خم کہ از دریا درو راہے بود　　پیشِ او جیحونہا بازو نہد

حضرت میاں جیؒ کا فیض روحانی اور وصال: حضرت مولانا کو اپنے پیر طریقت حضرت میاں جی نور محمدؒ کی صحبت بہت کم نصیب ہوئی، لیکن بمصداق ''واما پرتوِ بزرگاں کافی است'' پیر کی نظر فیض اثر اور اس پر حضرت مولاناؒ کی ذاتی صلاحیت دونوں نے مل کر چند ہی سال میں آپؒ کو کندن بنا دیا، ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں حضرت میاں جی نور محمدؒ کا بعمر ۵۸ سال وصال ہوگیا، اور یہ تینوں پیر بھائی مسندِ ارشاد پر بیٹھے، اور اپنے پرتوِ انوار سے ایک عالم کو منوّر کرنے

لگے۔(سوانح علماءِ دیو بند:۲؍۲۷۲)

حج سے واپسی کے بعد: سفرِ حج سے وطن واپس آئے تو آپؒ نے پیر محمد والی مسجد میں سکونت اختیار کی، وہیں حاجی امداد اللہؒ اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کا قیام تھا، ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہونے کی وجہ سے اور اس لیے کہ مختلف مشائخ مثلاً حضرت محمد اعلیٰ تھانویؒ صاحب کشافُ اصطلاحاتِ الفنون اور حضرت مفتی الٰہی بخشؒ مصنفِ مثنوی تکملہ دفترِ ششم نے یہیں باطنی فیوض حاصل کیے تھے یہ مسجد ''دوکانِ معرفت'' کہلاتی تھی، یہاں دن رات علم وعرفان اور ذکر وفکر سے مجالس گرم رہتی تھیں، حکیم محمد عمر چرتھاولی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت مسجع ومقفیٰ عبارت میں اس مسجد کا نقشہ پیش کیا ہے:

''سبحان اللہ وبحمد اللہ، وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ یہ مسجد عبادت گاہِ قدسی نفساں تھی، ہم پایۂ نجوم یہاں کے نمازی تھے، ہم مرتبۂ فلک یہاں کی زمین تھی، ایک طرف شمال کے حجرے میں مثالِ قطبِ شمالی، عاشق ذوالجلال، شہیدلم یزلی، ولیٔ ازلی حافظ ضامن شہیدؒ یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے، ایک جانب جنوب کی سہ دری میں حضرتِ فیض درجت سلطانِ زمین ولایت وکرامت، ماہِ آسمانِ رفعت وعظمت، درویشِ صاحبِ برکت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ سرگرمِ قال اللہ وقال الرسول رہتے، اور مسجد کے سامنے گرتے پڑتوں کے تھامنے کو مشرق کے حجرے میں ہمارے مرشد مشفق قدس سرہٗ الخالق کبھی درس وتدریس طلبہ میں، کبھی مشاہداتِ ذاتِ سلطان الاذکار میں مستغرق، یہ نقشہ تو ان حضرات کی روحانی زندگی کا تھا۔

اب آپس کی بے تکلفی کی بھی ایک ہلکی سی جھلک ملاحظہ فرمایئے! تینوں

بزرگ بچپن کے دوست تھے، اس وقت جو تعلقات قائم ہو گئے تھے اور جس بے تکلفی کا مظاہرہ وہ عہدِ طفلی میں کرتے تھے مسندِ رُشد و ہدایت پر فائز ہونے کے بعد بھی ان کے اس رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ (سوانح: ۲۷۴)

نوٹ: اس کے بعد سوانح نگار نے قصبۂ تھانہ بھون اور قصبۂ شاملی کے جہاد وغیرہ کے حالات درج فرمائے ہیں، جن کو ہم بغرضِ اختصار و مصلحت حذف کرتے ہیں۔

روپوشی کا زمانہ: حضرت مولانا شیخ محمدؒ نے اس جہاد میں کس قدر حصہ لیا اس کے متعلق نہ کوئی زبانی روایت ملی اور نہ تحریری شہادت، تاہم قصبۂ تھانہ بھون پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا تو اوروں کے ساتھ آپؒ کو بھی نکلنا پڑا۔

رامپور میں آپؒ کے کچھ رشتہ دار تھے وہیں دو تین سال تک روپوشی کی زندگی گزاری، آپؒ کا قیام اس حویلی میں تھا جو محل کے نام سے مشہور ہے، اور بقول آپؒ کے وہ مکان اصل میں شیخ سالار صاحب چشتیؒ کا تھا۔

رامپور میں آپؒ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء تک مقیم رہے، وہاں سے کئی مرتبہ میرٹھ بھی جانا ہوا، لیکن غالباً گرفتاری کے ڈر سے ایک دفعہ بھی تھانہ بھون نہیں آئے، حضرت مولاناؒ نے تھانہ بھون سے جدائی کے ان ایام کو دورِ جلاوطنی سے تعبیر کیا ہے، لیکن جلاوطنی اور روپوشی کا یہ زمانہ علمی مشاغل کے لیے نہایت سازگار رہا، ان ہی ایام میں آپ نے مثنویٔ معنوی دفتر ہفتم مکمل کیا، اور اسی زمانہ میں ''حزب البحر'' کی شرح لکھی، ایک اور تصنیف ''ارشادِ محمدی'' بھی اسی دور کی یادگار ہے، اس کو آپؒ نے مولوی فدا علیؒ اور منشی محراب علی انوپ شہری کے ایما پر مرتب فرمایا۔ (۲/۲۸۸)

ٹونک میں قیام: ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں نواب وزیر الدولہ کے بلانے پر ریاست ٹونک تشریف لے گئے، اور وہاں نواب محمد علی کے جو اس وقت ولی عہد تھے استاذ مقرر ہوئے، ٹونک میں حضرت مولاناؒ کئی سال مقیم رہے، آپؒ کے دورانِ قیام نواب وزیر الدولہ کا انتقال ہوا، ان کی جگہ نواب محمد علی مسند نشین ہوئے، جب تک آپؒ ٹونک میں مقیم رہے نواب وزیر الدولہ اور ان کے بعد نواب محمد علی نے آپؒ کو پورے اعزاز واکرام کے ساتھ مہمان رکھا، سو روپئے ماہانہ وظیفہ ملتا رہا۔

دل چسپ اور عبرت آموز واقعہ: ایک ہندو راجہ نواب صاحب ٹونک کا دوست تھا، وہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کرتا رہتا تھا، مذہب اسلام کو اچھی طرح جاننے کے بعد وہ اس کی حقانیت کا قائل تو ہو گیا، لیکن ایک وسوسہ اس کے دل میں ایسا قائم ہوا کہ اس کی وجہ سے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے ہچکچاتا رہا، اس کا کہنا تھا کہ قرآن مجید واقعی اللہ کا کلام ہے تو اس کا اثر پڑھنے اور سننے والوں پر ہونا چاہیے، لیکن مسلمان رات دن اس کا وِرد کرتے ہیں پھر بھی ان پر رنج وخوشی اور عید ونوید کی آیتوں کا ذرّہ برابر اثر نہیں ہوتا، ایسی صورت میں اس کو الہامی کتاب کیسے کہا جا سکتا ہے؟ ایک مرتبہ نواب صاحب کے سامنے بھی اس نے اپنے اس وسوسہ کا اظہار کیا، نواب صاحب نے اس کو حضرت مولاناؒ کی خدمت میں پیش کر دیا، آپؒ نے اس بات کا اس وقت کوئی جواب نہیں دیا، اس راجہ سے جمعہ کے روز نہا دھو کر اور پاک وصاف کپڑے پہن کر آنے کو کہا، آپؒ کے ارشاد کے بموجب جب وہ راجہ جمعہ کے دِن حاضر خدمت ہوا آپؒ نے اس کو سامنے بٹھا کر سورۂ ''ق'' کی تلاوت فرمائی، جس کو سن کر وہ لوٹنے اور تڑپنے

لگا، جب آپؒ تلاوت سے فارغ ہوئے تو وہ دوڑ کر آپؒ کے قدموں پر گر پڑا اور فوراً مسلمان ہو گیا، اس کے استفسار پر آپؒ نے فرمایا کہ ''قرآن مجید یقینا کلام اللہ ہے، لیکن یہ ان ہی لوگوں کے دلوں پر اثر کرتا ہے جن میں تقویٰ وطہارت ہے، فی زمانناً مسلمانوں کے قلوب دنیوی آلائش سے ایسے ملوث ہو گئے ہیں کہ نورِ ہدایت کی کرنیں ان میں نفوذ نہیں کرسکتیں۔''

ٹونک سے واپسی: حضرت مولانا شیخ محمدؒ ۱۲۸۲ھ کے آخر یا ۱۲۸۳ھ کے شروع میں ٹونک سے تھانہ بھون تشریف لے گئے، ٹونک میں دورانِ قیام آپؒ کے پاس گورنمنٹ ہند نے محالِ باغبان قصبہ تھانہ بھون کے نیلام کا اشتہار بھی بھیجا تھا، نیلام کی زد میں آپؒ کی اپنی جائداد بھی آ گئی تھی، جس پر آپؒ نے مقدمہ دائر فرمایا تھا، چنانچہ یہ مقدمہ حضرت مولاناؒ کے لیے طرح طرح کی آزمائشوں کی کسوٹی بن گیا، آپؒ ان آزمائشوں میں ثابت قدم رہے، نہ آپؒ نے روپیہ پیسہ کی پروا کی، نہ مال واملاک کے جانے کا غم کیا اور نہ ہی خوشامد درآمد کے ذریعہ کام نکالنے کی کوشش کی۔ (صفحہ:۲۹۱)

وفات: دن کے ایک بجے کا وقت تھا کہ آپؒ سلطان الاذکار میں مشغول ہو گئے، ہر سانس کی آمد وشد سے لفظ اللہ صاف صاف نکلنے لگا، شام کے وقت حضرت کی مجلس میں اہل شہر کا ایک کثیر مجمع جمع ہو گیا، پاسِ انفاس اور سلطان الاذکار کی کیفیت اتنی بڑھی کہ ہر واقف وناواقف پر ظاہر ہو گئی، متولی عبدالرحمن تھانویؒ نے بصد نالہ و فغاں کہا: ''افسوس! آج یہ آفتابِ عالم تاب چھپا جاتا ہے۔'' بقولِ حکیم محمد عمر صاحبؒ اس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا ایک میدانِ وسیع میں صدہا اولیاء اللہ اور

ہزاروں صوفیۂ باصفا جہر کے ساتھ ذکر اللہ کررہے ہیں، اور ہر طرف سے اللہ اللہ کی صدا آرہی تھی، ساڑھے گیارہ بجے رات تک یہ کیفیت رہی، اور جب نصف شب گزر گئی تو دفعۃً مغرب کی سمت سے ایک آندھی اٹھی اور بادل چھا گیا، اسی وقت روحِ پرفتوح عالمِ بالا کی جانب رخصت ہوگئی۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

جیسے ہی حضرتؒ نے انتقال فرمایا پہلے تو سخت زلزلہ آیا، پھر دیر تک بادلوں کا شوراور آندھی کا زور رہا، آپؒ کی وفات کی وجہ سے جہاں زمین لرزاں تھی اور آسمان گریاں، وہاں تمام حاضرین کے دل وجگر بریاں تھے، بہت سے لوگوں نے رات ہی سے قرآن مجید اور کلمۂ توحید بطورِ ایصالِ ثواب پڑھنا شروع کردیا تھا، صبح ہوتے ہوتے بہت سے ناظرہ خواں اور حافظِ قرآن جمع ہوگئے، اور سب تجہیز وتکفین، قرآن مجید کی تلاوت اور کلمۂ طیبہ کا وِرد کرتے رہے، ۷/ربیع الثانی/۱۲۹۶ھ کو منگل کے دِن دس بجے کے قریب عیدگاہ کے نزدیک نمازِ جنازہ پڑھی گئی، مسلمانوں کے علاوہ دور دور کے لوگ شریک جنازہ ہو گئے تھے، حالاں کہ اس وقت تک ریل اس علاقہ میں جاری نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود ایک بڑا مجمع پیدل اور سواری سے شرکت جنازہ کے لیے تھانہ بھون پہنچ گیا تھا، اتفاقاً گورکنوں کی غلطی سے قبر کی تیاری میں دو گھنٹہ کی دیر ہوگئی، اس عرصہ میں آپؒ کے خلیفۂ مجاز حضرت قاضی سید محمد اسماعیل منگلوریؒ بھی آگئے، غرض دوپہر سے پہلے پہلے علم وعرفان کا یہ آفتابِ نیم روز زیرزمیں غروب ہوگیا۔

تاریخ وفات کا ایک مادہ آیت کریمہ ہے:

{عَسیٰٓ أَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا} (سوانح علماءِ دیوبند: ۲۹۵)

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ متوفی ۱۲۹۶ھ

نام ونسب: نام شاہ عبدالغنی مجددی، والد کا نام حضرت شاہ ابوسعید مجددی ہے، آپؒ کا سلسلۂ نسب مجددِالف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ سے ملتا ہے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت شب دوشنبہ ۲۵/شعبان/ ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۹/ جون ۱۸۱۹ء کو دہلی میں ہوئی۔ ''مظاہر حلیم'' تاریخی نام ہے۔ (مقاماتِ مظہری:۵۱۱)

تعلیم وتربیت: آپؒ نے مولانا حبیب اللہ دہلویؒ کے پاس قرآنِ پاک یاد کیا اور نحو وعربیت کی تعلیم پائی، فقہ وحدیث پر خاص توجہ کی، حضرت شاہ محمد اسحق دہلویؒ سے حدیث کا درس لیا، اپنے والدؒ سے مؤطا امام محمد اور مولانا مخصوص اللہؒ سے مشکوٰۃ پڑھی۔

۱۲۴۹ھ میں جب آپؒ کی عمر ۱۴ سال کی تھی اپنے والد ابوسعید مجددیؒ کے ساتھ حرمین کی زیارت سے مشرف ہوئے اور شیخ عابد سندھیؒ و شیخ اسماعیل رومیؒ سے حدیث کی سند حاصل کی، حج کے بعد حضرت شاہ ابوسعیدؒ بیمار ہوگئے، زیارتِ حرمین کے بعد ہندوستان کی طرف کوچ کی، ۲۲/رمضان/ ۱۲۵۰ھ کو ٹونک پہنچے اور عید کے دِن داعیٔ اجل کو لبیک کہا، نعش مبارک دہلی لائی گئی، چالیس دِن کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی غسل دیا گیا ہے۔ **ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشآء۔**

شاہ عبدالغنی صاحبؒ اپنے والد ماجدؒ کے انتقال کے بعد چند مہینے ٹونک

میں مقیم رہے، پھر دہلی آکر برسوں درس دیا اور مریدوں کی تربیت فرمائی، شاہ ابوسعید صاحبؒ نے انتقال کے دِن آپؒ کو اجازت مرحمت فرمائی اور چند وصیتیں کیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ ''دنیاداروں کے دروازے پر جاؤ گے تو ذلت اٹھاؤ گے، ورنہ وہ خود تمہارے دروازے پر آکر ناک رگڑیں گے۔''

ف: چنانچہ جن علماء ومشائخ نے اس نصیحت پر عمل کیا وہ امراء کے یہاں بھی مکرم وباعزت ہوکر رہے۔ (مرتب)

آپؒ کے معمولات: محمد حسین مرادآبادیؒ نے لکھا ہے کہ میں چند روز خانقاہ میں شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی خدمت میں رہا ہوں، میں نے ان کو علم ظاہر وباطن کی تعلیم میں مشغول پایا، فجر کے بعد مراقبہ کرتے تھے، اشراق کے بعد مریدوں کو توجہ دیتے تھے، پھر حدیث کا درس دیتے تھے، قیلولہ ونمازِ ظہر کے بعد فقہ کا درس دیتے تھے، عصر کی نماز کے بعد تعلیم باطن والقاءِ نسبت فرماتے تھے، دنیا واہل دنیا کی باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ انگریزوں کے نوکروں اور ملازموں کا ہدیہ اور دعوت قبول نہیں کرتے تھے، غایت احتیاط کی بنا پر بازار کے آم نہیں کھاتے تھے، فرماتے تھے کہ ''بیچنے والوں نے مالکوں سے بیع فاسد کے ذریعہ خریدا ہے۔''

ف: سبحان اللہ! یہ تھا کھانے میں تقویٰ کا حال، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ظاہری و باطنی علوم ومعارف سے نوازا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق دے، آمین۔ (مرتب)

سفر حجاز: آپؒ نے ۱۲۷۳ھ مطابق: ۱۸۵۷ء کے جہاد وانقلاب کے دوران اپنے اہل وعیال کو لے کر حجاز کی طرف ہجرت فرمائی، شریف نے مسجد نبوی کے

سامنے آپؒ کے رہنے کے لیے ایک حجرہ عنایت کیا، اسی میں آپؒ مقیم ہوئے اور جب تک زندہ رہے مسجد نبوی میں بقول مراد آبادی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تعلیم علمِ ظاہر و باطن فرماتے رہے۔

ہندوستان میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ آپؒ کے حلقۂ درسِ حدیث میں شریک ہوئے اور سندو اجازت سے مشرف ہوئے۔ حجاز میں مولانا عبدالحی لکھنویؒ اور مولانا عبداللہ مئویؒ نے آپؒ سے سند حاصل کی۔ (اعیان الحجاج: ۲/ ۲۴۳)

حجاز میں دور و دراز سے اہل فضل وکمال آپؒ کے حلقۂ درس میں آکر شامل ہونے لگے، آپؒ کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور ''مسند وقت'' کہلانے لگے، علماء نے آپؒ کی اسناد کو کتابی شکل میں جمع کیا، چنانچہ **''الیانع الجنی فی أسانید الشیخ عبدالغنی''** کے نام سے شیخ محسن ترہتیؒ (محمد بن یحيٰ التیمی) نے جمع کیا ہے۔

تصانیف: آپؒ کی تصانیف بھی متعدد ہیں، مثلاً ''انجاح الحاجہ (حاشیہ سنن ابن ماجہ) ''تبریز المکنونات فی تخریج احادیث المکتوبات'' (تخریج مکتوباتِ مجدد الف ثانی) ''تحفۂ تیموریہ، شفاء السائل، اردو ترجمہ الاحتساب اور ضمیمہ مقاماتِ مظہری''

وفات: ۷/محرم/۱۲۹۶ھ مطابق: ۳/ دسمبر/ ۱۸۷۸ء بروز سہ شنبہ مدینہ منورہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔ (مقاماتِ مظہری: ۵۱۱)

حضرت مولانا سید محمد معصوم نقشبندی بالا پوری ؒ متوفی ۱۲۹۷ھ

ولادت وابتدائی تعلیم: آپ ؒ مولانا خلیل اللہ کے فرزندِ بزرگ ہیں، آپ کی ولادت باسعادت بالا پور برار میں ہوئی، پرورش بھی برار کی آب و ہوا میں پائی، پھر والد ماجد و مولوی مجاہد الدین کی خدمت میں تعلیم و تربیت پائی، کتب تحصیل تقریباً ختم کی تھیں، حدیث وفقہ میں خوب مستعد تھے، درس و تدریس کا شوق کم تھا، کبھی کبھی حدیث کا درس فرماتے تھے۔

انفاق فی سبیل اللہ: متقی، پرہیزگار اور دیندار بزرگ تھے، مزاج میں درویشی تھی، مگر بظاہر امیرانہ تجمل و طمطراق سے زندگی بسر کرتے تھے، مہمان نواز وقبیلہ پرور تھے، صدہا اعزہ واقارب کے ساتھ حسن سلوک فرماتے تھے، ہر روز آپ ؒ کے دسترخوان پر دس بیس آدمی شریک طعام رہتے تھے، تمام جاگیر کی آمدنی مہمان نوازی اور کنبہ پروری میں صرف ہوتی تھی، آپ ؒ اس قدر سخی وفیاض تھے کہ کل آمدنی پر اکتفا نہ کر کے ہزارہا روپیہ قرض منگوا کے صرف کرتے تھے، وضع داری کے بڑے پابند اور آباءِ کرام کے طریقہ کے پیرو تھے، مدۃ العمر آن بان سے رہے، مزاج میں استغنا حد سے زیادہ تھا، متوکل علی اللہ رہتے تھے، کبھی کسی امیر یا رئیس سے سائل نہیں ہوئے۔

دار القضا کا نظام: برار میں آپ مسلمانوں کے پیشوا کیا بلکہ حاکم تھے، اکثر اہل اسلام کے معاملات کا شرعی فیصلہ آپ ؒ ہی فرماتے تھے، صاحبِ فتویٰ تھے،

ہر ایک مرید و مستغیث و مستفتی سے حق الخدمت و پیش کش معقول لیتے تھے، معتقدین حسن اعتقاد سے دیتے تھے، کوئی عذر نہیں کرتا تھا، شکل یہ تھی کہ اگر کوئی آپؒ کے نذرانہ میں سستی کرتا تو اس کا حقہ پانی بند کرتے تھے، اہل اسلام میں سے کوئی بھی ایسے شخص کو اپنی شادی وغمی میں شریک نہیں کرتا تھا، نہ اس کے ساتھ کوئی شریک ہوتا تھا، بظاہر یہ مولانا کا تشدد تھا، نہیں معلوم مولانا کس نیت اور کس ارادہ سے فرماتے تھے، شاید یہ امر ترھیباً و تھدیداً کرتے تھے، واللہ اعلم بالصواب۔ لیکن اہل برار آپؒ کے تشدد سے ناخوش نہیں ہوتے تھے، نہ کوئی حضرت کی نسبت شکایت کرتا تھا، عوام کی خوشی و رضامندی سے ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ آپؒ کرتے تھے بجا و درست تھا، برار میں آپؒ کے ہزار ہا مرید تھے، آپ کو ہدایت وارشاد کا شوق تھا، درس و تدریس کی طرف گو توجہ کم تھی مگر آپ دین اسلام اور مسلمانوں کی ملی خدمات میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

غیرتِ دینی: آپؒ کے مزاج میں دین اسلام کی حمیت وحرارت بے انتہا تھی، اپنے آباءِ سلف کی طرح دینی امور میں جان و مال صرف کرنے میں کبھی دریغ نہیں فرماتے تھے، جب کبھی اہل اسلام اور اہل اصنام میں دینی امر کو لے کر باہمی تکرار و بحث ہوئی تب آپؒ مستعدی کے ساتھ اسلام کے معین و مددگار بنتے تھے۔

ف: اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ان صفات سے متصف فرمائے، آمین۔ (مرتب)

حیدرآباد میں قیام: ۱۲۷۷ھ میں آپؒ کی جاگیر کا انتظام سرکار گورمنٹ کی طرف سے ابدی نسلاً بعد نسل ہوا، مگر آپؒ نے اپنے داماد مولوی سید نور الاتقیاء صاحب مرحوم کی رائے سے سرکار میں واگذاشت کی درخواست کی کہ اس کا

مبادلہ ممالک محروسہ آصفیہ میں ملے، چنانچہ آپؒ کی درخواست کے مطابق اس کا
مبادلہ قصبہ واگرول وغیرہ دیہات پرگنہ قصبہ سندلہ کھیڑلہ اب تک بحال و برقرار
ہیں، اور مولوی صاحبؒ ۱۲۸۴ھ میں بالاپور سے اورنگ آباد اور اورنگ آباد
سے حیدرآباد آئے، حضرت نورالاصفیاء صاحبؒ کے مکان پر فروکش ہوئے،
حیدرآباد کے علماء ومشائخ نے آپؒ کی تعظیم وتکریم کی، اکثر شہر کے امراء آپؒ سے
ملتے تھے، نواب مختار الملک سالار جنگ اوّل نے زور آور جنگ کوتوال کے
ذریعہ ملازمت کا اشتیاق ظاہر کیا، اسی سال ۱۴ / رمضان المبارک کو آپؒ مع
نواسئہ مولوی نور الحرمین صاحبؒ، مولوی فخر الدین ترمذیؒ، مولوی نور المقتدیٰ
صاحبؒ عم بزرگوار وغیرہ مدارالمہام کے دربار میں پہنچے، نواب صاحبؒ نے
استقبال کیا، اور کمالِ نیاز مندی سے دست بوس ہوئے اور سر جھکایا، آپ نے
پیٹھ پر ہاتھ رکھ کے دعا دی اور مسند پر بیٹھے، تھوڑی دیر گفتگو کر کے رخصت
ہوئے، نواب صاحبؒ نے چند قدم مشایعت کر کے رخصت فرمایا، پھر افطار کے
وقت سترہ خوان کا تورہ بھیجا، پھر ۱۲۸۶ھ میں مولوی صاحبؒ نے دختر زادے
مولوی سید نور الحرمینؒ کی شادی مولوی حبیب یار خان برادرِ محی الدولہ کی لڑکی سے
کی، نواب مختار الملک بہادر اوّل رسم تہنیت کے لیے نواب قادر الدولہ کے مکان
پر آئے، مولوی صاحبؒ نے لب زینہ تک استقبال کیا، نواب صاحب دیر تک
رہے، باہم گفتگو ہوتی رہی، نواب صاحب نے مولوی صاحبؒ سے پوچھا کہ
آپ کے جدِامجد حیدرآباد میں کتنی مدت تک رہے تھے؟ آپؒ نے جواب دیا کہ
آپ کے جد منیر الملک نے ایک سال تک رکھا تھا، اللہ تعالیٰ آپ کو خوش وخرّم

رکھے کہ فقیر کو دو سال سے مہمان رکھا ہے، پھر مولوی صاحبؒ نے نواب صاحب کو رخصت کے وقت پاندان، ہار اور گلدستہ دیے، اور ایک دستار و قبضۂ ترکش وکمان تبرکا عطا فرمایا، نواب صاحب نے دستار سر پر رکھی اور رخصت ہوئے، مکان سے دو ہزار روپئے نذر بھیجے، غرض کہ مولوی صاحبؒ تا بزندگی معزز و محترم رہے۔

وطن مالوف میں واپسی: پھر چند مدت کے بعد مولوی صاحبؒ نے ۱۲۸۷ھ میں حیدر آباد سے وطن مالوف برار مراجعت کی، خیر و عافیت سے پہنچے، اعزہ واقارب، معتقدین اور طالبین سے ملے، سب اہل برار آپؒ کی تشریف آوری سے بہت خوش ہوئے۔

وفات: آخر آپؒ نے ۱۲۹۷ھ میں اس عالمِ فانی سے فردوسِ بریں کو رحلت فرمائی۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

بالا پور کی خانقاہ میں اجداد کے مزارات کے قریب مدفون ہوئے، مولوی امجد حسین صاحب خطیب جامع مسجد ایلچ پورؒ نے تاریخ کہی: ''عارفِ ہند وآفتابِ برار''۔ (محبوب التواریخ: ۲/ ۸۶۴)

حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ[۱] متوفی ۱۲۹۷ھ

فضل وکمال: حضرت مولانا احمد علی محدثِ سہارن پوریؒ اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم اور نامور محدث تھے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا سید محمد علی صاحب مونگیریؒ اور علامہ شبلیؒ جیسے مشاہیر اور یگانۂ روزگار علماء آپؒ کے حلقۂ تلمذ میں داخل تھے۔

ولادت، نسب اور تعلیم: ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء کو سہارن پور کے انصاری خاندان میں پیدا ہوئے، اوائل عمر میں تعلیم کا شوق نہ تھا، اٹھارہ (۱۸) سال کی عمر میں تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے اور میرٹھ میں قرآن شریف حفظ کیا، پھر سہارن پور میں مولانا سعادت علی سہارن پوریؒ سے کچھ کتابیں پڑھیں، آخر میں دہلی پہنچ کر استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، صحیح بخاری کا اکثر حصہ شیخ وجیہ الدین صدیقی سے سہارن پور میں پڑھا، شیخ وجیہ الدینؒ مولانا عبدالحیؒ کے واسطے سے شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے سلسلۂ سند و اجازت میں شامل تھے، کتب حدیث کی تکمیل ۱۲۶۱ھ مطابق: ۱۸۴۵ء میں مکہ مکرمہ میں حضرت شاہ محمد اسحق دہلویؒ کی خدمت بابرکت میں رہ کر

۱۔ محدث سہارن پوریؒ کے متعلق رسالہ ''برہان'' ماہ ذوالقعدہ ۱۳۹۴ھ مطابق نومبر ۱۹۷۴ء کے شمارہ میں جناب سید محمد صاحب رضوی دارالعلوم دیوبند کا مضمون پڑھا، بہت ہی جامع اور بصیرت افروز تھا، اسی سے آپ کے حالات درج کر رہا ہوں۔ (مرتب)

کی، ان کے حدیث پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد ظہر تک حرم شریف میں بیٹھ کر احادیث کو نقل کرتے، اور ظہر سے عصر تک نقل کی ہوئی احادیث حضرت شاہ صاحبؒ سے پڑھتے تھے، حدیث کی تمام کتابیں اسی طرح پڑھیں، ان کا خط نہایت پاکیزہ تھا، چنانچہ ابوداؤد کا ایک مکمل نسخہ جو محدثِ سہارن پوریؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا حضرت مولانا خلیل احمد انبیٹھویؒ کے پاس موجود تھا، ''بذل المجہود'' کی تالیف کے دوران یہی نسخہ مؤلفؒ کے سامنے رہا ہے۔ (تاریخ مظاہر)

درس وتدریس اور کتب حدیث پر حواشی: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ ''اوجز المسالک'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''علوم سے فراغت کے بعد پڑھانے میں مشغول ہوگئے، دہلی میں مطبع احمدی جاری کیا، اس میں حدیث کی کتابیں چھاپیں اور ان پر مفید حواشی لکھے، خاص طور سے صحیح بخاری کا نہایت عمدہ حاشیہ لکھا ہے، بخاری کے آخری پانچ پاروں کے حواشی ان کی فرمائش پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے لکھے ہیں۔''

مولانا حکیم عبدالحی لکھنویؒ نے ''نزہۃ الخواطر'' میں لکھا ہے کہ ''مکہ مکرمہ سے واپس آکر تعلیم و تدریس میں مشغول ہوگئے، ذریعۂ معاش تجارت تھا، حدیث میں پوری بصیرت رکھتے تھے، اپنی عمر صحاح ستہ بالخصوص صحیح بخاری کے پڑھانے میں صرف کردی، دس سال صحیح بخاری کی تصحیح میں لگے، بخاری پر مفصل حاشیہ لکھا۔'' (نزہۃ الخواطر: ۷/ ۴۳)

تجارت وسخاوت: محدث سہارن پوریؒ کا ذریعۂ معاش تجارت تھا، آپؒ نے خود مطبع احمدی قائم کیا تھا، اس سے بڑی آمدنی تھی اور خوب فراغت اور فراخی

کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، روزانہ نئی پوشاک زیب تن کرتے اور اُتارے ہوئے کپڑے غریبوں کو تقسیم کر دیتے، معمول یہ تھا کہ رمضان شروع ہونے سے پہلے سال بھر کے دنوں کی تعداد کے مطابق کُرتے، پاجامے اور ٹوپیاں سلوالی جاتی تھیں، علی الصباح جو سائل سب سے پہلے مکان پر پہنچ جاتا اسے تینوں کپڑے دیدئے جاتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں مطبع احمدی تباہ ہو گیا تو کچھ دنوں تک سہارن پور میں قیام رہا، پھر میرٹھ میں مطبع احمدی از سرِ نو قائم کیا، بعد ازاں کلکتہ چلے گئے، مگر آمدورفت کا سلسلہ سہارن پور برابر رہا۔

سہارن پور میں قیام: ۱۲۹۱ھ مطابق: ۱۸۷۴ء میں محدثِ سہارن پوریؒ کلکتہ سے واپس چلے آئے اور مستقل طور پر سہارن پور میں مقیم ہو گئے اور مدرسہ کی بہت اِعانت فرمائی، حضرت مولانا سعادت علی صاحبؒ کے وِصال کے بعد اب تک مدرسہ کی نیابت کسی کے سپرد نہیں ہوئی تھی، حضرت ممدوحؒ کی تشریف آوری پر مولانا المکرم کی جگہ حضرت محدثؒ کا اسم گرامی لکھا جانے لگا۔

دارالعلوم کے نودرے کی بنیاد: ۱۲۹۲ھ مطابق: ۱۸۷۵ء میں جب دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی عمارت تعمیر ہوئی جو ''نودرہ'' کے نام سے موسوم ہے، تو اس کا سنگ بنیاد حضرت محدثِ سہارن پوریؒ کے دست مبارک سے رکھوایا گیا۔ رودادِ دارالعلوم دیوبند ۱۲۹۲ء مطابق: ۱۸۷۵ء میں لکھا ہے کہ ''اوّل پتھر بنیاد کا حضرت مولانا مولوی احمد علی صاحبؒ نے اپنے دست مبارک سے رکھا، اور بعد میں جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب و مولانا مولوی رشید احمد صاحبؒ اور

مولانا مولوی محمد مظہر صاحبؒ نے ایک ایک اینٹ رکھی۔‘‘

تلامذہ: آپؒ کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع ہے، جس میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتویؒ کا اسم گرامی سرفہرست ہے، نیز آپؒ کے شاگرد حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، علامہ شبلیؒ اور مولانا محمد صدیق دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۶۱ھ) بھی ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ ’’اللہ تعالیٰ نے آپؒ کے درس میں برکت بخشی تھی، سیکڑوں علماء اس کے فیض سے سرفراز ہوئے، اس زمانہ میں علماءِ حدیث میں موصوف سے بڑھ کر علمِ حدیث کا کوئی عالم ہندوستان میں نہ تھا، اس زمانے کے اکثر بڑے بڑے علماءِ احناف محدث سہارن پوریؒ کے شاگرد تھے، اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عمل اور عمل کے ساتھ دولت بھی عطا فرمائی تھی۔‘‘

(حیاتِ شبلیؒ:۸۵)

ف: جب استاذ کے اندر علم کے ساتھ عمل ہوگا تو ضرور شاگردوں پر اس کا اثر پڑے گا، وہ بھی عالمِ باعمل ہوں گے، جیسا کہ پہلے اساتذہ کے تلامذہ ذی استعداد عالم باعمل ثابت ہوتے تھے، مگر افسوس اب ایسا نہیں ہے، العیاذ باللہ تعالیٰ (مرتب)

تواضع: علامہ شبلیؒ کا بیان ہے کہ محدث سہارن پوریؒ بے حد منکسر المزاج، متواضع اور نیک تھے، کبھی مسجد میں امامت نہیں کی، چپکے سے مسجد میں جاتے اور نماز میں شامل ہوکر واپس آجاتے، بازار سے سودا خرید کر خود لاتے تھے۔

مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ بازار میں مولاناؒ کو میں نے دیکھا تو پیچھے پیچھے ساتھ ہولیا کہ سودا لے لوں، مگر مولاناؒ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے اور خود اپنے ہاتھ سے لے کر گھر آئے۔ (حیاتِ شبلیؒ)

محدثِ سہارن پوریؒ کی تواضع کا عالم تھا کہ اپنے شاگردوں کا بھی ایسا احترام کرتے جیسے شاگرد اپنے استاذ کا کرتے ہیں، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کا بیان ہے کہ درس سے فارغ ہوکر اپنے مکان میں لیٹ جاتے تھے، میں حاضر ہوتا تھا تو اٹھ کر بیٹھ جاتے، ایک دن میں نے کہا کہ ''میں آپ کا ادنیٰ شاگرد ہوں، سیکڑوں علماء آپ کے شاگرد ہیں، عمر میں بھی آپ میرے والد سے زائد ہیں، اس عمر میں آپ سارے دن پڑھا کر لیٹ جاتے ہیں اور میری حاضری میں اٹھ بیٹھتے ہیں۔'' اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ (سیرتِ مولانا مونگیریؒ)

وفات: محدثِ سہارن پوریؒ پر آخری عمر میں فالج کا حملہ ہوا، چنانچہ اسی مرض میں ۶ / جمادیٰ الاولیٰ/ ۱۲۹۷ھ مطابق: ۱۷ / اپریل/ ۱۸۸۰ء بروز دوشنبہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا، آپؒ نے ۷۲ (بہتر) سال کی عمر پائی، سہارن پور میں عیدگاہ کے قریب اپنے آبائی قبرستان میں آسودۂ خواب ہیں۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔

(رسالہ ''برہان'' / ۱۳۹۴ھ)

حضرت مولانا سید شاہ عبدالسلام فتح پوری رحؒ[۱] متوفی ۱۲۹۹ھ

نام ونسب: نام مولانا عبدالسلام حسنی حسینی، خطاب ''مرج البحرین الشریعۃ والطریقۃ'' والد کا نام مولانا شاہ ابوالقاسم صاحب، جو اپنے دور کے شیخ طریقت اور ساداتِ ہنسوہ میں ممتاز دینی حیثیت کے مالک تھے، آپؒ کے دادا مولوی سید مہدی بن حسین سلسلۂ چشتیہ کے عظیم المرتبت شیخ تھے۔

ولادت: آپؒ کی ولادت محلہ درگاہ قصبہ ہنسوہ ضلع فتح پور یوپی میں ۱۲۳۴ھ مطابق: ۱۸۱۸ء میں ہوئی، آپؒ کا تاریخی نام سید ریاض الحسن ہے۔

تحصیل علم وتکمیل سلوک: شاہ عبدالسلام صاحبؒ نے بعض ابتدائی علومِ درسیہ کی تحصیل اپنے عمِ بزرگوار مولانا سید سراج الدین احمدؒ سے کی، پھر لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہاں مولانا محمد معین لکھنویؒ، مولانا محمد معین الدین کڑویؒ اور مولانا محمد شکور مچھلی شہری سے کسبِ علم کر کے وطن واپس آگئے، والد ماجد کے انتقال کے کافی عرصہ بعد ۱۸۵۹ء میں دہلی جا کر حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی دہلوی ثم المدنیؒ (م:۱۸۷۸ء) سے تکمیل حدیث وتفسیر کی، ۱۸۶۴ء میں جب آپؒ بغرضِ حج مکہ معظّمہ تشریف لے گئے تو وہاں آپؒ نے مشہور استاذِ حدیث شیخ احمد دحلان مکی شافعیؒ سے تبرکاً سند حدیث حاصل کی، اسی سفر میں آپؒ نے شیخ علی بن یوسف ملک باشلی حریریؒ سے ''دلائل الخیرات'' کی

---

[۱] ماخوذ از: ''عہد رفتہ کے چند علماء اور مشائخ'' مؤلفہ پروفیسر محمد عبدالحیی فاروقی: ص/۶۱ تا ۷۸

سند واجازت بھی حاصل فرمائی تھی۔

سلوک کی تعلیم آپؒ نے سب سے پہلے اپنے والد ماجد مولانا شاہ ابوالقاسمؒ سے حاصل کی، پھر ایک عرصہ تک ان ہی کے زیر تربیت رہے، لیکن جب حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلویؒ سے علومِ دینیہ اور حدیث و تفسیر کی تکمیل کے لیے آپؒ دہلی تشریف لے گئے تو اسی موقع پر حضرت شاہ حضرت احمد سعید صاحب نقشبندی مجددی دہلویؒ سے تجدید بیعت کی، پھر سلوک کی مکمل تعلیم و تربیت بھی ان ہی سے حاصل کی، اس طرح تین سال تک وہاں قیام کر کے شیخ سے خلافت واجازت کی خلعت فاخرہ سے مفتخر ہو کر وطن تشریف لائے اور یہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، زیارتِ حرمین شریفین کے دوران آپؒ نے شاہ عبدالغنی محدث دہلوی مہاجر مدنیؒ کے علاوہ حضرت شاہ عبدالرشید صاحب مجددی دہلویؒ (م: ۱۸۷۰ء) شاہ محمد مظہر مجددی (م: ۱۸۸۳ء) شاہ محمد عمر مجددی (م: ۱۸۸۰ء) اور مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ (م: ۱۳۰۲ھ) جیسے اکابر سے بھی کسبِ فیض کیا تھا، آپؒ نے اپنا مستقل مستقر مرکزِ رشد و ہدایت ہنسوہ ضلع فتح پور یو پی کو بنایا تھا، اور سوائے ضروریاتِ شدیدہ کے وہاں سے کہیں اور جانا زیادہ پسند نہ فرماتے تھے۔

معمولاتِ شب و روز: آپؒ کے روزمرہ کے معمولات اس طرح تھے کہ روزانہ نصف شب کے بعد آپؒ بیدار ہو کر ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد نوافل اور ذکر و فکر میں مشغول ہو جاتے، صبح کے آثار نمودار ہونے کے بعد جامع مسجد تشریف لے جاتے، جہاں نمازِ فجر تک مراقبہ میں مشغول رہتے۔

ف: ماشاءاللہ! اس کے علاوہ کثیر وظائف کے پابند تھے بغرض اختصار اس کو حذف کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے، اور مجھے بھی ان بزرگوں کے وظائف کی ادائیگی کی توفیق دے۔ آمین (مرتب)

اتباعِ سنت: ماشاءاللہ سنن ہدیٰ کا تو بڑا رُتبہ ہے اس کے پابند تو تھے ہی مزید سنن زوائد پر بھی جیسی مواظبت آپؒ فرماتے تھے وہ خود اپنی جگہ ایک بڑی کرامت ہے، نشست و برخاست، بات چیت، ہنسنے، بولنے اور بات کرنے میں آپؒ صحابۂ کرامؓ کا نمونہ تھے، کبھی تبسم سے زیادہ آپؒ کو کسی نے ہنستے نہیں دیکھا، ہمیشہ خندہ پیشانی سے رہتے تھے، بہت نرم گفتار، شیریں کلام اور خوش خلق تھے، غصہ میں بھی کبھی بلند آواز یا کریہ الفاظ زبان مبارک پر نہیں لاتے تھے۔ آپؒ میں حلم اور تواضع بھی بحد کمال تھا، ایک مرتبہ ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا کہ ''میاں! میرا فتویٰ لکھ گیا؟'' فرمایا: ''ہاں'' اور اس کو فتویٰ نکال کر دے دیا، اس نے کہا: ''میاں! سنا دو کیا لکھا ہے؟'' حضرتؒ نے پڑھ کر سنا دیا، اس شخص نے پوچھا: ''میاں! دیکھ کر لکھا ہے یا بغیر دیکھے؟'' فرمایا: ''کتاب دیکھ کر'' اس نے کہا کہ ''مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ کتاب دیکھ کر نہیں لکھا ہے'' یہ سنتے ہی فوراً اٹھے، کتاب نکالی اور بہت دیر تک دیکھتے رہے، اس کے بعد فرمایا: ''ایسا ہی ہے جیسا کہ میں نے لکھا ہے۔'' اللہ! اللہ! کہیں کوئی عالمانہ تمکنت نہیں، اور نہ ہی اپنی شان میں کوئی کمی کا احساس، تصنع اور بناوٹ آپؒ کے مزاج میں ذرا بھی نہ تھی، جب کوئی مسئلہ ان سے پوچھا جاتا تو اگر معلوم ہوتا تو بتا دیتے، ورنہ صاف کہہ دیتے کہ مجھے معلوم نہیں۔

ف: یہی ہونا چاہئے، اکابر کا یہی حال تھا، اس لئے لا ادری (میں نہیں جانتا) کو بھی علم سے تعبیر فرماتے تھے، مگر اب تو ناقص سے ناقص شخص بھی ہمہ دانی کا دعویٰ کرتا ہے۔ اور بلا تحقیق ہی ہر سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ (مرتب)

امر معروف اور نہی منکر: امر معروف اور نہی منکر پر آپؒ کا بڑا التزام تھا، کسی کی کوئی بری بات سنتے یا دیکھتے تو اس کو ضرور منع کرتے تھے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، مگر منع کرنے کا طریقہ نہایت خوشگوار اور دل پسند ہوتا تھا، کسی کو خلوت میں منع کرتے اور کسی کو جلوت میں، کسی کو تقریراً منع کرتے تو کسی کو تحریراً، اور کسی کو بہ لطف تو کسی کو بہ غضب، غرض کہ جیسا مناسب سمجھتے وہی کرتے تھے۔

ف: سبحان اللہ کیا ہی خوب طریقہ تھا جو ہم سب کا اسوہ ہونا چاہئے۔ (مرتب)

اعمالِ صالحہ کا اہتمام: حضرت شاہ صاحبؒ نماز کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، ہر وقت کی نماز جماعت کے ساتھ مسجد میں پڑھتے تھے، آپؒ کے دولت خانہ سے قریب دو مسجدیں تھیں، دو وقت کی نماز ایک مسجد میں اور تین وقت کی دوسری مسجد میں پڑھنے کا التزام تھا، جمعہ کی نماز ایک تیسری مسجد میں پڑھنے جاتے تھے، ہر سال رمضان کے اخیری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے، جو سال ان کی عمر گرامی کا آخری سال تھا اس سال بھی باوجود ناسازیٔ طبع کے اعتکاف فوت نہیں ہوا، قرآن مجید بھی بہت عمدہ عربی لہجہ میں تجوید کے ساتھ پڑھتے تھے۔

روزانہ بعد نمازِ فجر وفراغتِ حلقہ تلاوت کا التزام رکھتے تھے، ہمیشہ قرآن مجید کو داہنے ہاتھ سے کھولتے اور بائیں ہاتھ سے بند کرتے تھے، کبھی کسی کی کوئی برائی آپؒ کی زبان سے نہیں سنی گئی، اور نہ ہی آپ کی مجلس میں کوئی ایسا تذکرہ

ہوتا تھا جس میں کسی کی برائی ہو، ستاریت مزاج میں اس قدر تھی کہ بعض لوگوں کے معائب انہیں معلوم ہوتے تھے اور ان کے اظہار کی کوئی دنیوی ضرورت داعی بھی ہوتی تھی، پھر بھی وہ معائب آپؒ کی زبان پر نہیں آتے تھے۔

کلماتِ عقیدت از حکیم سید عبدالحي حسنیؒ: مولوی حکیم سید عبدالحي حسنیؒ (م:۱۹۲۳ء) سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنی مشہور تالیف "الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام" المعروف بہ "نزهة الخواطر" میں حضرت شاہ صاحبؒ کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

(مولانا شاہ عبدالسلام صاحبؒ) "بڑے متقی، پرہیزگار اور دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنے والے تھے، علم و عمل اور اطاعتِ حق میں جامع الصفات تھے، کسی بات کے بیان کرنے میں احتیاط سے کام لیتے اور بے مصرف باتوں سے مجتنب رہتے تھے، اور اپنے ساتھیوں سے بہت کم اختلاف رکھتے تھے، ہر طرح کی مبالغہ آرائی سے زبان کی حفاظت کرتے تھے، میانہ روی، قناعت پسندی، پاک بازی، غنا اور ایثار پسندی جیسے محاسن سے متصف تھے، اللہ تعالیٰ نے آپؒ پر علوم و معارف کے ابواب کشادہ کر دیئے تھے، (جس کی وجہ سے) آپؒ کا شمار علماءِ راسخین میں ہوتا تھا، یہ ان کی اخلاقی خوبی ہی تھی کہ وہ اپنے دشمن سے بھی انتقام نہیں لیتے تھے، اور نہ ہی ایسے شخص کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرتے جو ان سے محبت رکھتا ہو، اور جو چیز ان کے سپرد ہوتی وہ ضائع نہ ہوتی تھی، حسد اور لعن طعن سے پرہیز کرتے اور حق بات کو جلد قبول کر لیتے تھے، اگرچہ اس کی کوئی شہادت نہ ہو، کسی کو برے الفاظ سے مخاطب نہ کرتے، کبھی غصہ

میں بے قابو نہ ہوتے، اور جب کسی نیک کام کا ارادہ کرتے تو کسی قسم کا بخل یا حرص مانع نہ ہوتا تھا، سچائی کے اعتراف میں انہیں کچھ شرم نہ تھی، اور جس بات کا علم نہ ہوتا تو (بے تامل) اس سے اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیتے تھے۔''

خلفاء: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی کتاب ''حیاتِ عبدالحي'' میں آپؒ کے چار خلفاء کے نام تحریر کیے ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) مولانا حکیم امین الدین احمدؒ متوطن کنتھوا متعلقہ کڑا مانکپور۔ بقول صاحب مآثر الاسلام یہ ابتداءً حضرت شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنیؒ کے شاگرد و مرید بھی تھے۔

(۲) مولانا شاہ محمد نجم الدین اکبر آبادیؒ، تکیہ محبوب شاہ، فتح پور، ہنسوہ (یوپی)

(۳) حاجی سید شاہ قدرت علیؒ، چیت عیسیٰ پور، ضلع فتح پور۔

(۴) مولوی حافظ محمد ناظر علی کاکورویؒ۔

وفات، تدفین: حضرت مولانا سید شاہ محمد عبدالسلام صاحب حسنی الحسینی قدس اللہ سرہٗ اپنی پاک وصاف زندگی کے تقریباً ۶۵-۶۶ سال گزار کر راہیٔ عالمِ آخرت ہوئے، إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔ چنانچہ سینکڑوں اللہ تعالیٰ کے بندوں کو ہدایت کی راہ پر لگا کر خود مرض الموت میں مبتلا ہو گئے، قلب کے محاذ میں پشت کی جانب ایک بندمنہ کا پھوڑا (کاربنکل) نمودار ہوا، حتی الامکان ہر طرح کا علاج کیا گیا اور آپریشن بھی ہوا، مگر شفایابی کا کوئی راستہ نہ نکلا، چنانچہ ۴/شوال/شب یکشنبہ ۱۲۹۹ھ مطابق: ۲۰/اگست/۱۸۸۲ء کو ہنسوہ ضلع فتح پور میں آپ کی وفات ہوگئی، نمازِ جنازہ مولوی سید شاہ محمد عبدالعزیز ہنسویؒ (م: ۱۳۰۷ھ) نے ایک جم غفیر کے ساتھ پڑھائی، اور قصبہ کی آبادی سے باہر ایک باغ میں اپنے

والد ماجد مولانا سید شاہ ابوالقاسم بن مہدی چشتی قادریؒ کے سرہانے دفن ہوئے۔نوّراللہ مرقدہٗ۔(''عہدِ رفتہ کے چند علماء ومشائخ''/صفحہ:۶۱ تا ۸۷)

سعادت: الحمدللہ علی احسانہ ۲۰/رجب ۱۴۳۹ھ مطابق ۸/اپریل ۲۰۱۸ء کو حضرت مولانا قاری محمد احسن صاحب مدظلہ کے جامعہ تجوید القرآن فتحپور ہنسوہ کے جلسۂ دستار بندی کے موقعہ پر جانا ہوا تو بعد نماز عصر حضرت اقدس مولانا سید عبدالسلام حسینی واسطیؒ کے مزار پر حاضر ہوکر فاتحہ پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ساتھ میں مولانا مقصود احمد صاحب اور مولانا ابوالحسن صاحب بھی تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کے فیوض وبرکات سے ہم سب کو مالا مال فرمائے۔آمین

زیارت کے بعد''جامعۃ الشیخ عبدالسلام الاسلامیہ'' کی مسجد میں مغرب کی نماز ادا کی۔وہاں کے ذمہ داروں نے طلبہ کو نصیحت کرنے کی فرمائش کی تو اس حقیر نے اپنی سعادت سمجھ کر تھوڑا بیان کردیا۔اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔آمین یارب العالمین

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ[۱] متوفی ۱۲۹۷ھ

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم   اذا جمعتنا یا جریر المجامع

نام، ولادت اور خاندان: حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا تاریخی نام ''خورشید حسین'' ہے، آپؒ ۱۲۴۸ھ مطابق : ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے، مولاناؒ کے والد ماجدؒ کا اسمِ گرامی ''شیخ اسد علی صاحب'' ہے، جونہایت بامروّت، صاحب اخلاق، مہمان نواز اور پرہیز گار تھے، حضرت مولاناؒ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ سے ملتا ہے۔

ابتدائی تعلیم وغیرہ: آپؒ بچپن ہی سے ذہین، بلند ہمت، جری اور چست تھے، مکتب میں اپنے ساتھیوں میں ہمیشہ اوّل رہتے تھے، قرآن مجید ناظرہ بہت جلد ختم کرلیا تھا، شاعری کا بچپن ہی سے شوق تھا، فارسی و عربی کی کتابیں دیوبند وسہارن پور میں پڑھ کر مولانا مملوک العلی صاحبؒ کے ہمراہ ۲ /محرم/ ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہنچے، وہاں ''کافیہ'' شروع کی اور معقول کی کتابیں پڑھیں، حدیث آپؒ نے حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے پڑھی، اسی زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بیعت ہوئے، مولانا مملوک العلی صاحبؒ نے آپؒ کو مدرسہ عربی یعنی دہلی کالج میں داخل کیا، مگر دہلی کالج سے امتحان دیے بغیر علیحدہ ہو گئے

---

۱ کتاب ''بیس بڑے مسلمان'' مؤلفہ مولانا عبدالرشید ارشد پاکستانی سے آپ کے حالات زندگی لکھنے کی سعادت حاصل کررہاہوں، اللہ تعالیٰ مفید بنائے۔ آمین (مرتب)

اور مطبع احمدی میں کتابوں کی تصحیح فرمانے لگے، ۱۲/ ذی الحجہ/ ۱۲۶۷ھ کو آپؒ کے اُستاذِ مکرم مولانا مملوک العلی صاحبؒ کا انتقال ہو گیا تو آپؒ اپنے اُستاذ زادہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس مقیم ہو گئے، مولانا مملوک العلی صاحبؒ کا مکان ''کوچہ چیلاں'' میں تھا۔

بچپن کا ایک خواب: آپؒ نے ایامِ طفلی میں یہ خواب دیکھا تھا کہ گویا میں اللہ جل شانہٗ کی گود میں بیٹھا ہوں، تو آپؒ کے دادا نے (جو تعبیر خواب میں مشہور تھے) یہ تعبیر بتائی کہ تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا اور بہت بڑے عالم ہو گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا جو اظہر من الشّمس ہے۔

سادگی و کسر نفسی: آپ بہت خوش مزاج اور با اخلاق تھے، مزاج تنہائی پسند تھا، آپؒ اکثر ساکت رہتے، لوگ ''مولوی صاحب'' کہہ کر پکارتے تو نہ بولتے اور جب نام لے کر پکارتے تو خوش ہوتے، جو شاگرد اور مرید ہوتے ان سے دوستوں کی طرح رہتے، علماء کی وضع یعنی عمامہ وغیرہ نہ رکھتے۔ ایک دن آپؒ نے فرمایا کہ ''اس علم نے خراب کیا، ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔'' مسئلہ کبھی نہ بتاتے، دوسرے کے حوالے فرماتے، وعظ بھی نہ کہتے، مگر مولانا مظہر حسین صاحب کاندھلویؒ نے اوّل وعظ کہلوایا اور خود بھی بیٹھ کر سنا اور بہت خوش ہوئے۔

نکاح: آپؒ کے والد ماجدؒ کو بڑی فکر تھی کہ کچھ ذریعۂ معاش اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی نکاح کرتے ہیں، بالآخر آپؒ کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے ذکر کیا، حاجی صاحبؒ نے حکم دیا تو نکاح پر راضی ہو گئے،

مزاج میں سخاوت اور مہمان نوازی تھی، اس لیے آمدنی کفایت نہ کرتی، یہاں تک کہ اہلیہ محترمہ کی اجازت سے ان کا زیور فروخت کر دیا، وہ بھی نہایت تابع دار تھیں، آخر میں اللہ تعالیٰ نے کشادگی عنایت فرمائی تو جو کچھ دستیاب ہوتا اہلیہ کو لا کر دیتے، اور اہلیہ بھی ایسی کشادہ دست کہ حضرت مولاناؒ کے پاس جب بھی کوئی مہمان آتا تو اُسی وقت کھانا پکا کر پیش کر دیتیں، کبھی اس کے خلاف نہ ہوتا۔

جہادِ آزادی کا آغاز: انگریزوں کے ہندوستان میں قدم رکھنے کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے یہ دیکھ کر کہ یہ لوگ دوسروں کے مذاہب کو پامال کرنے اور عیسائی مذہب کو پھیلانے کے لیے شرمناک ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں، تو ان کے انسداد (روکنے) کی تدبیریں شروع کر دیں اور ایک انقلابی جماعت کی داغ بیل ڈال دی، چنانچہ اس جماعت کے چوتھے امام حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ ہوئے اور سپہ سالار مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور قاضی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مقرر ہوئے اور تھانہ بھون دارالاسلام قرار پایا۔

چنانچہ معرکۂ شاملی میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور حضرت حافظ ضامن صاحبؒ ہمراہ تھے، بندوقچیوں سے مقابلہ ہوا، ان حضرات پر فائر ہوئے اور حضرت حافظ ضامن صاحبؒ کو زیر ناف گولی لگی اور شہید ہو گئے۔ (رحمہ اللہ تعالیٰ) اس کے بعد تینوں حضرات حضرت حاجی صاحبؒ، مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا رشید احمد صاحبؒ کے نام وارنٹِ گرفتاری جاری ہو گئے کہ شاملی تحصیل پر حملہ کرنے والے

یہی لوگ تھے۔

آخر حضرت حاجی صاحبؒ حجاز جانے کے لیے روانہ ہو گئے اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ احباب کے اصرار پر تین دِن تک روپوش رہے اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ گرفتار ہو گئے۔

اتباعِ سنت اور روپوشی: تین دِن پورے ہوتے ہی ایک دَم باہر نکل آئے اور کھلے عام چلنے پھرنے لگے، لوگوں نے پھر روپوشی کے لیے عرض کیا تو فرمایا: ''تین دِن سے زائد روپوش رہنا سنت کے خلاف ہے، کیوں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہجرت کے وقت غارِ ثور میں تین ہی دِن تک روپوش رہے۔''

(سوانح قاسمی/ جلد: ۲، مؤلفہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ)

ف: داد دیجیے اس جذبۂ اتباعِ سنت کی کہ ظالم انگریز نے وہ کونسی حیا سوز اور دِل آزار حرکت تھی جو اس نے مجاہدوں کے خلاف روانہ رکھی تھی اور کونسی غیر انسانی کارروائی تھی جو اس نے چھوڑی تھی؟ اس وقت ظالم انگریز کا ظلم و جور اپنے نقطۂ عروج پر تھا، لیکن حجۃ الاسلام اپنی حیات سے بے نیاز ہو کر اس موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت اضطراری کو ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور تین دن کے بعد فوراً نکل آئے اور کھلے عام گھومنے لگے، اور اس روپوشی کی حالت میں بھی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اپنے عشق و محبت کا تعلق اور رابطہ مستحکم ہی رکھا اور اس نازک حالت میں بھی سنت پر نگاہ جمی رہی۔

تھا اسیری میں بھی کچھ ایسا تعلق روح کو　　　ہم قفس میں روز خوابِ آشیاں دیکھا کیے

(از: بیس بڑے مسلمان: ۱۳۷)

قیامِ دارالعلوم دیوبند کے اسباب: دنیا کا کوئی کام بغیر کسی سبب، داعیہ اور محرک کے معرضِ وجود اور منصۂ شہود پر نہیں آتا، اس لیے جب ہم مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو یہ باتیں سامنے آتی ہیں:

''ہندوستان میں کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت اور دورِ اقتدار رہا ہے، جس میں نہایت فراخ دلی سے ہر فرقہ اور ہر مذہب کو اپنے مذہب پر پابند رہنے اور مذہبی رسوم بجا لانے کی کھلی آزادی تھی، جب شامت اعمال سے سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا چراغ گل ہو گیا اور ظالم و جابر برطانیہ قہر الٰہی کی صورت میں ہندوستان پر آچکا تھا، تو اس کے مقابلہ کے لیے ہندوستان کی دیگر اقوام اور مسلمان خصوصاً میدان میں نکلے اور عملی طور پر اس کے ساتھ جہاد کیا، جس کو انگریز کے نمک خوار ۱۸۵۷ء کے ''غدر'' کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ (لہٰذا ہم لوگوں کو بجائے ۱۸۵۷ء کے ''غدر'' کے بجائے ۱۸۵۷ء کا ''جہاد'' کہنا چاہیے۔)

اب اس ہنگامہ میں انگریز نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس کے متعلق ملاحظہ فرمائیں:

مسٹر رسل کا یہ مقولہ ہے کہ ''مسلمانوں کو خنزیر کی کھالوں میں سی دیا گیا اور قتل کرنے سے پہلے خنزیر کی چربی ان کے بدن پر ملی گئی، پھر انہیں جلا دیا گیا۔''

ف: مگر افسوس کہ برادرانِ وطن نے آزادئ ملک کے سلسلہ میں مسلمانوں کی اذیتوں اور شہادتوں کو بالکل ہی فراموش کر دیا، جیسا کہ ان کے ساتھ ظلم وستم کے سلوک سے عیاں ہے۔ اس لئے عیاں را چہ بیاں۔

عزائمِ برطانیہ: انگریز کو جب ہندوستان پر سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تو ان کے دل کے ارادے زبان اور قلم کی نوک سے بھی ظاہر ہونے لگے۔

گورنر ہند لارڈ ایلن برا نے ۱۸۴۳ء میں ڈیوک آف ولنگڈن کو لکھا کہ ”میں اس عقیدے سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمان قوم اُصولاً ہماری دشمن ہے، اس لیے ہماری پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کرتے رہیں۔“

(ان ہیپی انڈیا:۳۹۹)

اور لارڈ برٹس نے کہا کہ ”ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔“

یہاں تک رائے قائم کر لی تھی کہ ”اب اسلام چند سالوں کا مہمان ہے۔“

(موجِ کوثر:۱۰۸، شیخ محمد اکرم صاحب ایم۔اے۔)

اس نازک دور اور نامساعد حالات میں علماءِ دیوبند نے جس طرح ہمت و استقلال کا ثبوت دیا ہے اس میں ان کا کوئی شریک نہیں ہے، آخر بتلایئے کہ اس وقت تمام گمراہ کن تحریکوں کا مقابلہ کس نے کیا؟ ظالم برطانیہ کے فولادی پنجہ سے کس نے ٹکر لی؟ جانِ عزیز کو ہتھیلی پر رکھ کر کس نے جہاد کیا؟ آریوں اور پادریوں کا تعاقب کس نے کیا؟ ان کی تردید میں کتابیں اور رسالے کس نے لکھے؟ کس نے تقریروں کے ذریعہ اسلام کی حقانیت واضح کرتے ہوئے ان باطل فرقوں کے مکائد اور دسیسہ کاریوں سے مسلمانوں کو آگاہ کیا؟

برطانیہ کا ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جس میں ان کا دعویٰ تھا کہ ہماری حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا، اگر ایک جگہ غروب ہوتا ہے تو دوسری جگہ

طلوع ہوتا ہے۔

عیسائی بنانے کا طریقۂ کار: عیسائی بنانے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو اتنا غریب کر دیا جائے کہ عیسائیوں کی جھولی میں پڑنے کے لیے وہ مجبور ہو جائیں، قرآنی تعلیم کو یکسر مٹا دیا جائے اور انگریزی تعلیم کو عام کر کے عیسائیت کی راہ ہموار کر لی جائے۔

چنانچہ قرآن پاک کی قوتِ تاثیر سے خائف ہو کر برطانیہ کے مشہور ذمہ دار وزیر اعظم گلینڈ اسٹون نے بھرے مجمع میں قرآن کریم کو اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے کہا تھا کہ ''جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی۔''

الغرض قرآنِ کریم کو مٹانے اور مسلمانوں کے اسلامی جذبات کو ہندوستان سے نیست و نابود کرنے کے لیے ایسے ایسے حربے استعمال کیے گئے کہ شیطان بھی دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے اور لارڈ میکالے نے تو صاف لفظوں میں کہا کہ ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے اعتبار سے انگلستانی۔''

(بحوالہ مدینہ بجنور ۲۸/جنوری/۱۹۳۶ء)

اور سچ پوچھیے تو اس میں ان کو کافی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی، جیسا کہ کسی بھی صاحب علم پر مخفی نہیں ہے، یہ طریقہ وہ تھا جو براہِ راست حکومت برطانیہ اور اس کے ذمہ دار اصحاب نے اختیار کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ پادری صاحبان کی طرف سے (جن کی حفاظت و نگرانی اور مالی سرپرستی خود انگریز کر رہا

تھا) عیسائیت کی جارحانہ تبلیغ ہندوستان میں جو شروع کی گئی وہ اپنے مقام پر ایک سانحۂ عظیم اور آفاتِ ارضی میں سے ایک بہت بڑی آفت تھی، مسلمانوں پر تو حکومت کی طرف سے صدہا آئینی و قانونی پابندیاں عائد تھیں کہ وہ انگریز کے خلاف لب کشائی کرنے کے مجاز نہیں، مگر (العیاذ باللہ) اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پادریوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی۔ بقول کسے:

ہے اہل دل کے لیے یہ نظمِ بست و کشاد　　　کہ سنگ وخشت مقید ہیں اور سگ آزاد

(بیس بڑے مسلمان: ۱۲۳)

تاریخ دارالعلوم دیوبند: ۱۵/محرم الحرام/ ۱۲۸۳ھ مطابق: ۱۸۶۷ء

بروز جمعرات تاریخ کا وہ مبارک دِن ہے جس میں نبی پاک ﷺ کی دی ہوئی امانت کا چشمۂ علم سرزمین دیوبند سے پھوٹا اور رُشد و ہدایت کا پورا شجرۂ طوبیٰ بن کر پھیلا، جس کے لذیذ پھل سے دنیائے اسلام کی علمی بھوک ختم ہوئی اور اس صاف شفاف چشمے سے نہریں پھوٹ پھوٹ کر نکلیں اور ایشیا بھر کے مردہ دلوں کو زندہ اور اُجڑے ہوئے قلوب کو لہلہاتا ہوا چمن بنا دیا، اس مبارک تقریب میں بہت سے بزرگانِ ربانی جمع ہوئے اور دارالعلوم دیوبند کی موجودہ عالی شان عمارت کے متصل جنوب کی طرف مسجد چھتہ میں اَنار کے درخت کی ٹہنیوں کے سایہ میں اس مدرسہ کا افتتاح ہوا، سب سے پہلے معلم حضرت ملا محمودؒ صاحب اور سب سے پہلے متعلم حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ قرار پائے، اس مبارک مدرسہ کے آغاز کی خبر جب بتانے والوں نے مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کو بتائی اور یہ کہا کہ ''حضرت! ہم نے دیوبند

میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے، اس کے لیے دعا فرمائی جائے''، تو حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں: ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے' یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقاتِ سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقاءِ اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر، یہ مدرسہ ان ہی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔''

بلا شبہ دار العلوم دیوبند ہندوستان میں تحفظ اور بقاءِ اسلام کا ذریعہ ہے اور اس کی وجہ سے ہزاروں پیاسوں کو سیرابی نصیب ہوئی ہے۔

(بیس بڑے مسلمان: ۱۲۴)

مولانا مفتی محمد صاحب پالن پوری نے بھی اس کا نقشہ بہت ہی مؤثر انداز میں کھینچا ہے، جو درجِ ذیل ہے:

''مسلمانوں کے ہاتھ سے زمامِ حکومت چھن گئی تھی، اُن کا اقتدار اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا، اسلام کی شوکت وعظمت کا نیرِ اعظم غروب ہو رہا تھا، اسلامی تہذیب کے نقوش مٹنے لگے تھے، شعائرِ اسلامی نگاہ سے اوجھل ہوتے جارہے تھے، دینی تعلیم گاہیں ویران ہوگئی تھیں اور خانقاہیں سنسان تھیں، مسلمانوں کے چہروں پر اُداسی تھی اور دِل پر غم واندوہ کے بادل منڈلا رہے تھے، دینی شعور محو ہو رہا تھا، سنت نبوی مردہ ہو رہی تھی اور ضلالت کے بھیانک سائے تیزی سے پھیل رہے تھے، شرک وبدعات نے سر اُٹھا لیا تھا، دین کی اصل صورت مسخ ہونے لگی تھی، الحاد اور بے دینی کی بادِ سموم چلنے لگی تھی، چمنستانِ اسلام پر خزاں آرہی تھی اور مرغانِ خوش نوا اپنی اپنی نوائے شیریں بھول گئے تھے۔

یہ تھا وہ دل فگار نقشہ جسے یہ مقدس ہستیاں دیکھ رہی تھیں اور وہ اپنے سینوں میں ایک خلش، ایک اضطراب اور ایک عزم لے کر اس گوشہ میں جمع ہوئی تھیں، یہ بزرگ سوچ رہے تھے کہ کس طرح احیاءِ دین کا کام کیا جائے اور کس عنوان سے بقاءِ سنت کی تدبیر کی جائے؟ وہ سب فکر و خیال کے عمیق سمندر میں غوطہ زن تھے اور اپنے تصرفِ باطنی اور نورِ بصیرت سے مسئلہ کا حل تلاش کر رہے تھے، آخر کار نصرتِ خداوندی اور عونِ ایزدی سے وہ اس بات پر متفق اور ہم خیال ہو گئے کہ علومِ نبوت کے احیاء کے لیے ایک دبستانِ علم و آگہی کی داغ بیل ڈالی جائے، اُن کا یقین تھا کہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے مسلمانوں کے قلب و دماغ کی تیرگی دور کی جاسکتی ہے اور اسلام کی شعاعیں پھیلائی جاسکتی ہیں، اسی کے ذریعہ سینوں میں علم و عرفاں کی شمعیں روشن کی جاسکتی ہیں اور اسی کے ذریعہ مردہ رگوں میں نورِ ایمانی گردش کر سکتا ہے اور اسی سے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، خالدؓ، طارقؒ، الف ثانیؒ اور ولی اللہؒ کی روح پرور اور ایمان افروز زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر سکتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند: یہ صالح ہستیاں منتخب روزگار تھیں، خدارسیدہ تھیں، انہیں نورِ بصیرت حاصل تھا، یہ عرفانِ شریعت سے آراستہ تھیں اور یہ اس کا مومنانہ فراست، حکیمانہ صلاحیت اور ملہمانہ بصیرت کا کرشمہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے دیوبند کی خاک پر علومِ نبوت کی ایک درسگاہ عالمِ وجود میں آگئی، بادی النظر میں ایک حقیر درسگاہ تھی، لیکن فی الحقیقت علومِ معرفت کا عظیم سرچشمہ تھا، اس میں بڑی جامعیت تھی، بڑی ہمہ گیریت تھی، یہ ایک دانش کدہ تھا، یہ علم و عرفان کا مرکز

عظیم اور دین متین کا مظہر جلیل تھا، فکر و عمل کی بہترین جلوہ گاہ تھی۔ اور اس طائفۂ ولایت کے سرخیل حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ تھے، کون محمد قاسم؟ جو اشارۂ ربانی کے رمز شناس تھے، جن کے باطنی محاسن اور جن کے اخلاقی مکارم نے کفر کی ظلمتوں کا سینہ چیر کر اس میں نورِ ایمانی پیوست کیا اور جن کے باطنی شعور اور فکری بلوغ سے ظلمت کدۂ ہند میں وحیِ الٰہی کی روشنی پھیلانے کا اہتمام ہو رہا تھا، پھر یہ کہ اسلام کا بطل جلیل تنہا نہ تھا، اس کی معاونت کے لیے دیگر رجالِ کار بھی تھے، وہ کون؟ وہ حاجی سید عابد حسینؒ تھے، وہ مولانا ذوالفقار علیؒ تھے، وہ مولانا فضل الرحمنؒ تھے، وہ بندگانِ خدا تھے جن کی اِصابت فکر، جن کی جلالت علم اور جن کی فراست و فہم پر ماہ و پروین گواہ تھے۔

پھر یہی برعظیم کی وہ دبستان تھی جس سے علومِ نبوت کے چشمے پھوٹے اور خزاں رسیدہ چمنستانِ وطن کی آبیاری کا آغاز ہوا، پھر گل و لالہ میں تازگی آئی اور برگ و بار میں بالیدگی پیدا ہوئی اور دارالعلوم کے بانی کا یہ خواب ایک حقیقت بن کر جلوہ گر ہو گیا کہ

’’میں خانۂ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھوں اور پیروں کی دسوں انگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اطرافِ عالم میں پھیل رہی ہیں۔‘‘

پھر یہی خاکِ دیوبند ہے جہاں سے مجاہدین اسلام کا ایک کارواں گزرا تھا، جس کے سرخیل حضرت سید احمد شہید بریلویؒ تھے اور جن کی زبان سے ملہمانہ کلمات نکلے تھے: ’’مجھے اس مٹی سے علم کی خوشبو آتی ہے۔‘‘

سید شہیدؒ کی یہ پیشین گوئی سچی ثابت ہوئی اور آج دیوبند کی خاک ایک سدا

بہارِ گلشن عام بن کر جلوہ گر ہے اور اس کی مہک سے سارا عالم معطر ہے، یہی وہ درسگاہ ہے جس نے فرنگی حکمرانوں کی عیارانہ چالوں کا چیلنج قبول کیا اور لارڈ میکالے کی اس معاندانہ روِش کا مقابلہ کیا جس نے ایسی تعلیمی منصوبہ بندی کی تھی جس کا مقصد ایسی نسل تیار کرنا تھا جو رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو اور دِل و دماغ کے لحاظ سے انگریز، چنانچہ اس مذموم مقصد کے خلاف صلحاءِ امت نے یہ قدم اُٹھایا کہ ایسی تعلیمی اسکیم تیار کی تھی جس سے ایسی نسل تیار ہو سکے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو اور دل و دماغ کے اعتبار سے اسلامی ہو۔

پھر ایک حسین اور دل نواز صبح طلوع ہوئی جب دیوبند کی مسجد کے صحن میں یہ منظر انسانی آنکھوں نے دیکھا کہ ایک اَنار کے درخت کے سایہ میں ایک استاذ ایک شاگرد کو علومِ نبوت کا درس دے کر ایک عظیم الشان درسگاہ کی افتتاحی تقریب انجام دے رہا ہے، اُستاذ کا نام بھی محمود ہے اور شاگرد کا نام بھی، پھر بزرگانِ ملت اور صلحاءِ امت کی نیت کا خلوص، ان کا ولولۂ دینی، ان کا جوشِ ایمانی، ان کی بے پناہ قربانی اور ان کے جذبۂ خدمت کی فراوانی نے دنیائے اسلام میں غلغلہ پیدا کر دیا، برصغیر کے مسلمانوں میں بڑا انقلاب آیا، ذہنی ابتذال و انحطاط دور ہونے لگا، دل کی بجھی ہوئی شمعیں پھر روشن ہونے لگیں، پھر سینوں میں عزائم بیدار ہونے لگے، توحید و رسالت کے امین و نگہبان پھر سر بکف ہوکر دنیا میں نظر آنے لگے، دانش کدوں کے بند دروازے پھر کھل گئے، خانقاہوں کی رونق پھر واپس آ گئی اور پھر ۱۲۸۲ھ سے لے کر ۱۳۸۲ھ تک دیوبند کے منبع عرفان نے ایسے بے شمار فرزندانِ توحید پیدا کیے جو دنیا کے گوشے

گوشے میں پھیل گئے اور جو آسمانِ شہرت پر مہر و ماہ بن کر چمکے اور جن کی تبلیغی اور علمی سرگرمیوں نے بے شمار مخلوق کو کفر کی ظلمت سے نکال کر ایمان کا نور عطا کیا۔

علماءِ دارالعلوم دیوبند: اور یہ علماءِ دیوبند ہی ہیں جن کی علمی جلالت اور سیاسی بصیرت اور جذبۂ حریت نے ملک کو آزاد کرانے میں صف اوّل میں رہ کر رول ادا کیا ہے، تاریخ کے اوراق سے پوچھو جو علماءِ دیوبند کے مجاہدانہ کارناموں سے روشن ہیں، داخلی اور بیرونی زندانوں سے پوچھو، وہ تم کو علماءِ دیوبند کے سجدوں کے نشانات دکھلائیں گے، آسمان و زمین، چاند اور ستاروں سے معلوم کرو، ایوانِ برطانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے والے کون تھے؟ سب کے سب گواہی دیں گے کہ یہی علماءِ دیوبند تھے۔

(تاریخ ہند: ۲۳۶ / مؤلفہ مولانا مفتی محمد صاحب پالن پوری)

دارالعلوم دیوبند کی تاسیس ایک تحریک کا نقطۂ آغاز: مسلمانوں کی ملی زندگی میں دارالعلوم دیوبند ۱۸۵۷ھ کے خسارے کی تلافی کا سب سے بڑا ذریعہ بن کر سامنے آیا، وہ محض ایک مدرسہ نہ تھا؛ بلکہ اس کی تاسیس ایک تحریک کا نقطۂ آغاز تھا، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب ؒ اسی حیثیت سے اسے اسلامی چھاونی قرار دیتے تھے، اسے محض ایک درسگاہ کی شکل میں دیکھے جانے کے وہ قائل نہ تھے، اگر دارالعلوم دیوبند کی شکل میں مدارس کے قیام کی تحریک کی شروعات بروقت نہ کی گئی ہوتی تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا، ان کے اسلام و ایمان کی کیا حالت اور درگت بنتی اور ان کی تصویر کے کیا خدوخال ہوتے۔ (حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتوی ؒ حیات، افکار، خدمات/ صفحہ: ۱۱)

دینی مکاتب کی ضرورت: حضرت نانوتویؒ نے وقت کی ضرورت کوملحوظ رکھتے ہوئے ایک ایسی تعلیمی تحریک چلائی جس کے اثرات آج عالم گیر سطح پر محسوس کیے جاسکتے ہیں، اس تحریک نے مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت اور تبلیغ واصلاح کا فریضہ اس خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے کہ کم سے کم گذشتہ دو تین صدیوں میں اس کی نظیر ملنی دشوار ہے، ضرورت ہے کہ فرزندانِ دیوبند موجودہ حالات کے پس منظر میں دینی تعلیم کو گاؤں گاؤں پہنچانے کی کوشش کریں، کیوں کہ دوردراز کے دیہات وقریہ جات اِرتداد کی سرحد پر کھڑے ہیں اور مکاتب ہی کے ذریعہ ان کے ایمان کی حفاظت کا سروسامان کیا جاسکتا ہے۔

عصری تعلیم کی بھی ضرورت: اسی طرح عصری تعلیم کی درسگاہوں میں ہماری ملت کے نونہال لاکھوں کی تعداد میں زیرِ تعلیم ہیں اور یہ بات ضروری بھی ہے کہ مسلمان جدید تعلیم میں آگے بڑھیں لیکن وہ اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ شعوری طور پر مسلمان بھی رہیں اوران کے دل ودماغ کا کعبہ حجاز ہو، نہ کہ امریکہ ویورپ، اس کے لیے ضروری ہے کہ دینی تعلیم کی تحریک کوجدید تعلیم گاہوں تک بھی پہنچائیں اوراس بات کی کوشش کریں کہ ہمارا کوئی بچہ مبادیاتِ دین سے بے خبر نہ رہ جائے۔ (حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ، حیات، افکار، خدمات/صفحہ:۲۷)

اُصولِ دارالعلوم دیوبند: اب ہم وہ اُصول نقل کرتے ہیں جن پر حضرت مولانا نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند ہی کی نہیں؛ بلکہ جملہ مدارسِ دینیہ کی بنیاد رکھی، جن کی رعایت تمام مدارس کوکرنی چاہیے، تاکہ مدارس سے جو مطلوب و مقاصد ہیں وہ پورے ہوں اورامت سرگشتہ کے لیے علمی اورسیاسی ہرلحاظ سے

مفید ثابت ہوں۔ چنانچہ یوں رقم طراز ہیں:

''وہ اصول جن پر یہ مدرسہ نیز دیگر مدارسِ چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں:

(۱) اصل اوّل یہ ہے کہ تا مقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے، آپ کوشش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

(۲) ابقاءِ طعامِ طلبہ بلکہ افزائش طعامِ طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

(۳) مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو، تو پھر اس مدرسہ کی بنا میں تزلزل آجائے گا، القصہ تہہِ دل سے بروقت مشورہ نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبیٔ مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو، اس لیے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہارِ رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں، اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں، یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہماری مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل وجان قبول کریں گے۔ نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امورِ مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مشورہ رہتے ہوں یا کوئی وارِد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو۔ نیز اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدرِ ضرورت اہل مشورہ کی مقدارِ معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھے

کیوں نہ پوچھا؟ ہاں، اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتے ہیں۔

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماءِ روزگار خود بیں اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں، خدا نخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

(۵) خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور اندازِ مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے، ورنہ تو یہ مدرسہ اوّل تو خوب آباد نہ ہوگا، اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

(٦) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں تب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا۔ اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے اُمید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیتِ اہل چندہ زیادہ پائے داری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔'' ......انتہیٰ۔ (بیس بڑے مسلمان: ۱۳۰)

ف: یہ وہ آٹھ اصول ہیں جن پر حضرت مولانا نانوتویؒ نے اپنے مدرسہ

دارالعلوم دیوبند اور جملہ مدارسِ دینیہ کی بنیاد رکھی، لہٰذا جب تک ان اصولوں کو عملی جامہ نہ پہنایا جائے گا مدارس سے مطلوبہ فوائد کا حصول متعذر رہے۔ چنانچہ مشہور مقولہ ہے: ''إِنَّمَا حُرِمُوْا الوُصُوْلَ لِتَضْيِيْعِهِمُ الأُصُوْلَ۔'' یعنی لوگ اُصول کے ضائع کرنے ہی کی وجہ سے وصول سے محروم ہو گئے۔

سر سید احمد خانؒ اور مولانا نانوتویؒ: سر سید خانؒ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی بہت عزت کرتے تھے، بعض مذہبی مسائل کے علاوہ تعلیم پھیلانے میں دونوں متفق تھے، علومِ جدیدہ وعلومِ قدیمہ کے پڑھانے میں بھی دونوں ہم خیال تھے، سر سید خانؒ کو کسی دینی درس گاہ سے اختلاف نہ تھا اور خاص طور پر مدرسہ دارالعلوم دیوبند جس کے بانی مولانا محمد قاسم صاحبؒ تھے وہ اس کے حامی تھے اور اس کی کامیابی چاہتے تھے، سر سید کو حضرت نانوتویؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے علم و ذہانت اور ان کے خلوص وتقویٰ پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب ۱۲۹۱ھ میں علی گڑھ اسکول کی ابتدا ہوئی تو اس کی مشاورتی کمیٹی میں ہر دو حضرات کے نام کو شامل کیا گیا، مگر ہر دو حضرات نے (بعض دینی مصلحت سے) انکار فرمادیا کہ ہمیں معذور سمجھو۔ (بیس بڑے مسلمان: ۱۳۵ و ۱۲۷)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقیدت اور عشق ومحبت: حضرت حجۃ الاسلامؒ نے نظم ونثر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو مدح وتعریف بیان کی ہے اور جس خلوص وعقیدت سے ان کا اظہار کیا ہے ان کی کتابوں کو پڑھنے اور دیکھنے والا بجز کسی متعصب کے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

چنانچہ چند اشعار جو آپؒ کے عشق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دال ہیں ملاحظہ فرمائیں:

اُمیدیں لاکھوں ہیں؛ لیکن بڑی اُمید یہ ہے — کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا نام شمار
جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں — مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مور و مار
جو یہ نصیب نہ ہو اور کہاں نصیب میرے — کہ میں ہوں اور سگانِ حرم کی تیرے قطار
اڑا کے باد مری مشت خاک کو پس مرگ — کرے حضور کے روضہ کے آس پاس نثار
و لے یہ رُتبہ کہاں مشت خاکِ قاسم کا؟ — کہ جائے کوچۂ اطہر میں تیرے بن کے غبار

(قصیدۂ قاسمی)

ف: غور فرمایئے کہ کس طرح ایک ایک مصرع سے عشق نبوی چھلک رہا ہے اور کس شان فنائیت کا اظہار ان اشعار سے ہو رہا ہے، جو منصف مزاج شخص پر مخفی نہیں ہے۔ (مرتب)

حج: اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے تین مرتبہ حضرت مولانا نانوتویؒ کو حج کی توفیق اور حبیب کبریاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گنبد خضراء کی زیارت سے متمتع ہونے کا شرف عطا فرمایا ہے، پہلا حج آپؒ نے (۱۲۷۷ھ مطابق: ۱۸۶۰ء) میں، دوسرا (۱۲۸۶ھ مطابق: ۱۸۶۹ء) میں، تیسرا (۱۲۹۴ھ مطابق: ۱۸۷۷ء) میں کیا ہے۔ ان اسفار میں جو روحانی لذت انہوں نے محسوس کی وہ صرف ان کا قلب مبارک ہی اِدراک کرسکتا تھا، دوسرا بھلا اس کو سمجھے تو کیسے سمجھے اور بیان کرے تو کیسے بیان کرے؟ (بیس بڑے مسلمان: ۱۴۱)

حفظِ قرآنِ کریم: حضرت مولانا نانوتویؒ اہم دینی سرگرمیوں میں اس قدر منہمک تھے کہ موقع ہی ہاتھ نہ آتا تھا اور دل میں قرآنِ کریم کے حفظ کا شوق تھا وہ کب چین لینے دیتا تھا، بالآخر دو سال کے صرف دو رمضان میں قرآن پاک یاد کر

لیا اور ایسی رَوانی کے ساتھ سناتے تھے کہ کوئی کہنہ مشق پختہ کار بھی شاید ایسا نہ سنا سکتا ہو۔ اور یہ کلام اللہ کی عظمت اور اس کی طرف پوری توجہ اور محبت کا نتیجہ تھا کہ اس کا ایک ایک حرف سینہ میں نقش ہوگیا۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

وفاتِ حسرت آیات: ۱۴/ جمادیٰ الاولیٰ/ ۱۲۹۷ھ مطابق: ۱۸۷۹ء میں جمعرات کو بعد نمازِ ظہر دمِ آخر آ گیا۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔

گھر میں جگہ نہ تھی اس لیے جنازہ مدرسہ میں لاکر رکھا گیا اور بعد غسل و تکفین جنازہ کی نماز ہوئی، مجمع کثیر تھا، بعد نمازِ مغرب شہر کے باہر ایک قطعہ ٔ زمین جسے مکرم حکیم مشتاق احمد صاحب نے خاص قبرستان ہی کے لیے وقف کر دیا اس میں اولاً حجۃ الاسلام حضرت مولانا نانوتویؒ کو دفن کیا گیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ونوّر اللہ مرقدہٗ۔ آمین۔

اس طرح ہندوستان کا یہ درخشندہ ستارہ، انگریز کے خلاف لڑنے والا بہادر مجاہد، پادریوں کا تعاقب کرنے والا نڈر مناظر، آریوں کے چھکے چھڑانے والا بے باک ناقد، اسلام کے خلاف فتنوں کی سرکوبی کے لیے اپنی جانِ عزیز تک پیش کرنے والا جاں نثار مسلمان، سخاوت و ایثار کا پتلا، قوم و ملت کا ہمدرد، علوم دینیہ کے اِحیا کا علم بردار، حامیٔ سنت اور ماحیٔ بدعت، حکیمانہ انداز سے حقانیت اسلام کو دل نشین کرنے والا فصیح مبلغ اور زادِ قلیل پر قناعت کرنے والا بے نفس صوفی اِس دار العمل سے دار الجزا کو سدھار گیا۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔

(از: بیس بڑے مسلمان: ۱۲۴)

ف: ماشاء اللہ حضرت مولانا عبد الرشید ارشد صاحب نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''بیس بڑے مسلمان'' میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب

نانوتویؒ کے متعلق بہت ہی خوب اوصاف وکمالات بیان فرمائے، بلکہ حضرت مولانا اس سے بھی زیادہ تعریف وتحسین کے مستحق ہیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

واقعہ: مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آیا کہ گودرا گجرات کے چند میل آگے ایک مسجد میں جمعہ کی نماز میں بیان کے لئے مولانا اسماعیل گودروی نے مجھے بھیجا۔ میں نے خطبہ سے پہلے دس پندرہ منٹ بیان کیا، جب کہ مسجد دوسرے خیال کے لوگوں کی تھی مگر متعدد لوگ بیعت ہوئے۔ ایک دوسال بعد مولانا اسماعیل صاحب نے پھر اسی مسجد میں بیان کے لئے بھیجا تو معمول کے مطابق بیان کیا، اس مرتبہ اسی (۸۰) آدمی سلسلہ میں داخل ہوئے۔ مجھے بہت مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ مگر سہ بارہ جانے کی نوبت نہ آئی، ان حضرات سے ملاقات نہ ہوئی۔

ایک دوسری بات یہ پیش آئی کہ اس مسجد کے احاطہ کے ایک کمرے میں ایک صاحب مقیم تھے، انھوں نے مجھ سے بڑے رازدارانہ انداز سے کہا کہ مولانا میں بکثرت کتابیں مطالعہ کرتا ہوں اور اس مطالعہ کی برکت سے میرے دل میں یہ بات آئی اور میں نے فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا قائم فرمودہ دارالعلوم نہ ہوتا تو شاید ہندوستان میں کوئی مومن نہ رہ جاتا۔ اس حقیقت کے انکشاف سے بہت اثر ہوا۔ بس اللہ تعالیٰ ہی حق بات عام لوگوں کے دلوں میں بھی ڈال دیتے ہیں ورنہ عامی شخص کیسے ایسی معرفت کی بات کہتے۔ یہ میرا بھی خیال ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے معاد (یعنی آخرت) کی درستگی اور اس کے پہچاننے کے لئے اس دارالعلوم کو قائم فرما کر پورا پورا انتظام فرمادیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ ہی نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ اگر اس

حقیقت کو سمجھتی تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور ان کے قائم کردہ ادارہ دارالعلوم دیوبند کی ممنون احسان ہوتی۔ چنانچہ سارے عالم میں اس ادارہ کی شاخیں قائم ہیں جس کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کا فیض سارے عالم کو پہنچ رہا ہے۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

یقیناً بجاطور پر مولاناؒ ہی اس شعر کے مصداق ہیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(مرتب)

حضرۃ الامام نانوتویؒ کا ایک لطیف علمی نکتہ

تحریر فرمودہ: حضرت مولانا محمد سالم صاحبؒ

فرمایا کہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا معجزہ سانپ بن جانے میں تھا کہ لکڑی نے سانپ کی شکل اختیار کر کے سانپ ہی کا کام کیا یعنی جادوگروں کے جادو سے بنائے ہوئے سانپوں کو نگل کر ختم کر دیا۔ اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ''بکائے استوانہ حنانہ'' کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یعنی مسجد کا ممبر بننے سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس لکڑی کے ستون سے ٹیک لگایا کرتے تھے۔ لیکن ممبر بننے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لکڑی کے ستون کو چھوڑا تو وہ آپ کے عشق وفراق میں انسانوں کی طرح رویا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اس لکڑی کے ستون میں ایک انسان

عارف کی صفت بصورت گریہ پیدا ہوگئی۔جس سے معلوم ہوا کہ اس لکڑی کے ستون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کاملہ حاصل ہوچکی تھی، اور موسیٰ علیہ السلام کی لکڑی کے سانپ بن جانے میں کوئی دلیل معرفت نہیں پائی جاتی۔اس لئے معجزۂ محمدی ﷺ معجزۂ موسویؑ سے بدرجہا فائق اور برتر قرار پائے گا۔

یہ لطیفۂ علمی اہل علم کے لئے محض ایک واقعہ اور لطیفہ ہی نہیں بلکہ ایسا باب علم ہے کہ جو بے شمار حقائق علمیہ کے انکشاف کا ہمیشہ ذریعہ بنتا رہے گا۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں، اپنی آستینوں میں

ف: یہ ہمارے اکابر کے حِکم واسرار ہیں جو ان کے نوک زبان تھے جن پر ہم کو ناز وفخر ہے اور بجا طور پر ان کی مدح میں ہم یہ شعر پڑھ سکتے ہیں ؎

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم اذا جمعتنا یا جریر المجامع

ترجمہ: یہ ہمارے آباء واجداد ہیں، مجمع میں ایسے آباء کو لاؤ اے جریر۔

مگر ہمارے لئے محض اپنے آباء واجداد کے احوال پر خوش ہونا اصل نفع نہیں ہے، بلکہ ہم کو تو اس وقت خوش ہونا چاہئے جب کہ ہم اپنے اکابر کے علوم ومعارف کو اپنے صفحات قلوب پر نقش کرلیں، جس کی وجہ سے ہمارے اکابر بزبان حال وقال اس شعر سے مترنم ہوں ؎

اولئک ابنائی فجئنی بمثلھم اذا جمعتنا یا عزیز المجامع

جیسا کہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے متعلق فرمایا کہ: احمد وہ آفتاب ہے کہ اس میں ہمارے جیسے ستارے گم ہیں۔

نیز جیسا کہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے متعلق فرمایا کہ آپ حضرات ایسے باکمال ہیں کہ میری جگہ آپ لوگوں کو ہونا چاہئے تھا اور مجھے آپ کی جگہ۔

اسی طرح حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور ان کے رفقاء سے فرمایا جب کہ ان دستار بندی کا انتظام ہو رہا تھا، تو انھوں نے حضرت الاستاذ کی خدمت میں جا کر عرض کیا کہ ہم لوگ اس دستار بندی کے لائق نہیں ہیں، تو فرمایا کہ ابھی تمہارے اساتذہ موجود ہیں اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے، مگر جب تمہارے اساتذہ نہیں رہیں گے تو اس وقت تم ہی تم رہو گے۔ ماشاء اللہ کتنی بڑی بشارت سنائی۔ فھینا لھم

اب یہ حقیر ضمناً ایک بات عرض کرتا ہے کہ حضرت تھانویؒ اور ان کے رفقاء جیسے علماء وفضلاء جو دورۂ حدیث سے فارغ ہو چکے تھے، اور اساتذہ کے نزدیک دستار بندی کے لائق تھے، مگر ان لوگوں نے کس قدر تواضع ونیستی کی بات فرمائی کہ ''ہم دستار بندی کے لائق نہیں ہیں'' تو حضرت الاستاذ نے ان کی تسلی کے طور پر کیسی بشارت سنائی جو آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔

مگر افسوس کہ اب اس تواضع وانکساری کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا تو پھر اپنے اکابر کے فیوض وبرکات اور حکم واسرار سے کیسے بہرہ ور ہوں گے۔ اس لئے بطور نصیحت طلبہ کرام کو الشیخ ابن عبد ربہ کے ارشاد سنانے کو جی چاہتا ہے:

لایکون العالم عالما حتی یکون فیه ثلاث خصال لایحتقر من دونه ولایحسد من فوقه ولایاخذ علی علمه شیئا۔

یعنی عالم صحیح معنوں میں عالم نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس میں تین خصلتیں نہ پائی جائیں۔(۱) اپنے چھوٹوں کو حقیر نہ سمجھے۔(۲) اپنے بڑے سے حسد نہ کرے۔(۳) اپنے علم پر مخلوق سے ثمن و قیمت نہ لے۔اس لئے کہ ہمارے علم کی قیمت کوئی چکا نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان خصال حمیدہ کو اپنے اندر پیدا کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔اور اکابر کے نقش قدم پر چلائے اور ان کے حکم و اسرار اور علوم و معارف سے ہمارے قلوب کو منور فرمائے۔آمین یارب العالمین۔

اب ہم جلد ہفتم کو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ پر ختم کرتے ہیں۔اس کے بعد جلد ہشتم کے شروع میں اویس زمانہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی و شیخ العلماء حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کا تذکرہ ہوگا۔

محمد قمر الزمان الہ آبادی

مصادر و مراجع اقوالِ سلف ہفتم

قرآن مجید	کلام اللہ عز وجل
مشکوٰۃ شریف	حضرت شیخ ولی الدین خطیب تبریزیؒ
مسند امام احمد بن حنبل	حضرت امام احمد بن حنبلؒ
مسلم شریف	حضرت امام مسلم بن الحجاج القشیریؒ
تفسیر روح المعانی	حضرت علامہ سید محمود آلوسی بغدادیؒ
بخاری شریف	حضرت امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ
ترمذی شریف	حضرت امام محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ
مجمع البحار	حضرت علامہ طاہر پٹنی گجراتیؒ
احیاء العلوم	حضرت حجۃ الاسلام ابو حامد غزالیؒ
تاریخ دعوت و عزیمت (پنجم)	حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
ارواحِ ثلاثہ	حضرت شاہ امیر خان صاحبؒ
علماءِ ہند کا شاندار ماضی	حضرت مولانا سید محمد میاں دہلویؒ
رِسالۂ بیعت	حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دہلویؒ
تالیفاتِ مصلح الامتؒ	حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادیؒ
الواح الصنادید	حضرت مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی دہلوی
تذکرۂ حضرت شاہ ولی اللہؒ	حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
آثار الصنادید	حضرت سر سید احمد خانؒ
شاہ ولی اللہؒ کے اَجدادِ گرامی	حضرت مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

رودِ کوثر	حضرت شیخ محمد اکرام فیصل آبادی
نزہۃ الخواطر	حضرت مولانا سید عبدالحی لکھنویؒ
منصب امامت	حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید دہلویؒ
سیرتِ سید احمد شہیدؒ (دوم)	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
پیش لفظ ''تقویۃ الایمان''	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
ظفرالمحصلین	حضرت مولانا محمد حنیف صاحب گنگوہیؒ
خطوطِ مرزا مظہر جانِ جاناںؒ	محترم جناب خلیق انجم صاحب
ارشادالطالبین	حضرت مولانا قاضی ثناءاللہ صاحب پانی پتیؒ
مالابدمنہ	حضرت مولانا قاضی ثناءاللہ صاحب پانی پتیؒ
فتاویٰ رشیدیہ کامل	حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ
قافلۂ اہل دل	حضرت مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی
درالمعارف	حضرت مولانا شاہ رؤف احمد صاحب مجددی
تفسیر کشاف	حضرت ابوالقاسم جاراللہ محمود بن عمر زمخشریؒ
تذکرۂ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ	حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی
سوانح مولانا محمد یوسف صاحبؒ	حضرت مولانا محمد ثانی حسنی لکھنویؒ
صراطِ مستقیم	حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ
انوارالعارفین	حضرت مولانا محمد حسین مرادآبادی
تذکرۃ الرشید	حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ
تذکرۂ حضرت مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادیؒ	حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
نیل الاوطار	حضرت قاضی القضاۃ محمد بن علی الشوکانیؒ

تقصار جیود الاحرار	حضرت نواب صدیق حسن خان صاحبؒ
حیاتِ حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ	حضرت قاری عزیز الرحمن صاحب ناظم مدرسہ لوہاری
کاروانِ ایمان وعزیمت	حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
بیس بڑے مسلمان	حضرت مولانا عبدالرشید ارشد صاحب پاکستانی
معارفِ اکابر	محترم جناب اقبال محمد قریشی
اشرف السوانح	حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ
سیرتِ مولانا کرامت علی جون پوریؒ	حضرت مولانا عبدالباطن صاحب جون پوریؒ
حیاتِ طاہر	حضرت مولانا محمد عثمان صاحب معروفیؒ
مقاماتِ مظہری	حضرت مولانا شاہ غلام علی صاحب دہلویؒ
رسالہ برہان	سرپرست حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ
مختصر ومدلل تاریخ ہند	حضرت مولانا مفتی محمد صاحب پالن پوری
ذکر صالحین	حضرت مولانا مرغوب احمد صاحب لاجپوری
فخر وطن	محترم جناب فاروق ارگلی صاحب
تاریخ مشائخ چشت (پنجم)	محترم جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب علیگڈھ
تذکرۂ اہل دل	حضرت مولانا سعید الرحمن صاحب اعظمی
محبوب التواریخ یعنی تذکرہ اولیاءِ دکن	محترم سید یوسف محمد حسینی صاحب
تاریخ شیراز ہند جون پور	محترم سید اقبال احمد جون پوری
شخصیاتِ افغانستان کی روح پرور یادیں	حضرت مولانا عبدالمالک صاحب کراچی
مشاہیر علماءِ فرنگی محل اوران کی علمی خدمات	حضرت مولانا خالد رشید فرنگی محلی لکھنؤ
تذکرۂ علماءِ فرنگی محل	حضرت مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی لکھنؤ

تحریک آزادی اور مسلمان	حضرت مولانا اسیر ادروی صاحب مئو
سید مرتضیٰ بلگرامی زَبیدیؒ	ڈاکٹر رخسانہ نکہت اور اُم ہانی
تاج العروس	سید مرتضیٰ بلگرامی زَبیدیؒ
تذکرۂ علماءِ اعظم گڑھ	حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمیؒ
عہدِ رَفتہ کے چند علماء ومشائخ	محترم پروفیسر محمد عبدالحی فاروقی
دیارِ پورب میں علم اور علماء	مؤرخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ
مشائخ نقشبندیہ مجددیہ	حضرت مولانا محمد حسن صاحب بجنوریؒ
تذکرۂ اولیاءِ دیوبند	حضرت حافظ محمد اکبر شاہ بخاریؒ
سوانح حیاتِ جعفرؒ	حضرت مولانا محمد عبید اللہ اسعدی صاحب باندہ
سیرتِ سلطان ٹیپو شہیدؒ	حضرت مولانا محمد الیاس صاحب ندوی بھٹکلی
ضمیمہ مقاماتِ مظہری	حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ
سراجِ منیر (قلمی)	ڈاکٹر سید محمد اکمل اجملی دائرۂ شاہ اجمل الٰہ آباد
فتاویٰ نویسی کے رہنما اصول	حضرت مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری
ردالمحتار رملقب بہ شامی	حضرت علامہ ابن عابدین شامیؒ
التفسیر والمفسرون	ڈاکٹر محمد حسین ذہبی استاذِ جامعہ ازہر مصر
مجالس الابرار اردو ترجمہ نفائس الازہار	حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب راندیری سورتیؒ
نفائس الازہار	حضرت علامہ شیخ احمد رومیؒ
سراج الدولہ	مکرم رئیس احمد بدایونی
حدائق الحنفیۃ	حضرت مولانا فقیر محمد صاحب جہلمی
رسالہ مآثر	مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو
بیس بڑے مسلمان	حضرت مولانا عبدالرشید ارشد صاحب

الحمد للہ مندرجہ کتب مصادر پر کتاب مکمل ہوئی۔ محمد قمر الزمان الٰہ آبادی

یادداشت.....